MUHAMMAD

A Biography of the Prophet

محمد ﷺ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

www.KitaboSunnat.com

پیغمبرِ اسلام کی سوانح حیات

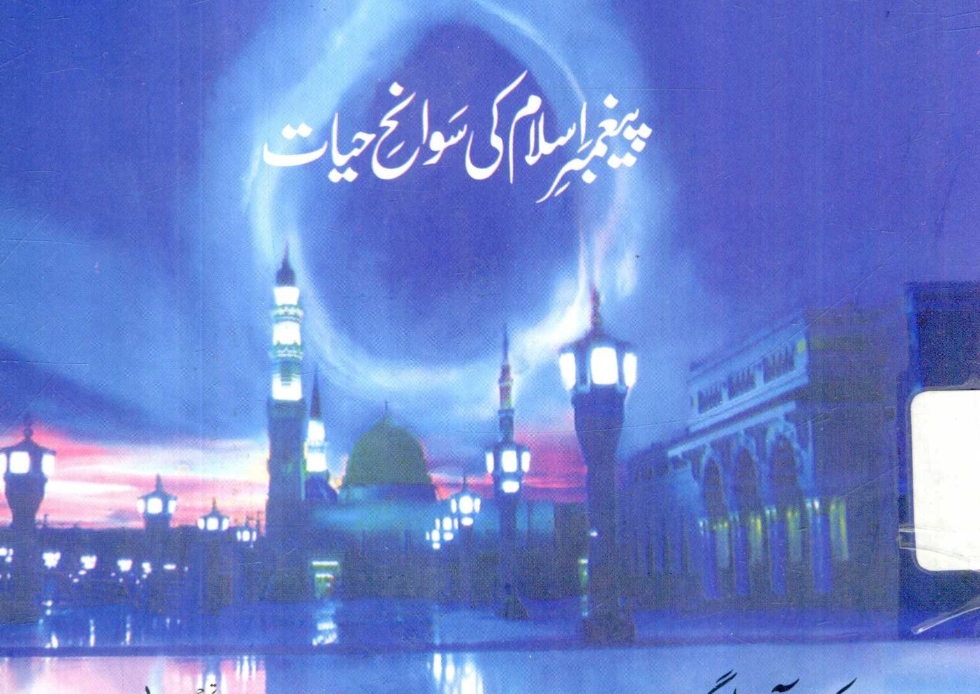

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

محمد ﷺ

پیغمبرِ اسلام کی سوانح حیات

DATA ENTERED

29639

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

نشریات
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔فون: 0321-4589419

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۲ء

نام کتاب : محمد ﷺ پیغمبر عہد رواں

تالیف : کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ : نعیم اللہ ملک

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

اہتمام : نشریات، لاہور

قیمت : ۶۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884

نشنل بُک

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 32212991-32629724

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

29637

ترتیب

۱	مدینے والے دیاں خیراں! از مترجم	۵
۲	اکتوبر ۲۰۰۱ ایڈیشن کا تعارف	۱۵
۳	دیباچہ	۲۲
۴	تمہید	۲۶
پہلا باب	حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جنہیں یورپ اپنا دشمن سمجھتا ہے	۳۵
دوسرا باب	حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اللہ کے رسولؐ	۶۶
تیسرا باب	دورِ جاہلیت	۷۸
چوتھا باب	نزولِ وحی	۹۹
پانچواں باب	انسانیت کو شعور و آگہی بخشنے والا پیغمبرؐ	۱۲۶
چھٹا باب	شیطانی آیات	۱۵۱
ساتواں باب	ہجرت اور ایک نیا قبلہ	۱۸۴
آٹھواں باب	مقدس جہاد	۲۲۳
نواں باب	مقدس امن	۲۸۳
دسواں باب	پیغمبر اسلامؐ کی رحلت؟	۳۳۳
اشاریہ		۳۵۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینے والے دیاں خیراں!

میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو گاؤں میں اپنے گھر کے سامنے مسجد کے قریب چوپال میں ایک مجذوب کو دھونی رمائے دیکھا۔ شدید سردی میں بھی وہ مختصر لباس میں برگد کے درخت کے نیچے ڈیرہ جمائے رکھتا۔ وہ نہر اپر چناب کے قریب منگو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ پتا نہیں دل پر کیا چوٹ لگی تھی کہ گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ وقفے وقفے کے ساتھ وہ آسمان کی طرف دیکھتا، پھر ایک سرد آہ بھر کر کہتا: ''مدینے والے دیاں خیراں!'' مولا بخش نے مدینے والے سے محبت اور عقیدت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا!

پھر میں تعلیم اور روزگار کے سلسلے میں کوئی چالیس سال تک گاؤں سے غیر حاضر رہا۔

یہ جنوری ۲۰۰۷ء کی ایک سرد رات تھی۔ ان دنوں میں لاہور میں ایک اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس رات ایسی طوفانی بارش ہوئی کہ ڈنر کے لیے شملہ پہاڑی پر واقع پریس کلب کی عمارت تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ میں بڑی مشکل سے گیارہ بجے کلب پہنچا تو ڈائننگ ہال خالی تھا۔ میں نے ویٹر سے کھانا لانے کو کہا کہ اتنی دیر میں ایک اجنبی شخص میرے قریب آ کر بیٹھ گیا، کہنے لگا: ''آپ سے ضروری کام ہے۔ برطانیہ کی کیرن آرمسٹرانگ نے رسول کریم کی جو سوانح عمری لکھی ہے، آپ اس کا اردو میں ترجمہ کر دیں''۔ پھر وہ شخص مجھے کبھی نہیں ملا۔

میں نے چشم تصور سے ایک سو سال پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا کہ مولانا شبلی نعمانی نے پچھلی صدی کے شروع میں سیرت النبیؐ لکھنے کی غرض سے ایک لاکھ روپے کے عطیات کے لیے اخباروں میں اشتہار شائع کرایا تھا (اس وقت کے ایک لاکھ روپے آج کے دس کروڑ سے بھی زیادہ ہیں)۔ لیکن بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں بیگم نے ہی مولانا کو اس عظیم کام کے لیے ایک لاکھ روپے دے دیے اور ان سے کہا کہ اب وہ کسی اور سے رقم نہ لیں۔

اسی سال جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو میں علمی کام کے سلسلے میں ایک ممتاز علمی اور دینی شخصیت کے پاس گیا تو انہوں نے مطلوبہ کام کرنے کے بعد مجھ سے کہا: "دنیا کے سارے کام چھوڑ کر صرف سیرت النبیؐ کا کام کرو"۔

میں نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو ذہن پھر علامہ شبلی کی طرف منتقل ہو گیا۔ انہوں نے ۱۹۱۴ء میں سیرت کی پہلی جلد ہی مکمل کی تھی کہ پیغامِ اجل آ گیا۔ اس وقت مولانا نے اپنے جانشین سید سلیمان ندویؒ سے کہا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر سیرت کا کام مکمل کریں۔ سید صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور سیرت کی پانچ جلدیں مکمل کیں۔ کتاب کی ساتویں جلد ان کے بیٹے ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے، جو ڈربن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، لکھی اور اس طرح یہ شہرہ آفاق کتاب تین نسلوں کی علمی جدوجہد کے نتیجے میں پایہ تکمیل تک پہنچی۔

میری حالت مصر کی اس روایتی بڑھیا کی طرح تھی جو سوت کی ایک انٹی لے کر یوسفؑ کو خریدنے چل پڑی تھی۔ اس خیال سے ہی میرے جسم کا رُواں رُواں کانپ اٹھتا تھا کہ شاہِ مدینہ کی سوانح حیات پر قلم کیسے اٹھاؤں؟ میری کم علمی اور بے سروسامانی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

پھر دل میں خیال آیا کہ رسولِ کریمؐ کی سیرت لکھنے سے پہلے ان مقدس شہروں اور مقامات کو دیکھوں جن گلیوں میں سرورِ کائناتؐ چلتے پھرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عمرے کا بھی انتظام کر دیا اور مجھے رمضان المبارک کا پورا مہینہ دیارِ حجاز میں گزارنے کا موقع ملا۔ وہاں مسجدِ نبویؐ میں میں نے محمد اقبالؒ کو یہ نعت پڑھتے دیکھا:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!

وطن واپسی کے بعد میں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور اس مقدس کام کے لیے، جو میری نجات کا ذریعہ ہے، سب کچھ چھوڑ کر صرف ریفرنس کی کتابیں لیے اس حال میں گاؤں چلا گیا کہ ساتھ میرے رہ گئی ایک میری آرزو۔ وہاں میں نے عقیدت کی نظروں سے، باوضو ہو کر چشمِ تر کے ساتھ خدا کے فضل اور توفیق سے پورے ایک سال میں اس فریضے کو انجام دیا اور جس روز یہ کام مکمل ہوا، خوش قسمتی سے وہ حج کا مبارک دن تھا۔

اس پورے عرصے میں اکثر میں اپنا وجود کھو دیتا تھا۔ گاؤں میں سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے مسجد سے یہ آواز آتی تھی:

آکھیں سوہنے نوں ہوائے نیں جے تیرا گزر ہووے   میں مر کے وی نئیں مردا جے تیری نظر ہووے

یہ انسانی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی کی سوانح حیات ہے جس کی زندگی میں اس قدر متنوع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور متضاد اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے آج تک کبھی یک جا نہیں کیے۔ بادشاہ ایسا کہ پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس ایسا کہ خود اپنے کو بھی اپنے قبضے میں نہ جانتا ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہو۔ دولت مند ایسا کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آ رہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر میں چولہا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے سے گزر جاتے ہوں۔ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرقِ آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پُر جوش جاں نثاروں کی ہمرکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو۔ شجاع اور بہادر ایسا ہو کہ ہزاروں کے مقابلے میں تن تنہا کھڑا ہو اور نرم دل ایسا کہ کبھی اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو۔ باتعلق ایسا کہ عرب کے ذرے ذرے کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب اور مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، خدا کی بھولی ہوئی دنیا کے سدھار کی اس کو فکر، غرض سارے سنسار کی اس کو فکر ہو اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو اور اس کے سوا ہر چیز اس کو فراموش ہو۔ اس نے اپنی ذات کے لیے اپنا برا کہنے والوں سے کبھی بدلہ نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعا خیر کی اور ان کا بھلا چاہا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا اور حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذابِ الٰہی سے ڈراتا رہا۔ عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکا ہوتا ہے، وہ ایک شب زندہ دار زاہد کی صورت میں جلوہ نما ہوتا۔ عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح کا شبہ ہو، وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ عین اس وقت جب ہم اس کو شاہِ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں، وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔ عین اس دن جب عرب کے اطراف سے آ آ کر اس کے صحنِ مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے، اس کے گھر میں فاقے کی تیاری ہو رہی ہے۔ عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بنا کر بھیجے جا رہے ہیں، فاطمہؓ بنتِ رسول اللہؐ جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے اور سینہ کے داغ باپ کو دکھاتی ہیں جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گئے تھے۔ انہوں نے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو حضورؐ نے فرمایا: ''اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے تو تمہاری درخواست کیوں کر قبول ہو''؟ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ''بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے''۔ عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوتا ہے، حضرت عمرؓ حاضرِ دربار ہوتے ہیں، اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوتؐ کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپؐ ایک کھردری چارپائی پر آرام فرما رہے ہیں۔ جسم پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں۔ ایک کھونٹی میں خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ سرورِ کائناتؐ کے گھر کی یہ کائنات دیکھ کر جنابِ عمرؓ رو پڑتے ہیں۔ سبب دریافت ہوتا ہے تو عرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہیں: "یارسول اللہؐ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپؐ پیغمبر ہو کر اس حالت میں ہیں۔" ارشاد ہوتا ہے: "عمرؓ! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت"۔

بحرین سے ایک دفعہ خراج کا لدا ہوا خزانہ آیا۔ فرمایا کہ صحنِ مسجد میں ڈال دیا جائے۔ صبح کی نماز کے لیے آپؐ تشریف لائے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آپؐ نے خزانے کے انبار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نماز کے بعد ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور تقسیم شروع کر دی۔ جب سب ختم ہوگیا تو دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہوگئے گویا کوئی غبار تھا جو دامنِ مبارک پر پڑ گیا تھا۔

آں حضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر کھانا نصیب نہ ہوا۔ وہی بیان کرتی ہیں کہ جب آپؐ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لیے تھوڑے سے جَو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جَو کے بدلے میں آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں رہن پڑی تھی۔

حضورؐ کے رہنے کا ایک حجرہ تھا جس کی دیواریں کچی اور چھت کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی تھی۔ بیسویں صدی کے نامور امریکی مورخ ول ڈیورینٹ نے A Story of Civilization: The Age of Faith میں پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ کے اس حجرے کا کل رقبہ بارہ یا چودہ مربع فٹ اور اونچائی آٹھ فٹ تھی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ کا کپڑا کبھی تہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ جو بدن مبارک پر کپڑا ہوتا تھا، اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہ کیا جاتا۔

ایک دن ایک سائل خدمتِ اقدس میں آیا اور بیان کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا: "گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہؐ کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہیں اور بھوک کی تکلیف سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ اکثر بھوک کی وجہ سے آواز میں کمزوری اور نقاہت آجاتی تھی۔ ایک دن دولت خانے سے نکلے تو بھوکے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ نخلستان سے کھجوریں توڑ لائے اور کھانے کا سامان کیا۔ کھانا جب سامنے آیا تو آپؐ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ یہ فاطمہ کو بھجوا دو کہ کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔

حضورؐ کو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنین علیہما السلام سے بڑی محبت تھی مگر یہ محبت امیر عرب نے بیش قیمت کپڑوں اور سونے چاندی کے زیوروں کے ذریعے ظاہر نہیں فرمائی۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ کا دیا ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سونے کا ایک ہار حضرت فاطمہؓ کے گلے میں دیکھا تو فرمایا: ''اے فاطمہ! کیا تم لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہو کہ محمد کی بیٹی گلے میں آگ کا طوق ڈالے ہے''۔ حضرت فاطمہؓ نے اسی وقت وہ طوق اتار کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سونے کے کنگن پہنے تو اتروا دیے کہ محمد کی بیوی کو یہ زیب نہیں دیتا۔

قریش نے آپؐ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا، کس کس طرح اذیتیں نہ پہنچائیں، جسمِ مبارک پر صحنِ حرم کے اندر نجاست ڈالی، گلے میں چادر ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی، راستے میں کانٹے بچھائے مگر آپؐ کے قدم کو راہِ حق میں لغزش نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ آپؐ کو شعب ابی طالب میں تین سال تک گویا قید رکھا گیا۔ آپؐ کا اور آپؐ کے خاندان کا مقاطعہ کیا گیا، اندر غلہ جانے کی روک تھام کی گئی، بچے بھوک سے بلبلاتے تھے، جوان درختوں کے پتے کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر آپؐ کے قتل کی سازش ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر صبر و استقلال کا دامن آپؐ کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار آپؐ کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بے یار و مددگار نہتے محمدؐ اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ! ہم دو ہی ہیں۔ لیکن تسکین سے بھری ایک آواز آتی ہے: ''ابوبکر! ہم دو نہیں تین ہیں۔ گھبراؤ نہیں! ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے''۔

بدر کا معرکہ ہے۔ تین سو نہتے مسلمان لوہے میں غرق ایک ہزار کے لشکر سے نبرد آزما ہیں۔ مگر ان تین سو سپاہیوں کا سپہ سالار خود کہاں ہے؟ معرکہ کارزار سے الگ خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہے۔ کبھی پیشانی زمین پر ہوتی ہے، کبھی ہاتھ آسمان کی جانب اٹھتے ہیں کہ خداوندا! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت صفحہ ہستی سے مٹ گئی تو پھر کوئی تیرا پرستار اس دنیا میں باقی نہ رہے گا۔

ایسے موقعے بھی آئے ہیں کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ گئے مگر خدا تعالیٰ کی نصرت اور مدد پر اعتماد کامل اور پورا بھروسا کرنے والا دانائے سبلؐ، ختم الرسلؐ، مولائے کلؐ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ احد میں اکثر مسلمانوں نے قدم پیچھے ہٹا لیے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جگہ پر تھے۔ پتھر کھائے، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے تھے، خود کی کڑیاں سر مبارک میں دھنس گئی تھیں، دندانِ مبارک شہید ہو چکا تھا، چہرہ اقدس زخمی ہو رہا تھا مگر اس وقت بھی آپؐ نے اپنا ہاتھ تلوار پر نہیں رکھا بلکہ خدا تعالیٰ ہی کی نصرت پر بھروسا اور اعتماد رہا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمے داری پر آپؐ کو پورا یقین تھا۔
حنین کے میدان میں ایک دفعہ جب دس ہزار تیروں کا مینہ برسا تو تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے لیکن ذاتِ اقدسؐ اپنی جگہ پر تھی۔ اُدھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور اِدھر سے ''میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں'' کا نعرہ بلند تھا۔ سواری سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: ''میں خدا کا بندہ ہوں'' اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

دنیا میں کیا کسی کو ایسے سپہ سالار کا حال بھی معلوم ہے جس کی بہادری اور استقلال کا یہ عالم ہو کہ فوج کتنی ہی کم ہو، کتنی ہی غیر مسلح ہو، اس کو پیچھے بھی چھوڑ کر کیوں نہ ہٹ گئی ہو مگر وہ نہ تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور نہ اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتا ہے بلکہ ہر حال میں زمین کی طاقتوں سے غیر مسلح ہو کر آسمان کی طاقتوں سے مسلح ہونے کی درخواست کرتا ہے۔

ہم نے کوہِ زیتون پر حضرت عیسیٰؑ سے دشمنوں کو پیار کرنے کا وعظ سنا ہے لیکن اس کی عملی مثال نہیں دیکھی ہوگی۔ آئیں مدینہ کی سرکار میں اس کا عملی مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ ابوسفیان کون ہے؟ وہ جو بدر، احد اور خندق کی لڑائیوں کا سرغنہ تھا، جس نے کتنے ہی مسلمانوں کو تہ تیغ کرایا، جس نے کئی دفعہ حضورؐ سرورِ عالم کے قتل کا فیصلہ کیا، جو ہر قدم پر اسلام کا سخت ترین دشمن ثابت ہوا۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباسؓ کے ساتھ آپؐ کے سامنے آتا ہے تو گو اس کا ہر جرم اس کے قتل کا مشورہ دیتا ہے مگر رحمتِ عالمؐ کا عفوِ عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں، محمد رسول اللہؐ انتقام کے جذبے سے بالاتر ہیں۔ پھر حضورؐ نہ صرف اس کو معاف کرتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، اس کو بھی امان ہے۔

ہند، ابوسفیان کی بیوی، وہ ہند جو احد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی ہے، وہ جو حضورؐ کے سب سے محبوب چچا اور اسلام کے ہیرو حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کرتی ہے، ان کے سینے کو چاک کرتی ہے، ان کے کان، ناک کاٹ کر ہار بناتی ہے، کلیجے کو نکال کر چبانا چاہتی ہے، لڑائی کے بعد اس منظر کو دیکھ کر آپؐ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ لیکن حضورؐ پھر بھی تعرض نہیں فرماتے اور یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ عفوِ عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آج سے پہلے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمے سے کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے''۔

وحشی، حضرت حمزہؓ کا قاتل، فتح طائف کے بعد بھاگ کر کہیں چلا جاتا ہے اور جب وہ مقام بھی فتح ہو جاتا ہے تو کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں: ''وحشی! تم نے ابھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہچانا نہیں''۔ حضورؐ اسے دیکھتے ہیں، آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ پیارے چچا کی شہادت کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ قاتل سامنے موجود ہے مگر صرف یہ اشارہ ہوتا ہے: ''وحشی جاؤ! میرے سامنے نہ آیا کرو کہ شہید چچا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عکرمہؓ، اسلام، مسلمانوں اور خود محمد رسول اللہؐ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے تھے جس نے آپ ہی کو سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ وہ خود بھی اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑ چکے تھے۔ مکہ جب فتح ہوا تو ان کو اپنے اور اپنے خاندان کے تمام جرم یاد تھے۔ وہ بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں اور محمد رسول اللہؐ کو پہچان چکی تھیں۔ وہ خود یمن گئیں، عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو لے کر مدینہ آئیں۔ حضورؐ کو ان کی آمد کی خبر ہوتی ہے تو ان کے خیر مقدم کے لیے اس تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسمِ مبارک پر چادر تک نہیں رہتی۔ پھر جوشِ مسرت میں فرماتے ہیں: ''اے مہاجر سوار! تمہارا آنا مبارک''۔ غور کا مقام ہے، یہ مبارک باد کس کو دی جارہی ہے؟ یہ خوشی کس کے آنے پر ہے؟ یہ معافی نامہ کس کو دیا جارہا ہے؟ اس کو جس کے باپ نے آپؐ کو مکہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں، جس نے آپؐ کے جسمِ مبارک پر نجاست ڈلوائی، جس نے بحالتِ نماز آپؐ پر حملہ کرنا چاہا، جس نے آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر آپؐ کو پھانسی دینا چاہی، جس نے دارالندوہ میں آپؐ کے قتل کا مشورہ دیا، جس نے بدر کا معرکہ برپا کیا اور ہر قسم کی صلح کی تدبیر کو برہم کیا، آج اسی کی جسمانی یادگار کی آمد پر یہ مسرت اور شادمانی ہے!

مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں؟ جہاں آپؐ کو گالیاں دی گئیں، آپؐ پر نجاستیں پھینکی گئیں، آپؐ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی، قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، وہ بھی تھے جو آپؐ کو جھٹلایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپؐ کی ہجویں کیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپؐ کو گالیاں دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو خود اس پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخی کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ بھی تھے جنہوں نے آپؐ پر پتھر پھینکے تھے، آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپؐ پر تلواریں چلائی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آپؐ کے عزیزوں کا خونِ ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کیے تھے، ان کے سینوں پر اپنی جفاکاری کی آتشیں مہر لگاتے تھے، ان کو جلتی ریت پر لٹاتے تھے، دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم کو داغتے تھے، نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے۔ آج یہ سب سرنگوں سامنے تھے۔ پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہؐ کے ایک اشارے کی منتظر تھیں۔ دفعتاً زبان مبارک کھلتی ہے، سوال ہوتا ہے: ''قریش بتاؤ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟'' جواب ملتا ہے: ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تو ہمارا شریف بھائی ہے اور شریف بھتیجا ہے''۔ ارشاد ہوتا ہے: ''آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا کہ لاتثریب علیکم الیوم، آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں، تم سب آزاد ہو''۔

یہ ہے دشمنوں کو پیار کرنا اور معاف کرنا، یہ ہے اسلام کے پیغمبرؐ کا عملی نمونہ اور عملی تعلیم جو صرف خوش بیانیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور شیریں زبانیوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کے باعث دوسرے تمام مذاہب اپنے پیغمبروں اور رہنماؤں کے میٹھے میٹھے الفاظ کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں اور بار بار ان ہی کو دہراتے ہیں کہ ان کے سوا ان کے پاس کوئی چیز نہیں اور اسلام اپنے پیغمبرؐ کے صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ عمل اور سنت کی دعوت دیتا ہے۔ محمد رسول اللہؐ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا: ''میں تم میں دو مرکزِ ثقل چھوڑ جاتا ہوں، خدا کی کتاب اور اپنا عملی راستہ''! یہی دو مرکزِ ثقل اب تک قائم ہیں اور قیامت تک قائم رہیں گے۔

حضورؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ قرآن کی پہلی سورت نازل ہونے کے بعد آپؐ غارِ حرا سے گھبرائے ہوئے گھر تشریف لائے تو جنابِ خدیجہؓ نے یہ کہہ کر آپؐ کو تسلی دی تھی: ''یا رسول اللہؐ! آپ قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں''۔ گو آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پیچھے آؤ، نہ آپؐ نے گھر بار لٹانے کا حکم دیا، نہ دولت مندوں پر آسمان کی بادشاہت کا دروازہ بند کیا بلکہ صرف یہ حکم دیا کہ اپنی کمائی میں سے کچھ دوسروں کو دے کر خدا کا حق ادا کرو۔ مگر خود آپؐ کا یہ عمل جاری رہا کہ جو کچھ آیا، خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب کی کمی نہ تھی لیکن وہ سب غیروں کے لیے تھا، اپنے لیے کچھ نہ تھا بلکہ وہی فقر و فاقہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد سات ہجری سے یہ معمول تھا کہ سال بھر کے خرچ کے لیے تمام ازواجِ مطہراتؓ کو غلہ تقسیم کر دیا جاتا تھا لیکن سال تمام بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ غلہ تمام ہو جاتا تھا اور فاقے پر فاقہ شروع ہو جاتا تھا کیونکہ غلے کا بڑا حصہ اہلِ حاجت کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ تمام لوگوں میں زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخاوت آپؐ رمضان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں ''نہیں'' کا لفظ نہیں فرمایا۔ کبھی کوئی چیز تنہا نہیں کھاتے تھے، کتنی بھی معمولی چیز ہوتی مگر آپؐ سب حاضرین کو اس میں شریک کر لیتے تھے۔ لوگوں کو عام حکم تھا کہ ''جو مسلمان قرض چھوڑ کر مر جائے، اس کی اطلاع مجھے دو کہ میں اس کا قرض ادا کروں گا۔ اور اگر اس نے ترکہ چھوڑا ہو تو اس کے حق دار اس کے وارث ہوں گے''۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رات کو آپؐ کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ راہ میں آپؐ نے فرمایا: ''ابوذر! اگر احد کا یہ پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے البتہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ رکھ چھوڑوں''۔

ایک دفعہ فدک سے چار اونٹوں پر غلہ لد کر آیا۔ کچھ قرض تھا، وہ لوگوں کو ادا کیا گیا، کچھ لوگوں کو دیا گیا۔ حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ کچھ بچ تو نہیں رہا؟ عرض کی اب کوئی لینے والا نہیں اس لیے کچھ بچ رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا: ''جب تک دنیا کا یہ مال باقی ہے، میں گھر نہیں جا سکتا''۔ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی۔ صبح کو بلالؓ نے آ کر بشارت دی: ''یارسول اللہؐ! خدا نے آپؐ کو سبکدوش کر دیا'' یعنی جو کچھ تھا، وہ تقسیم ہو گیا۔ آپؐ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد حضورؐ خلاف معمول اندر تشریف لے گئے اور پھر باہر آ گئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا: ''مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آ جائے اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر میں پڑا رہ جائے''۔ حضرت اُمِ سلمہؓ بیان کرتی ہیں: ''ایک دفعہ آپؐ ملول اور رنجیدہ اندر تشریف لائے۔ میں نے دریافت کیا تو فرمایا: اُمِ سلمہ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے''۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپؐ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف ہے، نہایت ہی بے چینی ہے لیکن اس وقت یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم ہوتا ہے: ''انہیں خیرات کر دو، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں''۔

یہ کائناتِ ہستی کے اس وجودِ مقدس و مطہر کا تذکرہ ہے جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں، جس کا ذکرِ پاک خدا نے بلند کر دیا ہے۔ یہ رب السموات والارض کے محبوبؐ کا ذکر ہے جس کے شہر کی خدا نے قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے: ''ہم مکہ کی قسم کھاتے ہیں مگر اس لیے کہ تیرا وجود اس سرزمین میں رہا اور بسا ہے''۔ جس کو خدا نے تمام کائناتِ انسانی میں ہر طرح کی محمودیتوں اور ہر قسم کی محبوبیتوں کے لیے چن لیا، محبوبیتِ عالم کا خلعتِ اعلیٰ صرف اسی کے وجودِ اقدس پر راست آیا۔ کرۂ ارض کی سطح پر انسان کے لیے بڑی سے بڑی بات جو لکھی جا سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ جو عشق کیا جا سکتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ مدح و ثنا جو کی جا سکتی ہے، غرض کہ انسان کی زبان انسان کے لیے جو کچھ کہہ سکتی اور ادا کر سکتی ہے، وہ سب کا سب صرف ایک انسانِ کامل و اکمل کے لیے ہے اور اس کا مستحق اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

وحدہٗ لاشریک خدا کی الوہیت و ربوبیت جس طرح وحدہٗ لاشریک ہے کہ کوئی ہستی اس کی شریک نہیں، اسی طرح اس انسانِ کامل کی انسانیتِ اعلیٰ اور عبدیتِ کبریٰ بھی وحدہٗ لاشریک ہے کیونکہ اس کی انسانیت و عبدیت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور اس حسن و جمالِ فردانیت کا کوئی شریک نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیرتِ مقدسہ کی اس کتاب کے صلے میں میری قبر کی تنہائیوں اور تاریکیوں کو دور کرے، روزِ محشر کو مجھے بخش دے اور میرے والدین کو، جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، اجرِ عظیم عطا کرے۔ محمد اقبالؒ کی طرح میری بھی یہی آرزو ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حساب من ز چشم او نہاں گیر

ترجمہ: جب یہ جہانِ کہنہ اپنے انجام کو پہنچے گا
تو ہر چھپی ہوئی تقدیر بے پردہ ہو جائے گی
مجھے سرورِ کائناتؐ کے سامنے رسوا مت کرنا
میرے عملوں کا حساب آپؐ کی نظروں سے اوجھل کرنا

اس کتاب کا کور ڈیزائن ایک زاہدہ و عابدہ خاتون، منفرد اور نابغہ روزگار آرٹسٹ محترمہ جویریہ حنیف نے، جو سرورِ کونینؐ کی ذاتِ گرامی کو وجہ تخلیقِ کائنات سمجھتی ہیں، آں حضرتؐ سے گہری عقیدت و شیفتگی کے زیرِ اثر تیار کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف پر بیٹھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو نبی کریمؐ کے طفیل ان کے والدین اور خود ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ کتاب کا سرورق صاحب طرز خطاط محمد علی زاہد نے لکھا۔ حضورؐ سے ان کی عقیدت کو خدا اُن کے لیے سامانِ نجات بنائے۔

میں ان تمام علمی اور دینی شخصیات کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اس ذاتِ بابرکاتؐ کی سیرتِ طیبہ کی اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مختلف مرحلوں پر میری رہنمائی اور معاونت کی جن کا مقام یہ ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

ترجمہ: آسمان کے نیچے یہ ایک ایسی بارگاہِ احترام ہے جو عرش سے بھی نازک ہے
یہاں جنیدؒ اور بایزیدؒ جیسے لوگ بھی سانس روکے، از خود رفتہ ہو کر آتے ہیں

محبوبِ خداؐ کی سیرتِ طیبہ کی طباعت کے اخراجات کا انتظام خدا نے اپنے خزانۂ غیبی سے کیا، کسی سے سوال نہ کرنا پڑا: نہیں تو سنتا نہیں مانگنے والا تیرا!

امیدوارِ رحمت
نعیم اللہ ملک

مراکیوال، سیالکوٹ
موسم بہار ۲۰۰۹ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکتوبر ۲۰۰۱ ایڈیشن کا تعارف

میں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سوانح حیات دس سال پہلے سلمان رشدی کے بحران کے وقت لکھی تھی۔ اس زمانے میں مَیں اسلام کے بارے میں تعصب کو دیکھ کر سخت پریشان ہو جاتی تھی اور حالت یہ تھی کہ بے حد آزاد خیال اور روادار حلقے بھی اسلام کے متعلق اکثر و بیشتر تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے۔ بیسویں صدی میں رونما ہونے والے ہولناک واقعات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم اس دین کے بارے میں، جس کے دنیا بھر میں ایک ارب بیس کروڑ پیروکار موجود ہیں اور جو پوری دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں، مسخ شدہ اور غلط رائے قائم کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جب آیت اللہ خمینی نے رشدی اور اس کے پبلشر کے خلاف اپنا بدنام فتویٰ جاری کیا تو مغرب میں اسلام کے بارے میں تعصب نے مزید شدت اختیار کر لی۔

۱۹۹۰ میں، جب میں یہ کتاب لکھ رہی تھی، برطانیہ میں کوئی شخص یہ فتویٰ سننے کا روادار نہ تھا اور فتویٰ جاری ہونے کے ٹھیک ایک ماہ بعد منعقد ہونے والی اسلامک کانفرنس میں ۴۵ رکن ریاستوں میں سے ۴۴ ملکوں نے آیت اللہ خمینی کے فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے اسے غیر اسلامی قرار دے دیا جس کے نتیجے میں ایران یکا و تنہا رہ گیا۔ اسلام کی مقدس سرزمین سعودی عرب کے شیوخ اور قاہرہ کی عالمی شہرت یافتہ الازہر یونیورسٹی نے بھی آیت اللہ خمینی کے فتوے کو اسلامی قانون سے متصادم قرار دے دیا تو مغرب نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ صرف معدودے چند لوگ ہی ایسے تھے جو برطانیہ میں مقیم ان بیشتر مسلمانوں کی آواز سننے کو تیار تھے جنہوں نے آیت اللہ خمینی کے فتوے سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور جو نہیں چاہتے تھے کہ رشدی قتل ہو البتہ ان مسلمانوں کو رشدی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ناپاک جسارت پر سخت صدمہ پہنچا اور وہ اس غم سے نڈھال تھے کہ اس کے ناول میں ان کے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کا توہین آمیز خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مغرب کا آزاد خیال طبقہ یہ باور کرانے پر تلا ہوا تھا کہ پورا عالم اسلام رشدی کے خون کے لیے ہنگامہ برپا کر رہا ہے۔ برطانیہ کے کئی نامور مصنفوں، دانشوروں اور فلاسفروں نے اسلام کی اس انداز سے تشریح کی جس سے یا تو ان کی حیرت انگیز جہالت یا سچائی اور حقیقت سے وحشت ناک لاتعلقی کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی رائے تھی کہ اسلام ایک تنگ نظر اور جنونی مذہب ہے جو کسی احترام کا مستحق نہیں اور یہ کہ رشدی کے ناول The Satanic Verses میں مسلمانوں کے پیارے نبیؐ کی توہین آمیز خاکہ کشی سے مسلمانوں کے جذبات کو جو ٹھیس لگی ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

میں نے سیرت کی یہ کتاب اس لیے لکھی کیونکہ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مغرب کے بیشتر لوگ آنحضرتؐ کے بارے میں صرف رشدی کا تذکرہ پڑھیں گے۔ گو کہ میں جانتی تھی کہ رشدی اپنے ناول میں کس چیز کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کے صحیح اور سچے حالات بھی سامنے آنے چاہییں کیونکہ آپؐ کی ذات گرامی پوری دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ افضل، ممتاز اور بلند مرتبت ہے۔ کتاب کے لیے پبلشرز کی تلاش ایک مشکل کام تھا کیونکہ بہت سے پبلشروں کا خیال تھا کہ مسلمان اس بات سے ناراض ہوں گے کہ مجھ جیسی کافرہ خاتون کو ان کے پیغمبرؐ کی سیرت لکھنے کی جرأت کیوں کر ہوئی ہے اور یہ کہ اگر انہوں نے یہ کتاب شائع کر دی تو رشدی کے ساتھ مجھے بھی بہت جلد چھپ کر زندگی گزارنا پڑے گی۔ لیکن جب یہ کتاب چھپی تو مسلمانوں نے اس مشکل دور میں جس گرم جوشی اور فیاضی کے ساتھ اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا، اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور ان کے سنجیدہ حامیوں نے سب سے پہلے متانت اور سنجیدگی سے میری باتوں پر توجہ دی اور انہوں یہ رائے قائم کر لی کہ میرا مقام اس مغرور عیسائی راہبہ سے کہیں بلند ہے جو صرف ہنگامے برپا کرنے کے لیے مشہور تھی۔ اور اگلے دس برسوں کے دوران یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسلام کے بارے میں مغرب کا بلاوجہ تعصب اور بے بنیاد خدشات ماند پڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً پرانا تعصب دوبارہ بھڑک اٹھتا لیکن لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد مسلمانوں کو شک کا فائدہ دینے پر زیادہ مائل ہونے لگی۔

اس کے بعد ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے ہولناک واقعات پیش آ گئے جب چند مسلمان انتہا پسندوں نے نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کے ایک ونگ کو تباہ کر دیا جس کے نتیجے میں پانچ ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے۔ اس گھناؤنے جرم سے اسلام کے بارے میں مغرب کی اس منفی رائے کی توثیق ہو گئی کہ اسلام ایک جنونی مذہب ہے جو قتل و غارت گری اور دہشت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ میں اس کتاب کا یہ نیا دیباچہ اس حملے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف ایک ماہ بعد لکھ رہی ہوں۔ یہ ایک عجیب وقت ہے اور بیشتر لوگوں کی اب بھی یہی رائے ہے کہ اسلام کا میلان تباہ کن تشدد کی طرف ہے۔ امریکا میں حملوں کے بعد اس معاملے پر کبھی نہ ختم ہونے والے مباحث کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اسلام کے ناقدین اس سلسلے میں سیاق وسباق سے ہٹ کر قرآن کی بعض آیات کے حوالے سے یہ استدلال پیش کرنے لگے کہ ان آیات میں مسلمانوں کو انتہا پسندی پر اکسایا گیا ہے اور تشدد کی توثیق کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کے ان نکتہ چینوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کی مقدس کتابوں توریت اور انجیل میں بھی اپنے پیروکاروں کو تشدد اور لڑائی جھگڑے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہودیوں کی توریت میں اسرائیل کے باشندوں پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ وہ کنعانیوں کو اپنی مقدس سرزمین سے نکال باہر کریں، ان کے مذہبی آثار کو برباد کر دیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ کریں۔ یہودی بنیاد پرستوں کا ایک مختصر طبقہ توریت کی ان آیات کو فلسطینیوں کے خلاف تشدد کو روا رکھنے اور مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے عمل کی مخالفت کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہودیت کے بارے میں علم رکھنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ توریت کی یہ متشددانہ آیات یہودیت کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں اور ان آیات کو تشدد کے لیے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو عام طور پر عدم تشدد کا حامی ظاہر کیا جاتا ہے لیکن انجیل میں ان کا اندازِ گفتگو اور طرزِ عمل جارحانہ ہے بلکہ ایک موقعے پر تو وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ امن کے لیے نہیں، تلوار کے لیے دنیا میں آئے ہیں۔ لیکن جب عیسائی سربوں نے Srebreneca میں کوئی آٹھ ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تو کسی شخص نے ان آیات کا حوالہ نہ دیا اور نہ ہی کسی نے یہ الزام لگایا کہ عیسائیت خطرناک اور تشدد پسند مذہب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس پیچیدہ مذہب کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسیحیت پر اس قسم کا الزام دھرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ مغرب کی اکثریت کو دینِ اسلام کے بارے میں صحیح ادراک نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان معاملوں پر مفید انداز میں بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسلام کا موازنہ کرنے کے لیے ان کے پاس مناسب معلومات ہیں۔

لیکن ان تاریک دنوں میں بھی، جب بعض اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان مفاہمت کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جائیں گی، امید افزا لمحات بھی دیکھنے میں آئے۔ سب سے پہلے میں صدر جارج ڈبلیو بش اور وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوئی اور میں نے دیکھا کہ انہوں نے غیر معمولی انداز میں کھلے بندوں یہ اعلان کر دیا ہے کہ دہشت گرد اسلام کی عظیم، گراں بہا اور پیچیدہ روایات کی نمائندگی نہیں کرتے۔ انہوں نے مسجدوں میں جا کر مسلمانوں کو یقین دلایا کہ وہ افغانستان میں جو جنگ لڑنے جا رہے ہیں، وہ اسلام کے خلاف جنگ نہیں ہے۔ انہوں نے اس حقیقت پر زور دیا کہ اسلام بلاشبہ ایک پر امن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب ہے۔ یہ روایت سے ہٹ کر ایک نئی بات تھی۔ رشدی کے بحران میں کسی بھی سیاسی لیڈر نے اس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

پھر یہ حوصلہ افزا حقیقت بھی سامنے آئی کہ بہت سے لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ انہیں دین اسلام کے متعلق جہالت پر مبنی رویہ ترک کر کے اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ امریکا میں کتابوں کی دکانوں پر قرآنِ حکیم کے نسخے فروخت ہونے لگے اور اسلام کے بارے میں کتابیں، جن میں میری بعض تصانیف بھی شامل تھیں، بڑی تعداد میں بکنے لگیں۔ بارہ برس قبل بہت کم لوگ دین اسلام کے متعلق حقیقت کے متلاشی تھے لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد تو لوگ اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں کوئی بات سننے کے روادار نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بعض مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کے باشندوں جیسی وضع قطع رکھنے والوں کو قتل کر دیا گیا، ایک سکھ اور ایک مصری عیسائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور لندن میں ایک افغان ٹیکسی ڈرائیور کو، جو طالبان سے بھاگ کر برطانیہ آ گیا تھا، تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ عورتیں حجاب اوڑھ کر گھر سے باہر قدم رکھنے سے خوف زدہ تھیں، مسجدوں پر حملے کیے گئے۔ لیکن ان ہولناک واقعات پر بڑے پیمانے پر تشویش اور انہیں روکنے کے لیے عزم بھی پایا جاتا تھا۔ یہ سب مثبت علامتیں ہیں اور اگر ستمبر کی قتل و غارت گری سے اسلام اور مغرب کے درمیان افہام و تفہیم کی نئی فضا پیدا ہوتی ہے تو اس المیے سے یقیناً اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

مجھے اس بات سے دلی صدمہ پہنچا کہ دہشت گردوں کو یقین تھا کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ دہشت گردوں کا مبینہ سرغنہ اسامہ بن لادن ایک بنیاد پرست نظریے پر کاربند ہے جس کی بنیاد آنحضرتؐ کے پیغمبرانہ کیرئر پر رکھی گئی ہے۔ بنیاد پرستوں کے پروگرام کے مطابق، جس کا آغاز مصری دانشور سید قطب نے کیا جسے صدر جمال ناصر نے ۱۹۶۶ میں پھانسی کا حکم دیا تھا، پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ مقدسہ وحی سے عبارت تھی اور وہ وحی کی رو سے اس خدائی پروگرام پر عمل کرتے تھے جو صحیح معاشرے کی تشکیل کے لیے واحد طریقہ ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پوری زندگی جہالت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ مسلمان جہالت کی اصطلاح کو قبل از اسلام عرب کے وحشی دور کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سید قطب کے مطابق جہالت ہر زمانے میں پائی جاتی ہے اور بیسویں صدی کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پیغمبرؐ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی سرزمین سے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ سب سے پہلے انہیں جاہلی معاشرے سے الگ ہو کر فوج کا ہراول دستہ تیار کرنا چاہیے جو مسلمانوں کی جانب سے اس طرح لڑ سکے جس طرح رسول کریمؐ نے مکے میں تبلیغ کے شروع میں جنگ کی تھی۔ آخر کار سچے مسلمان حضورؐ کی طرح جاہلیت سے الگ ہو کر صحیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معنوں میں اسلامی معاشرہ تشکیل دیں گے جہاں وہ اگلی جدوجہد کے لیے تیاری کر سکیں گے۔ پروگرام کے آخری مرحلے میں مسلمان اپنی آخری کامیابی کے یقین سے سرشار ہو کر اس طرح جہاد کریں گے جس طرح نبی کریمؐ نے ۶۳۰ عیسوی میں فتح مکہ کے وقت جہاد کر کے پورے عرب کو دائرہ اسلام میں داخل کر لیا تھا۔

اسامہ بن لادن کھلے بندوں اس نظریے پر عمل پیرا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد آنے والے ہفتوں کے دوران انہوں نے اکثر سید قطب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انہوں نے بعض مقامات پر تربیتی کیمپ بھی قائم کر لیے ہیں جہاں ان کے مخلص پیروکار جہاد کے لیے ہراول دستے کی حیثیت سے ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ ہائی جیکرز جب ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو ان کے ذہن میں بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاکہ موجود تھا۔ ان کے سامان سے مبینہ طور پر جو دستاویزات ملی ہیں، ان میں لکھا ہوا تھا: ''پُر امید رہو کیونکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ پُر امید رہتے تھے''۔

۱۱ ستمبر کو حضورؐ کے نام پر کشت وخون کرنا ایک نجس اور مکروہ فعل ہے کیونکہ جیسا کہ میں ان صفحوں میں ثابت کرنے کی کوشش کروں گی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی پوری حیاتِ مبارکہ کے دوران اس قسم کی بلاامتیاز قتل وغارت گری کو روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ خود اسلام کا لفظ خدا کی کامل اطاعت اور اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی عکاسی کرتا ہے اور یہ لفظ اسلام یعنی امن کی علامت ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے تشدد کے بجائے نہایت جرأت مندی کے ساتھ عدم تشدد کی پالیسی اختیار کر لی تھی جس پر گاندھی بھی کاربند رہے ہیں۔ بنیاد پرستوں نے یہ دعویٰ کر کے کہ جہاد حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ کی معراج اور پیغمبرانہ کیرئر کا نقطہ کمال تھا، آپؐ کی پوری زندگی کے مطلب کو مسخ کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ جہاد کے بانی نہیں بلکہ آپؐ کی ذاتِ اقدس امن کی علمبردار ہے۔ حضورؐ نے اہلِ مکہ کے ساتھ صلح اور مصالحت کا اس قدر پختہ عزم کر رکھا تھا کہ آپؐ نے اس کے عوض خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا اور اپنے عزیز ترین صحابہ کرامؓ کی وفاداریوں کو کھو دینے کا خطرہ مول لے لیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انتہاپسندی سے کام لے کر جنگ کرنے کے بجائے مذاکرات اور صلح پر آمادگی ظاہر کر دی اور قرآنِ حکیم نے بظاہر اس اہانت اور مشروط اطاعت کو فتح عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

اس خطرناک دور میں ہمیں چاہیے کہ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت طیبہ پر عمل کریں اور مسلمان انتہاپسندوں کو حضورؐ کی سوانح عمری کو ہائی جیک کرنے اور اسے اپنے عزائم کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیں۔ ہم آنحضرتؐ کی حیات مقدسہ سے بہت کچھ سیکھ سکتے اور مکمل طور پر بدلی ہوئی اس دنیا میں سیرت کی روشنی میں اپنا طرزِ عمل متعین کر سکتے ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب اپنے عظیم مشن کا آغاز کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو آپؐ کے پاس اس کا واضح خاکہ اور منصوبہ موجود نہیں تھا۔ اگر آپؐ کے پاس ایسا کوئی پلان ہوتا تو اس کی جڑیں یقیناً ایک دوسرے پر حملے، انتقام اور جوابی حملوں کی پرانی پر تشدد دنیا میں پیوست ہوتیں لیکن آپؐ تو ان برائیوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوئی پالیسی وضع کرنے اور اس پر عملدرآمد کرنے کے بجائے اپنے گردوپیش رونما ہونے والے واقعات کا پوری توجہ اور ذہانت کے ساتھ گہرا مشاہدہ کیا، ان کی داخلی منطق سے بالمشافہ گفتگو کی، اپنے ہم عصروں سے کہیں آگے دیکھا اور پھر ان دقیق مسائل کا حل تلاش کیا۔ اس طرح آپؐ نے جنگ سے تباہ شدہ عرب کو درپیش مسئلوں کا ایک ایسا حل پیش کیا جو بظاہر ناقابل فہم اور انسانوں کی عقل سے ماوراء تھا۔ ستمبر کے المیے کے بعد ہمیں بھی بنیادی تبدیلی کے مشکل مسئلے کا سامنا ہے۔ ہمیں بھی یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہم ہتھیاروں اور سرد جنگ کے نظریے سے اس قسم کی جنگ وجدل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں جس غیر معمولی صورت حال کا سامنا ہے، اس پر قابو پانے کے لیے نئے حل تلاش کرنا ہوں گے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہم پیغمبر اسلامؐ کی رواداری اور صبر وتحمل کی حکمت عملی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم حضورؐ سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ امن کیسے قائم کیا جاتا ہے۔ آپؐ کے پورے کیرئر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اولیں ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ہم لالچ، نفرت، ہوس اور ایک دوسرے کے لیے تحقیر کے جذبات کو دلوں سے نکال کر اپنے لیے ایک نیا معاشرہ تشکیل دیں۔ صرف اسی اصول پر عمل کر کے ایک ایسی مضبوط اور مستحکم دنیا معرض وجود میں آسکتی ہے جس میں اقوام عالم باہمی اختلافات کا احترام کر کے ہم آہنگی کے ساتھ مل جل کر رہ سکتی ہیں۔

مغرب میں ہم نے کبھی اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور دین اسلام کے بارے میں ہمارے نظریات ناتمام، غیر سنجیدہ اور گستاخانہ رہے ہیں۔ لیکن اب ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ہم جہالت اور تعصب پر مبنی اس رویے کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ میں نے سیرت کی اس کتاب کے آخر میں کینیڈا کے اسکالر ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جن کی تصنیف میرے لیے مستقل روحانی فیضان اور وجدان کا باعث رہی ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں اس جانب اشارہ کیا تھا کہ بیسویں صدی کی آزمائشوں پر پورا اترنے کے لیے مغرب اور عالم اسلام دونوں کو انتھک جدوجہد کرنا ہوگی۔ مسلمانوں کو مغربی معاشرے اور مغرب کی کامیابیوں کا اعتراف کرنا ہوگا کیونکہ یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ لیکن مغرب کی قوموں کو بھی یہ جان لینا چاہیے کہ اس کرۂ ارض پر ان کے ساتھ رہنے والے مسلمان ان سے کمتر نہیں، برابر ہیں۔ مغربی تہذیب اور عیسائیت جب تک دوسرے انسانوں کے ساتھ عزت اور احترام کا سلوک نہیں کرے گی، اسے بیسویں صدی کے حقائق کا ادراک نہیں ہوگا۔ ۱۱ ستمبر کے المیے سے ثابت ہوگیا ہے کہ گو اس جانب کچھ پیش رفت ہوگئی ہے لیکن مغرب اور عالم اسلام اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امتحان میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اگر ہمیں اکیسویں صدی میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ہے تو اقوام مغرب کو مسلمانوں کے بارے میں مکمل فہم وادراک حاصل کر لینا چاہیے جو اس کرۂ ارض پر ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے دین، ان کی ضروریات، ناراضی اور ان کی امنگوں اور خواہشات کا احترام اور تحسین کرنی چاہیے اور اس لازمی عمل کا آغاز حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے زیادہ مستند علم سے ہونا چاہیے جن کی خصوصی بصیرت اور عقل ودانش سے اس تیرہ وتار اور خوفناک زمانے میں ہدایت اور روشنی کی نئی کرنیں پھوٹ سکتی ہیں۔

کیرن آرمسٹرانگ　　　　برمنگھم (برطانیہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

دس سال پہلے جب میں پیغمبر اسلامؐ کی سوانح حیات ''محمدؐ'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھ رہی تھی، اس وقت مغرب اور عالم اسلام کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو چکے تھے جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ سلمان رشدی کے بحران نے برطانوی معاشرے کو ایک ہیجانی کیفیت سے دو چار کر دیا تھا۔ بریڈ فورڈ میں مسلمانوں نے The Satanic Verses کی جلدوں کو نذر آتش کر دیا اور بعض لوگوں نے آیت اللہ خمینی کے بدنام فتوے کی بھرپور حمایت کر دی البتہ غیر مسلموں کی صورت حال قدرے بہتر تھی۔ ہماری دیواروں پر یہ خوفناک نعرے لکھ دیے گئے: کرسمس کے موقعے پر ایک مسلمان کو قتل کر دو! مسجدوں کو بم سے اڑا دو! برطانیہ کے ممتاز آزاد خیال لیڈروں نے اپنے دفاع میں آزادی رائے کے حق کو استعمال کرتے ہوئے اسلام کے بارے میں جو پبلک بیانات دیے، وہ اس قدر غلط اور تعصب پر مبنی تھے کہ میرے جسم کا خون منجمد ہو گیا۔ اس کے بعد خلیج میں جنگ چھڑ گئی اور مغربی میڈیا نے صدام حسین کو کلاسیکل انداز میں جہاد لڑنے والے مسلمان حکمران کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا حالانکہ وہ ایک کٹر سیکولر تھے اور ان کی پالیسیاں اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم تھیں۔

میں نے ''محمدؐ'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھ کر اس خلیج کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں اس کتاب کے لیے پبلشر ڈھونڈنے میں مشکلات پیش آئیں۔ بہت سے ایڈیٹروں کا خیال تھا کہ رشدی کی طرح مجھے بھی چھپ کر زندگی گزارنا پڑے گی اور یہ کہ مسلمان اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ مغرب کی ایک کافرہ عورت ان کے جلیل القدر اور قابل احترام پیغمبرؐ کی سوانح عمری لکھنے کی جسارت کرے۔ لیکن آخرکار جب میرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی یہ کتاب شائع ہوگئی تو یہ تاریک پیش گوئیاں بے بنیاد ثابت ہوئیں اور واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف مغرب اور امریکا بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ اس کتاب کی پذیرائی کی جس سے میں بہت متاثر ہوئی۔ ۱۹۹۷ء میں جب اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تو دنیائے عرب میں اسے بے حد سراہا گیا۔ میرے بیشتر مغربی دوستوں نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا، وہ غلط ثابت ہوئے اور کسی مسلمان نے کتاب کی اشاعت پر منفی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے دل وجان سے میرا اور میری کتاب کا خیر مقدم کیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے نئے دوست مل گئے ہیں۔ میں مسلمانوں اور ان کے دین کی اس رواداری کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں جس کی بدولت انہوں نے اس بھیانک دور میں اس قدر مثبت انداز میں جواب دیا ہے۔

اب دس سال کے بعد ہم آگے کی جانب پیش رفت کر چکے ہیں۔ ۲۰۰۰ء کے موسم خزاں میں، جب میں اسلام کی تاریخ کا بہتر شعور پیدا کرنے کی غرض سے امریکا کا دورہ کر رہی تھی تو بیشتر امریکیوں کی روشن خیالی اور جذبہ خیر سگالی سے میری بے حد حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں اپنے کئی سامعین کے چہروں سے بخوبی یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اسلام کے ساتھ بہتر افہام وتفہیم پیدا کرنے کے دلی آرزومند ہیں۔ مغرب میں، جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، دین اسلام کے بارے میں ہمارے عمیق ثقافتی تعصب اور تنگ نظری کی تاریخ بہت طویل ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم نے تاریخی حقائق کی جانچ پڑتال کیے بغیر اسلام کے فرضی مظالم کا تصور اپنے ذہنوں میں نقش کرلیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ میرے سامعین کی بڑی تعداد دنیا کے اہم دین اسلام کے متعلق زیادہ منصفانہ طریقے سے صحیح ادراک حاصل کرنا چاہتی ہے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ہم انسان کے ساتھ انسان کے غیر انسانی رویوں کی المناک جھلکیاں دیکھ چکے ہیں۔ ہم یہ بھی مشاہدہ کر چکے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں شاندار کامیابیوں کے باوجود نسلِ انسانی اب بھی حد درجہ ظالم اور خونخوار ہے۔ مثال کے طور پر سابق یوگوسلاویا میں جن لوگوں کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا، ان میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اس صورت حال کا ازسرنو جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اگر بیسویں صدی نے ہمیں کوئی سبق سکھایا ہے تو وہ یقیناً ''دوسروں'' کے ساتھ روایتی غیر انسانی سلوک کرنے کی سوچ کا سنگین خطرہ ہے۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ صورت حال زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ میرے کتاب کے دورے میں کئی لوگ پرانی تلخیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بک اسٹورز پر ہونے والی تقریبات میں شریک لوگوں یا ریڈیو پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے والوں کی رائے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسلام کے بارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پائے جانے والے خیالات کی موثر تردید کی اشد ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے اس ضمن میں قرآن کی بعض آیات کا بھی حوالہ دیا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس صحیفوں میں کئی ایسے پیرے موجود ہیں جن میں خدا نے بڑے پیمانے پر قتل عام کی اجازت دی تھی بلکہ عیسیٰ علیہ السلام نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ امن لے کر نہیں، تلوار لے کر آئے ہیں۔ پھر ان جدید ہم عصر صلیبیوں نے خواتین کے بارے میں اسلام کے مبینہ منفی رویے کو ہدف تنقید بنایا اور اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے انکار کیا کہ دنیا کا کوئی بھی بڑا مذہب عورتوں سے بیزاری کے جذبات سے پاک نہیں ہے۔ یہ لوگ اس بات کو سننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کے بعض دوسرے بانیوں کے مقابلے میں خواتین کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رویہ کہیں زیادہ مثبت رہا ہے۔ مذہب کا صحیح استعمال بہت مشکل ہے اور دوسری تمام انسانی سرگرمیوں کی طرح اس سے بھی آسانی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کو بھی کئی صدیوں تک ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن میں نے داناؤں کے جس قول کا ذکر کیا ہے، اسے ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے اور برطانوی ناول نویس ای ایم فوسٹر E. M. Foster نے Only Connect میں اس کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ ہم الگ تھلگ رہ کر دوسروں کے عیب نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ یسوع مسیح نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم اپنے بھائی کی آنکھ میں تنکے کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن خود اپنی آنکھ میں بڑے شہتیر کو نہیں دیکھ پاتے۔ جب ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ رابطہ کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو کمتر انسان سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پچھلی صدی کی تباہ کاریوں کے بعد اس صورت حال نے ذہنی رویے کی صورت اختیار کر لی ہے جو معاشرے کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہے۔

چنانچہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اب بھی بہت کام کرنا ہوگا۔ ہم ابھی تک اسلام اور مغرب کے درمیان پل تعمیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے حالانکہ میرے خیال میں یہ کام شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ کوئی بھی قاری حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت سے استفادہ کر سکتا ہے۔ آپؐ کا شمار دنیا کی اولیں شخصیات میں ہوتا ہے جن کی زندگیاں کروڑوں انسانوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ حضورؐ اس دور میں رہتے تھے جو ہمارے اپنے زمانے کی طرح سنگدل اور پرتشدد تھا۔ آپؐ کا معاشرہ سنگین بحران سے دوچار تھا۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا قدیم مذہب ڈرامائی طور پر تبدیل ہونے والی دنیا کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ آج کے بیشتر لوگوں کی طرح وہ لوگ بھی روحانی خلا کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

نبی کریمؐ کی ولولہ انگیز حیاتِ مقدسہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری دنیا کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر سکتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور پرانی روایات کو نئے انداز میں پیش کر کے لوگوں کی زندگیوں کو روشن اور تاباں کر سکتا ہے اور یہ کہ کسی مذہب کو متعارف کرانا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس کے لیے تخلیقی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہماری جنگ سے تباہ حال دنیا میں رسول اللہؐ ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ محض چند سطروں پر مشتمل معاہدے پر دستخط کرنے یا وائٹ ہاؤس کے لان پر ہاتھ ملانے سے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کا قیام اکثر پُر خطر اور خوفناک ہوتا ہے۔ امن کے لیے تمام حقیقت پسندانہ اور تخیلاتی ذرائع کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں تمام تحفظات اور حقیقتوں کو پسِ پشت ڈال کر ایک خطرناک اور نامعلوم مستقبل کی طرف مراجعت کرنا ہوگی۔ خود پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ مقدسہ میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا جب آپؐ نے مسلح جدوجہد اور انتقامی کارروائیوں سے اجتناب کر کے عدم تشدد کی جرأت مندانہ پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دیرپا امن کی بنیاد انصاف اور دوسروں کے مقدس حقوق کا حقیقی احترام کرنے پر استوار ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمہید

جوں جوں ہم بیسویں صدی کے اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں، مذہب ایک مرتبہ پھر زبردست طاقت بن گیا ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش مذہب کے بڑے پیمانے پر احیا کا مشاہدہ کر رہے ہیں حالانکہ ۱۹۵۰ء اور ساٹھ کے عشروں میں ہم میں سے اکثر لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت لادین قوتوں کا یہ خیال تھا کہ مذہب ایک فرسودہ اوہام پرستی کا نام ہے جسے مہذب اور عقلیت پسند انسانوں نے فروغ دیا ہے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے پورے وثوق کے ساتھ یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ مذہب بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ اس وقت یہ باور کیا جا رہا تھا کہ مذہب محض ایک زائد از ضرورت نجی سرگرمی ہے جو عالمی واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ ایک جھوٹی پیش گوئی تھی۔ سوویت یونین میں کئی عشروں کی سرکاری لادینیت کے بعد مرد اور عورتیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مغرب کے باشندوں میں، جنہیں روایتی نظریے اور کلیساؤں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، روحانیت اور داخلی زندگی کا ایک نیا شعور ابھرنے لگا ہے۔ اس صورتِ حال کا سب سے ڈرامائی پہلو یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ادیان میں مذہبی انتہا پسندی نے، جسے ہم عموماً ''بنیاد پرستی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ مذہب کی انتہائی سیاسی شکل ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صورتِ حال پوری دنیا اور عالمی امن کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ حکومتیں اس صورتِ حال کو نظر انداز کر رہی ہیں لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ ماضی کی طرح تشکیک کے زمانے کے بعد دنیا بھر میں ایک شدید مذہبی جوش و خروش کا دور شروع ہو گیا ہے۔ اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب ایک اہم انسانی ضرورت بن گیا ہے اور ہمارا معاشرہ خواہ کتنا ہی معقولیت پسند ہو جائے، مذہب کو آسانی کے ساتھ موقوف یا ایک کونے میں نہیں لگایا جا سکتا۔ بعض لوگ مذہب کے اس نئے دور کا خیر مقدم کریں گے لیکن کئی دوسرے لوگ اس صورت حال کو افسوس ناک قرار دیں گے البتہ ہم میں سے کوئی بھی شخص مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی کو درپیش اہم مسئلوں سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ مذہبی جبلت بے حد طاقتور جوہر ہے جسے اچھائی اور برائی دونوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں مذہب کو سمجھنے اور نہ صرف اپنے معاشرے بلکہ دوسری تہذیبوں میں بھی اس کے مظاہر کا نہایت احتیاط کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

ڈرامائی طور پر سکڑتی ہوئی اس دنیا میں ہم ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں رہ سکتے اور نہ ہی کرۂ ارض کے دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو خود سے الگ تھلگ تصور کر سکتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی طرف سے دوسروں پر بعض ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں اور مشترکہ خطروں سے نمٹنے کے لیے بھی ہمیں مل جل کر لائحہ عمل طے کرنا ہے۔ ہمارے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دوسری تہذیبوں کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھنے لگیں جس کا ہمارے عہد سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دنیا بھر کے لوگوں نے پہلی مرتبہ ایک سے زیادہ مذاہب سے روحانی فیضان حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں اور کئی لوگوں نے دوسری تہذیبوں کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ مغرب میں، جہاں عیسائیت کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی، یہودیت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم میں سے اکثر لوگ اپنے آباء واجداد کے مذہب پر کاربند ہیں، اس کے باوجود بعض اوقات ہم دوسرے مذاہب سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عظیم ہندو فلسفی اور سیاستدان سر رادھا کرشنن (۱۸۸۸ء سے ۱۹۷۵ء) نے مدراس کے کرسچن کالج میں تعلیم پائی تھی اور وہ مشرق اور مغرب دونوں قوموں کے مذہبی خیالات سے بہت متاثر تھے۔ یہودی فلاسفر مارٹن بوبر Martin Buber (۱۸۷۸ء سے ۱۹۷۵ء)، جنھوں نے قرون وسطیٰ کے دو عیسائی راہبوں نکولس اور میٹسر ایک ہارٹ پر ڈاکٹریٹ مقالے لکھے، عیسائی بڑے ذوق وشوق سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور عیسائیوں کے نظریات اور روحانیت پر ان کا گہرا اثر ہے۔ یہودیوں کو عیسائیوں کے مقابلے میں بوبر سے بہت کم دلچسپی ہے لیکن وہ پروٹسٹنٹ ماہر الٰہیات پال Paul (۱۸۸۶ء سے ۱۹۶۵ء) اور جدید مفکر ہاروے کوکس Harvey Coax کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اب جغرافیائی مسافتوں، جارحیت اور خوف کی وہ سرحدی رکاوٹیں گرنا شروع ہو گئی ہیں جنھوں نے دنیا کے مختلف مذاہب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

پرانے تعصبات کے باوجود یہ ایک امید افزا صورت حال ہے۔ صدیوں پرانی عیسائی سام دشمنی سے قطع نظر یہودی اور عیسائی اسکالرز اب ایک نئی افہام وتفہیم پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج بنی نوع انسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مذہبی تجربے میں گہرا اتحاد قائم کرنے کا شعور پیدا ہو رہا ہے اور یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ مذاہب جنہیں ''ہم'' کسی زمانے میں قابل نفرت سمجھتے تھے، گویا ہمارے اپنے حالات کے لیے موزوں اور ہماری روحانیت کے لیے تقویت کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ صورت حال دوررس اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اب ہمارے اپنے یا دوسری قوموں کے مذاہب اور تہذیبوں کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس ممکنہ نتیجے کا اس انقلاب کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا جو سائنس کی بدولت پوری دنیا کے مردوں اور عورتوں کے نقطہ نظر پر اثر انداز ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اس صورت حال کو خطرناک قرار دیں گے اور ''دوسروں'' کے خلاف نئی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بعض دوسرے لوگوں نے پہلے ہی وسیع افق کی جھلکیاں دیکھنا شروع کر دی ہیں اور وہ ان مذہبی تصورات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں جنہیں ان کے آباء و اجداد نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

لیکن دنیا کا ایک بڑا مذہب خیر سگالی کے حلقے سے باہر رہا اور کم سے کم مغرب میں اس کی منفی تصویر پیش کی گئی ہے۔ وہ لوگ، جو زین یا تاؤازم سے فیض یاب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، ان میں اسلام کے بارے میں عام طور پر اشتیاق نہیں پایا جاتا اور نہ ہی اسلام کے متعلق ان کا رویہ ہمدردانہ ہے حالانکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا تیسرا دین اور ہمارے یہودی اور عیسائی مذاہب کے زیادہ قریب ہے۔ مغرب میں اسلام کے خلاف جارحیت کی تاریخ بہت لمبی ہے جس کی جڑیں سامی نسل سے نفرت اور دشمنی میں پیوست ہیں اور جس کا حالیہ برسوں میں تشویشناک احیا ہو گیا ہے۔ نازیوں کی طرف سے یہودیوں کو آگ میں جلانے کے واقعات کے بعد اس پرانے تعصب کے بارے میں مختلف اندیشے پائے جاتے ہیں۔ بحر اوقیانوس کے دونوں جانب اسلام سے پرانی نفرت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور اگرچہ لوگ اسلام کے متعلق بہت کم جانتے ہیں، اس کے باوجود اس مذہب پر حملے کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی جاتی۔

اسلام کے خلاف جارحیت قابل فہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری صدی میں سوویت یونین کے عروج تک مغرب کو اسلام کے سوا کوئی اور سیاسی یا نظریاتی چیلنج درپیش نہیں تھا۔ ساتویں صدی میں جب اسلامی ریاست قائم ہوئی، اس وقت یورپ ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ اسلام نے مشرق وسطیٰ میں مسیحی دنیا کے بیشتر علاقے اور شمالی افریقا کے اس عظیم چرچ کو برباد کر دیا جسے روم کے کلیسا کے نزدیک زبردست اہمیت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی یہ شاندار کامیابی عیسائیوں کے لیے ایک سنگین خطرہ تھی۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ کیا خدا نے عیسائیوں کو تنہا چھوڑ کر ''کافروں'' پر نوازشات شروع کر دی ہیں؟ اس دور میں بھی، جب یورپ نے زمانہ جاہلیت سے نکل کر خود اپنی عظیم تہذیب قائم کر لی، مسلمانوں کی بدستور وسعت پذیر سلطنت کے بارے میں پرانا خوف برقرار رہا۔ یورپ مسلمانوں کی اس توانا اور متحرک تہذیب و ثقافت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ بارہویں اور تیرہویں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدی میں صلیبی جنگوں کا منصوبہ آخر کار ناکام ہوگیا اور بعد میں ترک عثمانی اسلام کو یورپ کی دہلیز پر لے آئے۔ اسلام سے خوف کی بنا پر مغربی عیسائی مسلمانوں کے دین کے بارے میں معقول یا معروضی نقطہ نظر اختیار نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں، جب وہ یہودیوں کے متعلق اندیشوں پر مبنی واہموں کے تانے بانے بن رہے تھے، انہوں نے اسلام کی مسخ شدہ تصویر بھی ذہنوں میں بٹھالی جس سے ان کی مدفون پریشانیوں کی عکاسی ہوتی تھی۔ مغربی اسکالروں نے اسلام کے خلاف الزام تراشیاں کرتے ہوئے اسے ایک الحاد پرست دین اور اس کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو (نعوذ باللہ...... مترجم) ایک جھوٹا نبی کہنا شروع کر دیا جنہوں نے دنیا کو فتح کرنے کے لیے تلوار کے پر تشدد دین کی بنیاد رکھی تھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یورپ کے باشندوں کے لیے ایک ہوّا بن گئے اور مائیں اپنے نافرمان بچوں کو ڈرانے کے لیے آپؐ کا نام استعمال کرنے لگیں۔ Mummer کے ڈراموں میں آپؐ کو مغربی تہذیب کے دشمن کے طور پر پیش کیا گیا جنہوں نے ہمارے بہادر سینٹ جارج کے خلاف جنگ لڑی تھی۔

اسلام کی غلط اور مسخ شدہ تصویر نے یورپ کے پختہ عقیدے کی صورت اختیار کر لی جو عالم اسلام کے بارے میں ہمارے نظریات پر بدستور اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر یہ مسئلہ اور بھی گھمبیر ہوگیا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے مغرب سے شدید نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے جس کی ایک وجہ وہ رویہ ہے جو یورپ اور امریکا نے مسلم دنیا کے بارے میں اپنا رکھا ہے۔ یہ انداز فکر، جس کا بعض اوقات اظہار کیا جاتا ہے، غلط ہے کہ اسلام شروع سے ایک متشدد یا جنونی مذہب ہے۔ اصل میں اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اس میں مشرقی جارحیت یا مغرب دشمنی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں جب مسلمانوں کی پہلی بار مغربی نو آبادکاروں سے مڈبھیڑ ہوئی تو وہ مغرب کی جدید تہذیب سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے اپنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حالیہ برسوں میں اس ابتدائی گرم جوشی کے بجائے مسلمانوں میں تلخ آزردگی اور غصے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ دنیا بھر میں ''بنیاد پرستی'' بیشتر مذاہب میں ابھر آئی ہے جو بیسویں صدی کے آخری عشروں کی زندگی میں پائی جانے والی مخصوص کشمکش کا ردعمل ہے۔ بھارت میں انتہا پسند ہندو، ذات پات کے نظام کی حمایت اور مسلمانوں کی مخالفت کے لیے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ یہودی بنیاد پرستوں نے دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں غیر قانونی بستیاں قائم کر لی ہیں اور انہوں نے تمام عربوں کو اپنی مقدس سرزمین سے نکال باہر کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں امریکا میں جیری فالوویل Jerry Falowell کی اخلاقی اکثریت اور نیو کرسچن رائٹ نے، جو سوویت یونین کو بڑی سلطنت قرار دیتے تھے، حیرت انگیز قوت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ یہ مفروضہ غلط ہے کہ صرف مسلمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی اپنے دین کے معاملے میں انتہا پسند ہیں۔ جس طرح آنجہانی ربی مائر کہانے Meir Kahane کی غیر اخلاقی پالیسیوں کی بنیاد پر یہودیت کے زرخیز اور پیچیدہ مذہب کو مسترد نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مرحوم آیت اللہ خمینی نے اسلام کو جس صورت میں پیش کیا ہے، اس کی بنا پر اسلام کو مسترد کرنا غلطی ہوگی۔ اگر عالم اسلام میں ''انتہا پسندی'' کو فروغ حاصل ہوا ہے تو اس کی وجہ مسلم ممالک کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہے۔ یہاں اس کی ایک مثال پیش کرنا ہی کافی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایران کی آبادی صرف ۹۰ لاکھ تھی لیکن آج ایرانیوں کی تعداد پانچ کروڑ ستر لاکھ ہے اور ان کی اوسط عمر سترہ برس ہے۔ انقلابی اسلام، جس میں انتہا پسندی کا عنصر غالب ہو، صرف نوجوانوں کا مذہب ہے۔

اس نئی کشمکش کا صحیح پس منظر میں جائزہ لینے کے لیے بیشتر مغربی باشندے روایتی اسلام کے بارے میں مناسب علم نہیں رکھتے۔ لبنان میں شیعوں نے جب ''اسلام'' کے نام پر بعض لوگوں کو یرغمال بنالیا تو یورپ اور امریکا کے عوام نے فطری طور پر مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ قرآن میں کسی شخص کو قیدی بنانے اور اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے سلسلے میں کیا اہم قوانین وضع کیے گئے ہیں اور یہ کہ ایسا طرز عمل قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ اس المیے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ میڈیا اور پاپولر پریس بھی ہمیں مطلوبہ امداد بہم نہیں پہنچاتا۔ مثال کے طور پر اس سانحے کے دوران زیادہ کوریج ان مسلمانوں کو دی گئی جو برطانوی مصنف سلمان رشدی کے خلاف آیت اللہ خمینی کے فتوے کی حمایت کرتے تھے۔ اس کے برعکس اس فتوے کی مخالفت کرنے والی اکثریت کی رائے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ سعودی عرب کے مذہبی حکام اور قاہرہ کی باوقار جامعہ الازہر کے شیوخ نے اس فتوے کو غیر قانونی اور غیر اسلامی قرار دے کر اس فتوے کی مذمت کی تھی۔ اسلامی قانون کے مطابق کسی شخص پر مقدمہ چلائے بغیر اسے سزائے موت نہیں دی جاسکتی اور عالم اسلام کے باہر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مارچ ۱۹۸۹ء میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ۴۵ میں سے ۴۴ رکن اسلامی ملکوں نے متفقہ طور پر آیت اللہ کے فتوے کو مسترد کر دیا۔ لیکن برطانوی پریس میں اسلامی کانفرنس کے اس فیصلے پر سرسری توجہ دی گئی اور لوگوں کی اکثریت کا یہ گمراہ کن تاثر برقرار رہا کہ پورا عالم اسلام رشدی کے خون کے لیے شور برپا کر رہا ہے۔ بعض اوقات میڈیا ہمارے روایتی تعصبات کو ہوا دے دیتا ہے جس کی ایک مثال ۱۹۷۳ء میں اوپیک کے تیل بحران کے وقت دیکھنے میں آئی۔ اس زمانے میں کارٹونوں، اشتہارات اور مضمونوں میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے گئے، ان کی جڑیں مغرب کے پرانے اندیشوں میں پیوست تھیں۔ اس وقت یہ تاثر دیا گیا کہ تیل کا بحران مسلمانوں کی سازشوں کی نتیجہ ہے اور یہ کہ مسلمان ساری دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی معاشرہ اسلام کے بارے میں ہمارے فرسودہ نظریات کی تائید کرتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، اسلامی ملکوں میں زندگی بہت سست ہے، وہاں کی حکومتیں کرپٹ اور ظالم ہیں اور عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی ذمے داری ''اسلام'' پر عاید کی جاتی ہے۔ لیکن بہت سے اسکالرز ہمیں انتباہ کرتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں کسی مذہب کے رول پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ اسلام کے نامور مورخ Marshall G. S. Houdson نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ مغرب میں عالم اسلام کے جن پہلوؤں کی مذمت کی جاتی ہے، وہ عموماً ترقی پذیر معاشروں کا خاصہ ہیں۔ تین سو سال پہلے یہاں زندگی کے طور طریقے مختلف نہیں تھے۔ لیکن بعض اوقات مسلم دنیا میں پائی جانے والی ہر بے ضابطگی پر اسلام کے خلاف الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کے حقوق کے حامی عام طور پر عورتوں کے ختنے کی رسم پر ''اسلام'' کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ اصل میں یہ ایک افریقی رسم ہے اور قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ اسلامی فقہ کے چار میں سے تین مکاتب فکر میں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسے شمالی افریقا میں چوتھے مکتب فکر میں اس لیے سمو دیا گیا کیونکہ یہ زندگی کی حقیقت تھی۔ عیسائیت کی طرح اسلام پر بھی عمومی قواعد کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ان دونوں مذاہب میں وسیع تصورات اور نصب العین موجود ہیں۔

اسلام کے بارے میں گھسے پٹے مفروضوں کی ایک مثال سعودی عرب ہے جس کے متعلق مغرب میں یہ باور کیا جاتا ہے کہ وہاں دین پر سب سے مستند شکل میں عمل کیا جاتا ہے۔ یہ دقیانوسی مفروضہ بھی قائم کرلیا گیا ہے کہ سعودی عرب میں رائج اسلام مسلمانوں کی اولیں برادری کے اسلام سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ چونکہ مغرب میں سعودی حکومت کو ایک عرصے سے قابل نفرت حکومت سمجھا جاتا ہے اس لیے ''اسلام'' کو بھی درخور اعتنا تصور نہیں کیا جاتا۔ لیکن وہابی ازم محض ایک اسلامی فرقہ ہے جو اٹھارویں صدی میں پھلا پھولا تھا۔ اس فرقے کی مثال عیسائیوں کے پیوریٹن فرقے کی سی ہے جسے سترہویں صدی میں انگلستان، نیدرلینڈز اور میسے چوسٹ میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ پیوریٹن اور وہابی دونوں فرقوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اصل دین کی طرف مراجعت کی ہے لیکن یہ دونوں فرقے مکمل طور پر نئے اور اس وقت کے مخصوص حالات کے ردعمل کے طور پر معرض وجود میں آئے تھے۔ ان دونوں فرقوں کا مسلمانوں اور عیسائیوں پر خاصا اثر ہے تاہم یہ کہنا غلط ہے کہ صرف یہی فرقے اسلام اور عیسائیت کا معیار ہیں۔ کسی بھی مذہب میں اصلاحی تحریک چلانے کا مقصد اس مذہب کے بانی کی حقیقی روح کی طرف لوٹنا ہے لیکن گزرے ہوئے حالات کو پوری طرح واپس لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

میں اسلام کے بے عیب ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہی۔ تمام مذاہب انسانی ادارے ہیں اور ان میں سنگین غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے۔ بعض اوقات تمام مذاہب نے ناکافی اور گھناؤنے طریقوں سے اپنے نظریات کا پرچار کیا ہے لیکن ان مذاہب نے لاکھوں مردوں اور عورتوں کو دین کے حقیقی معنوں اور زندگی کی قدر و قیمت سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی روشناس کرایا ہے۔ ''اسلام'' کو بزعم خود ایک غیر مقدس زمرے میں شامل کرنا یا یہ فرض کر لینا کہ اس کا مجموعی یا غالب اثر منفی نوعیت کا ہے، غلط اور غیر منصفانہ ہے۔ مغربی معاشرے کا یہ چلن رواداری اور خدا ترسی سے دھوکے کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اسلام اعلیٰ نصب العین اور ان مکاشفوں میں برابر کا شریک ہے جن سے یہودیت اور عیسائیت دونوں کو روحانی فیضان حاصل ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام نے لوگوں کو ان اقدار سے روشناس کرانے میں مدد دی ہے جو ہمارے کلچر میں موجود ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت کو خدا کی وحدانیت، انصاف، شائستگی، باہمی لطف وکرم اور انسانیت کے احترام پر کوئی اجارہ داری حاصل نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے توحید پرست دین کی جو تشریح کی ہے، وہ اپنی نوع کے اعتبار سے منفرد اور غیر معمولی خصوصیات کی حامل ہے جس سے ہمیں اہم سبق ملتا ہے۔ میں نے جب سے اسلام کو اپنی توجہ کا محور بنایا ہے، اس دین کے بارے میں میرے شعور اور آگہی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دین اسلام کے متعلق مجھے سب سے پہلا اشارہ سمرقند میں ملا جہاں میں چھٹیاں گزارنے گئی تھی۔ میں نے سمرقند میں اسلامی فنِ تعمیر میں اسلام کی اس روحانیت کا مشاہدہ کیا جو میرے اپنے کیتھولک ماضی سے ہم آہنگ تھی۔ ۱۹۸۴ میں مجھے اسلامی تصوف کے موضوع پر ایک ٹیلی وژن پروگرام تیار کرنے کا کام سونپا گیا جس کے دوران میں مسلمان صوفیوں کی طرف سے دوسرے مذاہب کی تحسین کرنے سے بے حد متاثر ہوئی۔ یہ ایک ایسی خوبی تھی جو میں نے عیسائیت میں یقیناً نہیں دیکھی تھی۔ اس امتیازی وصف کی بنا پر اسلام کے بارے میں ہر وہ چیز چیلنج ہو گئی جسے میں اب تک حقیقت سمجھتی تھی۔ میں اسلام کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔ آخر صلیبی جنگوں اور مشرق وسطیٰ کے موجودہ تنازعے کے مطالعے کے دوران میں نے رسول اللہؐ کی سوانح حیات اور اس الہامی کلام قرآن حکیم کو، جو حضورؐ عربوں کے لیے لائے تھے، پڑھنا شروع کر دیا۔ اب میں عیسائیت پر یقین نہیں رکھتی اور نہ ہی مسیحی تعلیمات پر عمل کرتی ہوں، نہ ہی میرا کسی دوسرے سرکاری مذہب سے کوئی تعلق ہے۔ لیکن جب میں اسلام کے متعلق اپنے نظریات پر نظر ثانی کر رہی تھی تو میں نے مذہبی مشاہدے پر بھی دوبارہ غور شروع کر دیا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ایک ماورائے ادراک ہستی مطلق کے بارے میں دنیا کے تمام عظیم مذاہب کی پاکباز روحانی شخصیتوں اور پیغمبروں کا وژن حیرت انگیز طور پر ایک جیسا ہے اور یہی روحانی مشاہدہ زندگی کی اٹل حقیقت رہا ہے۔ بدھ مت کے پیروکار اگرچہ کسی مافوق الفطرت وجود کا انکار کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ذہنی کیفیت کا نام ہے جو انسانیت کے لیے فطری امر ہے تاہم توحید پرست ادیان حدِ ادراک سے پرے اس ہستی کو ''خدا'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنے ہمسایہ مسلمانوں سے انصاف کرنا ہے تو ہمیں اس ناگزیر حقیقت کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھنا ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عام قاری کے لیے رسول اللہؐ کی چند سوانح عمریاں دستیاب ہیں۔ اس ضمن میں مَیں ڈبلیو منٹگمری واٹ کی سیرت طیبہ کی دو جلدوں Muhammad at Mecca اور Muhammad at Medina کی خاص طور پر زیر بار ہوں۔ لیکن یہ کتاب طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہے جس سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات مقدسہ کے بارے میں صرف بنیادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مارٹن لنگز نے اپنی کتاب Muhammad : His Life Based on the Earliest Sources میں آٹھویں، نویں اور دسویں صدی کے سیرت نگاروں سے حضورؐ کی سیرت کے سلسلے میں معلومات کا گراں قدر سرمایہ اکٹھا کیا ہے۔ لیکن لنگز نے یہ کتاب نومسلموں کے لیے لکھی ہے۔ انہوں نے بنیادی بلکہ استدلالی نوعیت کے کئی سوال تشنہ چھوڑ دیے ہیں اور ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ غالباً اس وقت سیرت طیبہ پر دستیاب سب سے پرکشش کتاب میکسم روڈنسن Maxime Rodinson کی ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔ روڈنسن نے اپنی علمی فضیلت کا ہلکے پھلکے انداز میں اظہار کیا ہے۔ میں نے ان کی کتاب سے بہت کچھ سیکھا ہے البتہ وہ تشکیک اور اخلاقیات کے موید کے پیرائے میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی توجہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کے سیاسی اور عسکری پہلوؤں پر مرکوز کی ہے جس کی بنا پر ہمیں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روحانی وجدان کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

میرا اپنا طریق کار ان سب سے جدا ہے۔ ہم دنیا کے کسی بھی بڑے دین کے بانی کے مقابلے میں رسول اللہؐ کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں چنانچہ حضورؐ کی سیرت مطہرہ کے مطالعے سے ہمیں مذہبی مشاہدے کی نوعیت کے متعلق اہم بصیرت حاصل ہوسکتی ہے۔ تمام مذاہب ہستی مطلق اور ناقابل بیان حقیقت اور کرۂ ارض پر رونما ہونے والے واقعات کے درمیان قریبی تعلق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی میں ہم اس عمل کا نہایت قریب سے جائزہ لے سکتے ہیں جو عام طور پر ممکن نہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ نبی کریمؐ کا روحانی مشاہدہ اسرائیل کے پیغمبروں، سینٹ ٹریسا اور ڈیم جولیاں سے کس قدر گہری مماثلت رکھتا ہے۔ میں نے آپؐ کی سیرت طیبہ کے مختلف واقعات کے بارے میں اسلامی روایات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے ادیان میں ایسے ہی بیشتر موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن ہر مذہب مخصوص بصیرت کا حامل ہے چنانچہ ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ مسلمان سیاست کو مذہبی فریضہ کیوں سمجھتے ہیں؟ رسول اللہؐ کو غیر معمولی سیاسی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور عیسائی آپؐ کی اس دنیاوی فتح کو تقوے اور پرہیزگاری کے منافی قرار دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عیسیٰؑ جیسی شکست خوردگی ہی خدا تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے؟

میں نے رسول اللہؐ کی حیات مقدسہ کے کثیر الجہات پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جب ہم آپؐ کو مکہ شہر کے خلاف جنگ لڑتے دیکھتے ہیں تو ہمیں لامحالہ یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ کیا آپؐ نے تلوار کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب کی بنیاد رکھی تھی؟ خدا کا پیغمبر لڑائی اور قتل کرنے پر کس طرح آمادہ ہوسکتا ہے؟ جب ہم حضور کے اپنی ازواج مطہراتؓ اور بیٹیوں کے ساتھ سلوک پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا آپؐ حقیقی معنوں میں ایک جنگجو وطن پرست تھے جنھوں نے عورتوں سے نفرت کرنے والے دین کی بنیاد رکھی تھی؟

۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ سے ظاہر ہوگیا ہے کہ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، عالم اسلام کے ساتھ ہمارا تعلق بہت گہرا ہے۔ عارضی اتحادوں کے باوجود یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ مغرب، مسلم دنیا میں اپنا اعتماد کھو چکا ہے۔ رابطوں میں تعطل کسی ایک فریق کی کوتاہیوں کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا اور اگر مغرب کو عالم اسلام میں پہلے کی طرح ہمدردی اور احترام دوبارہ حاصل کرنا ہے تو اسے مشرق وسطیٰ میں اپنے رول کا ازسرنو جائزہ لینا اور اسلام کے بالمقابل اپنی مشکلات پر غور کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مغربی نفرت کی تاریخ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن حالات کی یہ تصویر مکمل طور پر سیاہ نہیں ہے۔ بعض یورپی باشندوں نے شروع ہی سے ایک زیادہ متوازن نقطہ نظر اختیار کر رکھا ہے لیکن ان لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت مختصر رہی ہے اور انہیں اپنے مقصد میں ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہے البتہ ان معدودے چند لوگوں نے اپنے ہم عصروں کی غلطیوں کو درست کرنے اور فرسودہ نقطہ نظر سے بلند ہو کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب رواداری، ہمدردی اور جرأت مندی پر مبنی اس روایت کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جنہیں یورپ اپنا دشمن سمجھتا ہے

یورپ کے باشندوں کے لیے مسلمانوں کے اس تشدد آمیز ردعمل کا ادراک کرنا بہت مشکل ہے جس کا اظہار انہوں نے سلمان رشدی کی کتاب The Satanic Verses میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی افسانوی تصویر کشی پر کیا ہے۔ یہ بات قابلِ یقین دکھائی دے رہی تھی کہ ایک ناول کی اشاعت کے نتیجے میں اس قدر ہلاکت خیز نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس تشدد آمیز ردِعمل کو اسلام کی نا قابلِ علاج عدم رواداری کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور برطانیہ کے لوگوں کو یہ جان کر خاص طور پر سخت پریشانی اور حیرت ہوئی کہ ان کے شہروں میں مختلف اور منفرد اقدار کے تحت زندگی بسر کرنے والے مسلمان اپنے دین کا دفاع کرنے میں جان تک کی بازی لگانے کو تیار ہیں۔ لیکن اس المیے کے پیچھے مغرب کے تکلیف دہ ماضی کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔ جب برطانیہ کے عوام نے بریڈ فورڈ کے مسلمانوں کو سلمان رشدی کے ناول کی جلدیں نذرِ آتش کرتے ہوئے دیکھا تو کیا انہوں نے اس واقعے کو بھی ان کتابوں کو تلف کرنے کے اَن گنت واقعات کی کڑی قرار دیا جنہیں پچھلی کئی صدیوں سے مسیحی یورپ میں سرِ عام جلا دیا جاتا تھا؟ مثال کے طور پر ۱۲۴۲ء میں فرانس کے بادشاہ لوئیس نہم نے، جو رومن کیتھولک چرچ کا سینٹ تھا، اس بنیاد پر یہودیوں کے مجموعہ قوانین کی مذمت کی کہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر حملے کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی اور اس کی جلدوں کو بادشاہ کی موجودگی میں آگ لگا دی گئی۔ لوئیس کو فرانس کے یہودیوں سے اختلافات پر پُرامن طور پر معقولیت کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ یہ اعلان کر دیا کہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہودی کے ساتھ بحث کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کے پیٹ میں تلوار گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ (John of Joinville: The Life of St. Louis , London 1955, P.36)۔ یہ لوئیس ہی تھا جس نے عیسائی خارجیوں کو سزا دینے کے لیے پہلی مرتبہ انہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا تھا۔ اس نے نہ صرف مسیحی خارجیوں کی کتابیں نذرِ آتش کر دیں بلکہ سیکڑوں مردوں اور عورتوں کو بھی زندہ جلا دیا۔ اسے مسلمانوں سے بھی شدید نفرت تھی اور اس نے عالمِ اسلام کے خلاف دو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی قیادت کی تھی۔ لوئیس کے دورِ حکومت میں یہ اسلام نہیں، مسیحی مغرب تھا جس نے دوسرے مذاہب کے ساتھ نباہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور مغرب کے تعلقات کی تلخ تاریخ کا آغاز مسلم اسپین میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایک حملے سے ہوا تھا۔

۸۵۰ عیسوی میں پرفیکٹس Perfectus نامی عیسائی راہب اندلس کی اسلامی مملکت کے دارالحکومت قرطبہ کے ایک بازار میں خریداری کر رہا تھا کہ عربوں کے ایک گروپ سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ ان عربوں نے اس عیسائی راہب سے سوال کیا کہ آیا عیسیٰ علیہ السلام بڑے پیغمبر تھے یا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)؟ پرفیکٹس فوراً سمجھ گیا کہ یہ سوال مکر اور فریب پر مبنی ہے کیونکہ کسی اسلامی ریاست میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین کرنے کے جرم کی سزا موت ہے۔ چنانچہ اس نے پہلے تو بڑی احتیاط کے ساتھ سوال کا جواب دیا لیکن پھر وہ اچانک جوش میں آ گیا اور حضورؐ کو گالیاں دینے لگا (نعوذ باللہ...... مترجم) اور پیغمبر اسلامؐ کو نبوت کا جھوٹا مدعی، جنسی اعتبار سے کج رو اور عیسیٰؑ کا دشمن کہنے لگا (نعوذ باللہ، نقلِ کفر، کفر نباشد...... مترجم)۔ چنانچہ اس راہب کو پکڑ کر قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

قرطبہ میں یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا کیونکہ وہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات عام طور پر بہت اچھے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی سلطنت میں یہودیوں کی طرح عیسائیوں کو بھی مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی اور اسپین کے باشندے ایک ایسے ترقی یافتہ معاشرے کے فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے جو باقی یورپ کے مقابلے میں کئی صدیاں آگے تھا۔ انہیں عموماً Mozarabs یا Arabisers یعنی مستعربین، (وہ عیسائی جنہوں نے عربوں کے رسوم و آداب اختیار کر لیے تھے...... مترجم) کہا جاتا تھا۔

پال ایلویرو Paul Alvaro نے Indiculus Luminosus میں، جسے آر ڈبلیو سدرن نے Western View of Islam in the Middle Ages.(London1962 P.21) میں نقل کیا ہے، عربوں کے ساتھ عیسائیوں کے تعلقات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

عربوں کی نظموں اور رومانوی قصوں کو پڑھنا عیسائیوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ عربوں کے مذہبی علما اور فلاسفروں کا اس غرض سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ نہیں کرتے کہ ان کی تردید کریں بلکہ ان کا مقصد عربی زبان کی فصاحت اور بلاغت سے استفادہ کرنا ہے۔اب وہ لوگ کہاں ہیں جو کتاب مقدس (انجیل) کی لاطینی زبان میں تفسیریں پڑھتے یا نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے تھے؟ افسوس! تمام باصلاحیت نوجوان عیسائی اب پورے جوش وخروش کے ساتھ عربوں کی کتابیں پڑھنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔

اسپین کے پال الیویرو نے، جس نے اپنے زمانے میں مستعربین پر رکیک حملے کیے ہیں، عیسائی راہب پرفیکٹس کو ثقافتی اور مذہبی ہیرو قرار دیا ہے۔اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو دشنام طرازی کی، اس کی وجہ سے قرطبہ میں ایک عجیب وغریب اقلیتی تحریک پیدا ہو گئی جس کے زیر اثر عیسائی مرد اور عورتیں قاضی (مسلمان جج) کے سامنے پیش ہو کر نبی کریمؐ پر نہایت پر جوش انداز میں خودکش حملے کرنے لگے۔

پرفیکٹس جب قید خانے میں پہنچا تو وہ بہت خوفزدہ تھا لیکن قاضی نے اسے سزائے موت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس نے اندازہ لگا لیا کہ مسلمانوں نے پرفیکٹس کو بلاوجہ اشتعال دلایا ہے۔چند دنوں کے بعد پرفیکٹس دوبارہ پھٹ پڑا اور اس نے حضورؐ کی شان میں اس انداز سے توہین آمیز کلمات کہے کہ قاضی کے پاس قانون کو پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔چنانچہ راہب کو پھانسی دے دی گئی۔اس کے فوراً بعد عیسائیوں کے ایک گروہ نے، جو شہر کے ایک کونے میں رہتا تھا، اس راہب کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور اپنے ''شہید'' کی یادگار چیزوں کی پوجا شروع کر دی۔چند دنوں کے بعد اسحاق نامی ایک اور عیسائی راہب نے قاضی کی عدالت میں پیش ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے دین پر اس قدر شدید حملے کیے کہ قاضی یہ سمجھا کہ یہ شخص یا تو شراب کے نشے میں چور ہے یا مخبوط الحواس ہے۔چنانچہ قاضی نے اس کے حواس بحال کرنے کے لیے اسے زور سے تھپڑ مار دیا۔لیکن اسحاق بدستور سب وشتم کرتا رہا۔اس صورت حال کو دیکھ کر قاضی اسے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

نویں صدی عیسوی کا قرطبہ ۱۹۸۸ء کے بریڈفورڈ سے بالکل مختلف شہر تھا۔اس وقت مسلمان طاقتور اور پر اعتماد تھے۔وہ ان جنونی عیسائیوں کو موت کی سزا دینے میں اس لیے حد درجہ متذبذب تھے کیونکہ ان عیسائیوں کے ذہنوں پر مسلمانوں کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔دوسرے یہ کہ مسلمان محسوس کرتے تھے کہ ان عیسائیوں کو ایسے ''شہیدوں'' کی ضرورت ہے جن کی وہ پوجا کر سکیں۔مسلمان دوسرے مذاہب کے بارے میں گفتگو کرنے کے مخالف نہیں تھے۔اسلام نے مشرق وسطیٰ کی سرزمین میں جنم لیا تھا جہاں مختلف مذہبوں کے لوگ آباد تھے، جہاں مختلف ادیان کے پیروکار صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔مشرق کی مسیحی بازنطینی سلطنت میں اقلیتی مذہبی گروہوں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے اور مذہبی معاملات میں آزادی اور خودمختاری حاصل تھی۔اسلامی سلطنت میں عیسائیوں کو تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی بشرطیکہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبوب شخصیت پر حملے نہ کریں۔ اسلامی مملکت کے بعض علاقوں میں تو تشکیک اور آزاد خیالی کی روایت چل نکلی جسے مسلمانوں نے اس وقت تک، جب تک کہ وہ شائستگی اور ادب کے حدود میں رہی، برداشت کیا۔ قرطبہ کا قاضی اور امیر پرفیکٹس اور اسحاق کو سزائے موت دینے سے گریزاں تھے البتہ وہ توہینِ رسالت کے قانون کی خلاف ورزی کی بھی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن اسحاق کے پھانسی پر لٹکنے کے چند روز بعد اس کی خانقاہ کے چھ اور راہب قرطبہ پہنچ گئے اور انہوں نے آنحضرتؐ کے خلاف زہر آلود حملے شروع کر دیے۔ اسی موسم گرما میں کوئی پچاس عیسائی توہینِ رسالت کے جرم کی پاداش میں مارے گئے۔ قرطبہ کے بشپ اور مستعربین نے، جو شہادت کی ان جارحانہ رسوم پر چوکنا ہو گئے تھے، اس کارروائی کی شدید مذمت کی۔ لیکن ان شہیدوں کو دو حامی اور مددگار مل گئے جن میں سے ایک یولوجیو Eulogio نامی پادری اور دوسرا پال ایلویرو Paul Alvaro تھا۔ ان دونوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ شہید "خدا کے سپاہی ہیں" جو اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے دلیری سے جنگ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام پر ایک ایسا پیچ در پیچ حملہ کر دیا جس سے مسلمان حکام کے لیے نمٹنا اس لیے مشکل تھا کیونکہ اس سے وہ بظاہر قصوروار دکھائی دیتے تھے۔

ان شہیدوں کا تعلق معاشرے کے تمام طبقوں سے تھا اور ان میں مرد، عورتیں، راہب، پادری، عام آدمی، سادہ لوح لوگ اور نام نہاد اسکالرز شامل تھے۔ یہ لوگ ایک واضح اور منفرد مغربی تشخص کے متلاشی تھے۔ بعضوں کا تعلق ملے جلے گھرانوں سے تھا اور ان کے والدین مسلمان اور عیسائی تھے، یہ لوگ مسلم تہذیب وثقافت میں جذب ہونے پر مجبور تھے اور ان کے عرب نام رکھ دیے گئے تھے۔ (پرفیکٹس غالباً عرب نام الکامل کا لاطینی ترجمہ ہے۔ دوسرے شہیدوں کو Servus Dei کا نام دیا گیا جو عبداللہ کا ترجمہ ہے)۔ ان میں سے بعض افراد کو سرکاری ملازمت کی طرف دھکیل دیا گیا تھا اور وہ گھبراہٹ اور الجھنوں کا شکار تھے۔ ان لوگوں کے لیے اپنی ثقافتی جڑوں کو کھو دینا ایک پریشان کن تجربہ تھا۔ آج ہمارے اپنے عہد میں بھی اس کی وجہ سے جارح اور سرکش مذہبی عقائد جنم لے رہے ہیں اور وہ انسانوں کو اپنے حصار میں لینے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ جب ہم مغرب اور دنیا کے دوسرے حصوں میں، جہاں مغربی کلچر کے باعث روایتی اقدار خطرے میں پڑ گئی ہیں، مسلمانوں کے جارحانہ طرزِ عمل اور غیظ وغضب کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں تو اس وقت ہمیں قرطبہ کے شہیدوں کی جارحیت کو یاد کر لینا چاہیے۔ ایلویرو اور Eulogio کی قیادت میں چلنے والی شہیدوں کی تحریک عیسائی مستعربین اور مسلمانوں کی شدید مخالف تھی جس میں ان دونوں طبقوں پر ثقافتی منحرف ہونے کا الزام لگایا گیا۔ Eulogio نے ہمسایہ مسیحی سلطنت میں پیمپلونا Pamplona کا دورہ کیا اور وہاں سے مغربی کتابیں لے کر لوٹا جن میں کلیسا کے لاطینی فادرز کی اصل تحریریں اور Virgil اور Juvenal کی رومن کلاسیکل کتابیں شامل تھیں۔ وہ اسپین کے ہم وطنوں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف سے عربوں جیسی بودوباش اختیار کرنے کی مزاحمت اور ایک ایسی نشاۃ الثانیہ چاہتا تھا جس میں مسلمانوں کی غالب تہذیب وثقافت کے اثرات ختم کر کے اپنے ملک کے رومن ماضی کی یادوں کے ذریعے فرقتِ وطن کے عارضے کا مداوا ہو سکے۔ Eulogio کو جب قاضی کے حکم پر قتل کر دیا گیا تو یہ تحریک بھی ماند پڑ گئی۔ اس سے پہلے قاضی نے Eulogio سے کہا کہ وہ علامتی طور پر اسلام قبول کر کے اپنی جان بچا لے۔ اس طرح مستقبل میں کوئی شخص اس کے طرزِ عمل کی چھان بین نہیں کرے گا۔ قاضی نے اسے ''دوسرے احمقوں اور جنونی لوگوں کی طرح المناک اور ہلاکت خیز تباہی سے گریز کرنے'' کا بھی مشورہ دیا۔ (پال ایلویرو: Vita Eulogii، نارمن ڈینئل نے The Arabs and Medieval Europe لندن اور بیروت ۱۹۷۵، صفحہ ۲۹ میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے)۔ لیکن Eulogio نے قاضی کو صرف یہ جواب دیا کہ وہ اپنی تلوار کو تیز کر لے۔

یہ انوکھا واقعہ مسلم اسپین میں زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اگلے چھ سو برسوں میں تاریخی اعتبار سے ایک خدا کو ماننے والے تینوں مذہبوں کے لوگ نسبتاً امن اور ہم آہنگی کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے رہے۔ یہودیوں کو، جنہیں باقی یورپ میں تعاقب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا، اپنی عظیم ثقافت کے احیا کا موقع مل گیا۔ لیکن قرطبہ کے ''شہیدوں'' کا قصہ اس رویے کی عکاسی کرتا ہے جو اس زمانے میں مغربی یورپ میں عام تھا۔ اس دور میں اسلام ایک عظیم عالمی طاقت تھا جب کہ یورپ کو، جو وحشی قبیلوں کی لوٹ مار کے باعث مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا، ثقافتی اعتبار سے ایک بند کھاڑی کی حیثیت حاصل تھی۔ جس طرح آج پوری دنیا مغرب کے زیرِ اثر ہے، اس زمانے میں ٹھیک اسی طرح پوری دنیا اسلام کے زیرِ نگیں نظر آتی تھی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی تک اسلام مغرب کے لیے ایک مسلسل چیلنج بنا رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلام کے خلاف سرد جنگ اب سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کی جگہ لینے والی ہے۔

ایلویرو Alvaro اور Eulogio دونوں کو یقین تھا کہ اسلام کا عروج نبوت کے جھوٹے مدعی دجال کی آمد کی تیاری ہے جس کا تذکرہ عہد نامہ جدید میں کیا گیا ہے اور جس کی سلطنت قیامت کی نشانی ہوگی۔ Second Epistle to the Thessalonians کے مصنف نے واضح کیا تھا کہ جب تک دنیا میں ارتداد اور الحاد کا عظیم فتنہ برپا نہیں ہوگا اور ایک باغی بیت المقدس کے معبد پر قبضہ کر کے اپنے خوش نما نظریات کے ذریعے بہت سے عیسائیوں کو گمراہ نہیں کر دے گا، اس وقت تک عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور نہیں ہوگا۔ (2nd Thessalonians 1:4-8)۔ لیکن اس کا مصنف سینٹ پال نہیں تھا۔ یہ خط پال کی وفات کے کئی برسوں بعد لکھا گیا۔ کتابِ مکاشفہ میں ایک دیوہیکل چوپائے کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس پر ۶۶۶ کا پراسرار ہندسہ لکھا ہوگا، وہ ایک غار سے باہر نکل کر خود قبۃ الصخریٰ پر تخت نشین ہو جائے گا جس کے بعد پوری دنیا پر اس کی شہنشاہیت قائم ہو جائے گی۔ (کتابِ مکاشفہ ۱۹:۱۹)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام ان تمام قدیم پیش گوئیوں پر پورا اترتا تھا۔ مسلمانوں نے ۶۳۸ عیسوی میں بیت المقدس کو فتح کرلیا، انہوں نے قبۃ الصخریٰ پر دو عظیم الشان مسجدیں تعمیر کیں اور پوری دنیا پر ان کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ گوکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ظہور ہوا جب کسی وحی کی ضرورت نہیں تھی، آپؐ نے ایک پیغمبر کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالیا۔ چنانچہ بہت سے عیسائی اپنے مذہب کو چھوڑ کر نئے دین میں داخل ہوگئے۔ ایلو یرو اور Eulogio کے پاس آنحضرتؐ کی ایک مختصر سوانح عمری موجود تھی جس سے انہیں معلوم ہوا کہ حضورؐ کی رحلت اسپین کے عیسوی سن کے مطابق ۶۶۶ میں ہوئی تھی جو روایتی گنتی سے ۳۸ سال آگے تھے۔ مغرب میں آٹھویں صدی کے آخر میں لکھی جانے والی آن حضرت کی یہ سیرت مسیحی دنیا میں، جو طاقتور اسلامی دیو کے سامنے لرزہ براندام تھا، ورائے ساحل Pamplona کے قریب واقع Leyre کی ایک خانقاہ میں لکھی گئی تھی۔ اسلام کی کامیابی نے ایک سیاسی خطرے کے علاوہ یہ پریشان کن مذہبی مسئلہ بھی کھڑا کردیا کہ آخر خدا نے اس ''ناپاک دین'' کو پھلنے پھولنے کی اجازت کیوں دی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے لوگوں کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا ہے؟

قرطبہ کے ''شہیدوں'' نے توہینِ رسالت کا جو ارتکاب کیا، اس کی بنیاد سیرت کی یہی کتاب تھی۔ خوف اور دہشت کی فضا میں آنحضرتؐ کا جو خیالی پیکر بنایا گیا، اس میں آپؐ کو (نعوذ باللہ...... مترجم) ایک مکار اور جھوٹا مدعی نبوت کہا گیا جس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، آپؐ (نعوذ باللہ...... مترجم) ایک شہوت پرست انسان تھے جو نشے میں رہتے اور اپنے پیروکاروں کو بھی یہی کچھ کرنے کی ترغیب دیتے، آپؐ نے تلوار کی نوک پر لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا، پیغمبر اسلامؐ پر خدا کی طرف سے الگ وحی نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک بدعت وکفر اور عیسائیت کی ناکام شکل ہے۔ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلنے والا متشدد دین ہے جس نے جنگ وجدل اور انسانوں کو ذبح کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ قرطبہ میں ''شہیدوں'' کی تحریک کے دم توڑنے کے بعد یورپ کے دوسرے حصوں میں رہنے والے بعض لوگوں نے ان شہیدوں کا قصہ سنا لیکن اس کا ردعمل بہت معمولی تھا۔ اس واقعے کے کوئی اڑھائی سو برس بعد، جب یورپ بین الاقوامی منظر میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، عیسائیوں کے افسانوی قصے کہانیوں کے مطابق پراسرار طریقے سے آنحضرتؐ کی ایک اور خیالی تصویر پیش کردی گئی۔ بعض سنجیدہ مزاج اسکالروں نے رسول اللہؐ اور آپؐ کے دین کے بارے میں معروضی اندازِ فکر اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن عام لوگوں کی سطح پر حضورؐ کا وہی خیالی پیکر ذہنوں میں بدستور نقش رہا۔ آپؐ کو ابھرتے ہوئے مغربی تشخص کا عظیم دشمن اور ہر اس چیز کا ذمے دار ٹھہرایا گیا جو ''ہمارے'' پاس نہیں تھی۔ مغرب میں ان پرانے تصورات اور واہموں کے آثار آج تک موجود ہیں۔ اقوامِ مغرب میں آنحضرتؐ کے بارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اب بھی عموماً یہ خیال پایا جاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیاوی مہموں کو سر کرنے کے لیے مذہب کو استعمال کیا تھا یا اسلام کو تلوار کے ذریعے ایک تشدد پسند دین کے طور پر پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ایسے اسکالرز بھی موجود ہیں جنھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا معروضی مطالعہ کرنے کے بعد حضورؐ کے متعلق ان فرضی داستانوں کو جھوٹا اور باطل قرار دیا ہے۔

گیارہویں صدی کے آخر تک یورپ کو پوپ کی قیادت میں دوبارہ عروج حاصل ہونے لگا اور اس نے اسلام کی سرحدوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ ۱۰۶۱ عیسوی میں نارمنڈی کے باشندوں نے جنوبی اٹلی اور سسلی میں مسلمانوں پر حملوں کا آغاز کر دیا اور ۱۰۹۱ء میں کئی مسلم علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ شمالی اسپین کے عیسائیوں نے اندلس کے مسلمانوں سے اپنے علاقے واپس لینے کے لیے جنگیں شروع کر دیں اور ۱۰۸۵ء میں انہوں نے طلیطلہ Toledo کو فتح کر لیا۔ ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن ثانی نے بیت المقدس میں واقع حضرت عیسیٰؑ کے مقبرے کو آزاد کرانے کے لیے یورپ کے مہم جو سورماؤں کو طلب کر لیا۔ اس مہم کو پہلی صلیبی جنگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صلیبی جنگجو کئی برسوں تک ناقابلِ یقین مصائب اٹھا کر بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد ۱۰۹۹ء میں مشرقِ بعید میں پہلی مغربی نوآبادی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مغرب کی اس نئی کامیابی نے اسلام کے خلاف کھلی جنگ کی صورت اختیار کر لی البتہ شروع شروع میں یورپ کا کوئی باشندہ دینِ اسلام یا پیغمبر اسلامؐ کے خلاف خصوصی طور پر نفرت نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ صرف اپنی عظمت کے خوابوں اور یورپ کے پاپائی نظام کی توسیع کے نشے میں مخمور تھے۔ پہلی صلیبی جنگ کے وقت جو گیت The Song of Roland لکھا گیا، وہ دینِ اسلام کے بارے میں یورپی باشندوں کی مکمل جہالت اور لاعلمی کا آئینہ دار ہے۔ اس گیت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شارلیمن Charlemagne اور رولینڈ Roland کے نزدیک مسلمان دشمن بت پرست ہیں جو سورج دیوتا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پرستش کرتے ہیں۔ صلیبی جنگجو جب ایشیائے کوچک میں پہلی مرتبہ ترکوں کے خلاف صف آرا ہوئے تو وہ ترکوں کی شجاعت اور جوانمردی کے دل سے معترف تھے:

> ہمارے آدمیوں نے ترکوں کے ساتھ جنگ میں جس قابلِ ذکر بات کا مشاہدہ کیا، وہ ان ترکوں کی جرأت اور دلیری تھی جن کا خیال تھا کہ جس طرح وہ عربوں، شامی اور عرب خانہ بدوشوں، آرمینیا کے باشندوں اور شام اور یونان کے لوگوں کو تیروں کی بوچھاڑ کے ذریعے زیر کر چکے تھے، اسی طرح وہ فرانک فوجیوں کو بھی دہشت زدہ کر دیں گے۔ لیکن ترک جنگجو اب ہمارے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ترکوں کی ایک کہاوت ہے کہ فرانک باشندوں اور ان کے آباءواجداد مشترک تھے اس لیے وہ پیدائشی طور پر سورما اور جنگجو ہیں۔ ان کا یہ کہنا سچ ہے اور کوئی شخص اس کی تردید نہیں کر سکتا البتہ اگر وہ دینِ مسیح اور تثلیث کے قائل ہو جاتے...... تو یقیناً بے حد مضبوط، دلیر اور آزمودہ کار سپاہی بن جاتے۔ اس کے باوجود ہمارے آدمیوں نے خدا کی مہربانی سے انہیں شکست دے دی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

The Deeds of the Franks and other Pilgrims to Jerusalem) لندن ۱۹۶۲ صفحہ ۲۲)۔

۱۰۹۷ عیسوی میں ڈوریلیئم Dorylaeum کے محاذ پر فرانک یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان سپاہیوں کے ساتھ ان کا خونی رشتہ ہے لیکن دو سال بعد جب صلیبی جنگجوؤں نے بیت المقدس کو فتح کر لیا تو وہ مسلمانوں کو اپنی طرح کے انسان کا درجہ دینے کو بھی تیار نہ تھے۔ انہوں نے شہر کے مسلمان باشندوں کو نہایت سنگدلی کے ساتھ اس طریقے سے بڑے پیمانے پر ذبح کر دیا کہ خود ان کے ہم عصروں کو اس کارروائی سے شدید صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو ذلیل اور حقیر سمجھ کر انہیں مقاماتِ مقدسہ سے نکال باہر کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔ صلیبی جنگجوؤں نے مسلمانوں کے لیے خفیہ طور پر Fifth یعنی دشمن کی اصطلاح گھڑ لی۔

۱۱۰۰ عیسوی تک یورپ میں کسی کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ۱۱۲۰ء میں ہر شخص آپ کی شخصیت کو جاننے لگا۔ مغرب میں جب شارلیمن، کنگ آرتھر اور رابن ہڈ کے فرضی قصے کہانیوں کے چرچے ہو رہے تھے، مغربی تصورات میں آنحضرتؐ کے بارے میں یہ بات پوری طرح سما گئی کہ آپؐ دنیائے مسیحیت کے دشمن ہیں۔ آر ڈبلیو سدرن R. W. Southern نے اپنی کتاب Western veiws of Islam in the Middle Ages کے صفحہ ۲۹ پر اس صورت حال کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب یہ فرضی قصے اور خیالی پیکر وضع کیے گئے، ٹھیک اسی لمحے سے ان کہانیوں کو سچ مان کر ان کی تفصیلات بیان کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ صورت حال ادبی زندگی کا حصہ بن گئی۔ عوامی شاعری میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے خانہ بدوش پیروکاروں کی جو صورت گری کی گئی، وہ بھی کسی تبدیلی کے بغیر نسل در نسل منتقل ہوتی گئی۔ ان افسانوی کرداروں میں جو رنگ بھرے گئے، سیرت نگار پورے خلوص کے ساتھ سیکڑوں برس تک انہیں اپنے اپنے انداز میں دوبارہ پیش کرتے رہے۔

مغرب میں پیغمبر اسلامؐ کی افسانوی شخصیت کے پیش نظر لوگ آپؐ کے تاریخی کردار پر نپولین یا اسکندرِ اعظم کی طرح سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ نہیں ہو پا رہے۔ The Satanic Verses میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو سراپا بیان کیا گیا ہے، وہ بھی مغرب کی مسلمہ قوتِ متخیلہ کی صدائے بازگشت ہے۔ نبی کریمؐ کی نصرت اور کامیابی کا تذکرہ کرتے وقت روایتی افسانوں میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ آپؐ (نعوذ باللہ ......مترجم) ایک جادوگر تھے جنہوں نے بھولے بھالے خوش اعتقاد عربوں کو دھوکا دینے اور افریقا اور مشرق وسطیٰ میں کلیسا کو تباہ کرنے کے لیے جھوٹے ''معجزے'' اور فرضی قصے کہانیاں گھڑی تھیں۔ ایک کہانی میں ایک سفید بیل کا ذکر کیا گیا ہے جس نے لوگوں میں خوف اور دہشت پھیلا دی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن، جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عربوں کے لیے لائے تھے، اس کے دونوں سینگوں کے درمیان معجزانہ طور پر تیرتا تھا نیز آپؐ نے ایک فاختہ کو سدھایا ہوا تھا جو آپؐ کے کانوں میں ٹھونگیں مار کر مٹر کے دانے کھاتی تھی۔ اس سے یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظاہر کرنا مقصود تھا کہ روحِ مقدس آپؐ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔ حضورؐ کے روحانی مشاہدات کی تشریح کرتے وقت یہ دعویٰ کیا گیا کہ آپؐ مرگی کے مرض میں بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے اور آسیب زدہ ہونے کے باعث جنوں بھوتوں کا آپؐ پر غلبہ ہو جاتا تھا۔ آپؐ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی من گھڑت قصے بیان کیے گئے اور اس سلسلے میں گمراہ کن الزامات لگائے گئے۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ آپؐ نے سفلی جبلتوں کی حوصلہ افزائی کر کے لوگوں کو اپنے دین میں داخل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دعووں میں کوئی صداقت نہیں تھی، وہ ایک سنگدل بہروپیے تھے جنہوں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔ (نعوذ باللہ۔ نقلِ کفر، کفر نباشد..... مترجم)۔ جو پیروکار آپؐ کے ابتدائی خیالات سے آگاہ تھے، وہ محض اپنے مذموم عزائم کی وجہ سے خاموش رہے۔ مغرب کے عیسائی حضورؐ کی کامیاب مذہبی بصیرت اور وجدان کا اعتراف کرنے کے بجائے اسلام کی خود مختار الہامی حیثیت سے انکار کرتے رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اسلام عیسائیت ہی کی مسخ شدہ صورت اور سب سے بڑا کفر اور بدعت ہے۔ کہا گیا کہ سرجیس Sergius نامی بدعتی راہب نے، جسے مسیحی دنیا سے جبراً نکال دیا گیا تھا، عرب میں حضورؐ سے ملاقات کر کے آپؐ کو عیسائیت کی تعلیم دی تھی نیز یہ کہ تلوار کے بغیر اسلام کبھی پھل پھول نہیں سکتا تھا۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ اسلامی سلطنت میں مسلمانوں کو اپنے دین اسلام پر تبادلہ خیالات کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور یہ کہ ایک جن کی وجہ سے آپؐ پر کپکپی طاری ہو گئی تھی اور سوروں کے ایک غول نے آپؐ کو چیر پھاڑ دیا تھا۔

فرضی قیاس آرائیوں اور قوتِ واہمہ کی بنیاد پر بنائے جانے والے اس خیالی پیکر کی بعض تصریحات سے عیسائیت کی خود اپنے تشخص کے بارے میں اس کے داخلی اضطراب اور گہری تشویش کی غمازی ہوتی ہے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں عیسائی اپنے مذہب کے اس جارحانہ طرزِ عمل کی وجہ سے سخت پریشان تھے جس کا مسیح علیہ السلام کے امن اور صلح پسندی کے پیغام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جس دور میں کلیسا متذبذب عیسائیوں پر تجرد کی زندگی اور رہبانیت کو مسلط کر رہا تھا، اس وقت پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ مقدسہ کے بارے میں حقائق معلوم کرنے اور عیسائیوں کے مظالم کی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے آپؐ کی عائلی زندگی کے متعلق عجیب وغریب قصے گھڑے جا رہے تھے اور بدنیتی، رشک وحسد، تعصب اور تنگ نظری سے کام لیتے ہوئے اسلام کو ذاتی خواہشات کے حصول کا ذریعہ اور ایک ناقابلِ التفات دین سمجھا جا رہا تھا۔ اس ضمن میں آخری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں، مغرب تھا جس نے مذہبی معاملوں پر کھلے بندوں بحث مباحثے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یورپ پر مسیحیت کے پیروکاروں میں عقلی اور شعوری مطابقت پیدا کرنے کا بھوت سوار تھا چنانچہ وہاں عیسائیت سے روگردانی کرنے والے منحرفوں کو شدت کے ساتھ اس قدر سنگین سزائیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی گئیں کہ مذاہب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانے میں عیسائیت کے بارے میں اختلاف کرنے والے افراد اور گروہوں کی ایذ رسانی اور پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے پیروکاروں کے درمیان ہولناک خونریزی اور ایذا رسانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور ان دقیق مذہبی مسئلوں پر، جنہیں یہودیت اور اسلام کے نزدیک نجی اور اختیاری تصور کیا جاتا تھا، بدترین محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔ بدعت اور کفر کے بارے میں مسیحی نظریے کو، جس نے خدا کے متعلق انسانی نظریات کو ایک ناقابلِ قبول اونچی سطح پر لا کھڑا کیا ہے اور انہیں بت پرستی کی شکل دے دی ہے، نہ تو یہودیت تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی اسلام! صلیبی جنگوں کا دور، جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں فرضی داستانیں گھڑی گئیں، یورپ کے لیے سخت تناؤ اور منفی ردِعمل کا زمانہ تھا جس کا اندازہ اسلام کے متعلق یورپ میں پائے جانے خوف، خدشات اور ہیجان سے لگایا جا سکتا ہے۔

ان حالات میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ مغرب کے عیسائی، مسلمانوں یا بازنطینیوں کی طرح مختلف مذہبی طبقوں اور نظریات کو اپنے نظام میں مناسب جگہ دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ یورپی سرزمین پر یہودیت واحد اجنبی مذہب تھا چنانچہ ابتدائی صلیبی جنگجوؤں نے مشرقِ وسطیٰ کے سفر کا آغاز وادی رہائن کے ساتھ بسنے والے یہودیوں کے قتلِ عام سے کیا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں سامی مذہب اور تہذیب وتمدن کی دشمنی یورپ میں ایک ناقابلِ علاج مرض کی شکل اختیار کر گئی۔ عیسائیوں نے رسول اللہؐ اور عربوں کے متعلق فرضی افسانے وضع کرنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے بارے میں بھی خوفناک قصے گھڑنا شروع کر دیے۔ یہ مشہور کیا گیا کہ یہودی، مسیحی سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے عالمی سازش کا حصہ ہیں اور اس مملکت کو برباد اور مقدس عشائے ربانی کو نجس کرنے کے لیے عید کے موقعے پر کمسن بچوں کو قتل کر کے ان کا خون روٹی میں ملا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس عالمِ اسلام میں یہودیوں کے خلاف اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس صورت حال سے مغربی نفسیات میں غیر صحت مند فکری انتشار اور بیماری کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن اسپین، جنوبی اٹلی اور سسلی کی فتوحات کا مطلب یہ تھا کہ اب لاکھوں مسلمان عیسائیوں کی سرحدوں کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ مسیحی حکمرانوں کے پاس ان غیر ملکیوں کے مسئلے سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ایک سرکاری پالیسی کے تحت ہمسایہ مسلمانوں اور یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کے ہر قسم کے رابطوں پر پابندی لگا دی جائے۔ چنانچہ کلیسا نے اس مقصد کے لیے خاص طور پر قانون سازی کی اور ۱۱۷۹ء اور ۱۲۱۵ء میں لیٹرن کونسلوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کو مشترکہ دشمن قرار دے دیا۔ عیسائیوں کو ان دونوں مذہبوں کے پیروکاروں کے ساتھ ہر قسم کے رابطوں کی ممانعت کر دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کے گھروں میں ملازمت یا ان کے بچوں کی دیکھ بھال کی، ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا یا تجارتی لین دین کیا تو اس جرم کی پاداش میں انہیں عیسائیت سے خارج کر کے ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۲۲۷ء میں پوپ گریگوری نہم نے درج ذیل فرمان جاری کر دیا: مسلمان اور یہودی امتیازی لباس پہنیں، عیسائیوں کے تہواروں کے موقعے پر سڑکوں اور بازاروں میں نہ چلیں پھریں اور مسیحی ملکوں میں انہیں کوئی سرکاری عہدہ نہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ موذن پر نماز کے لیے روایتی انداز میں اذان دینے پر بھی پابندی لگادی گئی اور کہا گیا کہ اذان عیسائیوں کے کانوں پر گراں گزرتی ہے۔

پوپ کلیمنٹ پنجم (۱۳۰۵ء سے ۱۳۱۴ء) نے اعلان کیا کہ مسیحی سرزمین پر اسلام کی موجودگی خدا کی توہین ہے۔ عیسائی پہلے ہی اس ''نجس مخلوق'' کا صفایا کرنا شروع کر چکے تھے۔ ۱۳۰۱ عیسوی میں فرانس کے بادشاہ چارلس آف انجو نے سسلی کے آخری مسلمان کو ملک سے نکال باہر کیا اور اسے جنوبی اٹلی میں لیوسیرا Lucera کے مقام پر قید کر دیا جسے وہ وبائی امراض کا گھونسلا... وحشت ناک آلودگی ... اور سرکش طاعون قرار دیتا تھا۔ (The Arabs and Medieval Europe P.156)۔ فرڈی نینڈ اور ازابیلا نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کو فتح کر کے یورپ میں اسلام کے آخری قلعے کو تباہ کر دیا جس پر یورپ کے تمام گرجا گھروں میں زور زور سے گھنٹیاں بجا کر ''کافروں'' پر عیسائیوں کی فتح کا جشن منایا گیا۔ اس کے چند سال بعد اسپین کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ یا تو وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں یا عیسائیت قبول کر لیں۔ بیشتر مسلمانوں نے یورپ چھوڑ دینے کو ترجیح دی لیکن بعضوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ اور اسپین کے سرکاری اہلکاروں اور عدالتوں نے مزید تین سو سال تک انہیں اور ان کی اولاد کو تختۂ مشق بنائے رکھا۔ قرطبہ کے ''شہیدوں'' نے پرانی مذہبی رواداری کی جگہ لے لی اور اسپین کے عیسائی خوف کی وجہ سے اپنے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو معاشرے کے خفیہ دشمن سمجھنے لگے۔

اسلام کے بارے میں غیر صحت مندانہ مغربی رویے کا اظہار اکثر و بیشتر ہیجان انگیز ردِعمل کی صورت میں کیا جاتا۔ روی شہنشاہ فریڈرک دوم بظاہر اسلام کی حمایت کرتا اور وہ یورپ کے مقابلے میں عالم اسلام میں زیادہ مشہور ہے، لیکن اس نے بھی ایک گھناؤنے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو قتل کرایا اور انہیں ان کے آبائی وطن سسلی سے نکال باہر کیا۔ مشرقِ قریب میں جب عیسائی، مسلمانوں کو ذبح کر رہے تھے، عین اس وقت اسپین میں کئی مسیحی طالب علم مسلمان اسکالروں کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عیسائی، یہودی اور عرب اسکالرز ترجمے کے ایک وسیع پراجیکٹ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے۔ اس منصوبے کے تحت اسلامی علوم وفنون کو مغرب میں منتقل کر کے یورپ کو اس کلاسیکل اور قدیم علم و دانش سے روشناس کرایا گیا جو زمانہ جاہلیت میں محو ہو گیا تھا۔ مسلمان فلاسفروں ابن سینا اور ابنِ رشد کو علم و حکمت کا مینارۂ نور سمجھ کر ان کی عزت و توقیر کی جاتی لیکن عیسائیوں کے لیے اس حقیقت کو نگلنا مشکل ہوتا گیا کہ یہ دونوں عظیم فلسفی مسلمان تھے۔ دانتے کی Divine Comedy میں اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت حال کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ابنِ سینا اور ابنِ رشد کو، جو یورپ میں Avicenna اور Averoes کے نام سے مشہور ہیں، دوزخ کے کنارے مقامِ اعراف پر بت پرستوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے جہاں مسیحی عقیدے کے مطابق غیر عیسائی نیک لوگوں اور بچوں کی روحیں رہتی ہیں۔ ان دونوں فلاسفروں نے یورپ میں علم وحکمت کے کلچر کی بنیاد رکھ کر مغرب کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں اور اسے علمِ اقلیدس سکھانے کے علاوہ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے افکار سے روشناس کرایا تھا۔ اس کے برعکس خود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو (معاذ اللہ ... مترجم) بدعتیوں کے ساتھ دوزخ کے آٹھویں دائرے میں دکھایا گیا جہاں انہیں سزا دی جارہی ہے۔ (نعوذ باللہ... مترجم)۔

میں نے تھوڑی سے نیچے کی طرف دیکھا تو وہاں کسی پہلو یا درمیان میں کوئی آتش دان نہیں تھا۔ ان کی انتڑیاں ایڑیوں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں، دل، جگر اور تلی کلیجے کے ساتھ اور میلے رنگ کا ایک تھیلا نگلی جانے والی خوراک کی غلاظت سے لبریز تھا۔

دانتے اب بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک آزاد اور خودمختار دین کا بانی نہیں سمجھتا تھا اور آپؐ کو محض ایک تفرقہ باز اور اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہونے والی شخصیت قرار دیتا ہے۔ یہ تصوراتی نقوش اسلام کے متعلق اس نفرت اور تعصب کے آئینہ دار ہیں جو عیسائیت کے سینے میں پرورش پا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی نفسیات میں موجود ان اختلافات کی بھی عکاسی ہوتی ہے جن کی رو سے اسلام کو ہر اس چیز کا ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے جسے مغرب ہضم نہیں کرسکتا۔ اسلام کا خوف اور اس سے نفرت یسوعؑ کے پیغامِ محبت سے مکمل انحراف کے مترادف ہے اور اس سے مغربی عیسائیت کی دیانت اور راست بازی میں موجود ایک گہرے ناسور کا پتا چلتا ہے۔

لیکن دوسری طرف کئی عیسائی ایک معروضی اور حقیقی وژن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس وقت مسیحی تصور میں یہودیوں اور مسلمانوں کو انسانی تہذیب کا مشترکہ دشمن قرار دیا جارہا تھا، ٹھیک اسی وقت اسپین میں ۱۱۰۶ عیسوی میں یہودیت کو ترک کر کے عیسائیت قبول کرنے والے پیٹر ایلفونسی PeterAlfonsi نامی شخص نے سب سے پہلے مغرب میں پیغمبر اسلامؐ کی مثبت تصویر کشی کی۔ ایلفونسی بعد میں انگلستان چلا گیا جہاں اسے ہیزی اول کے معالج کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اسلام کے بارے میں گو اس کا رویہ جارحانہ تھا البتہ اس کا خیال تھا کہ جو شخص کسی سچے مذہب کا پیروکار نہ ہو، وہ دینِ اسلام قبول کرسکتا ہے اور یہ ایک معقول انتخاب ہے۔ ۱۱۲۰ عیسوی میں جب اسلام سے نفرت نقطہ عروج پر تھی، مالمسبری Malmesbury کا ولیم اسلام اور بت پرستی کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے والا پہلا یورپی باشندہ تھا: ''عرب اور ترک دونوں ایک خالق کی حیثیت سے خدا کی پرستش کرتے ہیں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحیثیت خدا عزت وتکریم نہیں کرتے بلکہ آپؐ کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں۔"

(Banjamin Kedar: Crusade: European Approaches to the Muslims and Mission: P. 99)

لیکن بہت سے یورپی اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ابھی تک تذبذب کا شکار ہیں۔ بعض لوگ اب بھی اس بات پر بجا طور پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح مسلمان بھی خدائے واحد کو پوجتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح رومن مندروں میں دیوتاؤں کے بادشاہ عطارد کی پرستش ہوتی ہے، اسی طرح "اللہ" بھی ایک دیوتا ہے۔ کئی دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی تعظیم کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی اپنے پیغمبرؐ کی عزت وتوقیر کرتے ہیں۔

حقیقت کو افسانے سے جدا کرنے کی مشکلات کا اظہار ۱۱۵۰ عیسوی سے کچھ دیر پہلے لکھی گئی ٹرپن Turpin کی کتاب History of Charlemagne سے ہوتا ہے جس میں بت پرست عربوں کو سورج دیوتا کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوجا کرتے دکھایا گیا البتہ کتاب کے وسط میں رولینڈ اور Ferracutus نامی مسلمان کے درمیان ایک مباحثے کی تفصیلات درج کی گئی ہیں جس میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ مسلمان صرف خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ تقریباً اسی زمانے میں فرینگ کے وقائع نگار اوٹو Otto نے مسلمانوں کی بت پرستی کے افسانوی قصے کی تردید کر دی:

سب جانتے ہیں کہ تمام عرب صرف ایک خدا کی پوجا کرتے، عہد نامہ قدیم کے قوانین کی پاسداری کرتے اور ختنہ کرانے کی رسم ادا کرتے ہیں۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں پر حملہ نہیں کرتے البتہ ان کا عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح نہ تو خدا ہیں اور نہ ہی خدا کے بیٹے۔ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدائے برتر کا عظیم پیغمبر مانتے ہیں۔ (Chronicon صفحہ ۱۳۶)۔

یورپ میں بارھویں صدی کے وسط تک اسلام کے بارے میں زیادہ درست نقطہ نظر فروغ پانے لگا لیکن یہ معروضیت اور حقیقت پسندی اس قدر توانا نہیں تھی کہ پرانے جارحانہ طرز عمل کی جگہ لے سکے۔ ان حالات میں حقیقت اور افسانہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتے رہے اور جس وقت عیسائی لوگ انصاف پسندی کی روش پر چلنے کی حقیقی کوشش کر رہے تھے، پرانی نفرت کے آثار اکثر وبیشتر ابھر کر سامنے آ جاتے اور اوٹو Otto کے معقول نقطہ نظر کے باوجود حضورؐ کو (نعوذ باللہ... مترجم) ایک عیار اور تفرقہ پسند شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

بارھویں صدی میں اسلام کے بارے میں معروضی نقطہ نظر اختیار کرنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان میں کلونی Cluny کے راہب پیٹر دی ولنر یبل کی کاوشیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نے ۱۱۴۱ء میں مسیحی صومعوں کا دورہ کر کے بعض اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے کینیٹ کے راہب کی سرکردگی میں عیسائی اور مسلمان اسکالروں کی ایک ٹیم تشکیل دی اور یہ منصوبہ ۱۱۴۳ عیسوی میں پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسکالروں نے قرآنِ حکیم کے علاوہ کئی اسلامی کتب، عالمِ اسلام کی تاریخ اور اسلامی تعلیمات کا لاطینی زبان میں پہلی مرتبہ ترجمہ کیا اور بحث مباحثوں کے ضمن میں The Apology of Al-Kindi کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ ایک شاندار علمی کارنامہ تھا جس کی بدولت مغرب کے لوگوں کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ لیکن یہ کوششیں بارآور ثابت نہ ہوسکیں کیونکہ اس وقت مشرق قریب میں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے ملکوں کو بڑے پیمانے پر عسکری ہزیمتیں اٹھانے کا مرحلہ شروع ہوگیا اور کلیئرویکس Clair Vaux کے برنارڈ Bernard کی تحریک پر اسلام دشمنی کے جذبات پھربھڑک چکے تھے۔ ان حالات میں قرآن مجید کے معروضی مطالعے کے لیے یہ کوئی موزوں وقت نہیں تھا چنانچہ پیٹر Peter نے ایک رسالہ لکھا جس میں محبت اور نرمی کے ساتھ عالمِ اسلام سے اس طرح خطاب کیا گیا: ''میں دوسرے لوگوں کے برعکس ہتھیاروں کے ذریعے نہیں، الفاظ کی وساطت سے اور طاقت کے بجائے منطق اور استدلال سے، نفرت کے بجائے محبت سے تمہارے قریب آتا ہوں... میں تم سے پیار کرتا ہوں اور محبت آمیز جذبات کے ساتھ تمہیں اس خط کے ذریعے کفارۂ مسیح کے عقیدے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔''

(Crusade and Mission: European Approaches to the Muslims P. 99)۔ اس رسالے کا عنوان تھا: Summary of the Whole Heresy of the Diabolic Sect of the Saracens۔ جو مسلمان لاطینی زبان میں لکھے گئے اس رسالے کے متن کو پڑھ سکتے تھے، ان میں سے صرف چند لوگ ہی اس ہمدردانہ نقطۂ نظر سے متاثر ہوئے۔ لیکن اس ہمدرد راہب نے بھی، جس نے کئی موقعوں پر اپنے عہد میں پائے جانے والے مذہبی جنون کی مخالفت کی تھی، اسلام کے متعلق یورپ کی متعصبانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا اور جب فرانس کے بادشاہ لوئیس ہفتم نے مشرق وسطیٰ میں ۱۱۴۷ء میں دوسری صلیبی جنگ کی قیادت کی تو اسی پیٹر نے بادشاہ کے نام ایک خط میں یہ امید ظاہر کی کہ وہ اتنے ہی مسلمانوں کو تہ تیغ کرے گا جس قدر حموراہیوں اور کنعانیوں کو موسیٰؑ اور یوشعؑ نے قتل کیا تھا۔

(Crusade and Mission: European Approarches to the Muslims P. 101)۔

تیرہویں صدی کے شروع میں عیسائیوں کی ایک اور مقدس شخصیت نے ایک عسکری مہم جوئی کے تناظر میں عالمِ اسلام کے ساتھ رابطے کی کوشش کی۔ یہ فرانسس آف اسیسی Francis of Assissi تھا جو تباہ کن پانچویں صلیبی جنگ (۱۲۱۸ء، ۱۲۱۹ء) میں ایک وقفے کے دوران دریائے نیل کے ڈیلٹے میں عیسائیوں کے ایک کیمپ میں پہنچ گیا، اس نے دشمن کی صفوں کو پار کرلیا اور مسلمان فوجیوں سے کہا کہ وہ اسے سلطان الکامل کے پاس لے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تین دن تک سلطان کے ساتھ رہا، اس نے حضرت عیسیٰؑ کے پیغام کی صراحت کی اور الکامل سے کہا کہ وہ عیسائیت اختیار کرلے۔ چونکہ اس نے نبی کریمﷺ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی، اس لیے مسلمانوں نے خوش دلی کے ساتھ اس کی باتیں سنیں اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اس شکستہ حال شخص کی باتوں سے قدرے متاثر بھی ہوئے۔ جب وہ رخصت ہوا تو سلطان الکامل نے اس سے کہا:

''میرے لیے دعا کیجئے کہ خدا مجھے اس شریعت اور دین کا راستہ دکھائے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہے''۔ بعد میں سلطان نے انتہائی عزت و احترام سے فرانس کو عیسائیوں کے کیمپ میں بحفاظت واپس بھیج دیا۔

(The Crusaders P. 221)۔

لیکن فرانس نے مشرق کی جانب سفر کرنے سے پہلے اسپین اور افریقا کے مسلمانوں میں تبلیغ کے لیے راہبوں کی ایک جماعت روانہ کر دی تھی جس نے ایک مختلف انداز میں عالمِ اسلام کے ساتھ رابطہ کیا اور اشبیلیہ پہنچ کر قرطبہ کے ''شہیدوں'' کے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ انہوں نے پہلے تو جمعہ کی نماز کے دوران مسجد پر ہلہ بول دیا اور جب انہیں وہاں سے نکال دیا گیا تو وہ امیر کے گھر کے باہر پیغمبر اسلامؐ کو (نعوذ باللہ... مترجم) گالیاں دینے لگے۔ اس طرح اسلام کے لیے پہلی بڑی مشنری مہم کے دوران مسلمانوں کی طرف خلوص اور محبت کے ساتھ بازو نہ پھیلائے گئے۔ فرانس کے پیروکاروں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مسلمان عیسائیت قبول کرلیں۔ وہ تو محض شہادت کا تاج پہننے کے لیے مسلمانوں کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے اس قدر شور و غوغا برپا کیا کہ حکام، جو اس واقعے سے سخت ہراساں تھے، انہیں جیل بھیجنے پر مجبور ہو گئے اور اس واقعے کی تشہیر سے بچنے کے لیے انہیں ایک سے دوسری جیل میں منتقل کرتے رہے۔ وہ ان راہبوں کو پھانسی کی سزا دینے میں متذبذب تھے لیکن مقامی مستعربین عیسائیوں کو اندیشہ تھا کہ ان مذہبی جنونیوں کی وجہ سے ان کی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے حکام سے التجا کی کہ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ آخران عیسائی راہبوں کو مراکش میں Cueta کے مقام پر بھیج دیا گیا جہاں پہنچ کر یہ لوگ سیدھے مسجد میں چلے گئے اور جب مسلمان نمازِ جمعہ کے لیے جمع ہوئے تو انہوں نے حضورؐ کو (نعوذ باللہ... مترجم) پھر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ بالآخر حکام انہیں پھانسی دینے پر مجبور ہو گئے۔ جب فرانس نے یہ ماجرا سنا تو وہ خوشی سے چلا اٹھا اور کہنے لگا: ''مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ میرے پاس پانچ راہب موجود ہیں''۔ (The Crusaders)۔ فرانس نے بعد میں جو مشن بھیجے، اسلام کے بارے میں ان کا طرزِ عمل بھی یہی رہا۔ ۱۲۲۷ء میں ایک اور گروپ کو Cueta روانہ کیا گیا جسے تحریری طور پر آگاہ کیا گیا کہ ان کے مشن کا اصل مقصد'' کافروں کی موت اور ان کی سرزنش کرنا ہے''۔ (Crusade and Mission PP. 125-126)۔ کئی دوسرے گروپ بھی بیت المقدس چلے گئے۔ Acre کے بشپ جیمز آف ورٹی نے، جس نے ان عیسائی مشنریوں کے طرزِ عمل کی مخالفت کی، اس صورت حال کی ان لفظوں میں وضاحت کی ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسائی راہب جب یسوعؑ کے دین اور انجیل مقدس کی تعلیمات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو مسلمان توجہ اور خوشی سے ان کی باتوں کو سنتے ہیں۔ لیکن جب یہ لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کھلے لفظوں میں تردید کرتے اور اپنی گفتگوؤں میں آپ ؐ کو مکار اور جھوٹا کہتے ہیں (نعوذ باللہ… مترجم) تو مسلمان انہیں بے دریغ پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر خدا معجزانہ طور پر ان لوگوں کی حفاظت نہ کرتا تو مسلمان ان مشنریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے اور انہیں اپنے شہروں سے نکال دیتے۔

(The Crusaders PP. 222-223)۔

چنانچہ قرون وسطیٰ کے دوران، جب عیسائی لوگ مسلمانوں کے بارے میں منصفانہ اور معروضی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کررہے تھے، اس وقت بھی ان کے درمیان جھگڑا اور فساد ہو جاتا جو بعض اوقات جنگ وجدل کی صورت اختیار کر جاتا۔ تیرہویں صدی کے آخر میں ڈومی نیکن اسکالر Riccdo da Monte Croce نے اسلامی ملکوں کی سیاحت کی تو وہ مسلمانوں کے تقوے اور پرہیزگاری کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے لکھا کہ مسلمانوں کا تقدس اور پاکیزگی عیسائیوں کے لیے باعثِ شرم ہے۔ لیکن جب اس نے وطن واپس آ کر Disputation Contra Saracenos et Alchoranum کے نام سے کتاب لکھی تو اس میں اسلام کے متعلق انہی پرانے فرضی قصے کہانیوں کو دہرا دیا۔ اس طرح مغرب میں اسلام کے بارے میں جو خیالی تصویر بنائی گئی، اسے ایک ایسی سند کا درجہ حاصل ہونے لگا جو حقیقی مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کے رابطوں سے اخذ ہونے والے نتائج کے مقابلے میں، خواہ وہ کتنے ہی مثبت کیوں نہ ہوں، زیادہ مضبوط تھی۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مغرب میں اسلام کے متعلق یہی جذبات اور احساسات پرورش پاتے رہے۔ چنانچہ ہمارے بیشتر ہیجان اور جوش و ولولے کا اسی زمانے میں سراغ ملتا ہے جس کی نشان دہی Umberto Eco نے اپنے مضمون Dreaming of the Middle Ages میں ان لفظوں میں کی ہے:

اصل میں امریکی اور یورپی باشندوں کو یہی مغربی ورثہ ترکے میں ملا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مغربی دنیا کو درپیش تمام مسائل کی جڑیں قرونِ وسطیٰ میں پیوست ہیں۔ جدید زبانیں، تجارتی شہر، سرمایہ دارانہ معیشت (مع بینک، چیک اور شرح سود) قرونِ وسطیٰ کے معاشرے ہی کی ایجاد ہیں۔ ہم قرونِ وسطیٰ میں جدید افواج کے عروج، قومی ریاست کے جدید نظریے اور مافوق الفطرت وفاق جس کی قیادت جرمنی کے اس شہنشاہ نے کی جسے ایک بین الاقوامی کانفرنس نے، جو الیکٹورل کنونشن کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، منتخب کیا تھا، غریب اور امیر کے درمیان کشمکش، بدعت کے نظریے یا نظریاتی انحراف یہاں تک کہ عشق کے معاصرانہ تصور کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کے مطابق عشق کو ایک تباہ کن افسردہ مسرت اور آسودگی قرار دیا گیا ہے۔ میں ان میں کلیسا اور ریاست کے تنازعے ٹریڈ یونینوں (اگرچہ وہ کارپوریٹ شکل میں ہوں) اور محنت کشوں کی ٹیکنالوجی کی صورت میں تبدیلی کا بھی اضافہ کر سکتا ہوں۔

(Ulmberto Eco: Dreaming of the Middle Ages P. 64)۔

اس مضمون میں وہ اسلام کے مسئلے کا بھی اضافہ کر سکتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے بعد بھی مغرب کے باشندوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت سے پرانے دیو مالائی قصوں کی صدائے بازگشت بدستور سنائی دیتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے متعلق زیادہ مثبت اور معروضی تناظر میں جائزہ پیش کرنے کی مزید کوششیں جاری رہیں اور ادیبوں اور محققین کے درمیان اس رائے پر اتفاق بڑھتا گیا کہ لوگوں کے تصور کے برعکس ''اسلام اور اس کا پیغمبرؐ عجیب وغریب مخلوق نہیں''۔ ان علمی کاوشوں کے باوجود مغرب میں روایتی تعصب بدستور موجود رہا۔

قرطبہ کے ''شہیدوں'' نے اسلام کے بارے میں جس الہامی نظریے کو فروغ دیا، صلیبی جنگوں کے دوران اس کے اثرات برقرار رہے البتہ ان کی شدت میں کمی واقع ہوگئی اور اسے اہم اور بنیادی موضوع کا درجہ حاصل نہ رہا۔ ۱۱۹۱ء میں جب شیر دل رچرڈ Richard تیسری صلیبی جنگ کے لیے بیت المقدس کی جانب سفر کر رہا تھا تو اس نے سسلی میں میسینا Messina کے مقام پر مشہور اطالوی راہب جوشم Joachim کے ساتھ ملاقات کی جس نے رچرڈ کو بتایا کہ وہ صلاح الدین کو یقیناً شکست دے دے گا۔ لیکن اس کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی البتہ اس نے اس ملاقات کے دوران کئی مزید دلچسپ باتیں کیں۔ اس نے یقین ظاہر کیا کہ دنیا عنقریب ختم ہونے والی ہے اور دجال کے ظہور کا بڑا سبب حیات نو پانے والا اسلام ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دجال پہلے سے ہی روم میں موجود ہے اور وہ یقیناً پوپ ہوگا۔ جوں جوں یورپ کے عوام میں اپنے معاشرے پر نکتہ چینی کرنے کا رجحان بڑھتا گیا، اسلام کو بھی ایک داخلی دشمن قرار دیا جانے لگا اور اصلاح پسند، بے دین پاپائیت (جس سے ان کی پکی دشمنی تھی) اور اسلام دونوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ چنانچہ چودھویں صدی کی کتابوں سے اس رویے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ایک انگریز اصلاح پسند جان ویکلف John Wycliffe کہتا ہے کہ اسلام میں وہی خرابیاں موجود ہیں جو اس کے زمانے میں چرچ میں پائی جاتی ہیں۔ کلیسا میں بھی تکبر، لالچ، حرص و ہوس، تشدد، اقتدار اور دولت کی خواہش کارفرما ہے۔ اس نے مجموعی تناظر میں مغربی کلیسا کی نقشہ کشی کرتے ہوئے لکھا ہے: ہم خود بھی مغرب کے مسلمان ہیں اور اگرچہ کلیسا میں ہماری تعداد بہت مختصر ہے، ہم یہ سوچتے ہیں کہ پوری دنیا ہماری تابع فرمان ہوگی اور ہماری کمان میں خوف اور دہشت سے اس پر کپکپی طاری ہو جائے گی۔ (Quoted in Southern: Western Views of Islam PP. 79-80)۔ جب تک کلیسا دینِ عیسوی کی حقیقی روح کو اجاگر نہیں کرتا اور غربت وافلاس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا جاتا، اسلام کا یہ جذبہ مغرب اور مشرق میں بدستور فروغ پاتا رہے گا۔ اسلام اور نبی کریمؐ کے بارے میں متعصبانہ طرز عمل ہماری اس پرانی عیارانہ چال اور عادت کا آئینہ دار ہے جس کے مطابق ہم اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو ہر اس چیز کا مدِ مقابل ٹھہراتے رہیں گے جس کی ہم توقع کرتے ہیں یا اس کے خوف میں مبتلا ہیں۔

ویکلف کو عموماً ناقابل اعتماد معلومات پر بھروسا کرنا پڑا البتہ اس نے قرآن حکیم کا ترجمہ پڑھ رکھا تھا اور اس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیال تھا کہ اس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور رومی کلیسا کے درمیان موازنہ کرنے کے لیے اہم نکات دریافت کر لیے ہیں۔ اس کا استدلال تھا کہ چرچ کی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی انجیل کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے، آپؐ نے انجیل سے وہ چیزیں لے لیں جو آپؐ کے لیے موزوں تھیں اور باقی چیزوں کو چھوڑ دیا۔ آپؐ نے مذہبی احکام کی طرح کئی نئی باتیں ایجاد کیں جس کی وجہ سے آپؐ کے پیروکاروں پر اضافی بوجھ پڑ گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی کلیسا کی طرح مذہبی امور پر بحث مباحثوں کی ممانعت کر رکھی تھی۔ ویکلف نے قرآن حکیم کے بعض ایسے اقتباسات کا مطالعہ کیا تھا جن میں مسلمانوں کو دینی معاملوں پر تبادلہ خیالات کی ممانعت کی گئی تھی البتہ اس نے اس جانب اشارہ کیا کہ بعض مذہبی مناظروں کے باعث خدائے واحد کے دونوں قدیم مذاہب ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ خدا کے بارے میں بعض نظریات محض فرضی اور قیاسی ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص روح اللہ کے عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کرنے کے نظریے کو ثابت نہیں کر سکتا تاہم ویکلف نے کئی متنازع نظریات کے سلسلے میں اسلام کی نام نہاد عدم رواداری کا چرچ کے رویے سے موازنہ کیا ہے جن میں مقدس عشائے ربانی اور عیسائیوں کو دی جانے والی یہ ہدایت شامل ہے کہ وہ ان باتوں پر، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں، آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں۔

لوتھر Luther اور پروٹسٹنٹ فرقے کے دوسرے اصلاح پسندوں نے اس روایت کو جاری رکھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں لوتھر کو عثمانی ترکوں کے یورپ میں در آنے کے واقعات کا مشاہدہ کرنا پڑا اور وہ بھی قرطبہ کے ''شہیدوں'' کی طرح ڈراؤنے خواب دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اسلام پوری عیسائیت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس نے ۱۵۴۲ء میں Ricoldo da Monte Croce کی کتاب Disputation کا اپنا ترجمہ شائع کر دیا۔ اس ترجمے کے دیباچے میں اس نے یہ تذکرہ کیا کہ اس نے Disputation کا کئی برس پہلے مطالعہ کیا تھا لیکن اس کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا کہ لوگ جھوٹ کے اس قسم کے کثیر الجہات پلندے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ قرآن حکیم کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے لاطینی زبان میں کوئی ترجمہ دستیاب نہ ہوا۔ جیسا کہ آر ڈبلیو سدرن R. W. Southern نے عندیہ دیا ہے، اس سے سولہویں صدی میں اسلام کے بارے میں مطالعے کی شدید کمی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن بعد میں قرآن پاک کا ایک نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا اور اسے یہ احساس ہو گیا کہ Riccoldo نے جو کچھ لکھا، وہ سچ تھا۔ اس نے استفسار کیا کہ آیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمان مسیحؑ کے دشمن ہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ اسلام اس قدر سست رو اور کاہل ہے کہ قسمت کے اس بھیانک کھیل کو انجام تک نہیں پہنچا سکتا۔ مسیحیت کے اصل دشمن پوپ اور کیتھولک چرچ ہیں اور جب تک یورپ اس داخلی دشمن کے ساتھ چمٹا رہے گا، وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلسل شکست کا سامنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا رہے گا۔ زونگلی Zwingli اور کئی دوسرے اصلاح پسندوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ مسیح دشمنی کا اصل سرغنہ روم ہے اور اسلام محض اس کا جسم ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کے نظریات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے بیشتر لوگ اسلام کو ایک داخلی ریاست اور جذباتی منظر میں برائی کی علامت تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ نارمن ڈینئل Norman Daniel نے The Arabs and Medieval Europe میں لکھا ہے، یہ کوئی خارجی تاریخی حقیقت نہیں تھی جس کا دوسرے امور کی طرح تنقیدی جائزہ لیا جا سکے۔ مغربی اصلاح پسندوں نے اسلام کو ایک داخلی ریاست قرار دینے کا نظریہ پیش کر کے خالص نظریے کے دشمنوں پر الزام تراشی کی ہے۔ انہوں نے اسلام کو اپنا دشمن قرار دے کر اصل میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں طویل عرصے سے اسلام کے متعلق جو خیال آرائیاں کی جا رہی ہیں، وہ درست تھیں۔ (Daniel: The Arabs and Medieval Europe P. 302)۔

ڈینئل نے عیسائیوں کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی مثال دے کر مسیحی مخالفین کا اسلام کے ساتھ موازنہ کیا ہے لیکن اسے اس موازنے کے اصل مقصد کا ادراک نہیں۔ سترہویں صدی کے کیتھولک مشنری ایم لیف بائر M. Lefebyre نے مسلمانوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروٹسٹنٹ پیروکار ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ اگر اپنے پیغمبر پر ان کا ایمان برقرار رہا تو خدا ان کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے ایک پروٹسٹنٹ سیاح ایل رووولف L. Rauwolf نے مسلمانوں کو کیتھولک مسلمان قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے لیے نیک اعمال کرتے، خیرات دیتے، نماز پڑھتے، روزے رکھتے اور غلاموں کو آزاد کرتے ہیں۔ Norman Daniel : Islam and the West, The Making of an Image, PP 284-85

قرونِ وسطیٰ کے عیسائی اسلام کو مسیحیت کی ناکام شکل قرار دیتے تھے اور انہوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک بدعتی عیسائی حضورؐ کو ہدایت دیتا تھا، فرضی قصے کہانیاں گھڑلی تھیں۔ بعد میں عیسائیت میں رونما ہونے والی تازہ داخلی تقسیم کی روشنی میں مغربی باشندے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے دین کا خالص مسیحی پس منظر میں مسلسل جائزہ لیتے رہے۔ انہیں اسلام کے معروضی تاریخی حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی یہ ادراک تھا کہ مسلمانوں کے اندر اپنا دینی جذبہ اور جوش وخروش کارفرما ہے اور عیسائیت کی اصطلاح کے حوالے سے اس کی تشریح ممکن نہیں۔

لیکن نشاۃ الثانیہ کے دوران دوسری مغربی اقوام نے عالمِ اسلام کے متعلق زیادہ معروضی فہم حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے یہ کام اس لیے کیا کیونکہ وہ پیٹر دی ولنریبل Peter the Vulnerable کی روایت اور آرزوؤں کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ پندرھویں صدی میں جان آف سیگوویا اور نکولس آف کیوسا جیسے اسکالروں نے اس مقصد کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے بازنطین کی مسیحی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطنت کو فتح کر لیا جس کے نتیجے میں اسلام یورپ کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ جان آف سیگو ویا نے اس جانب اشارہ کیا کہ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے لیے عیسائیوں کو ایک نیا طریقہ دریافت کرنا ہوگا کیونکہ جنگ یا روایتی مشنری سرگرمیوں سے اسلام کو کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ اس نے سلامانکا Salamanca کے ایک مسلمان ماہر قانون کے ساتھ مل کر قرآنِ کریم کے نئے ترجمے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تبادلہ خیالات کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس بلانے کی بھی تجویز پیش کی۔ لیکن ۱۴۵۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا کوئی منصوبہ بار آور نہ ہو سکا البتہ اس کے دوست کیوسا کے نکولس نے اس نئے اندازِ فکر کے بارے میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ۱۴۶۰ء میں Cribatio Alchoran (قرآن کا اجمالی جائزہ) لکھی۔ یہ کتاب معمول کے مطابق مناظرانہ خطوط پر لکھی گئی لیکن اس کا اسلوب ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ تھا اور اس میں قرآنِ حکیم کی ان آیات کا تجزیہ کیا گیا جنھیں جان آف سیگو ویا اہم سمجھتا تھا۔ علوم وفنون کے احیا کے زمانے میں عربی زبان کے مطالعے کو فروغ حاصل ہو گیا اور اس آفاقی مذہب اور علوم و فنون کے متعلق جامع معلومات اکٹھی کرنے کے رجحان کی بدولت بعض اسکالروں نے عالم اسلام کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اختیار کر کے صلیبی جنگوں کے خام رویے کو ترک کر دیا۔ لیکن قرون وسطیٰ کی طرح حقائق کی قدر دانی کا فروغ پذیر رجحان اس پرانی نفرت کے اثرات کو پوری طرح زائل نہ کر سکا جو صدیوں پرانے مغربی تصور پر چھایا ہوا تھا۔

یہ بات ۱۶۹۷ عیسوی میں روشن خیالی کے آغاز میں دو بااثر کتابوں کی اشاعت سے مکمل طور پر واضح ہو گئی۔ پہلی کتاب Barthelmy d' Herbelot نے Bibliotbeque orientale کے نام سے لکھی جسے انگلستان اور یورپ میں انیسویں صدی کے شروع تک اسلامی اور مشرقی علوم کے ریفرنس کے طور پر بے حد اہم اور مستند ذریعے کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کتاب کو اسلام کا پہلا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا گیا۔ D' Herbelot نے عربی، ترکی اور فارسی کے ماخذ استعمال کر کے اسلام کے متعلق عیسائیوں کے اندھے نقطہ نظر کو رد کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر اس نے مشرق میں گردش کرنے والی فرضی داستانوں کی متبادل کیفیات بیان کیں۔ یہ طرزِ عمل ایک مثبت اور صحت مند جذبے کا مظہر تھا البتہ مصنف نے ''محمدؐ'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عنوان کے تحت یہ افسوسناک ریمارکس دیے:

مکار اور اس بدعت و کفر کے مصنف اور بانی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جسے مذہب کا نام دے دیا گیا ہے اور جس کے پیروکاروں کو ہم محمڈن کہتے ہیں، اس کی تفصیلات اسلام کے عنوان کے تحت درج ہیں۔ قرآن کے مفسروں، مسلمانوں یا محمڈن فقہ کے علما نے اس جھوٹے پیغمبر (نعوذ باللہ... مترجم) کی اس طرح تعریف و توصیف کی ہے جس طرح آریوسیوں، مسیحؑ کے حواری پولوس، سینٹ پال کے پیروکاروں اور دوسرے بدعتیوں نے ربوبیت سے علیحدہ ہونے کو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا ہے۔

(Quoted in Edward W Said, Orientalism: Western Conception of the Orient. P. 66)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگرچہ D' Herbelot دینِ اسلام کے صحیح نام سے آگاہ تھا لیکن اس نے اسلام کے لیے ''محمڈن'' لکھا جس کی وجہ یہ ہے کہ ''ہم'' اسلام کے لیے یہی نام استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مسیحی دنیا پیغمبر اسلام ؐ کو ابھی تک اپنے مسخ شدہ انداز میں دیکھتی ہے اور ''ہمارا'' یہ طرزِ عمل نہایت عامیانہ اور گھٹیا ہے۔

اسی سال انگریز مستشرق Humphry Prideaux نے اپنی اہم کتاب Mahomet: The True Nature of Imposture لکھی۔ اس کتاب کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے قرون وسطیٰ کے پرانے تعصب کو نگل لیا تھا۔ اصل میں اس نے Riccoldo da Monte Croce کو اہم ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے اور گو اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرونِ وسطیٰ میں، جس میں جہالت اور اوہام پرستی کا دور دورہ تھا، اسلام کے معاملے میں زیادہ معقول اور روشن خیالی پر مبنی نقطہ نظر اختیار کیا ہے، عقلی استدلال کے علمبردار اس شخص نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اسلام نہ صرف عیسائیت کا چربہ ہے بلکہ یہ دین ضعفِ عقل اور پاگل پن کی واضح مثال ہے اور اگر مذہب کے معاملے میں عقل واستدلال سے کام نہ لیا گیا تو عیسائیت سمیت تمام مذاہب غرق ہو جائیں گے۔ یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا گیا کہ عقل اور منطق کے دور نے لوگوں کو صلیبی جنگوں کے زمانے کے مفلوج کن مذہبی تعصب سے نجات دلا دی ہے۔ ان دعووں کے باوجود Prideaux نے ماضی کے تمام وحشت ناک فرضی قصوں کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں اس نے لکھا ہے:

آپؐ نے زندگی کا پہلا حصہ اخلاقی قیود سے آزاد رہ کر مکاری سے بسر کیا جس میں وہ غارت گری، لوٹ مار اور خوں ریزی کرتے رہے (نعوذ باللہ... مترجم)۔ آپؐ کا یہ طرزِ عمل بیشتر عربوں میں رائج رسوم کے مطابق تھا۔ عرب ہمیشہ مسلح رہتے ہیں اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف جنگ وجدل کے ذریعے اس کی تمام املاک کو لوٹ لیتا ہے...

اقتدار کی ہوس اور نفس پرستی دونوں آپؐ کی اولیں ترجیح تھیں۔ آپؐ نے سلطنت حاصل کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا، اس سے پہلی اور عورتوں کی کثیر تعداد سے دوسری خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ اصل میں یہ دونوں خواہشات آپؐ کے دین کے پورے ڈھانچے میں رچی بسی ہیں۔ آپؐ کے قرآن میں شاید ہی کوئی ایسا باب ہو جس میں جنگ اور خوں ریزی کے بارے میں کوئی قانون درج نہ ہو۔ عورتوں کو ہوس پرستی کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے انہیں قدرے آزادی دے دی گئی ہے اور دینِ اسلام کے پیروکاروں کی دل جوئی کے لیے آخرت میں لطف وانبساط کے وعدے کیے گئے ہیں۔ (Humphry Prideaux: The True Nature of Imposture, Fully Displayed in the Life of Mahomet, London 1708, P.80)۔

لیکن اٹھارویں صدی کے دوران لوگ اسلام کے متعلق زیادہ صحیح اور مستند علم کو فروغ دینے کی کوششیں کرنے لگے۔ چنانچہ ۱۷۰۸ عیسوی میں سائمن اوکلے Simon Ockley نے جب History of Saracens کی پہلی جلد شائع کی تو اس کے بہت سے قارئین اسے پڑھ کر پریشان ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصنف نے اسلام کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تلوار کا دین قرار دینے کے نظریے کو مسترد کر دیا تھا اور ساتویں صدی کے جہاد کی مسلمانوں کے نقطہ نظر کے مطابق تشریح کی تھی۔ ۱۷۳۴ عیسوی میں جارج سیل George Sale نے قرآنِ حکیم کا انگریزی میں شاندار ترجمہ شائع کر دیا جسے قدرے پھیکا ہونے کے باوجود اب بھی سند کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۷۵۱ عیسوی میں وولٹیئر Voltaire نے Les Mocurs et. l' espirit des natious شائع کی جس میں اس نے نبی کریم کا دفاع کرتے ہوئے آپؐ کو ایک عظیم سیاسی مفکر اور ایک عقلیت پسند مذہب کا بانی قرار دیا۔ اس نے یہ عندیہ بھی دیا کہ مسلمانوں کی سلطنت میں عیسائیت کے مقابلے میں زیادہ رواداری کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے۔ ولندیزی مستشرق Johann Jakob Reiske (وفات ۱۷۷۴ء) عربی کا بے نظیر اسکالر تھا جس نے حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ اور اسلام کے ظہور میں ربانی وصف کار فرما دیکھا (البتہ اس کے بعض ساتھی اس کے پیچھے پڑ گئے) اٹھارویں صدی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک مدبر اور روشن خیال، اعتدال پسند قانون ساز شخصیت قرار دینے کی روایت چل نکلی۔ چنانچہ Henri, Comte de Boulain Villiers نے اپنی کتاب Vie de Mahomed (پیرس ۱۷۳۰ء لندن ۱۷۳۱ء) شائع کی جس میں پیغمبرِ اسلامؐ کو عقلی دور کے پیشرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ Boulain Villiers نے قرونِ وسطیٰ کے مورخوں کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا کو زیر کرنے کے لیے دینِ اسلام کو رائج کیا تھا البتہ اس نے اس پوری روایت کی ذمے داری قدیم مصنفوں پر ڈال دی۔ اس نے لکھا کہ عیسائیت کے برعکس اسلام وحی کے ذریعے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ ایک دینِ فطرت ہے اور اس کا یہ امتیازی وصف قابلِ تعریف ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جولیئس سیزر اور سکندرِ اعظم کی طرح ایک عظیم فوجی ہیرو تھے۔ یہ ایک اور خیالی صورت گری تھی کیونکہ آپؐ یقیناً توحید پرست تھے۔ اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نبی کریمؐ کو مثبت روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ایڈورڈ گبن Edward Gibbon نے The Decline and Fall of Roman Empire کے پچاسویں باب میں اسلام کے اس شاندار نظریہ توحید کی تحسین کی کہ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ گبن نے یقین ظاہر کیا کہ مسلمانوں کی اس پر خطر مہم جوئی کے اعتراف کے طور پر انہیں عالمی تہذیب کی تاریخ میں جائز مقام ملنا چاہیے۔

لیکن یورپ میں حضورؐ کے بارے میں تعصب کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو چکی تھیں کہ ان میں سے بیشتر مصنف اس کی مزاحمت نہ کر سکے اور وہ خود بھی اکثر و بیشتر آپؐ کی ذات پر بلاوجہ حملے کرتے رہتے جس سے اس بات کی غمازی ہوتی کہ پرانی روایات ابھی مردہ نہیں ہوئیں۔ چنانچہ سائمن اوکلے Simon Ockley نے نبی کریمؐ کو ایک چالاک اور عیار شخص قرار دے دیا (نعوذ باللہ۔ مترجم) جنہوں نے اپنے اچھے اوصاف کو ظاہر کیا لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصل میں وہ جاہ وحشمت کے جویا نفس پرست انسان تھے۔ (Daniel: Islam and the West P.297)۔ جارج سیل George sale نے قرآن کریم کے ترجمے کے دیباچے میں لکھا: ''یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ دین محض ایک انسانی اختراع ہے اور اس کی ترقی اور استحکام کا دارومدار صرف تلوار پر ہے'' (Islam and the West P.300)۔ وولٹیئر نے اپنے مضمون Les Moecurs کے آخر میں اسلام کا مثبت خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھا: ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک عظیم انسان تھے اور وہ لوگ جو آپ کو مکار اور دغاباز سمجھتے تھے، وہ بھی ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ کی عزت اور تکریم کرتے تھے''۔ (Islam and the West, P.290)۔ وولٹیئر نے ۱۷۴۱ عیسوی میں اپنے ڈرامے Mahomet or Fanaticism میں حضورؐ کے بارے میں تعصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نبی کریمؐ کو نبوت کے ان جھوٹے مدعیوں کی مثال قرار دیا جنہوں نے مکروفریب کی چالوں اور دروغ گوئی کے ذریعے اپنے لوگوں کو مذہب کا غلام بنالیا تھا۔ اس نے بعض پرانی روایات کو تو بدکلامی قرار دیا لیکن خود نہایت دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے فحش گوئی کی۔ خود گبن Gibbon کا یہ حال تھا کہ اس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے زیادہ وقت نہ نکالا اور یہ استدلال پیش کیا کہ آپؐ نے عربوں کو لوٹ مار اور جنس کی ترغیب دے کر اپنا پیروکار بنالیا تھا۔ جہاں تک قرآنِ حکیم کے وحی کے ذریعے نازل ہونے کے متعلق مسلمانوں کے عقیدے کا تعلق ہے، گبن نے نہایت متکبرانہ انداز میں یہ اعلان کیا کہ کوئی بھی مہذب شخص قرآن کے بارے میں مسلمانوں کے اس عقیدے کو ہرگز درست تسلیم نہیں کرسکتا۔ وہ لکھتا ہے:

ایک مخلص خداپرست عرب کے لیے، جس کا دل و دماغ ایمان اور وجدان کی موسیقیت سے لبریز ہے، جس کے کان خوش کن آوازوں کے سرود سے ہم آہنگ ہیں اور جس کی علمی ناواقفیت انسانی فہم وادراک کا موازنہ کرنے سے قاصر ہے، یہ دلیل نہایت طاقتور ہے۔ اسلوب کی ہم آہنگی اور افراط وفراوانی ایک ہی جست میں بے دین یورپی باشندے تک نہیں پہنچ پائے گی۔ وہ ان فرضی قصے کہانیوں، خدائی احکام اور جذباتی تقریروں کو بے صبری سے سنے گا جس سے جذبات کو شاذ ہی مہمیز ملتی ہے بلکہ بعض اوقات تو رینگ کر خاک کے پردے میں مستور اور کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے (The Decline and Fall of the Roman Empire PP. 657-58)۔

اس سے مغرب کے ایک نئے اعتماد کی جھلک نظر آتی ہے۔ اب یورپی باشندے اسلامی خطرے کے سامنے جھک نہیں رہے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے دین کو فروتر سمجھ کر یہ مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ ''اگر ہم قرآن کو سمجھ نہیں سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہیں ہے۔'' تھامس کارلائل Thomas Carlyle نے ۱۸۴۱ء میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اپنے لیکچر The Hero as Prophet میں قرآنِ حکیم کو حقارت سے مسترد کردیا (نعوذ باللہ... مترجم) البتہ اس لیکچر میں آنحضرتؐ کے بارے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرونِ وسطیٰ کی پرانی اساطیر کی تردید کی گئی۔ یورپ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی یورپی باشندہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حقیقی معنوں میں ایک مذہبی شخصیت کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا تھا تاہم کارلائل نے قرآن پاک کو دنیا کی سب سے بے کیف کتاب قرار دیتے ہوئے کہا: ''مختصر یہ کہ قرآن ایک ناگوار اور تکلیف دہ، پریشان خاطر، خام، کبھی ختم نہ ہونے والی تکرار، طویل پیچ وخم، دشوار گزار، حد درجہ خام اور حماقتوں کا مجموعہ ہے''۔ (On Hero and Hero-worship, London 1841, P. 63) ۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے یورپ میں ایک نئے اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین مشرقی علوم کے درجنوں اسکالروں کو لے کر بحری جہاز کے ذریعے مصر روانہ ہوگیا۔ اصل میں وہ اسلامی دنیا کو تسخیر اور ہندوستان میں برطانوی بالادستی کو چیلنج کرنے کے لیے تمام نئی علمی افہام وتفہیم کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ نپولین نے مصر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنے اسکالروں کو حقائق معلوم کرنے کا مشن سونپ دیا اور اپنے افسروں سے کہا کہ وہ ان کی ہدایات پر سختی سے عمل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے مشن کے لیے مکمل تیاری کر رکھی تھی۔ نپولین نے اسکندریہ میں مصریوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ترش روئی سے یہ دعویٰ کیا "Nous Sommes les vrais Musulmans" (اصل مسلمان تو ہم ہیں... مترجم)۔ اس کے بعد وہ قاہرہ کی جامعہ الازہر کے ساتھ شیوخ کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے آیا۔ اس نے محتاط انداز میں پیغمبر اسلامؐ کی تعریف کی اور علما کے ساتھ والٹیر کی کتاب Mahomet پر تبادلہ خیال کیا۔ کسی شخص نے نپولین پر بحیثیت مسلمان زیادہ سنجیدگی سے توجہ نہ دی البتہ اسلام کے بارے میں اس کی ہمدردانہ تفہیم سے لوگوں کے جارحانہ رویے میں قدرے کمی واقع ہوگئی۔ نپولین کی یہ مہم نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، برطانوی اور ترک افواج نے اسے شکست دے دی اور وہ ایک بحری جہاز کے ذریعے واپس یورپ روانہ ہوگیا۔

انیسویں صدی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس صدی میں نوآبادیاتی روح غالب آگئی جس کی بدولت یورپی باشندوں میں یہ غیر صحت مند عقیدہ فروغ پا گیا کہ وہ دوسری نسلوں کے مقابلے میں برتر ہیں اور یہ کہ Mission Civilisatrice کے تحت ایشیا اور افریقا کی وحشی اور غیر مہذب دنیا کو اخلاقی پستی سے نجات دلانا ان کا فرض ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے بارے میں مغربی نقطہ نظر تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ فرانس اور برطانیہ زوال پذیر سلطنتِ عثمانیہ کو حریصانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ مثال کے طور پر فرانس کے عیسائی مفکر Francis Penc de chateaubriand نے صلیبی جنگوں کے احیا کا نظریہ پیش کر دیا جو نئے حالات کے تقاضوں سے نمٹنے کی غرض سے وضع کیا گیا تھا۔ وہ نپولین کی مہم سے بہت متاثر تھا اور اسے صلیبی یاتری سمجھتا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ صلیبیوں نے عیسائیت کو مشرق میں لانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے لکھا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسائیت آزادی کے لیے سب سے موزوں مذہب ہے لیکن صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس کا ''اسلام کے ساتھ جو انسانی تہذیب کا دشمن، ایک منظم انداز میں جہالت، مطلق العنانیت اور غلامی کے موافق ہے، تصادم ہو گیا تھا۔'' (Quoted in Said: Orientalism P-172)۔ انقلاب فرانس کے بعد ''اسلام'' ایک مرتبہ پھر ''ہمارا'' مدِ مقابل بن گیا۔ کلیسا کے نظامِ مراتب کا ذہن رکھنے والے قرونِ وسطیٰ کے دوران اسلام کے بعض ناقدین نے رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام لگایا کہ آپؐ نے غلاموں اور عورتوں جیسے معاشرے کے پست طبقوں کو بہت زیادہ اختیارات دے دیے تھے۔ لیکن اب ان گھسے پٹے پرانے الزامات نے الٹ شکل اختیار کر لی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یورپ کو اسلام کا مکمل علم ہو گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نقطہ نظر ''ہماری ضروریات'' کے لیے موزوں اور ہمارے کارناموں کو ناپنے کا پیمانہ تھا۔

Chateaubriand نے اپنی بیسٹ سیلر کتاب Journey from Paris to Jerusalem and from Jerusalem to Paris (1810-11) میں عیسائیوں میں صلیبی جنگوں کے دوران پائے جانے والے جنون کو فلسطین کی صورت حال پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے لکھا:

''عربوں میں عسکری جذبہ موجود ہے لیکن ان کا کوئی لیڈر نہیں، ان کے شہری قانون ساز افراد سے محروم ہیں اور ان کی حالت ایسی ہے گویا باپ کے بغیر خاندان۔ ان کی مثال وحشی اور خونخوار کیفیت کی طرف دوبارہ لوٹنے والے مہذب انسان کی سی ہے۔'' (Orientalism P.172)۔

یہ عرب مغرب کے کنٹرول کے خلاف اس لیے شور شرابہ کر رہے ہیں کیونکہ اپنے معاملات کو چلانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ قرآن میں نہ تو ''تہذیب کے لیے کوئی اصول مقرر ہے اور نہ ہی کردار کی بلندی کے لیے کوئی منشور!'' عیسائیت کے برعکس ''اسلام میں نہ تو ظلم سے نفرت کی تبلیغ کی گئی ہے اور نہ ہی آزادی سے محبت کا درس دیا گیا ہے۔'' (Orientalism P. 171)۔

فرانس کے علم الانسان کے باا ثر ماہر ارنیسٹ رینان Earnest Renan نے ان نسلی اور سامراجی افسانوں کی سائنسی انداز میں صراحت کرنے کی کوشش کی اور یہ استدلال پیش کیا کہ عبرانی اور عربی کم رتبے کی زبانیں ہیں جن میں آریائی روایت سے انحراف کے باعث کئی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان سامی زبانوں میں ''ہمارے'' علم اللسنہ کے نظاموں کے ترقی کرنے کا جوہر موجود نہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہودی اور عرب دونوں نامکمل نسلیں ہیں:

ہم دیکھتے ہیں کہ سامی نسل سادگی کی بنا پر ہر لحاظ سے ایک ادھوری اور نامکمل قوم ہے۔ اس نسل کا... اگر میں تمثیل پسندی کو استعمال کرنے کی جسارت کرتا ہوں... اصل میں انڈو یورپین خاندان سے وہی تعلق ہے جو ایک پینسل اسکیچ کا پینٹنگ سے ہے۔ اس نسل میں وہ بوقلمونی، شان و شوکت اور زندگی کی فراوانی موجود نہیں جو کاملیت کی شرط ہے۔ ان افراد کی طرح، جن میں پرشکوہ بچپن گزارنے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف اوسط درجے کے مردانہ خصائص پیدا ہوتے ہیں، سامی قومیں بھی چونکہ اپنی ابتدائی زندگی میں مکمل بہار کا نظارہ دیکھ چکی ہیں، اس لیے ان میں حقیقی بلوغت پیدا نہیں ہو سکی۔(Orientalism P.147)۔

اس کے علاوہ رینان نے یہودیوں اور عربوں کی مجرد تصویر پیش کی ہے جس میں ''ہمارے اعلیٰ اوصاف'' کی خوشامدانہ صراحت موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی نسل پرستی سے یورپ میں آباد یہودیوں کے لیے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔ ہٹلر نے، جو یورپی اور آریائی سرزمین پر ایک بیرونی نسل کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، پرانے مسیحی انداز میں یہودیوں کے خلاف سیکولر صلیبی جنگ میں نفرت کا بھرپور اظہار کیا۔

یورپ میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی میں برطانیہ اور فرانس نے اسلامی ملکوں پر حملے شروع کر دیے۔ فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجزائر اور برطانیہ نے ۱۸۳۹ء میں عدن کو نوآبادی بنا لیا۔ درمیانی مدت میں ۱۸۸۱ء میں تیونس، ۱۸۸۲ء میں مصر، ۱۸۹۸ء میں سوڈان اور ۱۹۱۲ء میں لیبیا اور مراکش کو زیر کر لیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں گو انہوں نے عرب ملکوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ترکوں کی سلطنتِ عثمانیہ کو شکست دینے کے بعد انہیں آزاد کر دیا جائے گا، برطانیہ اور فرانس نے مشرقِ وسطیٰ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

آج عالمِ اسلام مغربی سامراجیت اور عیسائیوں کے مشنری کام کو صلیبی جنگوں سے منسلک کرتا ہے اور اس کا یہ موقف غلط نہیں ہے۔ جنرل ایلین بی Allenbi ۱۹۱۷ء میں جب بیت المقدس پہنچا تو اس نے یہ اعلان کیا کہ صلیبی جنگیں مکمل ہو گئی ہیں۔ اور جب فرانسیسی فوجیں دمشق پہنچیں تو ان کے سپہ سالار نے جامع مسجد میں صلاح الدین کے مزار پر پہنچ کر کہا: "Nous Revenons Saladin" (صلاح الدین! دیکھو ہم لوٹ آئے ہیں... مترجم)۔ مفتوحہ اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کے روایتی کلچر کو تباہ کرنے کے لیے عیسائیوں کے مشنری ادارے نوآبادکاروں کی امداد کرتے رہے اور لبنان کے مارونیوں جیسے عیسائی گروپوں کو مفتوحہ ملکوں کا انتظام چلانے کے لیے بے تحاشا اختیارات دے دیے گئے۔ نوآبادکار اس جبر و استبداد کا یہ جواز فراہم کرتے تھے کہ وہ ان ملکوں میں ترقی اور خوش حالی لا رہے ہیں۔ لیکن مفتوحہ اسلامی ملکوں کے باشندوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل تشدد اور اہانت پر مبنی تھا۔ مثال کے طور پر الجزائر میں مزاحمت پر قابو پانے میں کئی برس لگے اور انتقامی حملوں میں مسلمانوں پر نہایت سنگدلی سے ظلم و ستم کیا گیا۔ فرانس کے معاصر تاریخ دان ایم بادریکورٹ M. Baudricourt نے ایک حملے کی تفصیل ان لفظوں میں بیان کی ہے:

ہمارے فوجی عسکری مہم سے واپس آئے تو سخت شرمندہ تھے ... کوئی اٹھارہ ہزار درخت جلا دیے گئے تھے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیا گیا۔ فرانس کے فوجی بدنصیب خواتین کے کانوں، ٹانگوں اور بازوؤں کے نقرئی زیورات کو حریصانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ فرانسیسی بازو بند کی طرح ان زیورات میں کوئی گرفت نہیں ہوتی اور انہیں لڑکیوں کے اعضا پر کس کر باندھ دیا جاتا ہے۔ جب یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لڑکیاں جوان ہو جاتی ہیں تو یہ زیور جسم سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ یہ زیورات حاصل کرنے کے لیے ہمارے فوجی ان عورتوں کے اعضا کاٹ دیتے ہیں اور اس طرح انہیں زندگی بھر کے لیے اپاہج کر دیا جاتا ہے۔ (M. Baudricourt: La Guerre et Ic gouvernement de I' Algerie, Paris 1853, P.160)۔

یورپی نو آبادکاروں نے اسلام کے بارے میں بھی توہین آمیز رویے کا مظاہرہ کیا۔ مصر میں لارڈ کرومر Lord Cromer نے روشن خیال دانشور محمد عبدہٗ (وفات ۱۹۰۵ء) کی ان کوششوں کی تحقیر کی جو وہ اسلام کے بعض روایتی نظریات پر نظر ثانی کے لیے کر رہے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ اسلام میں اصلاحات ممکن نہیں اور یہ کہ عربوں میں اپنے معاشرے میں ایک نئی اخلاقی اور روحانی زندگی کی روح پھونکنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ کرومر نے اپنی دو جلدوں پر مشتمل تحکمانہ کتاب Modern Egypt میں جن خیالات کا اظہار کیا، وہ محض بچگانہ اور ''ہمارے'' نظریات کے خلاف تھے:

سر ایلفرڈ لائل Sir Alfred Lyall نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا: ''مشرقی دماغ درستی اور صحت سے ناآشنا ہے۔ ہر اینگلو انڈین کو ہمیشہ یہ کہاوت یاد رکھنی چاہیے'' درستی اور صحت کا فقدان مشرقی ذہن کی اہم خصوصیت ہے''۔ اس کے برعکس یورپی باشندے کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ عقل اور منطق کی بات کرتا ہے، حقائق کے بارے میں اس کے خیالات میں کوئی ابہام نہیں ہوتا اور وہ فطری طور پر منطقی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے منطق کا مطالعہ نہ کیا ہو، اس کے باوجود وہ فطرتاً شکی مزاج ہوتا ہے اور کسی بھی مفروضے کو درست ماننے سے پہلے اس کا ثبوت طلب کرتا ہے۔ اس کی تربیت یافتہ ذہانت کسی میکانکی پرزے کی طرح کام کرتی ہے۔ لیکن مشرقی باشندے کا دماغ اس کی خوشنما سڑکوں کی طرح ہے جن میں موزونیت کا زبردست فقدان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے استدلال میں بے پروائی اور پھوہڑپن بھی پایا جاتا ہے۔ قدیم عربوں نے اگرچہ علم الکلام میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا لیکن ان کی اولاد میں منطق کی خوبی موجود نہیں۔ سچائی اور حقیقت کا اعتراف کرنے کے ضمن میں بعض اوقات وہ کسی سادہ عنوان سے نتائج اخذ نہیں کر سکتے۔(Quoted in Said Orientalism P.38)۔

مغربی اسکالروں نے گو عرب اور عالم اسلام کی زیادہ معروضی تصویر پیش کرنے کی کوششیں جاری رکھیں البتہ اس نو آبادیاتی برتری کی بنا پر بہت سے لوگ یہ باور کرنے لگے کہ اسلام پر سنجیدگی سے تدبر کرنا ایک فروتر کام ہے۔

اسلام کے بارے میں مغرب کا جارحانہ رویہ عالم اسلام کو الگ تھلگ کرنے میں یقیناً کامیاب ہو گیا۔ آج عالم اسلام میں بھی مغرب دشمنی کے جذبات غالب آ گئے ہیں لیکن یہ ایک نئی پیش رفت ہے۔ مغرب آنحضرتؐ کو اپنا دشمن سمجھتا چلا آ رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان صرف دو سو سال پہلے تک مغرب کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ صلیبی جنگوں کو یورپ کی تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اور جیسا کہ میں نے کسی جگہ یہ ذکر کیا ہے، یہ جنگیں مغرب کے تشخص اور ساخت پر اثرانداز ہوئی ہیں۔ (Holy war: The Crausdes and Their

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Impact on Today's world۔ صلیبی جنگوں نے اگرچہ مشرق قریب کے مسلمانوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے لیکن باقی عالمِ اسلام پران کا کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ یہ جنگیں ان کی سرحدوں سے دور دراز مقامات پرلڑی گئی تھیں۔عراق اور ایران کی اسلامی سلطنت کے مرکزی اور اہم علاقے قرونِ وسطیٰ میں مغربی حملوں سے مکمل طور پر محفوظ رہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں مغرب کو اپنا دشمن نہیں سمجھا جاتا تھا۔مسلمان جب مسیحی دنیا کے بارے میں سوچتے تو ان کے ذہن میں مغرب کا نہیں، بازنطینی سلطنت کا تصور اجاگر ہوتا۔اس زمانے میں مغربی یورپ وحشی، بت پرست، اجاڑ اور ویران اور باقی مہذب دنیا سے بہت پیچھے تھا۔

مسلم دنیا اپنے معاملوں میں مصروف تھی اس لیے وہ یورپ میں رونما ہونے والے واقعات پر توجہ نہ دے سکی۔مصر کے لیے نپولین کی مہم سے مشرق قریب میں غور وفکر کرنے کے عادی بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ انقلاب کے بعد فرانس کے پراعتماد فوجیوں سے بہت متاثر ہوئے۔مسلمان دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کے تصورات سے ہمیشہ متاثر ہوئے ہیں چنانچہ بہت سے مسلمان مغرب کے جدید انقلابی نظریات کو قبول کرنے لگے۔ عالمِ اسلام میں تقریباً ہر نامور دانشور، آزاد خیال اور مغربی طرزِ معاشرت کا حامی تھا۔ممکن ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک لبرل دانشور مغربی سامراجیت سے نفرت کرتے ہوں لیکن ان کا خیال تھا کہ یورپ کے لبرل باشندے ان کی حمایت اور لارڈ کرومر جیسے لوگوں کی مخالفت کریں گے۔وہ مغربی طرزِ زندگی کے معیار کی تعریف کرتے تھے جس میں کئی اسلامی روایات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔لیکن پچھلے پچاس برسوں میں ہم مسلمانوں کے اس جذبہ خیر سگالی سے محروم ہو گئے ہیں۔عالمِ اسلام کی اجنبیت اور بیگانگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبرؐ اور دینِ اسلام کے بارے میں یورپ کے اس جارحانہ اور توہین آمیز رویے کا بتدریج سراغ لگا لیا ہے جو مغربی کلچر کی جڑوں میں دور تک سرایت کر چکا ہے اور نو آبادیاتی دور کے بعد بھی اسلامی ملکوں کے متعلق یورپی پالیسی پر بدستور اثر انداز ہو رہا ہے۔

شام کی مصنفہ رعنا کبانی نے Letter to Christendom میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: کیا مغرب کا ضمیر ذاتی پسند اور ناپسند پر کاربند نہیں؟ مغرب نکاراگوا کے کنٹرا باغیوں کی طرح امریکی انٹیلی جنس کے حمایت یافتہ افغان مجاہدین کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے لیکن اسے ان جنگجو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں جو سرد جنگ کے لیے نہیں، اپنے سیاسی مسئلوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔جس وقت میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں، مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی ہر روز شہید ہو رہے ہیں۔حالیہ اعداد وشمار کے مطابق اب تک چھ سو فلسطینی شہید، تین ہزار زخمی اور بیس ہزار بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں بند ہیں.... اس کے باوجود مغرب کی نظروں میں اسرائیل ایک جمہوریت اور مغربی تہذیب کی سرحدی چوکی ہے۔اس دہرے معیار کے بارے میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟

(Rana Kabbani: Letter to Christendom P. 54)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغرب کو عالمِ اسلام میں رونما ہونے والے اس انقلاب کی ذمے داری قبول کرنی چاہیے جو وحشت اور ہولناکی کے اعتبار سے ہمارے قدیم فرضی تصورات سے بہت قریب ہے۔ آج عالمِ اسلام کے بہت سے لوگ مغرب کو بداعمال، ظالم اور انحطاط پذیر قرار دیتے ہیں۔ میکسم روڈنسن Maxime Rodinson، نکی آر کیڈی Nikki R. Keddie، Roy Mottahedeh اور گلز کیپل Gills Kepel جیسے بعض مغربی اسکالرز اس نئے اسلامی موڈ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اسلامی دنیا کے موجودہ بحران کے بارے میں زیادہ معروضی اور ہمدردانہ ادراک حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر حسبِ معمول صرف چند لوگ ہی توجہ دے رہے ہیں۔ دوسری جانب اسلام دشمنی کی حمایت میں اٹھنے والی آوازوں کا رویہ زیادہ جارحانہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ افہام و تفہیم کے بجائے نفرت کی پرانی روایت کو آگے بڑھانے کی خواہش مند ہیں۔

نئے انقلابی اسلام کو صرف مغرب کی نفرت سے مہمیز نہیں ملی، نہ ہی یہ کسی ایک نسل کی تحریک ہے۔ انقلابی مسلمان بنیادی طور پر اپنے گھر کا نظم و نسق درست کرنا اور جدید دور میں اپنی تہذیب و ثقافت کو حقیقی مقام پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام میں شدت پسندی کے اس رجحان میں اضافے کے اسباب معلوم کرنے کے لیے عام قواعد کا استنباط کرنا ممکن نہیں۔ تشدد کی یہ صورت نہ صرف ہر ملک بلکہ ہر قصبے اور ہر گاؤں کی سطح پر جدا جدا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی جڑیں کٹ گئی ہیں، مغربی تہذیب ان کی زندگیوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے یہاں تک کہ ان کے گھروں کے فرنیچر میں بھی نمایاں تبدیلی آ گئی ہے جو ان پر غلبے اور ثقافتی نقصان کی پریشان کن علامت ہے۔ بیشتر مسلمان اپنی اصلیت کی طرف لوٹ کر اپنا کھویا ہوا وہ تشخص بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ لیکن ہر علاقے میں اسلام کی ساخت اور مزاج مختلف ہے اور مقامی روایات اور حالات، جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، اسلام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ Michael Gilsenan نے اپنی کلاسیکل کتاب Recognizing Islam, Religion and Society in the Middle East میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ ایک سے دوسرے ضلعے میں تضادات اس قدر زیادہ ہیں کہ نوآبادیاتی دور کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کے بارے میں مشاہدے کی گرہ کشائی کی موجودہ کوششوں کی تشریح کے ضمن میں اسلام یا ''بنیاد پرستی'' کی اصطلاح سودمند ثابت نہیں ہوسکتی۔ انسانی عقل و فہم سے بالاتر یہ صورتِ حال میڈیا میں پیش کی جانے والی تصویر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ جس طرح قرطبہ کے ''شہیدوں'' نے یہ محسوس کیا تھا کہ ایک بیرونی طاقت ان کی ثقافتی اور روایتی اقدار کو پامال کر رہی ہے، ٹھیک اسی طرح مسلمان بھی اپنا تشخص کھونے پر مختلف اندیشوں اور خوف میں مبتلا ہیں۔

اسلام سے نفرت کے اظہار کے لیے ہم مسلسل افسانہ طرازیوں میں مصروف ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم تیل کی دولت سے مالا مال شیخ اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں متعصب آیت اللہ کے خوف میں مبتلا تھے۔ سلمان رشدی کے معاملے کے بعد اسلام کو ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جس میں تخلیقی صلاحیت اور فنونِ لطیفہ کی آزادی کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کے بارے میں ان میں سے کوئی بھی تصویر اس کی صحیح عکاسی نہیں کرتی کیونکہ یہ ایک حد درجہ پیچیدہ دین ہے۔ اس کے باوجود لوگ اسلام کے متعلق تند و تیز اور غلط فیصلے کرنے سے باز نہیں آتے۔ رعنا کبانی نے اس ضمن میں فے ویلڈن Fay Welden اور کونر کروز او برائن Conor Cruise O' Brien کے دو جارحانہ ریمارکس کا حوالہ دیا ہے۔ Sacred Cow میں رشدی کے حوالے سے بحث کے دوران ویلڈن نے لکھا ہے:

قرآن میں فکری بالیدگی کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یہ کوئی نظم نہیں جس پر دانش مندی سے محفوظ بنیاد پر معاشرے کی بنیاد استوار کی جا سکے۔ یہ کتاب نظم و ضبط برقرار رکھنے کے ذمے دار حکام کو ہتھیار اور طاقت مہیا کرتی ہے جس کی مدد سے یہ اہلکار لوگوں پر چڑھ دوڑتے اور انہیں خوف زدہ کرتے ہیں... خدا کی تشریح کے حوالے سے یہ کتاب مختلف اندیشوں کو جنم دیتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک محدود عبارت ہے۔ (Fay Weldon: Sacred Cow PP. 6,12)۔

میں تو یہی کہوں گی کہ یہ ریمارکس قرآنِ حکیم اور تاریخِ اسلام کے مطالعے کے سلسلے میں میرے ذاتی مشاہدے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن کونر کروز او برائن، جو اسلام کے بارے میں احترام کے جذبات رکھنے کو انحراف سمجھتا ہے، مجھے ریاکار اور منافق کہتا ہے۔ مسلم معاشرے کے متعلق اس نے لکھا ہے:

یہ معاشرہ گھناؤنا اور نفرت انگیز ہے... یہ معاشرہ اس لیے قابلِ نفرت ہے کیونکہ وہ ہے ہی قابلِ نفرت ... ایک مغربی باشندہ، جو مغربی اقدار پر کاربند رہتے ہوئے مسلم معاشرے کی تعریف کرتا ہے، وہ منافق یا جاہل ہے یا اس میں بیک وقت دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

او برائن نے اپنے آرٹیکل کے آخر میں لکھا ہے: ''عرب معاشرہ بیمار ہے اور اسے طویل عرصے سے یہ مرض لاحق ہے۔ عرب مفکر جمال الدین افغانی نے انیسوی صدی میں لکھا تھا: ہر مسلمان مریض ہے اور اس کا واحد علاج قرآن ہے۔ بدقسمتی سے جوں جوں مرض بڑھتا جا رہا ہے، اسی قدر زیادہ اس کا علاج کیا جا رہا ہے''۔ (Cruise O' Brien: The Times, 11 May, 1989)۔

لیکن تمام یورپی اسکالرز صلیبی جنگوں کے خطوط پر نہیں سوچتے۔ خود ہماری صدی میں بہت سے اسکالرز اسلام کے متعلق مغربی افہام و تفہیم کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جن میں قابلِ ذکر نام یہ ہیں:

H. A. R.Gibb, Louis Massignon, Marshal G. S. Hodgson, Dr. Schimmel, Henri Corbin

اور Wilfred Cantwell Smith۔ ان دانشوروں نے پیٹر دی ولنریبل اور جان آف سیگو ویا جیسے لوگوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی علمی استعداد کے ذریعے اپنے اپنے عہد کے تعصب کو چیلنج کیا ہے۔ مذہب نے صدیوں سے ہر معاشرے کے افراد کو سنجیدہ غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اپنے مذہبی تصورات کے اظہار میں اس طرح کامیاب نہ ہوں جس طرح انہیں کامیاب ہونا چاہیے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اعلیٰ مذہبی افکار نے ہمیشہ دوسروں کے لیے عدل وانصاف، کریم النفسی، احترام، محبت اور خدا ترسی کے جذبات کو ابھارا ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے کردار کو ناپ سکتے ہیں۔ اسلام کے سنجیدہ مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم چودہ سو سال سے مسلمانوں کی روحانی بالیدگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتا چلا آ رہا ہے۔ کینیڈا کے نامور اسکالر ویلفریڈ کینٹ ویل اسمتھ جیسے مصنف تو اس معاملے میں اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ انہوں نے لکھا ہے: ''انسانی معاشرے کا مسلمان طبقہ صرف اسی صورت میں آسودگی حاصل کر سکتا ہے کہ اسلام طاقتور، قوتِ حیات کا مرکز، خالص، تخلیقی اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو''۔ (Islam in Modern History PP. 304-5)۔ مغرب کا جزوی مسئلہ یہ ہے کہ یورپ میں صدیوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مذہبی روح کا مخالف اور شائستہ تہذیب کا دشمن سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم آپ ؐ کی شخصیت کو عزم واستقلال کا پیکر سمجھیں جنہوں نے اقوامِ عالم کو امن اور تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا باب

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسولؐ

۶۱۰ عیسوی میں رمضان کے مہینے میں حجاز کے شہر مکہ کے ایک عرب تاجر کو ایک ایسا مشاہدہ ہوا (وحی ... مترجم) جس نے دنیا کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابن عبداللہ روحانی بالیدگی کے لیے اپنی اہلیہ اور خاندان کے ہمراہ ہر سال وادی مکہ میں واقع کوہِ حرا کی ایک غار میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتے۔ اس زمانے میں جزیرہ نما عرب میں یہ عام دستور تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رمضان کے مقدس مہینے میں عبادت کرتے اور اپنے ہاں آنے والے غریبوں میں خیرات اور کھانا تقسیم کرتے۔ اس نوکدار اور ناہموار پہاڑ کی چوٹی سے مکہ کا خوش حال اور پھلتا پھولتا شہر نشیبی میدان میں صاف دکھائی دیتا۔ مکہ کے تمام باشندوں کی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی اپنے شہر پر بڑا فخر تھا جسے پورے عرب میں تجارت کے مرکز اور طاقتور بستی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مکہ کے تاجر حجاز کے کسی بھی عرب باشندے کے مقابلے میں سب سے زیادہ دولت مند تھے۔ انہیں وہ مکمل تحفظ اور اطمینان حاصل تھا جس کا دو نسل پیشتر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جب وہ عرب کے لق و دق صحرا میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اہلِ مکہ کو شہر کے وسط میں واقع مکعب نما مقدس عمارت پر بے حد ناز تھا جسے بیشتر لوگ اللہ کا گھر سمجھتے تھے۔ جزیرہ نما عرب میں یہ سب سے اہم عمارت تھی اور عرب کے تمام حصوں سے عازمین ہر سال یہاں آ کر حج کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کا قبیلہ قریش مکہ کی تجارتی کامیابی کا ذمے دار تھا اور اس قبیلے کے لوگ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ دوسرے عرب قبیلوں میں ان کی عزت اور وقار اس وجہ سے قائم ہے کیونکہ وہ گرینائٹ کی اس عمارت کے تقدس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے محافظ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

بعض عربوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ، جس کے نام کا سادہ مطلب ''خدا'' ہے، وہ مقدس ذات ہے جس کی یہودی اور عیسائی بھی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن یہودیت اور عیسائیت کے برعکس، جنہیں عرب مقدس الہامی مذہب سمجھتے تھے، عرب باشندے اس تکلیف دہ حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ اللہ نے ان کی طرف کوئی وحی یا آسمانی صحیفہ نہیں بھیجا حالانکہ ان کے درمیان ایک نامعلوم زمانے سے خانہ کعبہ موجود ہے۔ جن عربوں کا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رابطہ ہوتا، وہ حد درجہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے اور یوں لگتا تھا جیسے خدا نے عربوں کو اپنے متبرک آسمانی منصوبے میں شامل ہی نہیں کیا۔ لیکن رمضان المبارک کی سترہویں شب کو اس وقت، جب کسی نے غارِ حرا میں نبی کریمؐ کو نیند سے بیدار کر دیا اور آپؐ کو خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے کی موجودگی کا احساس ہوا تو صورتِ حال اچانک تبدیل ہوگئی۔ بعد میں حضورؐ نے اس ناقابلِ بیان مشاہدے کے بارے میں بتایا کہ ایک فرشتے نے آپؐ کو گلے سے لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ آپؐ نے یہ محسوس کیا جیسے آپؐ کے جسم سے جان نکل رہی ہے۔ اس فرشتے نے روکھے پن کے ساتھ آپؐ کو حکم دیا: ''اقرا! پڑھیے'' آنحضرتؐ نے احتجاجاً فرمایا کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ میں کاہن یا عربوں کا وجد آور پیغمبر نہیں ہوں۔ لیکن فرشتے پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے آپؐ کو دوبارہ گلے لگایا اور اتنے زور سے بھینچا کہ حضورؐ کو یہ محسوس ہوا کہ آپؐ کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ کے دہنِ مبارک سے وحی کے الفاظ خود بخود ادا ہونے لگے۔ عرب کی سرزمین پر خدا کی طرف سے اترنے والی یہ پہلی وحی تھی۔ آخر خدا عربوں کے ساتھ خود ان کی زبان میں مخاطب ہوگیا۔ وحی الٰہی پر مبنی اس مقدس کتاب کو قرآن یعنی الہامی کلام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس عجیب و غریب تجربے کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب مکہ میں اسلام کی تبلیغ شروع کی، اس وقت پورا عرب شدید خلفشار اور نااتفاقی کا شکار تھا۔ عرب کے بے شمار خانہ بدوش قبیلوں میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے ساتھ مسلسل حالتِ جنگ میں رہتا۔ عربوں کے لیے متحد ہونا ناممکن تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی ایسی تہذیب اور نظامِ حکومت کی بنیاد رکھنے کے قابل نہیں تھے جس کی بدولت انہیں دنیا میں کوئی مقام حاصل ہو سکے۔ ایسا لگتا تھا کہ تباہی، بربادی اور سفاکانہ بربریت حجاز کا مقدر بن گیا ہے اور تہذیب اور شائستگی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ۲۳ سال بعد، ۸ جون ۶۳۲ عیسوی کو جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو وہ تقریباً تمام قبیلوں کو مسلمانوں کی نئی برادری میں شامل کر چکے تھے۔ یہ درست ہے کہ یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اچھی طرح جانتے تھے کہ کئی خانہ بدوش بدو قبیلے چوری چھپے بت پرستی کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں لیکن آپؐ نے تمام رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود عربوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اتحاد کو برقرار رکھا۔ نبی کریمؐ کو اعلیٰ درجے کی سیاسی استعداد اور بصیرت ودیعت کی گئی تھی، آپؐ نے اپنی قوم کے حالات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا، اسے بے مقصد تشدد اور انتشار سے بچایا اور اسے ایک نیا اور قابل فخر تشخص دیا۔ اس قوم نے اب ایک بے مثل تہذیب کی بنیاد رکھ لی تھی۔ عربوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کی بدولت اپنی مخفی طاقت کو اس انداز سے استعمال کیا کہ ایک سو سال کے اندر عربوں کی سلطنت جبرالٹر سے لے کر ہمالہ تک پھیل گئی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر صرف یہی عظیم سیاسی کارنامہ انجام دیتے تو بھی وہ ہماری داد وتحسین کے مستحق ہیں۔ لیکن آپؐ کی کامیابی کا حقیقی دارومدار اس مذہبی بصیرت پر ہے جو آپؐ نے عربوں میں پیدا کی اور جسے اسلامی سلطنت کی محکوم قوموں نے پوری مستعدی اور شوق کے ساتھ اپنایا۔ یہ روحانی ضرورت پوری ہونے کے بعد عربوں کے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب برپا ہوگیا۔ عام خیال کے برعکس آنحضرتؐ اور آپؐ کے ابتدائی پیروکاروں نے یہ فتح اور کامرانی کوئی آسانی کے ساتھ حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے لیے انہیں ایک دشوار گزار، پرخطر اور جاں گسل جدوجہد کرنا پڑی اور اگر پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے قریبی ساتھی دین کو دنیا کی تمام چیزوں پر فوقیت نہ دیتے تو ان کی بقا اور وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ ان خطرناک برسوں میں حضورؐ اس کامل یقین سے سرشار رہے کہ آپؐ کو خدا سے براہِ راست روحانی فیضان ملتا ہے البتہ آپؐ نے وحی والہام کے علاوہ ہر اس فطری جوہر کو استعمال کیا جو آپؐ کو خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو اپنے پیغمبرؐ کی اس بے پایاں استعداد کا مکمل ادراک تھا اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ آپؐ نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے۔

چنانچہ کلاسیکل اسلامی دور میں ان چار بڑے مورخوں نے آپؐ کی سیرت لکھی: محمد ابنِ اسحاق (وفات ۷۶۷ء)، محمد ابنِ سعد (وفات ۸۴۵ء)، ابوجعفر الطبری (وفات ۹۲۳ء) اور محمد ابنِ عمر الواقدی (وفات ۸۲۰ء)۔ ان مورخوں نے آنحضرتؐ کی عسکری مہموں پر زیادہ توجہ دی۔ پیغمبر اسلامؐ کی حیاتِ مقدسہ کے یہ اہم ماخذ ہیں اور میں اس کتاب میں مسلسل ان کے حوالے دوں گی۔ ان مورخوں نے صرف اپنے نظریات پر انحصار نہ کیا بلکہ انہوں نے تاریخی تشکیلِ نو کے سلسلے میں نہایت عرق ریزی سے کام لیا۔ انہوں نے نہ صرف تحریری دستاویزات بلکہ احادیث اور روایات کے اصل ماخذوں سے استفادہ کیا ہے اور اگرچہ وہ ایک پیغمبر اور خدا کے بندے کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے، اس کے باوجود انہوں نے آپؐ کی سیرت کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ چنانچہ طبری نے اس قصے کو بھی ریکارڈ کیا ہے جسے اب رسوائے زمانہ کتاب The Satanic Verses کا موضوع بنایا گیا ہے اور جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ حضورؐ سے ایک مرتبہ غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ محمد ابنِ سعد اور محمد ابنِ اسحاق دونوں نے اپنی سیرت کی کتابوں میں کئی ایسی روایات اور کہانیاں شامل کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں جو صرف تعریف و توصیف پر مبنی نہیں۔ آنحضرت ؐ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو ایک صاف گو اور بے باک خاتون تھیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں ان کے تیز تبصروں کو بھی نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے۔ سیرت کی ان کتابوں سے، جو اپنے موضوع کے معیار کے اعتبار سے بلند مرتبت ہیں اور جن میں آپ ؐ کی زندگی کے کسی پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی، آپ ؐ کی نابغہ روزگار شخصیت کا قابلِ تحسین اور حقیقت پسندانہ مرقع ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ان ابتدائی سیرت نگاروں نے اس انداز اور اسلوب سے سیرت نہیں لکھی جو جدید مغربی مورخوں کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے اپنے عہد کے لوگ تھے جو اکثر و بیشتر معجزانہ نوعیت کے ایسے قصوں کو بیان کر دیتے تھے جن کی آج مختلف انداز میں تشریح کی جاتی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے مواد کی پیچیدگی اور عقل و فہم کو گرداب میں ڈالنے کی نوعیت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ہم دیکھیں گے کہ مسلمان روحانی اعتبار سے اس عقیدے پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان برابر اور حقوق و مواقع کے حوالے سے یکساں سلوک کے مستحق ہیں۔ اسلامی آرٹ کی عرب گل کاری کے نمونوں میں بھی کسی ایک چیز کو اس کے ظاہری تناسب اور تصویر کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس آرٹ میں کسی تصویر کا مجموعی تناظر اور مساوی حصوں میں موجود مبہم تعلق کی بنا پر تاثر قائم کیا جاتا ہے۔ ہمارے ان چاروں مورخوں میں بھی مساوات کی یہی روح کارفرما ہے۔ عام طور پر وہ کسی ایک کے نظریے یا تشریح کو دوسروں کے نظریے یا تشریح پر ترجیح نہیں دیتے۔ بعض اوقات وہ ایک ہی واقعے کے دو بالکل مختلف اور متضاد رُخ ایک ساتھ پیش کر دیتے ہیں اور ان نقطہ ہائے نظر میں پائے جانے والے اختلاف کی وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھیں گے کہ طبری نے شیطانی آیات کے قصے کی دو الگ الگ سرگزشتیں بیان کی ہیں جب کہ محمد ابنِ اسحاق نے عمرؓ ابنِ خطاب کے قبولِ اسلام کے واقعے کے بارے میں یکے بعد دیگرے دو الگ الگ راویوں کے بیان قلمبند کیے ہیں اور اس تضاد پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ ان دونوں معاملوں میں مورخوں نے نہایت دیانت کے ساتھ اپنے اپنے راویوں کے نام درج کر دیے ہیں حالانکہ ان راویوں کی کڑی (سلسلہ) جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ یہ سیرت نگار اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر واقعے کے ہر راوی کے بیان کو برابر وزن دیتے ہیں۔ وہ اپنی کتابوں میں درج تمام احادیث سے بھی اتفاق نہیں کرتے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے ساتھ دلی عقیدت کے باوجود یہ مورخ، آپؐ کی سیرت کے واقعات کو، جس قدر ان کے بس میں تھا، پوری ایمانداری اور راستبازی کے ساتھ من و عن بیان کر دیتے ہیں۔

ان مورخوں نے سیرت کے جو واقعات لکھے ہیں، ان میں کئی خلا موجود ہیں۔ ہمیں آنحضرتؐ پر چالیس سال کی عمر میں وحی نازل ہونے سے پہلے آپ ؐ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں عملی طور پر کچھ معلوم نہیں البتہ حضورؐ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدائش، بچپن اور جوانی کے متعلق مقدس روایات کا ظہور ایک ناگزیر عمل تھا اس لیے یہ حالات قلمبند کر لیے گئے۔ لیکن ہمیں اس ضمن میں کسی ٹھوس بات کا علم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مکہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد آپؐ کے ابتدائی پیغمبرانہ کیرئر کے بارے میں بھی بہت کم مواد دستیاب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جب آپؐ نسبتاً ایک غیر معروف شخصیت تھے، کسی شخص نے آپؐ کے مشن پر مبنی واقعات کو ریکارڈ نہ کیا۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینہ میں آخری دس سالہ قیام کے دوران مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تاریخ بن رہی ہے چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ کے حالات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ محفوظ کر لیا۔

تاریخ دانوں نے آپؐ کی زبانی احادیث کو صحابہ کرامؓ اور بعد میں آنے والی نسلوں کے ذریعے اخذ کیا۔ نویں صدی عیسوی میں محمد ابنِ اسماعیل البخاری اور مسلم ابنِ الحجاج القشیری جیسے اسکالروں نے احادیث کی قابلِ اعتماد ذرائع سے تصدیق کو یقینی بنانے کے لیے ہر حدیث کے راوی کے حسب ونسب کی نہایت عرق ریزی کے ساتھ جانچ پڑتال کی اور جس حدیث کے راویوں کا سلسلہ پریشان کن خلا یا راویوں کی مشکوک مذہبی شہرت کی بنا پر نا قابلِ اعتماد پایا جاتا، اس حدیث کو، خواہ وہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے کتنی ہی بلند مرتبت اور نبی کریمؐ اور ابتدائی مسلمانوں کی تعریف وتوصیف سے کتنی ہی لبریز کیوں نہ ہو، ان عظیم مجموعوں میں سے نہایت بے دردی کے ساتھ خارج کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، یہ احادیث اسلامی قانونِ شریعت کا سب سے بڑا ماخذ بن گئیں۔ ان احادیث کی تدوین اور از سرِ نو ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنی ابتدائی تاریخ کے ضمن میں تنقیدی طرزِ عمل اختیار کرنے کی استعداد موجود تھی۔ ابتدائی مورخوں کے رویے سے بھی مسلمانوں کے اس معروضی اندازِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ سیرت نگار مورخ اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں تمام محفوظ حدیثوں کو مستند یا درست نہیں سمجھتیں۔

ہماری معلومات کا سب سے بڑا سرچشمہ خود قرآنِ کریم ہے۔ اگرچہ قرآن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت اور سوانح حیات درج نہیں اور اس میں پیغمبر اسلامؐ کے بجائے خالقِ کائنات کا زیادہ تذکرہ کیا گیا ہے البتہ قرآن میں بالواسطہ طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ کے حوالے سے گراں قدر مواد دستیاب ہے۔ مغرب کے لوگوں کے نزدیک قرآنِ مجید ایک دقیق اور مشکل کتاب ہے اور اگلے ابواب میں میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھوں گی۔ لیکن یہاں صرف یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس مقدس الہامی کتاب کا آغاز کیسے ہوا اور ہمیں کس نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعویٰ تھا کہ آپؐ کو مسلسل ۲۳ برس تک براہِ راست خدا کا پیغام ملتا رہا۔ اب ان تمام سورتوں کو یکجا کر کے قرآن کی موجودہ شکل دے دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید تورات اور احکامِ عشریہ کی طرح، جو انجیل کے مطابق کوہِ سینا پر موسیٰ علیہ السلام پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ہی مرتبہ نازل ہوئے تھے، نبی کریمؐ پر ایک ہی وقت میں مکمل صورت میں آسمان سے نازل نہیں ہوا بلکہ اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک آیت اور ایک ایک سورت پورے ۲۳ برسوں میں حضورؐ پر نازل ہوئی تھی۔ قرآنِ کریم میں آنحضرتؐ کے نکتہ چینوں کی طرف سے اٹھائے گئے سوالوں کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات کسی جنگ کی اہمیت یا مسلمانوں کی صفوں میں پائے جانے والے کسی تنازعے کی وضاحت کی گئی ہے۔ چونکہ کوئی بھی نیا پیغامِ ربانی وحی کی صورت میں حضورؐ پر نازل ہوتا (جو دوسرے عربوں کی طرح ناخواندہ تھے) تو اس کے بعد آپؐ اس وحی کو بلند آواز سے پڑھتے اور مسلمان اسے حفظ کر لیتے اور جو لوگ لکھنا جانتے تھے، وہ اسے لکھ لیتے۔ عرب قرآن پر ششدر تھے کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے جس ادب کا مطالعہ کیا تھا، قرآن اس سے بہت مختلف تھا۔ قرآن کو سن کر، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، کئی لوگ فوراً مسلمان ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ صرف وحی الٰہی ہی اس غیر معمولی زبان میں نازل ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، وہ حواس باختہ ہو گئے اور یہ معلوم نہ کر سکے کہ اس پریشان کن وحی کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ مسلمان قرآنِ پاک کو اب بھی انتہائی دل گداز اور رقت انگیز کلام سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جب وہ قرآن کو سنتے ہیں تو اس الہامی کلام کی اثر پذیری اور آواز سے ان پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہونے اور فرشتے (جبرائیل ... مترجم) کی طرف سے پوری قوت کے ساتھ حضورؐ کو بھینچنے کے وقت یا بعد میں جب آپؐ جس طرف دیکھتے، اس مافوق الفطرت ہستی نے پورے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا، وہی کیفیت ان پر بھی چھا جاتی ہے۔

مغرب کے لوگ اس کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گبن Gibbon اور کارلائل Carlyle جیسے افراد بھی، جنہیں اسلام سے گہری ہمدردی تھی، قرآن سے مات کھا گئے تھے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔ یہاں پہلی مرتبہ مغرب کا دورہ کرنے والے چند جاپانی سیاحوں کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ ان لوگوں کو انگریزی زبان پر مکمل عبور تھا اور وہ جن ملکوں میں بھی جاتے، وہاں رائج مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مقام پر بیٹھ کر انجیل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بائبل پڑھنے سے ان کے دماغ مختل ہو گئے اور جب یہ لوگ امریکا پہنچے تو انہوں نے ایک ممتاز اسکالر سے اپنی مشکلات بیان کیں۔ وہ عمر بھر ثابت قدمی کے ساتھ انجیل کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن انہیں اس کتاب میں کوئی مذہب نظر نہ آیا۔ امریکی اسکالر نے بائبل کے مطالعے کے سلسلے میں ان سیاحوں کی مشکلات کو سن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اس بات سے اتفاق کیا کہ جب تک ایک مخصوص موڈ اور ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر انجیل کا مطالعہ نہ کیا جائے، اس وقت تک اس میں کوئی مذہبی تفہیم پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہی قدیم یہودیوں کی تاریخ کا ادراک ہو سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآنِ کریم کے مطالعے کے ضمن میں ترجمے کا مسئلہ بھی پیش آتا ہے۔ اگر شیکسپیر Shakespeare کی سب سے خوبصورت شاعری کا کسی اور زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اس میں وہ حسن اور رعنائی برقرار نہیں رہتی اور وہ عامیانہ شاعری نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کو کسی غیر ملکی زبان میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے اور عربی وہ زبان ہے جس کا ترجمہ کرنا خاص طور پر بہت ہی مشکل کام ہے۔ خود عربوں کا کہنا ہے کہ جب وہ عربی کی نظموں یا افسانوں کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ پڑھتے ہیں تو وہ اسے پہچان نہیں پاتے۔ عربی زبان کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اسے کسی غیر ملکی زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ اگر عرب سیاستدانوں کی تقریروں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو وہ مصنوعی اور اجنبی لگتی ہیں۔ اگر دنیاوی معاملوں یا روایتی ادب کی عام عربی زبان کے متعلق یہ بات سچ ہے تو قرآن، جو حد درجہ پیچیدہ، ٹھوس اور رمز و کنائے کی زبان میں لکھا گیا ہے، اس کے بارے میں یہ بات اور زیادہ سچی ہے بلکہ نہایت روانی کے ساتھ انگریزی بولنے والے عرب بھی یہ کہتے ہیں کہ جب وہ قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ پڑھتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی مختلف کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں اس کتاب میں قرآنِ پاک کے بہت سے حوالے نقل کروں گی لیکن قارئین کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ انگریزی ترجمے کو پڑھ کر ان پر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح رقت طاری ہو جائے گی۔

بہر حال اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم قرآن کو متکبرانہ انداز میں مسترد کر دیں۔ قرآنِ کریم کا دوسری کتابوں کی طرح مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اگر اس کتابِ مقدس تک صحیح طریقے سے رسائی کی جائے تو اس سے انسان میں ربانی انوار اور موجودگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مسیحی روایات کے زیر اثر پرورش پانے والا کوئی بھی شخص اس روحانی جذب اور وجدان کا اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ جس طرح سنسکرت، عبرانی اور عربی ہندوؤں، یہودیوں اور مسلمانوں کی مقدس زبانیں ہیں، اس طرح عیسائیوں کی اپنی کوئی متبرک زبان نہیں ہے۔ عیسائیت میں وحی کا سرچشمہ خود عیسیٰ علیہ السلام کی ذات تھی نہ کہ کوئی آسمانی صحیفہ۔ چنانچہ عہد نامہ جدید یونانی کوئی مقدس کتاب نہیں ہے۔ یہودی مسلمانوں کے اس روحانی پہلو کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے کیونکہ جس طرح مسلمان قرآنِ پاک کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اسی طرح یہودی تورات کا (پہلی پانچ الہامی کتابیں جنہیں عیسائی عہد نامہ قدیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں) ادب کرتے ہیں۔ یہودی جب تورات پڑھتے ہیں تو وہ صرف مذہبی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کے صفحوں پر نظر ہی نہیں ڈالتے بلکہ وہ لفظوں کو بلند آواز سے پڑھ کر اس زبان سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ اس طرح وہ تورات کو زبانی یاد کر لیتے ہیں۔ تورات کو پڑھتے وقت یہودی عام طور پر آگے اور پیچھے کی طرف جھومتے ہیں اور اس طرح وہ خدائی روح کے تنفس سے روحانی بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہودی جب تورات پڑھتے ہیں تو وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسائیوں کے مقابلے میں، جو مبہم قوانین کے حد درجہ بے کیف مجموعے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ایک مختلف کتاب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مسلمان قرآنِ کریم میں موجود خدا کے مقدس الفاظ کو خیر و برکت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ مقدس عشائے ربانی کی طرح قرآن بھی قاری کے ذہن میں مقدس الفاظ کی حقیقی موجودگی کا شعور پیدا کرتا ہے، اس میں خدا انسانی شکل میں ہم کلام ہوتا ہے۔ قرآن کی طاقت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی سلطنت میں رہنے والے بیشتر لوگوں نے قرآن کی مقدس زبان اختیار کرنے کے لیے خود اپنی مادری زبانیں ترک کر دی ہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے، قرآنِ پاک کی مختلف سورتیں، جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے ادا ہوئیں، موجودہ ترتیب میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے کوئی بیس سال بعد ۶۵۰ عیسوی میں، جب قرآنِ حکیم کی پہلی مرتبہ سرکاری طور پر تدوین کی گئی تو اسے ترتیب دینے والوں نے طویل سورتوں کو شروع میں اور مختصر سورتوں کو، جن میں حضورؐ پر نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتیں شامل ہیں، آخر میں رکھ دیا۔ جیسا کہ اس کی ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسا کوئی قصہ یا دلیل پیش نہیں کی گئی جسے تسلسل یا ترتیب کی ضرورت ہو۔ اس کے بجائے قرآن میں فطرت میں ذاتِ خداوندی کی موجودگی، پیغمبروں کی زندگیوں اور قیامت جیسے موضوعات کا تذکرہ اور انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ مغرب کے لوگوں کا خیال ہے کہ قرآنِ حکیم میں اکتا دینے والی تکرار موجود ہے اور اس میں کئی باتوں کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ کتاب نجی ترغیبات کے لیے نہیں بلکہ دعاؤں اور تعلیمات کا مجموعہ ہے جس کی کثرت کے ساتھ تلاوت کی جاتی ہے۔ مسلمان مسجد میں جب اس کی کوئی سورت سنتے ہیں تو انہیں ایک ہی نشست میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی یاددہانی کرائی جاتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے یہ کتاب پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں معلومات کا گراں مایہ ذریعہ ہے۔ اگرچہ قرآن حضورؐ کی رحلت کے بعد مدون کیا گیا، اس کے باوجود اسے ایک مستند اور مصدقہ حیثیت حاصل ہے۔ جدید اسکالرز، جنہوں نے مختلف سورتوں کے نزول کی تاریخوں کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا ہے، اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ قرآنِ پاک کے ابتدائی حصوں میں ان مخصوص مسئلوں کا ذکر کیا گیا ہے جب آپؐ کا دین ایک مختصر گروہ کی حیثیت سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور جن مسئلوں کو اسلام کے مستقل بنیادوں پر استوار ہونے اور ایک فاتح دین کا درجہ ملنے کے بعد فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کیریئر کے بارے میں آپؐ کے اپنے زمانے میں جو تبصرہ کیا گیا ہے، مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس شرح اور صراحت کی بدولت ہمیں ان مخصوص مشکلات کا پتا چلتا ہے جو حضورؐ کو درپیش تھیں اور جن کے دائرہ عمل اور وسعت نے آپؐ کے اعلیٰ تدبر اور بصیرت کی بنا پر زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمیق اور آفاقی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے برعکس ہم عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ابتدائی مسیحی مصنف سینٹ پال نے، جس نے اپنا پہلا مکتوب جسے انجیل میں شامل کیا گیا، حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بیس سال بعد بھیجا۔ پال کو عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس نے اپنی تمام تر توجہ عیسیٰؑ کی موت اور ان کے قبر سے دوبارہ اٹھنے کے روحانی مفہوم پر مرکوز کی ہے۔ بعد میں حضرت عیسیٰؑ کے جو حالات ان کے حواریوں نے لکھے، ان میں زبانی روایات پر انحصار کیا گیا جن میں فلسطین میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور تعلیمات کا عمومی تذکرہ کیا گیا ہے۔ مرقس وہ پہلا شخص ہے جس نے عیسیٰؑ کی وفات کے چالیس سال بعد ستر کے عشرے میں، متی اور لوقا نے اسی کی دہائی میں اور یوحنا نے تقریباً ایک سو سال بعد عیسیٰؑ کے حالات قلمبند کیے۔ لیکن ان حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ کے جو حالات لکھے، وہ رسول اللہؐ کے ابتدائی عرب مورخوں کی سوانح عمریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان حواریوں کو تاریخی حقائق کے بجائے یسوع مسیح کی زندگی کے مذہبی مفہوم میں زیادہ دلچسپی تھی اور انہوں نے حقیقی واقعات بیان کرنے کے مقابلے میں کلیساؤں کی ضروریات، مشغولیت اور عقائد سے متعلق تفصیلات لکھی ہیں۔ مثال کے طور پر عہد نامہ جدید کے اسکالرز یہ عندیہ دیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مصائب اور موت کے بارے میں حواریوں کے بیانات حد درجہ پراگندہ اور الجھے ہوئے ہیں اور ان میں حقائق کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اس وقت عیسائی یہودیوں کے ساتھ قطع تعلق کرنے کے لیے بے چین تھے چنانچہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی موت کا الزام رومیوں کے بجائے یہودیوں پر عاید کر دیا۔ حواریوں نے عیسیٰؑ کے صرف چند الفاظ ہی قلمبند کیے ہیں البتہ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ حواریوں کے بیان جھوٹ پر مبنی ہیں۔ انہوں نے ایک اہم مذہبی صداقت کا اظہار کیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی روح کو ان کی طرف واپس بھیجیں گے تاکہ ان کے عمیق ترین وجدان کو ان کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔

انجیلِ مقدس میں حضرت عیسیٰؑ کو ایک مثالی اور کامل شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کے سیرت نگاروں نے آپؐ کی بالکل مختلف تصویر کشی کی ہے۔ جیسا کہ میں اس کتاب کے دسویں باب میں وضاحت کروں گی، مسلمانوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ گہری عقیدت اور محبت ہے لیکن انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپؐ خدائی اوصاف سے متصف تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی مورخوں نے آپؐ کو ایک انسان کے طور پر پیش کیا ہے بلکہ آپؐ کو ایک عیسائی سینٹ سے مشابہت رکھنے والی شخصیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا حالانکہ عیسائیوں کی برگزیدہ شخصیات کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اصل میں وہ خود بھی انسان ہی تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہودیوں کی مقدس کتاب تورات کی ان رنگین شخصیات، موسیٰ، داؤد،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلیمانؑ، ایلیجا یا یسعیاہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند مرتبت ہیں جو حد درجہ مذہبی شخص ہونے کے باوجود کاملیت کا نمونہ نہیں تھے۔ ایک ماورائے ادراک ذاتِ مطلق اور ناقابلِ بیان ہستی کو، جسے لوگ ''خدا'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، انسانی زندگی کے ناقص اور المناک روپ میں پیش کرنا یقیناً ایک تکلیف دہ کوشش ہے۔ نبی کریمؐ کوئی پلاسٹر سینٹ نہیں تھے۔ آپؐ ایک متشدد اور خطرناک معاشرے میں رہتے تھے اور بعض اوقات آپؐ نے کئی ایسے ذرائع اختیار کیے جو آج کی قدرے محفوظ دنیا میں رہنے والے ہم جیسے خوش نصیبوں کے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ لیکن اگر ہم بزرگی اور پاکیزگی سے متعلق اپنی مسیحی توقعات کو بالائے طاق رکھ دیں تو ہمیں آپؐ کی ذات میں ایک پرجوش اور پیچیدہ انسان نظر آئے گا۔ پیغمبر اسلامؐ میں عظیم روحانی اور سیاسی بصیرت کا جوہر موجود تھا اور یہ دو ایسی خوبیاں ہیں جو تاریخ نے ایک ہی شخص میں شاذ ہی یکجا کی ہیں۔ آنحضرتؐ کو پختہ یقین تھا کہ تمام مذہبی لوگوں پر یہ ذمے داری عاید ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھا اور عدل پر مبنی معاشرہ قائم کریں۔ آپؐ کبھی غضبناک ہو کر سخت رویہ اختیار کر لیتے لیکن شفقت، ملائمت، رحمدلی، خدا ترسی، بے پایاں لطف و عنایت اور فیاضی آپؐ کی ذات کے نمایاں اوصاف تھے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں پڑھا کہ عیسیٰؑ ہنستے بھی تھے۔ لیکن ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ حضورؐ مسکراتے اور اپنے قریبی ساتھیوں سے دل لگی اور ہنسی مذاق کرتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپؐ بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، آپؐ کو اپنی ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا، اپنے ایک دوست کی موت پر آپؐ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے اور اپنے کمسن بیٹے کی وفات پر غمزدہ باپ کی طرح شدید صدمے سے نڈھال ہو گئے۔

اگر ہم کسی بھی دوسری تاریخی شخصیت کی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کا جائزہ لیں تو ہم آپؐ کو یقیناً دنیا کی سب سے عظیم، نابغہ روزگار شخصیت اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والا عالی دماغ شخص قرار دیں گے۔ ایک عظیم ادبی شاہکار کو تخلیق کرنا اور ایک بڑے مذہب اور ایک نئی عالمی طاقت کی بنیاد رکھنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ لیکن آپؐ کی تخلیقی صلاحیتوں کی حامل غیر معمولی عبقری شخصیت کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے ہمیں اس معاشرے کا، جس میں آپؐ پیدا ہوئے اور ان قوتوں کا، جن سے آپؐ کو نبرد آزما ہونا پڑا، تفصیلی جائزہ لینا چاہیے۔ عربوں کو خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے حضورؐ جب کوہِ حرا سے نیچے اترے تو آپؐ کو ایک مشکل اور ناممکن مہم درپیش تھی۔ جزیرہ نما کے چند عرب باشندے توحید اور وحدانیت کی جانب راغب ہو رہے تھے لیکن انہیں ایک خدا کو ماننے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانے کے عقیدے کے نتائج اور مشکلات کا مکمل ادراک نہیں تھا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ یہودی صدیوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہوواہ ہی ایک خدا ہے۔ قدیم اسرائیلی غالباً ایک دیوتا کی پرستش کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے دیوتاؤں کے وجود سے انکار بھی نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے تھے۔ ان میں اس عقیدے پر اتفاق پایا جاتا تھا کہ وہ صرف یہوواہ کی پوجا کریں گے لیکن اس کے ساتھ وہ دوسرے دیوتاؤں پر بھی یقین رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا کے متعلق حضرت موسیٰؑ کا تصور بھی خالص وحدانیت پر مبنی نہ ہو۔ وہ اپنی قوم کے لیے کوہِ طور سے موسوی شریعت کے جو دس احکام لائے، ان میں دوسرے دیوتاؤں کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے: ''تم میرے سامنے اجنبی دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرو گے''۔ موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں مصر سے بنی اسرائیل کے اخراج (۱۲۵۰ قبل مسیح) اور تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح میں بابل میں جلاوطن یہودیوں کے ساتھ رہنے والے توحید پرست پیغمبر کو گزرے، جو عام طور پر لیسی ثانی کے نام سے مشہور ہیں، تقریباً سات سو سال بیت چکے تھے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف ۲۳ برسوں کی مختصر مدت میں عربوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا کر کے انہیں توحید پرست بنا دیا! ہم دیکھیں گے کہ کئی عربوں نے آپؐ سے درخواست کی تھی کہ اگر آپؐ ایک خدا کے ساتھ دیوتاؤں کی موجودگی کا اقرار کر لیں تو وہ بھی خدائے واحد کو مان لیں گے لیکن حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ صرف اللہ ہی کی پرستش کرتے رہے اور آپؐ نے ان عربوں کے ساتھ سودے بازی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

صرف ایک خدا پر ایمان لانے کا اعلان محض تخیل پرستی اور ذہنی اثاثہ نہیں تھا بلکہ یہ عقیدہ انسانی شعور اور آگہی میں انقلاب کا متقاضی تھا۔ انجیل کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اسرائیلیوں میں بت پرستی کا رواج تھا اور ہم دیکھیں گے کہ عربوں کے لیے بھی آبائی دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کو ترک کرنا حد درجہ تکلیف دہ بات تھی۔ غالباً یہ بھی تعجب انگیز بات نہیں کہ یہودیوں نے بابلی سلطنت میں جلاوطنی کے دوران ہی بت پرستی کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے مذہبوں کی طرح ایک خدا کو ماننے کا تصور اصل میں تہذیب وتمدن ہی کی پیداوار ہے۔ ایک عالمی سلطنت میں لوگوں کا ذہنی افق وسیع ہو گیا اور دنیا کے بارے میں ان کے خیالات مکمل طور پر تبدیل ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مقامی دیوتاؤں کو حقیر اور ناکافی سمجھنے لگے۔ قدیم سلطنتوں نے رعایا کو وہ نظم وضبط اور تحفظ فراہم کیا جو انسانی تہذیب کے پھلنے پھولنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ لوگوں نے یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ خود کائنات کے اندر بھی ایک ترتیب اور سلیقہ موجود ہے اور ممکن ہے کہ اس کائنات کا حاکم اور فرمانروا بھی ایک ہو۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں ثقافتی تبدیلیوں کا عمل تیز ہو گیا اور جوں جوں انفرادی شعور فروغ پذیر ہونے لگا، لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہونا شروع ہو گئے کہ ان کے افعال اگلی نسلوں کے مستقبل پر اثرانداز ہوں گے۔ لیکن ساتویں صدی کے عرب جیسے غیر مہذب معاشرے میں اس قسم کی سوچ ناپید تھی۔ جب زندگی خطرناک اور مستقبل ظلم واستبداد کی وجہ سے تاریک ہو، جب انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کا نظام رائج ہو اور جب سماجی تحفظ کا فقدان ہو، اس وقت ایک قادرِ مطلق اور کریم النفس ذاتِ خداوندی پر ایمان لانا تقریباً ناممکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ قدیم بت پرست دنیا میں مختلف دیوتاؤں کو طاقت اور اثر ورسوخ کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا اور صرف ایک خدا کو ماننے کا مطلب امداد کے بنیادی منبعے سے منہ موڑ کر گمراہی اختیار کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ کے باشندوں کی طرح بعض عرب شہروں میں رہتے تھے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ لوگ صحرا نشین تھے اور معاشرے پر مایوس کن قبائلی نظام کی ثقافتی روح اب بھی پوری طرح غالب تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم کامیابیوں کا سب سے نمایاں اور قابلِ غور پہلو آپؐ کی تنہائی ہے۔ آپؐ یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں جانتے تھے لیکن اس ضمن میں آپ کا علم بہت محدود تھا۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے برعکس آپؐ کو عقیدہ توحید کے مشکل مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کے سلسلے میں اس مسلمہ روایت کی مدد حاصل نہیں تھی جس کا اپنا زورِ حرکت اور بصیرت موجود ہو اور جس کے بل بوتے پر صدیوں پر محیط اخلاقی رہنمائی کا سامان کیا جا سکے۔ حضرت عیسیٰؑ اور سینٹ پال دونوں یہودیت سے پیوست تھے اور ابتدائی عیسائیوں کا تعلق یہودیوں، ان کے حامیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں میں موجود نیک لوگوں سے تھا۔ مسیحیت نے رومی سلطنت میں اپنی جڑیں مضبوط کیں جہاں یہودی طبقوں نے بت پرستوں کو ذہنی طور پر تیار کر کے وحدانیت کے نظریے کو قبول کرنے کی راہ ہموار کر دی تھی۔ لیکن نبی کریمؐ کو نہایت دشوار اور نا مساعد حالات میں اپنی مہم کا آغاز کرنا پڑا اور توحید کے انقلابی روحانی عقیدے کی تبلیغ کے لیے انتھک جدوجہد کرنا پڑی۔ جب آپؐ نے اپنا مشن شروع کیا تو کوئی بھی غیر جانبدار مبصر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ مشن پایہ تکمیل تک پہنچ پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں میں ابھی تک وہ روحانی بصیرت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک خدا کو مان لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس متشدد اور دہشت انگیز معاشرے میں بڑے پیمانے پر توحید کا پرچار کرنا بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ بھی ان کی خوش نصیبی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریمؐ کی زندگی خطرات میں گھری ہوئی تھی اور آپ کا بچ نکلنا ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود آپؐ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے اور زندگی کے آخری حصے تک آپؐ نے اس قبائلی تشدد کو جڑ سے اکھاڑ دیا جس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے بت پرستی کا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کی ان کوششوں کی بدولت عربوں نے اپنی تاریخ کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کر دیا۔ آپؐ کی اس بے مثل کامیابی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہمیں ظہورِ اسلام سے پہلے کے حالات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے، اس دور کے حالات کو سمجھنا چاہیے جسے مسلمان دورِ جاہلیت کہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

دورِ جاہلیت

عرب آج دنیا کا امیر ترین ملک ہے اور عالمی طاقتیں وہاں اپنے تیل کے مفادات کی بڑی سرگرمی سے حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن جب رسول اللہؐ تقریباً ۵۷۰ عیسوی میں مکہ کے شہر میں پیدا ہوئے، اس وقت علاقے کی کوئی بھی بڑی طاقت عرب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ فارس اور بازنطینی دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی جدوجہد جاری تھی اور یہ کشمکش حضورؐ کی وفات سے تھوڑی دیر پہلے ختم ہوئی۔ دونوں طاقتیں جزیرہ نما کے جنوبی علاقے میں، جو اب یمن ہے، عربوں کو زیرِ نگیں لانے کے لیے بے چین تھیں۔ جنوبی عرب کی سلطنت باقی علاقے سے بالکل مختلف تھی، یہاں مون سون کی بارشیں ہوتی تھیں اس لیے یہ علاقہ بہت شاداب وزرخیز اور خوش حال تھا۔ یمن قدیم تہذیب وثقافت کا امین اور یہاں کے باشندوں کا معیارِ زندگی بہت بلند تھا۔ لیکن عرب کے دشوار گزار لق ودق صحرا اجاڑ اور ویران تھے جن میں انسانوں کی وہ وحشی نسل آباد تھی جنہیں یونانیوں نے Sara Kenoi یعنی خیمہ نشین قوم کا نام دے رکھا تھا۔ فارس اور بازنطینی دونوں سلطنتوں کو اس ویران علاقے پر حملہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ یہ سرزمین ایک ایسے نئے عالمی مذہب کو جنم دینے والی ہے جو عنقریب دنیا کی بہت بڑی طاقت بننے والا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ عرب کے خطے میں رہنے والے لوگ خدا کو نہ ماننے والے مشرک تھے اور کوئی بھی جدید اور ترقی یافتہ مذہب اس علاقے تک رسائی حاصل نہیں کرسکا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ یثرب (جو بعد میں مدینہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہر بنا)، خیبر اور فدک کی زرعی بستیوں میں چند یہودی قبیلے آباد تھے لیکن ان یہودیوں کو ان کے ہمسایہ عرب بت پرستوں سے ممیز کرنا عملاً بہت مشکل تھا۔ ان یہودیوں کا مذہب بھی نامکمل اور ادھورا تھا۔ مہذب علاقوں میں آباد بہت سے عربوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور چوتھی صدی عیسوی میں انہوں نے اپنا سریانی کلیسا قائم کر لیا تھا۔ ریگستانِ عرب کے عرب خانہ بدوش گو یہ محسوس کرتے تھے کہ یہودیت اور عیسائیت ان کے مذہب کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، اس کے باوجود وہ ان دونوں مذاہب کو عموماً شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فارس اور بازنطینی سلطنتیں ان دونوں مذہبوں کو شاہی کنٹرول کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ ۵۷۰ عیسوی میں، جو رسول اللہؐ کی پیدائش کا سال ہے، جنوبی عرب کی بادشاہت کے معاملے میں، جو ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی کھو چکی تھی، عربوں کے اندیشے درست ثابت ہو چکے تھے۔ بازنطینی مسیحی سلطنت نے، جس نے عیسائیت کی خارجی شکل اختیار کر کے یہ قرار دے دیا تھا کہ عیسیٰؑ کی ذات میں صرف ایک ربانی فطرت موجود ہے، حبشہ یا جدید ایتھوپیا کو طفیلی ریاست بنا لیا تھا۔ بازنطینی حکمران اپنی مملکت کے اندر خارجی عیسائیوں کو ایذائیں پہنچاتے لیکن بیرونی ملکوں میں شاہی عزائم کی تکمیل کے لیے انہیں آلہ کار بناتے۔ حبشہ کے الحاق کے بعد بازنطینیوں نے حبشہ کے حکمران نجاشی کو شہ دی کہ وہ یمن میں داخل ہو جائے۔ اس منصوبے کا مقصد یمن کو قسطنطنیہ کی قلمرو میں شامل کرنا تھا۔ جنوبی عرب نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بجائے حبشہ کے خطرے سے نمٹنے کے لیے فارس سے امداد کی درخواست کی اور فارس کے ساسانی حکمرانوں نے خندہ پیشانی سے یہ درخواست قبول کر لی۔ اپنی سلطنت میں توسیع کرنے کی جدوجہد میں فارس کے حکمرانوں نے مذہب کو بھی نظریاتی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور بازنطینی عیسائیت کے خلاف یہودیت کی سرپرستی کرنے لگے۔ ۵۱۰ عیسوی میں جنوبی عرب کے بادشاہ یوسف اسائی نے یہودیت اختیار کر لی اور ذونواس (لٹکتی ہوئی کاکلوں والا) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ لیکن ۵۲۵ عیسوی میں جب یمن کی یہودی سلطنت نے حبشہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو فارس کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خوبصورت نوجوان بادشاہ ذونواس اپنی شکست سے اس قدر دل برداشتہ ہو گیا کہ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ سمندر کی طرف کیا اور اسے پیٹتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ اسے لے کر سمندر میں داخل ہو گیا، پایاب چلتا ہوا گہرے پانی میں پہنچ گیا، گھوڑے کو سمندر کے اندر تہہ تک پہنچا دیا یہاں تک کہ وہ سمندر کی موجوں میں ڈوب کر مر گیا۔ اس طرح جنوبی عرب حبشہ کا محض ایک صوبہ بن کر رہ گیا لیکن اس کے باشندے فارس سے امداد کی بدستور درخواست کرتے رہے۔ آخر شاہ خسرو نے ۵۷۰ عیسوی میں علاقے پر حملہ کر دیا اور یمن کی مغرور سلطنت، فارس کی نو آبادی بن گئی۔ اس مرتبہ نسطوری عیسائیت (جس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی دو فطرتیں ہیں، ایک انسانی اور دوسری ربانی، اس مسیحی فرقے کو فارس کی حمایت بھی حاصل تھی) یمن کا سرکاری مذہب بن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئی۔ حجاز اور نجد کے علاقوں میں بسنے والے خانہ بدوش عربوں کو جنوبی عرب کے ہمسایوں پر بڑا فخر تھا اور اس کے زوال کو مصیبت اور آفت تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ یہودیت اور عیسائیت دونوں کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے۔

شمال میں، جہاں دونوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف اپنی سرحدوں کو محفوظ کرنے اور وحشی ساسانیوں سے، جو قحط اور خشک سالی کے برسوں میں خاص طور پر وقفے وقفے کے ساتھ آباد علاقوں پر حملے کرتے، بچنے کے لیے مضطرب تھیں۔ دونوں طاقتوں نے شمال میں ان عرب قبائل سے فائدہ اٹھایا جنھوں نے مسیحیت کی خارجی شکل کو قبول کر لیا تھا۔ بازنطینی حکمرانوں نے عربوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لیے سرحدی علاقوں میں خانقاہیں اور صومعے تعمیر کر دیے۔ آخر غسان کا قبیلہ، جو بازنطینی سلطنت کی سرحدوں پر سردیاں گزارتا تھا، عیسائیت کے مونوفزائٹ فرقے میں شامل ہو کر بازنطینی سلطنت کا حلیف بن گیا۔ انہوں نے نجران میں رصافہ کے باہر سردیوں کا جنوبی کیمپ تعمیر کر لیا جس میں اپنے سردار کے لیے بازنطینی طرزِ تعمیر کا ایک شاندار ہال بھی شامل تھا۔ اس عمارت کے آثار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ غسانیوں نے بازنطینی بفراسٹیٹ بنا دی جس کا مقصد فارس کے زرتشت حکمرانوں کے متوقع حملے کی صورت میں مسیحی سلطنت کا دفاع کرنا تھا۔ (ایران میں ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں زرتشت نے اس زمانے میں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جب جرمنیا Jerenia اور یسی Issia بیت المقدس میں تبلیغ کر رہے تھے۔ اس مذہب کے پیروکار عقیدہ ثنویت یعنی نیکی اور بدی، یزداں اور اہرمن کے درمیان ازلی کشمکش پر یقین رکھتے ہیں)۔ لیکن فارس بدلہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ مشرقی شام کے لیکمد عرب باشندے عیسائیوں کے نسطوری فرقے کے پیروکار بن گئے۔ فارس کی سلطنت کے عراقی علاقوں کے عرب بھی نسطوری تھے۔ ساسانیوں نے اپنی سرحد کی حفاظت کے لیے لیکمد حکمرانوں کو بفراسٹیٹ کا فرمانروا بنا کر حیرہ کو اس ریاست کا دارالحکومت بنا دیا۔ لیکن فارس اور بازنطینی دونوں سلطنتیں ان عرب ریاستوں سے پسپا ہو گئیں۔ بازنطینی شہنشاہ ہرقل نے ۵۸۴ عیسوی میں فارس کے خلاف جنگ کے دوران معاشی قدم کے طور پر غسانیوں کی امداد بند کر دی اور شاہ خسرو نے ۶۰۲ عیسوی میں لیکمد حکومت کا خاتمہ کر کے عربوں کی جگہ ایرانی حکمرانوں کا تقرر کر دیا۔ رسول کریمؐ کی وفات کے تیس سال بعد جب مسلمانوں کی فوج نے ان علاقوں پر حملہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ عربوں میں بڑی طاقتوں کے خلاف شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا اور وہ اپنی تقدیر کو اسلام کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے تیار تھے۔

لیکن یہ واقعات تو مستقبل میں پیش آئے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں وسطی عرب کے عرب باشندے عیسائیت کی مسخ شدہ صورتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جنوب میں نجران کا پرشکوہ گرجا صحرانوردوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے حیرت کا باعث بنا ہوا تھا لیکن ان مذہبی نظاموں پر ان کی بے اعتمادی بدستور قائم رہی اور بڑی طاقتوں سے الگ تھلگ رہ کر آزادی اور خود مختاری سے زندہ رہنے کے عزم میں کوئی لغزش نہ آئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں عدم اعتماد کی فضا بھی برقرار رہی۔ عرب مذہبی اور سیاسی اعتبار سے احساسِ کمتری میں مبتلا رہے یہاں تک کہ انہوں نے خانہ بدوشوں کی متحدہ ریاست قائم کر کے اپنا مقدر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اب بھی اس قدر کمزور تھے کہ ان کا استحصال کیا جا سکتا تھا بلکہ جنوب کے عربوں کی طرح وہ اپنی آزادی بھی کھو سکتے تھے۔ بہ ہر حال خانہ بدوشوں کی متحدہ ریاست کا وجود برقرار رکھنے کے امکانات بہت ہی معدوم تھے۔ حجاز اور نجد کے عرب صدیوں سے ان قبائلی گروپوں کی صورت میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسا مخصوص طرزِ زندگی اپنا لیا تھا جو چھٹی صدی تک جزیرہ نما عرب میں بودوباش کا معیار رہا۔ جو عرب شہروں اور آباد علاقوں میں رہتے تھے، ان کا رہن سہن بھی پرانے گڈریوں جیسا تھا، وہ اب بھی اونٹ رکھتے اور خود کو صحرا کے بیٹے کہلوانا پسند کرتے تھے۔

قبائلی روایات اور ضابطوں کے مطابق ہر فرد میں فنی اور سماجی ہنر مندی کے ساتھ ساتھ ان ذاتی خوبیوں کا وجود بھی ضروری تھا جن کی نہایت احتیاط کے ساتھ تربیت دی جاتی تھی۔ جزیرہ نما کے عرب محض ایک صحرا نورد قوم ہی نہیں تھے۔ اونٹ کو، جس نے ان کی زندگی کو ممکن بنا دیا تھا، ہمارے اپنے عہد سے کوئی دو ہزار سال پہلے گھروں میں پالنے کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ یہ جانور، جس میں پانی ذخیرہ کرنے کی بے مثل صلاحیت موجود ہے، صحرا میں انتہائی برق رفتاری سے طویل فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ عرب شروع میں مہذب علاقوں کی زرخیز زمینوں پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ سواری اور مال برداری کے جانور پالنے کے طویل تجربے کے بعد بعض دلیر لوگ وقفے وقفے کے ساتھ آنے والے قحط اور خشک سالی کے دوران اونٹوں کو بے آب و گیاہ، ویران اور لق و دق میدانوں میں لے جاتے (A. J. Toynbee: A Study of History, Vol. III, PP. 7-22, London, 1951)۔ ان مشکل حالات میں اپنی روزی کمانا بے رحم قسمت کے خلاف جنگ اور بغاوت کی علامت تھی جس سے عربوں کے اس پختہ عزم کی عکاسی ہوتی تھی کہ وہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ دور دراز کے ریگستانی علاقوں میں چلے گئے اور اس طرح تہذیب کے مرکزوں اور ان کے درمیان وسیع فاصلہ حائل ہو گیا۔ گرمیوں میں وہ اپنے اپنے قبیلے کے قرب و جوار میں اونٹ چراتے اور سردیوں کے موسم میں ان سرسبز میدانی علاقوں کا رخ کرتے جو بارشوں کے بعد ان کے مویشیوں کے لیے جنت کا درجہ رکھتے تھے۔ ان عربوں کی گذر اوقات اونٹنیوں کے دودھ اور شکار کے گوشت پر تھی۔ لیکن یہ خانہ بدوش الگ تھلگ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتے تھے، انہیں زراعت پیشہ لوگوں کی ضرورت تھی جو ان کی خوراک کے لیے گیہوں اور کھجور جیسی ضروری اشیا بہم پہنچاتے۔ یہ خانہ بدوش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوں جوں جزیرہ نما کے زرخیز حصوں کے ریگستانی علاقوں میں آگے بڑھتے گئے، نخلستانوں میں آباد کاشتکار بھی نواحی علاقوں میں آبپاشی کرنے لگے اور اس طرح انہوں نے صحرا کو بڑی حد تک تازگی اور شادابی سے ہمکنار کر دیا۔ دوسری طرف زراعت پیشہ لوگ بھی ان خانہ بدوشوں کی نقل و حرکت کرنے کی استعداد پر انحصار کرنے لگے جو بیرونی دنیا سے ان کے لیے ضروری اشیا اور سامانِ تجارت لے کر آتے تھے۔ چونکہ صحرانورد عام طور پر ماہر جنگجو ہوتے تھے اس لیے وہ آبادیوں میں رہنے والے عربوں کی محافظت کرتے اور اس کے عوض زرعی اجناس کا ایک حصہ وصول کرتے۔

میدانی علاقوں میں زندگی انتہائی دشوار گزار تھی۔ خانہ بدوش تقریباً بھوکے رہتے اور ناقص خوراک کھاتے اس لیے کم غذائیت کا شکار رہتے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑتا اور روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کا سخت مقابلہ کرتے۔ زندہ رہنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ آپس میں قریبی رابطہ رکھ کر ایک گروہ کی صورت میں زندگی بسر کریں کیونکہ ایک فرد کے تنہا رہنے کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ صحرانوردوں نے خون کے رشتے اور قرابت کی بنیاد پر خودمختار گروپ بنا لیے۔ یہ لوگ حقیقی یا افسانوی مشترک آباؤ اجداد رکھنے کی وجہ سے متحد ہوتے اور خود کو بنی کلب یا بنی اسد (کلب یا اسد کے بیٹے) کے نام سے موسوم کرتے۔ یہ گروپ اپنا دائرہ مزید وسیع کر کے دوسرے گروپوں کے ساتھ الحاق کر لیتے۔ مغرب میں ہم چھوٹے گروپوں کو ''کنبہ'' اور بڑے گروپ کو ''قبیلہ'' کہتے ہیں۔ عرب عموماً یہ امتیاز نہیں کرتے اور چھوٹے اور بڑے دونوں گروپوں کے لیے ''قوم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے کہ قبیلے بہت بڑے نہ ہوں اور ان کا انتظام و انصرام مشکل نہ ہو جائے، ان قبیلوں کی تشکیلِ نو کا عمل مسلسل جاری رہتا۔ ان کے نزدیک قوم اور اس کے تمام اتحادیوں کے ساتھ شدید اور قطعی وفاداری بے حد ضروری تھی۔ صرف قبیلہ ہی اپنے لوگوں کی جان و مال کی سلامتی کو یقینی بنا سکتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ اس معاشرے میں نہ تو انفرادیت کی کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی حقوق و فرائض کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ ہر چیز گروپ کے مفاد کے تابع تھی۔ اس گروہی جذبے کو فروغ دینے کے لیے عربوں نے ''مروہ'' کا نظریہ دریافت کر لیا تھا۔ مغربی اسکالروں نے ''مروہ'' کا ترجمہ ''مردانگی'' کیا ہے لیکن اصل میں یہ لفظ بے حد پیچیدہ اور وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ''مروہ'' کا مطلب ہے جنگ میں جرأت اور بہادری، مصائب میں صبر و استقلال، قبیلے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے میں سرگرمی اور پختہ عزم، قبیلے کے کمزور افراد کی حفاظت اور طاقتور لوگوں کو للکارنا۔ ہر قبیلہ ''مروہ'' کے اس مخصوص برانڈ پر فخر کرتا جو اسے نسل در نسل ورثے میں ملتا تھا۔ ''مروہ'' کی حفاظت کے لیے ہر فرد اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کے دفاع اور اپنے سردار کی اطاعت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ اس پر کسی دوسرے قبیلے کی کوئی ذمے داری عاید نہ ہوتی۔ عربوں کے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تدریجی ارتقا میں کسی آفاقی یا فطری قانون کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی۔

''مروہ'' کے ذریعے کئی مذہبی فرائض بھی ادا کیے جاتے اور اس کی بدولت عربوں کو ایک ایسا نظریہ اور بصیرت مل گئی جس کے ذریعے انہوں نے خطرات سے پُر بقا کا مطلب پالیا تھا۔ لیکن مذہب وہ واحد معاملہ تھا جسے مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا اور قبیلے ہی کو مقدس درجہ حاصل تھا۔ عرب موت کے بعد زندگی کے نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ایک فرد کی کوئی لافانی یا ابدی تقدیر نہیں تھی۔ کوئی مرد یا عورت صرف اپنے قبیلے میں ہی حیاتِ جاودانی، روحانی تسلسل اور بقائے دوام حاصل کرسکتا تھا۔ ہر شخص کا فرض تھا کہ وہ ''مروہ'' کے تحت اپنے قبیلے کی بقا کو یقینی بنائے۔ اس طرح ہر قبیلہ صرف اپنے مفادات کا خیال رکھتا۔ قبیلے کے سردار سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے گروپ کے کمزور افراد کی دیکھ بھال کرے اور اس کی املاک اور اشیا کی تقسیم کو یقینی بنائے۔

فراخ دلی، فیاضی اور کشادگی کو اہم وصف سمجھا جاتا تھا۔ قبیلے کا سربراہ اپنے قبیلے اور اتحادیوں کی مہمان نوازی پر کھلے دل کے ساتھ بے تحاشا دولت خرچ کرکے قبیلے کی طاقت اور اعتماد کا مظاہرہ کرتا۔ مہمان نوازی اور سخاوت اب بھی عربوں کا سب سے بڑا امتیازی وصف ہے۔ لیکن اس میں عملی فائدے کا پہلو بھی موجود تھا۔ ایک قبیلہ جو آج دولت مند ہے، کل کو تہی دست اور محتاج بھی ہوسکتا ہے اور اگر آپ خوش حالی کے دنوں میں تنگدلی اور بخل کا مظاہرہ کریں گے تو ضرورت پڑنے پر آپ کی کون مدد کرے گا؟ فیاضی اور کشادہ دلی کے باعث عرب کل کی کوئی فکر نہیں کرتے اور اپنی بقا کے اندیشوں سے بے نیاز ہیں۔ ان خوبیوں کی بدولت وہ مادی چیزوں سے لاتعلق ہوجاتے ہیں اور اس علاقے میں، جہاں بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے اسباب موجود نہیں، ہر کسی کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اس نقطہ نظر کی بنا پر اس اصول کی صداقت بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ دہر (وقت یا تقدیر) زندگی کی مسلمہ حقیقت ہے جسے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اگر لوگ بعض آفات اور تباہ کاریوں کو ناگزیر نہ سمجھیں تو زندہ رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ عربوں کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ انسانی زندگی کو طول دینے، موت سے بچنے یا رزق میں کشادگی کو یقینی بنانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے قبیلے اور اس کے افراد کی حفاظت کی غرض سے سردار کو ہر زخم کا بدلہ لینے کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ جس معاشرے میں ایسا کوئی عمومی قانون موجود نہ ہو جسے مرکزی اتھارٹی نافذ کر سکے، وہاں سماجی تحفظ کو حدِ اعتدال پر رکھنے کا واحد طریقہ خاندانی دشمنی یا انتقام ہے۔ زندگی بہت ارزاں تھی اور کسی کو قتل کرنا غیر اخلاقی اور معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اپنے قبیلے یا اتحادیوں کے کسی شخص کو قتل کرنا غلط تھا۔ ہر قبیلہ اپنے کسی مقتول فرد کا بدلہ لینے کے لیے قاتل قبیلے کے کسی فرد کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور یہ واحد طریقہ تھا جس کے ذریعے قبیلے کا سربراہ اپنے لوگوں کو تحفظ فراہم کرسکتا تھا۔ اگر وہ بدلہ لینے میں ناکام ہوجائے تو کوئی شخص اس کی قوم کا احترام نہیں کرے گا اور اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبیلے کے لوگوں کو قتل کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ چونکہ عرب میں کوئی بھی شخص آسانی کے ساتھ روپوش ہوسکتا تھا اور اس کا سراغ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا، اس لیے صرف قاتل ہی کو سزا دینا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بدلے میں قبیلے کے مقتول افراد کے برابر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اس قبیلے کو کمزور کر دیا جاتا تھا۔ بدلہ لینے کا یہی وہ اصول ہے جس سے ہم قبائلی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انتقام لینے کے سلسلے میں ایک قبیلے کے کسی فرد کو دوسرے قبیلے کے فرد کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس نوع کی سماجی تنظیم کو گزرے طویل مدت ہو چکی ہے، اس لیے اس دور میں ہم بدلہ لینے کے اصول کو ناقابل قبول تصور کرتے ہیں لیکن جدید پولیس فورس کی عدم موجودگی میں نظم و نسق برقرار رکھنے کا یہی ایک قابل عمل اور موثر طریقہ تھا۔ چونکہ مجرم قبیلے کے کسی فرد کے قتل ہونے سے یہ قبیلہ کمزور ہو جاتا تھا اس لیے اس نظام کے تحت طاقت کا مناسب توازن برقرار رہتا۔ انتقام کے اصول کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی قبیلہ دوسرے قبیلے کے کسی شخص کو قتل کرنے میں آسانی سے پہل نہیں کر سکتا تھا لیکن اس طریق کار کے باعث عربوں کے لیے متحد رہنا ناممکن تھا۔ عرب اپنے محدود وسائل کو یکجا کرنے کے بجائے تشدد کی چکی میں پسے جا رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ بدلہ لینے کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

طاقت کا توازن برقرار رکھنے کا ایک اور ذریعہ "غزوہ" یا حملہ تھا جسے ایک مستقل پیشے یا قومی کھیل کی حیثیت حاصل تھی۔ مشکلات اور مصیبت کے زمانے میں ایک قبیلے کے لوگ اس امید کے ساتھ دشمن کے علاقے پر حملہ کر دیتے کہ انہیں وہاں سے اونٹ، مویشی یا دوسری چیزیں مل جائیں گی۔ جہاں تک ممکن ہوتا، خونریزی سے اجتناب کیا جاتا کیونکہ اس کے نتیجے میں انتقام لینے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ رہزنی اور لوٹ مار کو غیر اخلاقی فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا البتہ اس معاملے میں قرابت داروں یا اتحادیوں سے صرف نظر کیا جاتا۔ ڈاکے اور لوٹ مار کے نتیجے میں دولت ہاتھ آ جاتی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا سامان ان لوگوں کو مل جاتا جو ان اشیا سے محروم ہوتے تھے۔

اس غیر مہذب معاشرے میں، جہاں طاقت کا بے دریغ استعمال ہوتا، "مروہ" کئی اعتبار سے تقویت اور استحکام کا باعث تھا اور اس کی بعض خوبیوں کو اسلام میں اہم اقدار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ رسول اللہؐ نے سماجی تنظیم کا کوئی اور ذریعہ نہ پا کر امتِ مسلمہ کو قبائلی خطوط پر استوار کر دیا۔ اسلام نے اجتماعیت کے بجائے افراد کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کا جو نیا نظریہ متعارف کرایا، اس کی بدولت مسلمانوں میں جماعت کے تصور کا ادراک اور اخوت اور بھائی چارے کا ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ اسلام کے پیروکاروں میں مساوات کی روح اجاگر ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ قبائلی نظام میں اعلیٰ مراعات یافتہ طبقے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی وہاں اشرافیہ یا وراثتی عہدے جیسی کوئی چیز موجود تھی۔ کوئی بھی قبائلی سردار اپنا عہدہ بیٹے کے سپرد نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ قبیلے کو اپنی قیادت کے لیے حسب نسب یا مراعات سے قطعِ نظر سب سے بہتر شخص کی ضرورت ہوتی تھی۔ مساوات اور برابری کی بنیاد پر قائم ہونے والا استحصال سے پاک یہ عمیق اور مستحکم معاشرہ اسلام کا طرۂ امتیاز تھا اور مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی بلکہ ان کے فنی اور ادبی اداروں میں بھی یہ خصوصیات پوری شان وشوکت کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔

لیکن اخلاقیات کے ان اصولوں میں وحشیانہ پن کا عنصر نمایاں تھا۔ اس معاشرے میں صرف طاقت ور شخص ہی زندہ رہ سکتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کمزوروں کا صفایا کر دیا جاتا اور ان کا بری طرح سے استحصال کیا جاتا۔ آبادی پر کنٹرول کے لیے شیر خوار بچوں کو قتل کر دیا جاتا۔ چونکہ ہر قبیلہ عورتوں کی مختصر تعداد کے نان ونفقے کا انتظام کر سکتا تھا، اس لیے لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا اور اس گھناؤنے فعل پر تاسف کا اظہار بھی نہ کیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں غلاموں کی طرح عورتوں کے لیے بھی کوئی انسانی یا قانونی حقوق موجود نہیں تھے اور انہیں محض مالِ منقولہ تصور کیا جاتا تھا۔ عورتوں کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کیا جاتا، غرض انہیں اپنا مستقبل بہتر بنانے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ مرد جتنی عورتوں سے چاہتا، شادی کر لیتا۔ چونکہ نسل کا تعین عورت کے ذریعے ہوتا اس لیے انہیں ترکے میں جائیداد ملتی لیکن اس سے ان کے اختیارات اور اثر ورسوخ میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ مرد بعض اوقات ان خواتین کا ترکہ حاصل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ شادی کر لیتے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ عربوں کے پاس روایتی اصطلاح میں مذہب کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ افسانوی قبائلی روایات کو ترتیب دینے کے لیے وہ کسی کاہن یا جادوگر کو اپنے ہاں رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بجائے ان کے شاعر قبیلے کی عظمت اور عربوں کی اعلیٰ اقدار پر مبنی گیت گا گا کر ان خوبیوں کو شعروں میں زندۂ جاوید بنا دیتے۔ عرب شاعر دیوتاؤں اور دیویوں کی آفاقی جدوجہد کے قصے کہانیاں یا اپنے روایتی قومی کرداروں کے افسانے بیان کرنے کے بجائے اپنے قبیلے کے جنگی معرکوں اور کارناموں کا تذکرہ کرتے، لڑائیوں کی تباہ کاریوں پر نوحے کہتے اور قبیلے کے لوگوں میں ''مروہ'' کی خوبیوں پر احساسِ تفاخر پیدا کرتے۔ شاعری کو حد درجہ اہم فن کی حیثیت حاصل تھی اور عرب اس کی بے حد قدر ومنزلت کرتے تھے۔ چونکہ جزیرہ نما کے باشندے ناخواندہ تھے، اس لیے شاعر حضرات بلند آواز سے شعر پڑھتے۔ عربوں کا خیال تھا کہ شاعروں پر جنوں کا سایہ ہوتا ہے لہٰذا وہ شاعری کو نہ صرف مافوق الفطرت خوبی سمجھتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ شاعری میں ساحرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ کسی شاعر کی طرف سے دشنام طرازی اور ہجو کہنے کا دشمن پر تباہ کن اثر ہوتا۔ کسی غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر ہونے کو عام طور پر وجدانی مشاہدہ تصور کیا جاتا ہے اور عرب میں شاعر کسی کاہن یا پیغمبر کے بہت سے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی امنگوں اور خواہشات کی ترجمانی کرتا اور جب لوگ اس کے الفاظ سنتے تو وہ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعروں میں اپنی ہی آرزوؤں کا عکس دیکھتے۔ چنانچہ شاعروں کو عرب کی سیاسی اور سماجی زندگی میں زبردست اہمیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عرب شاعر وہ فرائض بجالاتے تھے جو ہمارے اپنے معاشرے میں ذمے دار میڈیا انجام دے رہا ہے۔ وہ لوگوں کو معلومات بہم پہنچاتے اور دوسرے قبائل کے سامنے واقعات کی اس انداز سے منظر کشی کرتے کہ پروپیگنڈے کی جنگ میں اس کے طاقتور اثرات مرتب ہوتے۔

لیکن جنوں اور بھوتوں کے زیرِ اثر کئی ایسے لوگ موجود تھے جن کا نبی کریمؐ کے زمانے میں زیادہ احترام نہیں کیا جاتا تھا۔ کاہنوں یا غیب کی باتیں بتانے والوں کو انجیل کی چلتی پھرتی مافوق الفطرت شخصیات کا درجہ حاصل تھا۔ انہیں مروجہ اصطلاح میں پیغمبر نہیں سمجھا جاتا تھا البتہ انہیں حق بات کہنے والوں کی حیثیت حاصل تھی اور اگر کسی کا اونٹ کھو جاتا یا وہ اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا چاہتا تو کاہنوں کے ساتھ مشورہ کرتا تھا۔ کاہن اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے مبہم یا ذومعنی باتیں کرتے چنانچہ ان کی ''فال اور استخاروں'' کو عموماً ناقابلِ فہم باتوں یا بے ربط لفظوں میں بیان کر دیا جاتا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ان کاہنوں کے لیے کوئی وقت نہیں تھا اور آپؐ ان لوگوں کی ''پیغمبرانہ'' باتوں کو سطحی، گمراہ کن اور بے معنی قرار دیتے تھے۔

لیکن عربوں کی ایک روحانی زندگی بھی تھی جسے وہ بے حد اہمیت دیتے تھے۔ وہ مختلف مقامات کو مقدس سمجھتے تھے جہاں وہ مخصوص دنوں میں قدیم رسوم کے مطابق دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ان میں مکہ میں زم زم کے چشمے کے قریب واقع کعبۃ اللہ کو سب سے زیادہ اہم مقدس مقام تصور کیا جاتا تھا۔ گرینائٹ کی یہ صندوق نما عمارت بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عمارت ان قدیم معبدوں اور قربان گاہوں سے مشابہ ہے جو اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ کعبہ کے مشرق کی جانب ایک سیاہ پتھر (حجرِ اسود) ایستادہ ہے۔ یہ شہابی پتھر آسمان سے گرا تھا اور اسے جنت اور زمین کے درمیان تعلق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے کعبہ کو سرکاری طور پر ہبل نام کے دیوتا سے منسوب کیا گیا تھا جسے نباطیوں کی بادشاہت سے، جو اب اردن ہے، عرب میں درآمد کیا گیا تھا۔ لیکن مکہ میں عام عقیدہ یہ تھا کہ کعبہ اصل میں اللہ کے نام سے معنون ہے جسے عرب اپنا معبود سمجھتے تھے۔ کعبہ کے گرد ایک دائرہ نما جگہ تھی جہاں زائرین سورج کی سمت کے مطابق سات مرتبہ طواف کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ یہ قدیم عبادت گاہ ۳۶۰ بتوں یا دیوتاؤں کی مورتیوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہ مورتیاں مقررہ مہینے میں عبادت کے لیے آنے والے مختلف قبائل اپنے ساتھ لاتے تھے۔ مکہ کی اردگرد کی زمین کو (جو کعبہ کے مرکز کے گرد بیس میل نصف قطر میں واقع ہے) ایک مقدس علاقے کی حیثیت حاصل تھی جہاں ہر قسم کے تشدد اور لڑائی کی ممانعت کی گئی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک لامذہب معاشرے میں پلنے بڑھنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب وغریب بات تھی لیکن کعبہ جیسی مقدس عبادت گاہ اور وہاں ادا کی جانے والی مذہبی رسوم سے عربوں کی اہم روحانی اور نفسیاتی احتیاج پوری ہوتی تھی۔ اگلے صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زندگی بھر پراسرار طور پر کعبے کی کشش محسوس کرتے رہے۔ اسی طرح کعبے کے گرد طواف کرنے کو، جو کسی غیر ملکی باشندے کے نزدیک گراں اور اکتا دینے والا کام ہے، مکہ کے لوگوں کی زندگی میں زبردست اہمیت حاصل تھی۔ یہ کوئی ایسا بے کیف فریضہ نہیں تھا جسے لوگ بادلِ نخواستہ اور بے سوچے سمجھے انجام دیتے تھے۔ وہ کعبے کے طواف سے لطف اندوز ہوتے اور انہوں نے اسے روزمرہ زندگی کا معمول بنالیا تھا۔ شکار کھیلنے کے بعد جب وہ واپس آتے تو گھروں کو لوٹنے سے پہلے کعبے کا طواف کرتے، اپنے کسی خوش باش ساتھی کے ہمراہ قریبی بازار میں شراب پیتے اور اگر ان کا مے خوار دوست شام کو رنگین بنانے کے لیے واپس نہ آتا تو وہ پھر کعبے کا طواف کرنے لگتے۔ اس مذہبی رسم کو ادا کرنے پر وہ کیوں مائل تھے اور ان کے خیال میں اس سے انہیں کیا حاصل ہوتا تھا؟

ایسا لگتا ہے کہ ساسانی دنیا میں اس معبد کو شروع ہی سے بے حد اہمیت حاصل تھی۔ اس کا گول گھیرا، چار کونے (جو دنیا کے چار کونوں کی نمائندگی کرتے ہیں) اور اس کے گرد ۳۶۰ مورتیاں، یہ سب چیزیں قدیم ساسانی مذہب سے چلی آرہی تھیں۔ ساسانیوں کا سال ۳۶۰ دنوں اور ان پانچ مقدس اضافی ایام پر مشتمل ہوتا تھا جو "وقت کی گردش سے باہر" آسمان اور زمین کے درمیان رابطہ کرنے کے لیے ان خصوصی رسوم کی ادائیگی میں گزارے جاتے تھے۔ عربوں کی اصطلاح میں یہ پانچ مخصوص دن فریضہ حج کے لیے وقف تھے جو سال میں ایک مرتبہ ادا کیا جاتا اور جس میں پورے جزیرہ نما کے عرب شریک ہوتے تھے۔ حج کا آغاز طواف کعبہ سے ہوتا جس کے بعد مکہ کے باہر مختلف دیوتاؤں سے منسوب دوسری رسوم ادا کی جاتیں۔ اصل میں حج خزاں کے موسم میں کیا جاتا تھا۔ حج کی مختلف تقریبات کے پسِ پردہ یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ آخری سانسیں لیتے ہوئے سورج کو اس قدر رد ق کیا جائے کہ وہ موسمِ سرما کی بارش برسانے پر مجبور ہو جائے۔ پھر یہ لوگ اکٹھے ہو کر گرج چمک کے دیوتا کی قیام گاہ وادی مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جاتے اور مکہ سے کوئی سولہ میل دور جبلِ عرفات کے گرد واقع میدانی علاقے میں پوری رات جاگ کر گزارتے، منیٰ میں تین مقدس ستونوں پر کنکریاں مارتے اور آخر میں جانوروں کی قربانی دیتے۔ آج کوئی شخص ان مذہبی رسوم کا مطلب نہیں سمجھتا لیکن رسول اللہؐ کے زمانے میں غالباً خود عرب بھی ان رسوم کی حقیقی اہمیت کو فراموش کر چکے تھے۔ اس کے باوجود عربوں کو کعبے اور عرب کے دوسرے مقدس مقامات سے گہری عقیدت تھی اور وہ کامل خلوص اور دل جمعی کے ساتھ یہ رسوم ادا کرتے تھے۔

ہم سب کو اپنی زندگی میں خلوت کی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے جہاں ہم تنہا کچھ وقت گزار سکیں۔ اس سے ہمیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی تمام تر توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے اور زیادہ تخلیقی سوچ پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ عرب میں، جہاں پوری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی، کسی جائے امن اور محفوظ عبادت گاہ کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ عرب کعبے میں ایک خوشگوار ماحول میں اکٹھے ہو سکتے تھے اور انہیں یہ علم ہوتا تھا کہ اس دورانیے میں قبائلی انتقام کے قوانین معطل رہیں گے۔ عملی اعتبار سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی دشمن قبیلے کے حملے کے خطرے کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کر سکیں گے۔ مکہ جیسے معبد عام طور پر اہم منڈیاں تھیں جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ لیکن اس جائے امن میں روحانی بالیدگی کا سامان بھی موجود تھا۔ کعبے کا طواف ان میں ایک نئی روح پھونک دیتا اور ان کی زندگی کو نئی جہت اور لافانی مسرتوں سے ہمکنار کر دیتا۔

خود کعبے کے چاروں کونوں کو پوری دنیا کی نمائندہ حیثیت حاصل تھی۔ اس کی دائرہ نما شکل دنیا کی تقریباً تمام تہذیبوں کے لیے اولین اور حقیقی نمونہ ہے جسے ابدیت، دنیا اور روح کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ زمان و مکان کے اعتبار سے یہ جگہ کلیت اور قطعیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مختلف روایات کے مطابق طواف کے عمل کو مشترکہ مذہبی حیثیت حاصل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تسلسل کے ساتھ اس مقام پر واپس آ رہے ہیں جہاں سے آپ نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح یہ فلسفہ حیات منکشف ہو جاتا ہے کہ آپ کا انجام دراصل زندگی کی ابتدا ہے۔ اس دائرے کے مرکز میں ایک چھوٹے نقطے سے دنیا کی گردش ظاہر ہوتی ہے جو ابدیت کی علامت ہے اور جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ کعبے کے گرد بار بار طواف کرنے سے زائرین کو اپنا مرکز اور سمت تبدیل کرنے اور دنیا کے بالمقابل اپنے مرکز کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے اور طواف کرنے کا عمل غور و فکر اور استغراق کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خانہ کعبہ کا طواف ''دلکی چال'' کی ایک قسم ہے۔ طواف جسمانی اعتبار سے یکسوئی کا متقاضی ہے جو بظاہر اکتا دینے والا عمل ہے لیکن حقیقت میں دماغ کو بلندیِٔ پرواز کی طرف مائل کرتا ہے۔ تمام روایات کے مطابق سب مقدس مقامات دنیا کے مرکز میں واقع ہیں اور انہیں قدیم دیوتاؤں کی یادگار سمجھا جاتا ہے چنانچہ زائرین کے ذہن میں اس مقام کی عظمت اور شان و شوکت کا پورا نقشہ محفوظ ہوتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں طاقت کے مرکز کا قرب حاصل ہو رہا ہے۔

ہم سب کو اپنی زندگی میں داخلی رویے کا صحیح سمت میں تعین کرنے کے لیے عبادت کرنے اور مذہبی رسوم پر کاربند رہنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر تواضع اور خوش خلقی کے لیے قدیم دستور اور روایات پر عمل کرنے سے ہم میں دوسروں کا احترام کرنے کی خُو پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے آزاد اور لادین معاشرے میں بہت سے لوگ اس قسم کی علامتی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتے اس لیے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ معاشرہ ظالم بلکہ پراگندگی اور انتشار کا شکار ہے۔ ہماری دنیا میں صرف آرٹسٹ ہی معنی خیز علامتیں تخلیق کرتا ہے جس سے ہم پر زندگی کی نئی جہت وا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے۔طواف یا حج جیسی عبادت کی بدولت عرب عملی اعتبار سے فنی حسن کی ایک اور صنف تخلیق کر رہے تھے جس کے معانی اور اہمیت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔وہ عمیق اور مبہم سطح پر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کی علامتی اور مجازی نوعیت کیا ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت تھی جس سے مغرب میں رہنے والے ہم میں سے بیشتر لوگ محروم ہو چکے ہیں۔ پروٹسٹنٹ دنیا میں پرورش پا کر پلنے بڑھنے والے لوگ اس ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کی وجہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے کئی پیروکار مذہبی رسوم اور عبادات کو مافوق الفطرت قرار دے کر انہیں شک وشبے اور معاندانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

خانہ کعبہ سب سے اہم اور مقدس مقام تھا لیکن اس زمانے میں کئی اور معبد بھی موجود تھے۔ اسلام سے پہلے جبلِ عرفات پر حج کے دوران جن مذہبی رسوم پر عمل کیا جاتا، جزیرہ نما میں ہر جگہ انہیں لازمی عنصر تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح زمین کے اس ٹکڑے کو تمام ذی روح مخلوق کی پناہ گاہ کا درجہ حاصل تھا۔ باقی کوئی مقدس مقام زمانے کی گردش سے محفوظ نہیں رہا البتہ ہمیں یمن میں نجران کے مقام پر کعبے اور مکہ کے جنوب میں الہلات جیسی عبادت گاہوں کا علم ہے۔لیکن ہماری کہانی کے لیے مکہ کے قریب واقع وہ تین مقدس مقامات بے حد اہمیت رکھتے ہیں جو اللہ کی تین بیٹیوں (بنات اللہ) سے منسوب تھے۔طائف شہر کی فصیل کے اندر لات کا معبد تھا جس کا مطلب ہے ''دیوی''۔ثقیف قبیلہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ یہ لوگ اسے الربا (یعنی سب سے بہتر) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔نخلہ میں عزیٰ کا معبد تھا جس کا مطلب ہے ''سب سے طاقتور''۔عزیٰ تین معبدوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا جس کے ساتھ سمندر کی جانب قضید کے مقام پر منات نامی معبد واقع تھا جس کا مطلب ہے ''قسمت کی دیوی''۔ یہ دیویاں یونانی اور رومن مندروں کی دیویوں سے بہت مختلف تھیں۔ وہ Juna یا Pallas Athena جیسے کردار نہیں تھے اور نہ ہی محبت یا جنگ میں ان کا کوئی مخصوص اثر ورسوخ تھا۔عربوں نے ان دیویوں کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کوئی دیو مالائی قصے نہیں گھڑے تھے اور اگرچہ وہ انہیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ یونانیوں اور رومیوں کی طرح ان دیویوں کی پرستش کرتے تھے۔ عرب کسی غیر مرئی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے اکثر خونی رشتوں کے الفاظ استعمال کرتے تھے، مثال کے طور پر بنات الدہر (وقت یا قسمت کی بیٹیاں) کا مطلب تھا حرماں نصیبی یا گردشِ ایام۔اسی طرح بنات اللہ کا مطلب تھا آسمانی مخلوق۔وہ اپنی عبادت گاہوں میں ان دیویوں اور دیوتاؤں کی تصویریں یا مجسمے نصب نہیں کرتے تھے اور کنعانیوں کی طرح، جن کا بائبل میں کئی مرتبہ ذکر ہوا ہے، بار آوری کی علامتیں استعمال کرنے کے بجائے بڑے بڑے پتھر رکھ دیتے تھے اور جب وہ ان پتھروں کی عزت وتکریم کرتے تو وہ ناپختہ اور سادہ انداز میں ان کی پوجا نہ کرتے بلکہ ان پتھروں کو معبودِ حقیقی کا مرکزِ نگاہ تصور کرتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان تینوں دیویوں کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق بار آوری کی سامی دیویوں انات اور اشتر سے تھا۔ چنانچہ عربوں میں یہ عقیدہ خانہ بدوش زندگی شروع کرنے سے پہلے اس وقت سے رائج تھا جب وہ کھیتی باڑی کرتے اور میدانوں میں رہتے تھے۔

(W. Montgomery Watt: Muhammad's Mecca, History in the Quran, Edinburgh, 1988)

عرب لات، عزیٰ اور منات کے بتوں یا مورتیوں کی پوجا نہیں کرتے تھے لیکن انہیں ان بتوں کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ ان کی مذہبی عبادت صرف ان مقدس مقامات تک محدود تھی۔ چنانچہ یونانیوں اور رومیوں کے برعکس، جو دیویوں اور دیوتاؤں کی گھروں میں پوجا کرتے تھے، عرب اپنے گھروں میں ان بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے البتہ یثرب کے بعض مشرکوں نے منات کی مورتیاں گھروں میں سجا رکھی تھیں۔ حجاز کے صحرانورد قبائل نخلہ، طائف اور قضید کو مقدس مقامات سمجھتے جو عربوں کی مرکزیت کی علامت تھے۔ ان دیویوں کی قدامت بھی ان کی مذہبی عبادت کی ایک اور وجہ تھی۔ عرب جب مقدس مقامات پر ان کی پوجا کرتے تو وہ اپنے آباء و اجداد سے روحانی قربت محسوس کرتے جو انہی مقامات پر بنات اللہ کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اس طرح یہ عمل ان کے زخموں کا مداوا ثابت ہوتا۔ اگرچہ دوسرے مقدس مقامات کو خانہ کعبہ کے مقابلے میں زیادہ اہم اور متبرک نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن عرب انہیں روحانی قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ یہ متبرک مقامات کئی عربوں کے تشخص کی علامت تھے اور اگر کوئی ان پر نکتہ چینی کرتا تو وہ اس کا بہت برا مناتے۔

لیکن دوسرے عرب اس قدیم مذہب سے مطمئن نہیں تھے اور دورِ جاہلیت کے آخری مرحلے میں عرب میں روحانی بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا۔ قبائلی نظام اور قدیم بت پرستی صدیوں سے صحرانشینوں کی تسکینِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی رہی تھی تاہم چھٹی صدی عیسوی میں زندگی کے طور طریقے بدل چکے تھے۔ جزیرہ نما عرب کا بیشتر حصہ تہذیب کے رویوں اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہا تھا، اس کے باوجود عربوں نے اس کے نظریات اور اس کی حرکی قوت سے آگہی حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ بعضوں نے اخروی زندگی کے نظریے کے متعلق سن رکھا تھا جس کی رو سے فرد کے ابدی مقدر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ یہ نظریہ قدیم قبائلی نظام کے گروہی نصب العین سے کس طرح مطابقت رکھ سکتا تھا؟ وہ عرب، جنہوں نے مہذب ملکوں کے ساتھ تجارت شروع کر دی تھی، وطن واپس آ کر ان ملکوں کے بارے میں پر اثر قصے بیان کرتے اور شاعروں نے شام اور فارس کے حیرت انگیز عجوبوں کا تذکرہ شروع کر دیا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ عربوں کو اس قسم کی طاقت اور شان و شوکت حاصل ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ قبائلی نظام میں رہ کر وہ اپنے محدود وسائل کو اکٹھا کر کے متحد قوموں اور پوری دنیا کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے؟ عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ باہمی جنگ و جدل اور انتقام کے لامتناہی سلسلے میں گھرے ہوئے تھے اور پرانی دشمنیوں کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اس کے ساتھ ہی جب وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نظریے سے روشناس ہونے لگے کہ افراد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے تو ان کی گروہی ثقافت کے نمایاں اوصاف ماند پڑنے لگے۔

جو عرب یہ سمجھتے تھے کہ وہ واضح نصب العین سے دور ہیں، وہ شہروں میں آباد تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں ایک قبیلہ جنوبی عرب کے مصیبت زدہ علاقے سے ہجرت کر کے یثرب میں آباد ہو گیا جہاں اس نے یہودی قبائل کے ساتھ بودوباش اختیار کر لی۔ اس قبیلے نے زراعت کے پیشے میں قسمت آزمائی کر کے نمایاں کامیابی حاصل کر لی لیکن اسے معلوم ہو گیا کہ قبائلی نظام صرف اسی صورت میں موثر طور پر کام کرتا ہے جب عرب ایک دوسرے کے آس پاس رہنے کے بجائے وسیع و عریض علاقوں میں آوارہ گردی کریں۔ ساتویں صدی کے آغاز تک پورا نخلستان تشدد اور لڑائی کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیکن مکہ میں، جہاں قریش کا قبیلہ، جس میں آنحضرتؐ تقریباً ۵۷۰ عیسوی میں پیدا ہوئے اور جو عرب میں سب سے زیادہ طاقتور قبیلہ بن گیا تھا، سخت مضطرب تھا کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ قدیم نظریے نے اسے شہری زندگی کے لیے تیار نہیں کیا۔

قریش پانچویں صدی کے آخر میں مکہ میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ قصی، اس کے بھائی زہرہ اور اس کے چچا تیم نے کعبے کے قریب سکونت اختیار کر لی۔ قصی کے ایک اور چچا کا بیٹا مخزوم اور چچازاد بھائی جمح اور سہم، قصی کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کے کنبے کا نام ان سے منسوب ہو گیا اور وہ وادی مکہ کے قریش کے نام سے مشہور ہو گئے۔ قریش کے دور کے رشتے دار نواحی دیہات میں آباد ہو گئے جنہیں مضافات کے قریش کہا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق قصی نے شام کا سفر کیا اور واپسی پر تین دیویوں لات، عزیٰ اور منات کے بت حجاز لے آیا اور نباطی دیوتا ہبل کو خانہ کعبہ میں ایک تخت پر بٹھا دیا۔ قریش نے طاقت اور فریب کے ذریعے مکہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے والی قبیلے خزاعہ کو، جو اپنے مقدس فریضے کو انجام دینے سے قاصر رہا، مکہ سے نکال باہر کیا۔ قصی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عبدالدار اور عبد مناف آپس میں لڑ پڑے۔ ان کی یہ لڑائی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے تک ان کی اولاد اور مکہ کی داخلی سیاست پر اثر انداز ہوتی رہی۔ عبدالدار قصی کا منظورِ نظر بیٹا تھا اور اسے مخزوم، سہم، جمح، ان کے چچا عدی اور ان کے کنبوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان لوگوں کو احلاف یا اتحادیوں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قصی کے چھوٹے بیٹے عبد مناف نے وراثت کے لیے مقابلہ کیا جس میں اس کے بھتیجوں اسد، زہرہ اور تیم اور قابلِ احترام معزز شخصیت الحارث بن فہر نے عبد مناف کی حمایت کی اور خانہ کعبہ میں عطر کے ایک پیالے میں ہاتھ ڈال کر ایک معاہدہ کر لیا۔ اس طرح وہ ''مطیبین''، یعنی خوشبودار کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی فریق بڑے پیمانے پر لڑائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کے درمیان مصالحت ہو گئی جس کی رو سے عبدالدار اور اس کے اتحادیوں کو معمولی مراعات مل گئیں لیکن حقیقی طاقت عبد مناف اور خوشبو میں رچے بسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کے پاس رہی۔ ان کے بعد ان کے وارثوں نے پرانے اتحاد کو برقرار رکھا۔

قریش نے روایتی گلہ بانی کے ساتھ ساتھ تجارتی سرگرمیاں بھی شروع کر دیں۔ مکہ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے باعث لمبی مدت کے لیے کاروبار کرنے کی غرض سے موزوں مقام پر واقع تھا۔ کعبہ کی حرمت کے پیشِ نظر ہر سال بہت سے عرب حج کے لیے یہاں آتے اور کعبے کی وجہ سے تجارت کے لیے مناسب فضا پیدا ہو گئی۔ مکہ عرب کی دو بڑی تجارتی شاہراہوں حجاز روڈ اور نجد روڈ پر واقع تھا۔ شاہراہ حجاز بحیرہ احمر کے مشرقی ساحل کے ساتھ یمن کو شام، فلسطین اور اردن پار کے علاقوں اور شاہراہ نجد یمن کو عراق سے ملاتی تھی۔ قریش تجارت میں بے حد کامیاب ہوئے۔ انہوں نے علاقے کے خانہ بدوش قبیلوں کے ساتھ اتحاد قائم کر کے مکہ شہر کی سلامتی کو یقینی بنا لیا۔ یہ صحرانورد قبائل قریش کے مقابلے میں بہتر سپاہی تھے۔ ان عسکری خدمات کے عوض انہیں مکہ کی کئی تجارتی کمپنیوں میں حصے دار بنا لیا گیا۔ اس طرح قریش اعلیٰ سیاسی تدبر کی بدولت، جسے حلم کہا جاتا تھا، چھٹی صدی عیسوی کے دوران عرب کی سب سے بڑی طاقت بن گئے۔

قریش کو احساس تھا کہ انہیں بڑی طاقتوں کو اپنا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ چنانچہ جنوبی بادشاہت کے حشر سے بچنے کے لیے فارس اور بازنطینی مملکت کے درمیان رسہ کشی کے دوران وہ سختی کے ساتھ غیر جانبدار رہے البتہ ۵۶۰ عیسوی میں بازنطینیوں کے ساتھ ان کے تعلقات اس وقت خراب ہو گئے جب جنوبی عرب ابھی تک بازنطینی سلطنت کی طفیلی ریاست حبشہ کا صوبہ تھا۔ جنوبی عرب کا حبشی گورنر ابرہہ مکہ کی تجارتی کامیابی پر حسد کرتا تھا چنانچہ اس نے مکہ پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس واقعے کو حاشیہ آرائی کر کے مزین کیا گیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابرہہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قریش کی کامیابی کعبے کی مرہونِ منت ہے۔ زائرین کا رخ جنوبی عرب کی طرف موڑنے اور صنعا کو تجارت کا مرکز بنانے کے لیے اس نے یمن کے دارالحکومت میں چوڑی دھاری کے سنگِ مرمر سے عیسائیوں کا ایک عظیم الشان گرجا گھر بھی تعمیر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے اپنے لشکر کو لے کر مکہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا تو اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ خانہ کعبہ کو گرا کر اسے برباد کر دے گا۔ لیکن جب وہ مکہ کے دروازوں پر پہنچا تو اس کی فوج پر طاعون نے حملہ کر دیا اور وہ ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ قریش نے ڈرامائی طور پر اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے واقعے کو ایک معجزہ قرار دیا۔ ابرہہ ایک ہاتھی بھی ساتھ لایا تھا اور اہلِ مکہ اس دیو قامت جانور کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ بعد میں بتایا گیا کہ جب یہ ہاتھی مکہ شہر کے باہر مقدس علاقے میں پہنچا تو گھٹنوں کے بل گر پڑا اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر خدا نے ساحلِ سمندر سے پرندوں کے ایک غول ابابیلوں کو بھیجا جس نے ابرہہ کی فوج پر زہر آلود کنکریاں برسائیں۔ یہ کنکر جس پر گرتا، اسے ہلاک کر ڈالتا۔ ہاتھی کا سال قریش کے لیے بے حد اہم تھا۔ رسول اللہؐ کے پہلے سیرت نگار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد ابن اسحاق (وفات ۷٦۷ عیسوی) نے لکھا ہے کہ اس معجزے کے بعد خانہ بدوش قبائل یہ کہہ کر قریش کی بڑی عزت وتکریم کرنے لگے: ''یہ خدا کے بندے ہیں، خدا ان کے لیے لڑا اور اس نے ان کے دشمنوں کے حملے کو پسپا کر دیا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ جس کا The Life of Muhammad میں حوالہ دیا گیا ہے)۔

خود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہاتھی کے قصے سے بہت متاثر ہوتے۔ قرآنِ حکیم کی سورہ ۱۰۵ میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے جو انہیں مٹی اور پتھروں کی کنکریاں مار رہے تھے پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا''۔ (مترجم)۔

ابرہہ کے حملے کے بعد قریش اپنی آزادی کی حفاظت کے معاملے میں زیادہ محتاط ہو گئے۔ ساتویں صدی کے اوائل تک انہوں نے اس قدر دولت اکٹھی کر لی جس کا صحرانوردی کے دور میں خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ انہوں نے دولت اور سرمایہ داری کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا جس نے انہیں غربت اور خطرات کی زندگی سے بچا کر خدائی تحفظ فراہم کیا تھا۔ اب انہیں بھوک اور افلاس سے نجات مل چکی تھی، نہ ہی انہیں دشمن قبیلوں کا کوئی خطرہ رہا تھا۔ ان حالات میں، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، دولت کو گویا مذہبی حیثیت حاصل ہونے لگی۔ لیکن سرمایہ داری کا یہ بڑھتا ہوا رجحان پرانی قبائلی اخلاقی قدروں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس طرح لوگوں میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی ہوس اور انفرادیت کا رجحان فروغ پانے لگا۔ دولت اکٹھی کرنے کے معاملے میں مختلف خاندانوں کے درمیان سخت مسابقت کی فضا پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جوان ہونے تک قریش دولت مندی کی بنیاد پر تین بڑے گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ بعض کمزور کنبے، جن میں بنی ہاشم بھی شامل تھے جس میں حضورؐ پیدا ہوئے، دولت کے معاملے میں دوسرے خاندانوں سے پیچھے رہ گئے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ لیکن قدیم قبائلی روایات کے مطابق دولت کو برابر تقسیم کرنے کے بجائے لوگ انفرادی طور پر دولت جمع کرنے لگے۔ انہوں نے یتیموں اور بیواؤں کے حقوق غصب کرنا شروع کر دیے، ان کی املاک کو ہڑپ کرنے لگے اور پرانی روایات کے برعکس قبیلے کے کمزور اور نادار لوگوں کی دیکھ بھال کرنے کا کام چھوڑ دیا۔ نئی خوشحالی نے روایتی اقدار کے ساتھ تعلق ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے نسبتاً پسماندہ لوگ ذہنی انتشار اور کشمکش میں مبتلا ہو کر مایوس ہو گئے۔

کامیاب ترین تاجر، ساہوکار اور مالی کاروبار کرنے والے لوگ فطری طور پر اس نئے نظام سے بے حد مسرور تھے چنانچہ وہ دولت سمیٹنے کو مذہبی فریضہ جان کر پورے جوش وخروش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ خانہ بدوشی کی زندگی کی تنگ دستی کی صرف دو نسلوں کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ دولت اور مادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشیا ہی انہیں بچا سکتی ہیں، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے کی ہوس میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن مکہ کی نوجوان نسل کے بعض لوگ، جو اس نئی صورتِ حال سے خوش نہیں تھے، شہر میں پائے جانے والے ہیجان اور اضطراب کا ایک نیا حل تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ریگستان کا مذہب ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم قبائلی روایات قرآنی پیغام پر اثرانداز ہوئی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی دعوت کو سب سے پہلے مکہ کے عربوں نے سرمایہ داری کی بے رحمانہ مسابقت کے ماحول میں قبول کیا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے الہامی مذہبوں اور یونان کے عقلیت پسندوں کے فلسفے کی طرح اسلام بھی شہر کی گود میں پروان چڑھا ہے۔ ہم لوگ، جو زندگی کے حقائق کا بہت کم تجربہ رکھنے والے نزارتھ کے عیسیٰؑ کو مذہبی روح کا خلاصہ سمجھتے اور اس ماحول میں پلے بڑھے ہیں، اس بات پر تعجب اظہار کریں گے۔ ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ لندن شہر یا وال سٹریٹ میں کوئی پیغمبر پیدا ہوسکتا ہے لیکن ہندومت، بدھ مت، جین مت اور کنفیوشس کے مذہب نے شہروں ہی میں آ کر آنکھیں کھولی تھیں۔ یونانی فلاسفر اگورا Agora کے مقام پر، جہاں لوگ جمع ہوتے اور خرید و فروخت کرتے تھے، تعلیم دیتے رہے اور اسرائیل کے پیغمبر اس وقت شہروں میں تبلیغ کرتے رہے جب یہودیوں نے خانہ بدوشی کی زندگی کو ترک کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ غرض تمام عالمی مذاہب نے شہری زندگی کے تجارتی ماحول میں ہی ترقی کی ہے۔ اس وقت تاجروں نے وہ طاقت حاصل کرنا شروع کر دی تھی جو ان سے پہلے صرف بادشاہوں، اشرافیہ اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی۔ نئی خوش حالی نے لوگوں کی توجہ امیر اور غریب کے درمیان پائی جانے والی عدم مساوات اور سماجی انصاف کے مسئلوں کی طرف مبذول کر دی۔ دنیا کے تمام بڑے مذہبی لیڈر اور پیغمبر ان سماجی مسئلوں کو حل کرتے رہے اور انہوں نے ان مسئلوں کا منفرد حل پیش کیا۔ ساتویں صدی کے شروع میں، جب قریش اور کئی دوسرے عرب صحرانوردی کو پیچھے چھوڑ کر شہری زندگی کے سماجی مسائل سے آگہی حاصل کر رہے تھے، پیغمبر اسلامؐ عربوں کے لیے ایک نیا دینی پیغام لے کر آ گئے۔

عرب کی سرزمین پر آباد لوگ پہلے ہی سے ایک توحید پرست دین کی تلاش میں سرگرداں اور رسول اللہؐ کا یہ پیغام سننے کے لیے تیار تھے کہ خدا صرف ایک ہے۔ آپؐ نے جب مکہ میں تبلیغ شروع کی تو عام طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا تھا کہ مشرک عربوں کی طرف سے ہبل کا بت نصب کرنے کے باوجود خانہ کعبہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ ساتویں صدی کے آغاز تک اللہ کو بہت سے عربوں کی مذہبی زندگیوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ کئی ابتدائی مذاہب میں اس خدا پر یقین رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی جسے بعض اوقات آسمانوں کا خدا کہا جاتا تھا۔ ان قدیم مذاہب کے پیروکاروں کا عقیدہ تھا کہ اسی خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کے بعد وہ تھک کر گوشہ نشین ہو گیا۔ منظر سے غائب ہونے کے بعد اس آسمانی خدا میں لوگوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ان دیوتاؤں اور دیویوں نے لے لی جو زیادہ پرکشش اور قابلِ رسائی تھیں۔ جب انسان نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور زمین میں کھیتی باڑی شروع کی تو بار آوری کی دیویوں نے مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کو خاص طور پر سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہودیوں کے آسمانی صحیفوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ یہودی جب کنعان میں آباد ہوئے تو انہوں نے اپنے خدا یہوا کے ساتھ بعل، اناث اور عشروت کی بھی پرستش شروع کر دی۔ بار آوری کی ان قدیم دیویوں کو، جو یہودیوں کے مقابلے میں زمین کو بہتر جانتی تھیں، نظر انداز کرنا حماقت تصور کیا جاتا تھا البتہ مصیبتوں کے زمانے میں وہ یہوا ہی کا نام لے کر اس سے امداد طلب کرتے تھے۔

صحرانشینی کے برسوں میں عرب کی قدیم دیویوں کے ثمر باری کے فرائض کو فراموش کر دیا گیا اور اللہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ قرآنِ کریم میں واضح کیا گیا ہے کہ تمام قریش کا عقیدہ یہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کو اللہ نے تخلیق کیا ہے:

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو کام میں لگانے والا کون ہے؟ تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ۔ اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمان سے پانی اتار کر زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کس نے کیا؟ تو یقیناً ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے۔ (سورہ العنکبوت، آیات ۶۱، ۶۳)۔

لیکن وہ اللہ کے ساتھ ان دوسرے معبودوں کی بھی پرستش کرتے رہے جو ان کے لیے بے حد اہمیت رکھتے تھے۔ یہودیوں کی طرح عرب بھی سکھ چین اور آسائش کے زمانے میں لات، عزیٰ اور منات کی پوجا کرتے رہتے لیکن مصیبت اور بحران کے دنوں میں جبلی طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے جس میں انہیں سنگین خطروں سے بچانے کی طاقت موجود تھی۔ قرآنِ حکیم ظاہر کرتا ہے کہ جب یہ لوگ بحری سفر پر روانہ ہوتے، جسے عرب ایک پرخطر کام تصور کرتے تھے تو وہ خطرہ ٹلنے تک اللہ کو یاد کرتے رہتے۔ لیکن جب وہ خشک زمین پر قدم رکھ کر خود کو محفوظ سمجھتے تو دوسرے معبودوں کی پوجا شروع کر دیتے۔

وہ اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان پر خوش ہوتے ہیں۔ ان پر ایک جھونکا سخت ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ (برے) آ گھرے، (اس وقت) سب سے خاص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہم کو اس سے بچا لے تو ہم ضرور شکرگزار بن جائیں گے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہارے لیے وبال ہونے والی ہے۔ دنیاوی زندگی کے یہ (چند) فائدے ہیں، پھر ہمارے پاس تم کو آنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو بتلا دیں گے۔

پس دنیاوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے زمین کی نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں، خوب گنجان ہو کر نکلی۔ یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہوگئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حکم (عذاب) آ پڑا سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا وہ کل کو موجود ہی نہیں تھی۔ ہم اس طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔ (سورہ یونس آیات ۲۲ تا ۲۴)۔

پس یہ لوگ جب کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لیے عبادت کو خالص کر کے۔ پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو اس وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔ (سورہ العنکبوت آیت ۶۵)۔

کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ دریا میں کشتیاں اللہ کے فضل سے چل رہی ہیں اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی نشانی دکھائے، یقیناً اس میں ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اور جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ (نہایت) خلوص کے ساتھ اعتقاد کر کے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ (باری تعالیٰ) انہیں نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچاتا ہے تو کچھ ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو بدعہد اور ناشکرے ہیں۔ (سورہ لقمٰن آیات ۳۱، ۳۲)۔

کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ پھر تمہیں دریا کے سفر میں لے آئے اور تم پر تیز و تند ہواؤں کے جھونکے بھیج دے اور تمہارے کفر کے باعث تمہیں ڈبو دے، پھر تم اپنے لیے ہم پر اس کا دعویٰ (پیچھا) کرنے والے کسی کو نہ پاؤ گے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۹)۔

لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض عرب اس سے بھی آگے جانے کو تیار تھے۔ ساتویں صدی شروع ہوئی تو بیشتر عرب یہ یقین کرنے لگے کہ اللہ وہی ہے جس کی یہودی اور عیسائی پرستش کرتے ہیں۔ وہ عرب، جنہوں نے عیسائیت قبول کر لی، خدا کو اللہ ہی کے نام سے پکارتے اور مشرکوں کے ساتھ حج کرتے تھے البتہ عربوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ اللہ نے ان کے لیے کوئی آسمانی صحیفہ نازل نہیں کیا۔ رسول اللہؐ کے ابتدائی سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ مشرک عرب "آسمانی صحیفے رکھنے والے لوگوں" کا بے حد احترام کرتے تھے جنہیں وہ علم حاصل تھا جس سے عرب محروم تھے۔ بعضوں نے ایک ایسے مستند دین کی تلاش شروع کر دی جس کا بڑی طاقتوں، سامراجی قوتوں اور غیر ملکی قبضے کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ پانچویں صدی میں فلسطین کے ایک عیسائی مورخ سوزومینس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Sozomenus نے لکھا ہے کہ بعض عربوں نے حضرت ابراہیمؑ کے اس پرانے دین کو از سرِ نو دریافت کر لیا تھا جس پر وہ اپنے زمانے میں عمل کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی۔ وہ موسیٰ سے پہلے اسرائیلی قوم کے لیے تورات لے کر آئے تھے۔ عرب میں، جس وقت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہو رہی تھی، کئی عرب حضرت ابراہیمؑ کے دین پر کاربند ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

محمد ابن اسحاق نے سیرت رسول اللہؐ میں لکھا ہے کہ نبی کریمؐ کا مشن شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے قریش کے چار شخصوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ مشرکوں کی طرح کعبے میں بتوں کی پوجا نہیں کریں گے اور سچے مذہب کو تلاش کریں گے۔ انہوں نے ایک خفیہ معاہدہ کر کے اپنے قبیلے والوں سے کہا:

علم حاصل کرو، اللہ کی قسم! تمہاری قوم کسی ٹھیک راستے پر نہیں۔ وہ اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین کو بھول چکے ہیں۔ پتھر کیا چیز ہے جس پر نجاست ڈالی جاتی ہے؟ نہ وہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ نقصان دیتا ہے، نہ نفع پہنچاتا ہے۔ لوگو! اپنے لیے کوئی دین ڈھونڈو کیونکہ اللہ کی قسم تم کسی صحیح طریقے پر نہیں۔ طریق حنیفیہ دینِ ابراہیمؑ کی تلاش میں ملکوں میں پھیل جاؤ۔ (راہِ حق کے متلاشی ان چار افراد کے نام یہ ہیں: ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو... مترجم)۔

بعض مغربی اسکالروں نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ طریقِ حنیفیہ کا عنوان ایک مقدس روایت ہے۔ اس سے کسی تاریخی حقیقت کے بجائے اس روحانی اضطراب کی عکاسی ہوتی ہے جو جاہلیت کے آخری مرحلے کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس دین کی کوئی واقعاتی بنیاد بھی ہونی چاہیے۔ جن چار افراد کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان میں سے تین کو حضورؐ اور آپؐ کے ابتدائی صحابہؓ کی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل تھی جب کہ چوتھا شخص عثمان بن الحویرث اس وقت مکہ کی اہم شخصیت تھا جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جوان تھے اور آپؐ کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ عثمان قریش کا ایک متمول تاجر تھا۔ اس نے عیسائیت قبول کر لی اور اپنے قبیلے والوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اسے اپنا بادشاہ مان لیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ انہیں بازنطینی حکمرانوں سے، جو مکہ کو غالباً اپنی طفیلی ریاست بنانا چاہتے تھے، بہتر تجارتی مراعات دلا دے گا۔ لیکن قریش نے اس تجویز کو فوراً مسترد کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام عربوں کی طرح قریش بھی بادشاہت کے نظریے کے سخت مخالف تھے۔

دینِ حنیف کے متلاشی باقی تین افراد مسلمانوں کے لیے جانے پہچانے شخص تھے۔ عبید اللہ بن جحش آنحضرتؐ کا پھوپھی زاد تھا۔ اس نے پہلے تو اسلام قبول کر لیا اور بعد میں عیسائیت اختیار کر لی۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ ورقہ بن نوفل نے، جو عیسائی بن گیا تھا اور جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پہلی زوجہ محترمہ (حضرت خدیجہؓ) کا چچا زاد بھائی تھا، خدا کی طرف سے وحی نازل ہونے پر رسول اللہؐ کی بے حد حوصلہ افزائی کی تھی۔ لیکن سب سے آخری شخص راہِ حق کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہا اور اس نے کوئی بھی الہامی مذہب قبول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ کیا۔ زید بن عمرو نے نہ صرف خانہ کعبہ میں بت پرستی کو ترک کر دیا بلکہ وہ کفار کے مذہب کا شدید نکتہ چیں بھی تھا۔ اس کا سوتیلا بھائی خطاب ابن نوفیل مشرک تھا۔ اس نے دیویوں سے انکار اور ان کی بے حرمتی کرنے پر زید کی لعن طعن کی اور آخر اسے شہر سے نکال دیا۔ خطاب ابن نوفیل نے زید کو حرمِ پاک کے حدود میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے مکہ کے باہر، جہاں زید چھپا ہوتا، گشت کرنے کے لیے اوباش کافر نوجوانوں کا ایک ٹولہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ زید نے حجاز کو چھوڑ دیا اور سچے مذہب کی تلاش کے لیے مہذب ملکوں میں گھومتا رہا۔ وہ عراق کے شہر موصل اور اس کے بعد شام چلا گیا۔ راستے میں اسے جو بھی راہب یا ربی ملتا، وہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کے اصل دین کے بارے میں استفسار کرتا۔ آخر ایک راہب نے اسے بتایا کہ مکہ میں ایک پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے جو اس دین کا پرچار کرے گا جسے وہ تلاش کر رہا ہے۔ اس کے بعد زید واپس وطن کی جانب روانہ ہو گیا۔ لیکن شام کی جنوبی سرحد پر اسے قتل کر دیا گیا اور وہ رسول کریمؐ کے ساتھ کبھی رابطہ نہ کر سکا البتہ اس کا بیٹا سعیدؓ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتہائی قابلِ اعتماد ساتھی بن گیا۔

یہ ایک نصیحت آموز قصہ ہے جس سے اس زمانے میں بعض عربوں کی مضطرب روح کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشرکوں کے مذہب کی مخالفت کرنا کس قدر مشکل اور خطرناک کام تھا۔ خطاب ابنِ نوفیل جیسے قریشی کو اپنے آباء واجداد کے مذہب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ قدیم دیوتاؤں اور دیویوں کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ مذہب تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قریش کعبے کے مذہب کو کامل دین سمجھتے تھے اور ان کی تمام تر توجہ مکہ میں قریش کے اتحاد پر مرکوز تھی۔ ہم دیکھیں گے کہ خطاب کے بیٹے عمرؓ بھی پرانے مذہب کے ساتھ اپنے باپ کی محبت اور وابستگی میں اس کے شریکِ کار تھے۔ لیکن ایک متبادل دین کی خواہش دلوں میں بدستور پرورش پاتی رہی۔ ایک روایت کے مطابق مکہ سے جبراً نکالے جانے سے ایک دن پہلے زید نے کعبے کے قریب کھڑے ہو کر طواف کرنے والے قریش سے کہا تھا: ”اے قریش! اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں زید کی جان ہے، میرے سوا تم میں ایک بھی شخص ابراہیمؑ کے دین پر کاربند نہیں“۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا: ”خدایا! اگر میں جانتا کہ تم کس طرح پوجے جانے کو پسند کرتے ہو تو میں اسی طرح تمہاری پرستش کرتا، لیکن مجھے تمہارا پسندیدہ طریقہ معلوم نہیں“۔ (The Life of Muhammad P.99)۔ اس واقعے کے فوراً بعد خدا نے عربوں کی دعا سن لی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

نزولِ وحی

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہمارا علم بہت محدود ہے البتہ قرآنِ کریم نے چالیس سال کی عمر میں وحی نازل ہونے کے بعد حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی سے پہلے کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں:

کیا اس نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟
اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی؟
اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا؟ (سورہ الضحیٰ آیات ۶ تا ۸)

مسلمانوں کی بعد کی روایات میں ان ٹھوس حقائق کو افسانوی تفصیلات سے اس طرح مزین کیا گیا ہے جس طرح ان سے پہلے متی اور لوقا نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، لڑکپن اور بچپن کے بارے میں افسانوی قصے کہانیاں وضع کی تھیں جو مذہبی حقائق کو شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کی واضح مثال ہے اور جس سے عیسیٰؑ کے مشن کی نوعیت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان تمام تر تماثیل کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ انہیں شکم مادر ہی میں عظمت اور بزرگی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس طرح حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلامؐ دونوں کو کلاسیکی اعتبار سے برگزیدہ اور اولوالعزم شخصیات کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ دونوں پیغمبر مشاہدے کی نئی اقلیموں میں اترے، دونوں نے اپنی جانوں کو جوکھوں میں ڈالا اور اپنی اپنی قوم کو ایک ایسا تحفہ دیا جس نے ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے ان کی کایا پلٹ دی۔ ان کی مثال یونانی دیوتا پرومتھیس Prometheus کی مانند ہے جس نے دیوتاؤں سے آگ چرا کر اس سے زمین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر بنی نوع انسان کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا۔ ایسے ہیروز کے بچپن کی کہانیوں سے عام طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی بے مثل قسمت کی تیاری کے پسِ پردہ وہ طاقتیں کارفرما تھیں جو ہماری حدِ ادراک سے باہر ہیں۔ حضرت عیسیٰ ایک کرشماتی مسیحا بن گئے اور یہ معجزہ ان کی بالغ زندگی کا نمایاں جوہر تھا۔ ان کے برعکس حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معجزے نہیں دکھائے بلکہ آپؐ نے ہمیشہ یہ اعلان کیا کہ آپؐ پر وحی کے ذریعے قرآنِ حکیم کا نزول بذاتِ خود ایک معجزہ اور اس کے ربانی مبدا ہونے کی کافی دلیل ہے۔ آپؐ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ بھی ایک انسان ہیں۔ قرآنِ کریم نے بھی حضورؐ کے اس دعوے کی تصدیق کی ہے۔ اس باب کے شروع میں ہم نے جو سورہ (الضحیٰ) نقل کی ہے، اس میں واضح کیا گیا ہے کہ جب خدا نے آپؐ پر وحی نازل کی تو آپؐ سے غلطی سرزد ہوگئی اور آپ راہ بھولے ہوئے تھے۔ (آج بیشتر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسولِ کریمؐ چونکہ حقیقی معنوں میں ایک کامل انسان تھے، اس لیے آپؐ سے کسی غلطی کا سرزد ہونا ممکن نہیں۔ میں اس کتاب کے نویں باب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کروں گی)۔ حضورؐ کی والدہ محترمہ کے حمل اور آپؐ کے بچپن کے بارے میں معجزانہ کہانیاں آپؐ کی بقیہ زندگی کا نمایاں وصف نہیں بلکہ آپؐ کی پیغمبرانہ استعداد کی نوعیت شاعرانہ پرتو ہے جس سے مسلمانوں کے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ آپؐ دنیا بھر کی قوموں کے مطلوب ومقصود تھے بلکہ یہودی اور عیسائی بھی آپؐ کے ظہور کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

ایک روایت کے مطابق ایک عیسائی راہب نے دینِ حنیف کے پیروکار زید ابن عمرو کو ایک عرب پیغمبر کے ظہور کی پیش گوئی کی تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ابتدائی زندگی اور مسلمان برادری میں یہ جوہر پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حجاز کے عربوں کا عیسائیوں کے ساتھ بہت کم رابطہ تھا اور وہ مسیحیت کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ شام اور فلسطین کے پھلتے پھولتے اور فعال کلیساؤں سے مسلمانوں کا سامنا حضورؐ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ قرآنِ حکیم میں عیسائی مذہب کا بہت کم تذکرہ ہوا ہے لیکن اس میں دین مسیح کے بارے میں کوئی عداوت یا تعصب نہیں پایا جاتا۔ قرآنِ کریم کے مطابق رسول اللہؐ پر وحی کا نزول قدیم ادیان کا تسلسل تھا جس سے پرانے مذاہب کی تصدیق ہوتی ہے۔ سریانی کلیسا کے بعض عرب عیسائیوں نے انجیل کے ایک پیرے کا اس انداز سے ترجمہ کیا تھا جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کے منتظر تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا تھا کہ اپنی وفات کے بعد وہ ایک غم خوار روح القدس (فارقلیط) کو اپنے پیروکاروں کے پاس بھیجیں گے جو ان کی تعلیمات کی یاد دہانی اور انہیں سمجھنے میں ان کی مدد کریں گے۔ (محمد ابنِ اسحاق: سیرت رسول اللہؐ The Life of Muhammad P.104)۔ سریانی کتاب الصلوٰۃ میں، جس میں نماز کے متعلق انجیل کے بعض حصے درج ہیں، ''فارقلیط'' کے بجائے perikytos کا لفظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھتے جس کا عربی زبان میں ترجمہ "احمد" ہے۔ عرب میں یہ نام عام تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح اس کا مطلب ہے "تعریف کیا گیا"۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے نام کے مطلب سے آگاہ تھے کیونکہ قرآنِ حکیم میں یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ ان کے بعد "احمد" نام کے پیغمبر معبوث ہوں گے جو ان کے پیغام کی تصدیق کریں گے۔ (اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا: اے (میری قوم) بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے۔ (سورہ الصف آیت...۶ مترجم)۔

عرب کے شمالی علاقوں کی زرعی بستیوں میں آباد یہودیوں کو بھی جزیرہ نما میں ایک پیغمبر کے معبوث ہونے کی توقع تھی۔ دورِ جاہلیت کے آخر میں دینِ مسیح کو فروغ حاصل ہو رہا تھا جس سے یہودیت کی روایتی اصطلاح میں عرب اضطراب کی عکاسی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ایک نیک اور پارسا یہودی ربی (ابن الهيبان... مترجم) شام سے ہجرت کر کے یثرب میں آن بسا۔ جب لوگوں نے اس سے سوال کیا کہ وہ سرسبز و شاداب اور زرخیز ملک کو چھوڑ کر تکالیف دہ اور بھوک کی سرزمین میں کیوں آ گیا ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ وہ "پیغمبر" کی آمد کے موقع پر حجاز میں موجود رہنا چاہتا ہے۔ اس پیغمبر کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس نے یثرب کے یہودی قبیلوں سے کہا: "میں اس شہر میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ ایک نبی کے ظہور کا انتظار کروں جس کا زمانہ قریب آ چکا ہے اور یہ شہر اس کی ہجرت گاہ ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ معبوث ہو اور میں اس کی پیروی کروں۔ اب تمہارے لیے اس کا زمانہ قریب ہے۔ پس اے گروہِ یہود! ایسا نہ ہو کہ اس کی طرف کوئی اور تم سے سبقت کر جائے۔ وہ ذاتِ مبارک خوں ریزی کے لیے مجبور ہوگی۔ مخالفوں کی عورتیں اور بچے بھی اس کے پاس قید ہوں گے۔ یہ باتیں تمہیں اس پر ایمان لانے سے نہ روک دیں"۔ (محمد ابنِ اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۳۶، The Life of Muhammad)۔ اس جوش اور ہیجان کا یثرب کے ان مشرک عربوں پر گہرا اثر ہوا جو یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا مذہب یہودیوں کے مقابلے میں کمتر اور ادنیٰ درجے کا ہے کیونکہ یہودیوں کے پاس آسمانی صحیفے موجود ہیں۔ بعد میں ان میں سے ایک مشرک نے نخلستان میں یہودیوں اور عرب قبائل کے درمیان پائی جانے والی اس کشیدگی کو ان لفظوں میں بیان کیا:

> ہم لوگ مشرک اور بت پرست تھے اور (یہودی) اہلِ کتاب تھے۔ ان کے پاس ایک قسم کا علم تھا جو ہمارے پاس نہ تھا۔ ہمارے درمیان لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب ہم ان سے کوئی چیز لے لیتے جو وہ ناپسند کرتے تو وہ کہتے: ایک نبی کا زمانہ قریب آ گیا ہے اور اب وہ معبوث ہوں گے۔ ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں اس طرح قتل کریں گے جیسے عاد اور ارم کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ بات ہم ان سے اکثر سنا کرتے تھے۔ (محمد ابن اسحاق سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۳۶: The Life of Muhammad P.94)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کتاب کے ساتویں باب میں ہم دیکھیں گے کہ اس ماحول نے یثرب کے عربوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے تیار کر دیا تھا اور جب انہیں آپؐ کی بعثت کا علم ہوا تو انہوں نے حضورؐ کو متوقع پیغمبر کے طور پر فوراً تسلیم کر لیا۔ فلسطین میں بھی حد درجہ توقعات پائی جاتی تھیں جہاں مسیح کے پیروکاروں نے اسی قسم کی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ جو پیغمبر اپنے خدا کی جانب سے گفتگو کرے، اصل میں وہ اپنی قوم کے ترجمان کی حیثیت سے اپنے عوام کی امیدوں اور اندیشوں کی عکاسی کرتا اور اپنے عہد میں پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب میں شریک ہو کر نہایت عمیق سطح پر اسے دور کرتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی توقعات سے متعلق قصوں سے نہ صرف ساتویں صدی کے اوائل میں عرب کے روحانی اضطراب کی نشان دہی ہوتی ہے بلکہ اس سے یہ ٹھوس اشارہ بھی ملتا ہے کہ عیسیٰؑ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جیسی پیغمبرانہ عظمت رکھنے والے ہیروز اپنے زمانے اور آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ نور ہیں اور انہوں نے جو کامیابیاں حاصل کیں، وہ اس قدر رفیع الشان اور زمانے کی ضروریات سے اس قدر ہم آہنگ تھیں کہ وہ پراسرار انداز میں پہلے سے متعین معلوم ہوتی ہیں جن سے ماضی کی تمام مذہبی توقعات پوری ہو گئی تھیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس روحانی کشمکش سے پوری طرح آگاہ تھے جس نے مکہ کے معاشرے کو حالیہ کامیابیوں کے باوجود ایک تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار کر رکھا تھا۔ آپؐ تقریباً ۵۷۰ عیسوی میں قبیلہ بنی ہاشم میں پیدا ہوئے جس کا اقتدار روبہ زوال تھا اور جو یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ناموافق حالات سے دوچار ہے۔ قصی کا پوتا ہاشم ابنِ عبدالمناف اپنی زندگی میں مکہ کی اہم شخصیت تھا۔ یہ وہی ہاشم تھا جس نے ہر سال دو تجارتی کاروان مکے سے شام اور یمن بھیجنا شروع کیے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حبشہ کے نجاشی اور بازنطینی شہنشاہ کے ساتھ اس کے اچھے مراسم قائم تھے۔ اس نے جس قبیلے کی بنیاد رکھی، وہ شروع شروع میں بہت کامیاب ہوا۔ ہاشم کا بیٹا عبدالمطلب ایک کرشماتی شخصیت کا مالک تھا جس نے زم زم کے اس مقدس چشمے کو کھدائی کر کے از سرِ نو دریافت کیا تھا جسے قریش کے نجس پیشروؤں نے بند کر دیا تھا۔ چنانچہ ہاشم کے قبیلے کو حج کے دوران زائرین کو زم زم سے پانی پلانے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ عبدالمطلب ایک دولت مند تاجر بھی تھے جن کے اونٹوں کے بڑے ریوڑ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خانہ بدوشی کی قدیم روایات پر کاربند تھے۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں جن میں سے ہر شخص دوسرے سے زیادہ حسین و جمیل تھا۔ مورخ محمد ابنِ اسحاق نے مکہ کے لوگوں کے بارے میں عبدالمطلب کے بیٹوں کے تاثرات اس طرح درج کیے ہیں: ''عربوں میں مکہ کے باشندوں سے زیادہ کوئی نمایاں، باوقار اور شریف انسان موجود نہیں تھا۔ ان کی ناک اتنی لمبی تھی کہ پانی پیتے وقت ہونٹوں سے بھی سبقت کرتی تھی''۔ (کتاب الطبقات الکبیر: Andrae : Mohammad PP. 43-44)۔ عبدالمطلب کو اپنے سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی اور وہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے خوبصورت تھے۔ عبداللہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والد گرامی تھے۔

لیکن قریش کے لیے یہ بڑے کٹھن اور صبر آزما سال تھے۔ ان برسوں میں قریش کے مختلف قبائل کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ رسول اللہؐ کے بچپن کے زمانے میں ایک مشہور واقعے کی وجہ سے احلاف (اتحادیوں) اور مطیبین (خوشبودار) کے درمیان پرانی دشمنی تازہ ہوگئی۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب جب بوڑھے ہوگئے تو ہاشم کی قدرومنزلت میں ڈرامائی طور پر زبردست اضافہ ہوگیا تھا۔ یمن کے ایک تاجر نے قبیلہ سہم کے ایک اہم شخص کے ہاتھوں بعض اشیا فروخت کیں۔ یہ قبیلہ احلاف یا اتحادیوں میں شامل تھا۔ لیکن اس شخص نے ان چیزوں کی قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر یمنی تاجر نے قریش کے قبیلے سے درخواست کی کہ اسے انصاف دلایا جائے۔ قبیلہ تیم کے سردار نے، جو خوشبودار پارٹی میں شامل تھا، ایک اجلاس بلا کر انصاف اور صحیح معاملت پر یقین رکھنے والے تمام افراد کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دے دی۔ خوشبودار جماعت میں شامل ہاشم، المطلب، اسد اور زہرہ کے خاندانوں نے مثبت ردِعمل کا اظہار کیا اور حلف اٹھا کر ایک معاہدہ کر لیا جو بعد میں حلف الفضول کے نام سے مشہور ہوگیا۔ انہوں نے خانہ کعبہ میں قسمیں کھائیں اور اس بات پر معاہدہ منعقد کیا کہ اگر انہوں نے مکہ میں کسی شخص کو مظلوم پایا تو اس کی امداد کے لیے کھڑے ہو جائیں گے خواہ وہ مکہ کا باشندہ ہو یا باہر سے آیا ہو۔ جس نے بھی ظلم کیا، اس کا مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ وہ مظلوم کا حق لوٹا دے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو ابھی لڑکے تھے، اس موقعے پر موجود تھے۔ آپؐ نے نہایت جوش اور ولولے کے ساتھ اس حلف کی تائید اور حمایت میں گفتگو کی۔ لیکن یہ معاہدہ غالباً تجارتی مقاصد کے لیے کیا گیا تھا۔ جو خاندان اس معاہدے میں شریک ہوئے تھے، وہ ان اتحادی خانوادوں کے مقابلے میں کمزور ہو گئے تھے جنہوں نے مکے کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کر کے دوسروں کو دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا البتہ اس معاہدے نے کمزوروں کو اجارہ داری کے خلاف متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

پیغمبر اسلامؐ کے بچپن کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آپؐ کے خاندان کو سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ جب نوجوان عبداللہ کو بیاہنے کا وقت آیا تو عبدالمطلب نے زہرہ قبیلے کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لیے خود اپنی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی بالترتیب ہالہ بنت وہیب اور حضورؐ کی والدہ آمنہ بنت وہب کے ساتھ منگنی کر لی۔ یہ دونوں معزز خواتین قبیلہ زہرہ کے ایک سرکردہ تاجر کی رشتے دار تھیں۔ حضورؐ کے شکمِ مادر میں رہنے کے متعلق روایات حضرت عیسیٰؑ کے حالتِ حمل میں ہونے کے سلسلے میں متی اور لوقا کی روایت کے بالکل برعکس ہیں۔ اسلام میں مجرد زندگی گزارنے کا کوئی تصور موجود نہیں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نے اپنے پیغمبرؑ کی کنواری ماں کے ہاں ولادت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ عبدالمطلب ایک روز اپنے بیٹے عبداللہ کا ہاتھ پکڑے مکہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک عورت نے (بنی اسد بن عبدالعزیٰ کی یہ خاتون ورقہ بن نوفل کی بہن تھی ... مترجم) عبداللہ کو اختلاط کی ترغیب دینے کی کوشش کی۔ اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں ایک عرب جتنی چاہے، بیویاں رکھ سکتا تھا اور عبداللہ شادی کے لیے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس عورت سے کہا: ''میں اپنے والد کے ساتھ ہوں، نہ ان کے خلاف جا سکتا ہوں اور نہ انہیں چھوڑ سکتا ہوں۔'' عبدالمطلب، عبداللہ کو لے کر چلے اور انہیں وہب بن عبد مناف کے پاس لائے جو ان دنوں بنی زہرہ میں عزت و نسب کے لحاظ سے سردار تھے۔ وہب نے اپنی بیٹی آمنہ کو عبداللہ کے نکاح میں دے دیا۔ لیکن اگلی صبح جب عبداللہ نے اس عورت کو دیکھا جس نے انہیں شادی کی تجویز پیش کی تھی تو اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی اور کہا: ''کل عبداللہ کی آنکھوں کے درمیان نور کا ایک تیز شعلہ پوری آب و تاب کے ساتھ بھڑک رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی قوم کے لیے ایک پیغمبر ان کے ہاں پیدا ہوگا۔ آج یہ شعلہ بجھ گیا ہے اور خدا کا پیغمبر کسی اور خاتون کے شکم میں منتقل ہو گیا ہے''۔

عبداللہ بن عبدالمطلب زیادہ دیر زندہ نہ رہے اور رسول اللہؐ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ عبداللہ کی وفات سے خاندان کو کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ترکے میں صرف پانچ اونٹ اور بحیرا نامی نوجوان لونڈی شامل تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شکمِ مادر میں تھے تو آمنہ کو کوئی تکلیف نہ ہوئی بلکہ انہیں پردۂ غیب سے یہ آواز سنائی دی کہ عربوں کا فرمانروا اور سلطانِ دو جہاں ان کے پیٹ میں ہے۔ آمنہ نے اپنے پیٹ سے ایک نور کو آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھا جس میں انہیں شام میں، جو بعد میں اسلام کی روشنی سے فیض یاب ہوا، بصریٰ کے محل دکھائی دے رہے تھے۔ حضورؐ کی ولادت باسعادت بارہ ربیع الاول کو ہوئی۔ (سنہ عامتہ الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ عیسوی بعد از صبح صادق قبل از طلوع نیرِ عالم تاب کا ظہور ہوا... مترجم)۔ آمنہ نے آپؐ کے دادا عبدالمطلب کو فوراً اطلاع دی اور انہیں بتایا کہ یہ بچہ ایک دن عظیم انسان بنے گا۔ بوڑھے عبدالمطلب اپنے پوتے کو اٹھا کر کعبۃ اللہ میں لے آئے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اور اس کی عطا پر شکر ادا کرتے کھڑے رہے۔ خود عبدالمطلب کو یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مستقبل انتہائی روشن اور تابناک ہوگا۔ ایک کاہن نے عبدالمطلب کو یہ پیش گوئی کی تھی کہ ان کی اولاد میں سے ایک شخص پوری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ عبدالمطب نے ایک رات خواب میں رسول اللہؐ کی پشت سے ایک درخت نکلتے دیکھا جس کا بالائی حصہ آسمان کو چھو رہا تھا اور اس کی شاخیں مشرق اور مغرب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس درخت سے ایک روشنی نکل رہی تھی اور عرب اور فارس، جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا، اس کی پرستش کر رہے تھے۔

عرب میں یہ دستور تھا کہ بچوں کو پرورش کے لیے ریگستان میں دودھ پلانے والی عورتوں کے سپرد کر دیا جاتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاکہ وہ شہر کے بجائے صحت مند فضا میں پروان چڑھ سکیں۔ خیمہ نشین عورتیں قریش کے کسی بچے کو گود میں لینے کو ترجیح دیتیں کیونکہ اس کے خاندان سے انہیں تحائف اور امداد کی توقع ہوتی تھی۔ لیکن آمنہ اس قدر غریب تھیں کہ کسی عورت نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دودھ پلانے میں دلچسپی نہ لی۔ عرب میں خاص طور پر یہ ایک بدترین سال تھا اور حلیمہ بنت ابوذویب نے، جن کا تعلق ایک بے حد غریب خاندان سے تھا، کوئی اور بچہ نہ ملنے پر حضورؐ کو گود میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت خود حلیمہ اس قدر بھوکی تھیں کہ ان کے پاس اپنے بچے کے لیے بھی دودھ نہیں تھا۔ ان کی اونٹنی کا دودھ خشک ہو چکا تھا یہاں تک کہ وہ جس گدھی پر سوار ہو کر مکہ آئی تھیں، وہ بھی بری طرح نڈھال ہو چکی تھی۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے شیر خوار محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گود میں لیا، ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ آپؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ بیان کرتی ہیں:

پھر میں آپؐ کو لے کر اپنی سواری کی طرف لوٹی۔ جب میں نے آپؐ کو اپنی گود میں بٹھالیا تو آپؐ کے لیے میری چھاتیوں میں حسب خواہش دودھ اتر آیا۔ آپؐ نے دودھ پیا اور سیر ہو گئے۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے بھائی نے بھی جی بھر کر دودھ پیا حالانکہ اس سے پہلے ہم اس کے ساتھ سوتے بھی نہیں تھے۔ میرا شوہر اپنی بوڑھی اونٹنی کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ دودھ سے بھری ہوئی ہے۔ ہم نے اس سے اتنا دودھ دوہا کہ میرے شوہر نے بھی پیا اور میں نے بھی، یہاں تک کہ ہماری سیری اور سیرابی انتہا کو پہنچ گئی اور ہم نے آرام سے رات گزاری۔ صبح ہوئی تو میرے شوہر نے کہا: ''اے حلیمہ! خدا کی قسم، خوب سمجھ لو کہ تم نے ایک ذات مبارک کو پایا ہے''۔ میں نے جواب دیا: ''خدا کی قسم! مجھے یہی امید تھی''۔ پھر ہم نکلے۔ میں اپنی گدھی پر سوار ہوگئی اور آپؐ کو بھی اپنے ساتھ سوار کرلیا۔ خدا کی قسم! پھر تو وہ گدھی قافلے سے آگے ہوگئی۔ قافلے والوں کی گدھیوں میں سے کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی یہاں تک کہ میرے ساتھ والیاں مجھ سے کہنے لگیں: ''اے ابوذویب کی بیٹی! تجھ پر افسوس ہے، ہماری خاطر ذرا اور میانی چال چل۔ کیا یہ تیری وہ گدھی نہیں جس پر تو گھر سے نکلی تھی؟'' میں ان سے کہتی: ''کیوں نہیں، یہ وہی تو ہے''۔ وہ کہتیں: ''خدا کی قسم! اس کی تو حالت ہی کچھ اور ہے''۔ پھر ہم اپنے گھر آئے جو بنوسعد کی بستیوں میں تھا اور میں اللہ تعالیٰ کی زمین میں کسی کو نہیں جانتی جو اس سے زیادہ قحط زدہ ہو۔

لیکن جب ہم آپؐ کو اپنے ساتھ لائے تو میری بکریاں چراگاہ سے شام کو لوٹتیں اور دودھ سے خوب بھری ہوئی ہوتیں۔ ہم دودھ دوہتے، پیتے اور دوسرے لوگوں میں سے کوئی شخص اپنی بکریوں سے دودھ کا قطرہ تک نہ دوہتا اور نہ تھنوں میں سے ایک قطرہ پاتا۔ ہماری قوم کے جو لوگ ہمارے قریب ہی رہا کرتے، اپنے چرواہوں سے کہتے: ''ارے کم بختو! ابوذویب کی بیٹی کا چرواہا جہاں بکریاں چھوڑتا ہے، تم بھی وہیں چھوڑ و''۔ وہ ایسا ہی کرتے، پھر بھی ان کی بکریاں بھوکی ہی واپس آتیں، ایک قطرہ دودھ نہ دیتیں اور میری بکریاں دودھ سے بھری ہوئی اور سیر ہو کر لوٹتیں۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحات ۱۰۴، ۱۰۵: (The Life of Muhammad.)۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ حلیمہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپؐ کی والدہ کے سپرد کرنے میں متذبذب تھیں۔ چنانچہ انہوں نے آمنہ سے درخواست کی کہ وہ حضورؐ کو مزید کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہنے دیں۔ لیکن بعد میں ایک خوفناک لیکن عجیب وغریب واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا۔

روایت ہے کہ ایک دن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رضاعی بھائی دوڑتے ہوئے اپنے والدین کے پاس آئے اور ہانپتے کانپتے کہنے لگے کہ ہمارا جو قریشی بھائی ہے، اسے دو شخصوں نے، جو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، پکڑلیا اور اٹھا کر اس کا پیٹ چاک کردیا ہے۔ یہ سنتے ہی حلیمہ اور ان کے شوہر آپؐ کی طرف دوڑے تو آپؐ کو اس حال میں کھڑا پایا کہ چہرے کا رنگ سیاہ تھا۔ حلیمہ اور ان کے شوہر نے آپؐ کو گلے لگا لیا اور کہا: پیارے بیٹے کیا ہوا؟ فرمایا: میرے پاس دو شخص، جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھے، آئے اور مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور میرے دل کو جسم سے نکال کر اسے برف سے دھویا۔ پھر انہوں نے مجھے دو ترازوؤں میں تولا اور اعلان کیا کہ آپؐ تمام عربوں کے مقابلے میں سب سے بھاری ہیں۔ آخر ان میں سے ایک شخص نے آپؐ کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور آہستہ سے کہا: اے خدا کے محبوب! آپؐ کبھی خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ اور اگر آپؐ یہ جانتے کہ خدا نے آپؐ کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے تو آپؐ یقیناً بہت خوش ہوتے۔ (ابوبکر احمد البیہقی وفات ۱۰۶۶ء) دلائل النبوت صفحات ۱، ۱۲: این میری شمل: And Muhammad is His Messenger P.68)۔ یہ قصہ دنیا کی دوسری تہذیبوں کی ان افسانوی داستانوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے جن میں ابتدائی احوال کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ حضورؐ کے شقِ بطن کا واقعہ اس پاکیزگی اور طہارت کی علامت ہے جو خدا کے مقدس الہامی پیغام کو کسی آلائش سے آلودہ کیے بغیر انسانوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرنے والے شخص کے لیے بے حد ضروری ہے۔ بعض مسلمان مصنفوں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ معراج (رسول اللہؐ کی زندگی کے اس ارفع روحانی مشاہدے کا تذکرہ اس کتاب کے ساتویں باب میں کیا جائے گا) سے تھوڑی دیر پہلے رونما ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مصنف اس واقعے کی حقیقی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔

لیکن بیچاری حلیمہ اور ان کے شوہر الحارث کو ان تمام باتوں کا ادراک نہیں تھا، اس لیے وہ خوف زدہ ہوگئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ حضورؐ پر حملہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ آنحضرتؐ کو کوئی نقصان پہنچے، وہ آپؐ کو فوراً واپس مکہ لے گئے۔ لیکن جب آمنہ کو یہ پورا قصہ سنایا گیا تو انہوں نے آپؐ کے رضاعی والدین کو تسلی دی اور انہیں دوبارہ یقین دلایا کہ یہ ایک غیر معمولی بچہ ہے جس کے بارے میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اس کا مستقبل نہایت تابناک ہوگا۔ جب آپؐ کی عمر چھ برس تھی تو آمنہ کا انتقال ہوگیا اور آپؐ دوبارہ یتیم ہوگئے۔ آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کے مکان میں رہنے کے لیے چلے گئے جنہیں آپؐ سے بے حد محبت تھی۔ عبدالمطلب نے بڑھاپے میں جو شادی کی، اس کے نتیجے میں ان کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ چنانچہ حضورؐ کی اپنے دو چچاؤں عباسؓ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندہ دل اور خوش مزاج حمزہؓ کے ساتھ پرورش کی گئی جن کی عمریں تقریباً آپؐ کے برابر تھیں۔ عبدالمطلب اب بہت بوڑھے اور زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ رسول اللہؐ اپنے دادا عبدالمطلب بن ہاشم کے ساتھ رہا کرتے۔ عبدالمطلب کے لیے کعبۃ اللہ کے زیرِ سایہ فرش بچھایا جاتا تھا اور ان کے بڑے بیٹے اس فرش کے اطراف میں بیٹھے رہتے۔ بیٹوں میں سے کوئی بھی والد کی عظمت کے لحاظ سے فرش پر نہ بیٹھتا تھا۔ لیکن حضورؐ جب تشریف لاتے تو فرش پر بیٹھ جاتے۔ آپؐ کو وہاں سے ہٹا دینے کے لیے چچا آپؐ کو پکڑ لیتے تو عبدالمطلب کہتے: ''میرے بچے کو چھوڑ دو، خدا قسم! اس کی تو بڑی شان ہے''۔ وہ آپؐ کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور آپؐ کی پشت مبارک پر ہاتھ پھیرتے رہتے۔ رسول اللہؐ کی عمر آٹھ سال ہوئی تو عبدالمطلب بن ہاشم کا انتقال ہو گیا۔ دادا کی وفات کے بعد آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ رہنے لگے جو بنی ہاشم کے سردار بن گئے تھے۔ اس طرح آپؐ کو اپنے چچازاد بھائیوں طالب اور عقیل کی رفاقت میسر آ گئی۔

ابو طالب ایک اچھے انسان تھے اور اپنے قبیلے کے زوال کے باوجود مکہ میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی مالی حالت اگرچہ تیزی کے ساتھ گرتی جا رہی تھی لیکن وہ اپنے یتیم بھتیجے کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آتے۔ ایک سال وہ حضورؐ کو کاروباری سفر میں اپنے ساتھ شام لے گئے۔ جب ان کا قافلہ بصریٰ کی سرزمین پر پہنچا تو بحیرا نامی راہب نے اپنے کلیسا سے باہر نکل کر سب قافلے والوں کو کھانے کی دعوت دی جس پر قافلے میں شامل قریش ششدر رہ گئے۔ ان لوگوں کا اس سے پہلے بھی بارہا وہاں سے گزر ہوا تھا لیکن بحیرا ان سے نہ تو کسی قسم کا تعارض کرتا اور نہ کوئی بات! لیکن اس سال جب یہ لوگ اس کلیسا کے قریب اترے تو اس نے سب کے لیے بہت سا کھانا تیار کیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جب وہ کلیسا میں تھا اور یہ لوگ آ رہے تھے تو اس نے رسول اللہؐ کو قافلے میں یوں دیکھا کہ آپؐ لوگوں میں ہیں اور آپؐ پر ابر کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے۔ اس طرح بحیرا پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ جس پیغمبر کا طویل عرصے سے انتظار کیا جا رہا تھا، وہ اس تجارتی قافلے میں موجود ہے۔ اور یہی بات اس کی دعوت کی اصل وجہ تھی۔ مسلمانوں کی یہ روایت انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے معبد میں گم ہونے کے واقعے سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیکن قدیم روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ماخذ مسیحیت کے بارے میں کس قدر ناواقف تھے۔ انہوں نے بحیرا راہب کے نام کو سامی زبان کے لفظ بھیر Bhiral سے خلط ملط کر دیا ہے جو پادریوں کا لقب ہے۔ عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ آنحضرتؐ کو اصل میں بحیرا نے تعلیم دی تھی جسے وہ ''محمدن ازم'' کہتے ہیں۔

کھانا تیار ہوا تو بحیرا نے ایک آدمی کے ذریعے کہلا بھیجا کہ اے گروہ قریش! میں نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے، میری خواہش ہے کہ تم سب کے سب آؤ، خواہ تم میں سے کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، غلام ہو یا آزاد۔ ان میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک شخص نے اس سے کہا: آج تو تمہاری حالت ہی کچھ اور ہے۔ ہم تو بارہا تمہارے پاس سے گزرے ہیں، تم ایسا برتاؤ تو ہمارے ساتھ نہ کرتے تھے۔ آج کون سی غیر معمولی بات ہے۔ بحیرا نے کہا: تو نے سچ کہا۔ جو کچھ تو کہہ رہا ہے، حالت تو ویسی ہی تھی۔ لیکن تم لوگ مہمان ہو، میری خواہش ہے کہ تمہاری عزت کروں۔ پھر سب کے سب اس کے پاس جمع ہو گئے اور رسول اللہؐ اپنی کم عمری کے سبب ان لوگوں کے کجاووں کے پاس اسی درخت کے نیچے رہ گئے۔ جب بحیرا نے ان لوگوں کو دیکھا اور وہ صفت، جو اس کے خیال میں تھی اور جسے وہ جانتا تھا، نہ دیکھی تو کہا: اے گروہِ قریش! تم میں سے کوئی شخص کھانے سے رہ نہ جائے۔ انہوں نے کہا: اے بزرگ! تیرے پاس آنے سے بجز ایک لڑکے کے کوئی ایسا شخص نہیں چھوٹا جسے تیرے پاس آنا چاہیے تھا۔ وہ لڑکا عمر میں سب سے چھوٹا ہے اس لیے وہ ہمارے کجاووں کے پاس رہ گیا ہے۔ بحیرا نے کہا: ایسا نہ کرو، اسے بھی بلواؤ کہ وہ اس کھانے میں تم سب کے ساتھ رہے۔ قریش کے ایک شخص نے، جو انہیں کے ساتھ تھا، کہا: لات وعزیٰ کی قسم! ہمارے لیے باعثِ ذلت ہے کہ ہم میں سے عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا کھانے سے چھوٹ رہے۔ پھر وہ آپؐ کے پاس جا کر آپؐ کو گود میں اٹھا لایا اور ان لوگوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ بحیرا آپؐ کو نہایت غور سے دیکھنے لگا اور جسم مبارک کے ان خاص خاص حصوں کا معائنہ کرنے لگا جن کے صفات آپؐ کی شناخت میں اپنے پاس پاتا تھا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اِدھر اُدھر چلے گئے تو بحیرا اٹھ کر آپؐ کے پاس آیا اور کہا: اے لڑکے! لات وعزیٰ کی قسم دے کر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جو جو بات میں تم سے پوچھوں، بتاتے جانا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''لات وعزیٰ کی قسم دے کر مجھ سے کوئی بات نہ پوچھ۔ خدا کی قسم! مجھے ان دونوں سے جتنا بغض ہے، اور کسی چیز سے کبھی نہیں رہا۔ بحیرا نے آپؐ سے کہا: اللہ کی قسم! آپؐ مجھے وہ بتایئے جو میں آپؐ سے پوچھتا جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا: جو تمہیں مناسب معلوم ہو، وہ مجھ سے دریافت کرو۔ پھر وہ آپؐ سے حالتِ خواب، ہیئت اور معاملات کے متعلق سوال کرنے لگا۔ حضورؐ بھی اسے اپنے حالات کی نسبت خبر دینے لگے۔ وہ تمام باتیں آپؐ کے ان صفات کے مطابق ہوتی گئیں جو اس کے پاس تھیں۔ پھر اس نے آپؐ کی پشت مبارک دیکھی۔ دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت اسی مقام پر موجود تھی جہاں آپؐ کی صفات میں اس کے پاس مرقوم تھی۔ جب وہ اس سے فارغ ہوا تو آپؐ کے چچا ابوطالب کی جانب توجہ کی اور ان سے کہا: اس لڑکے کا تم سے کیا رشتہ ہے؟ ابوطالب نے کہا: میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے ان سے کہا: یہ تمہارا بیٹا نہیں، اس لڑکے کا باپ زندہ نہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا: میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ بحیرا نے ان سے کہا: پھر اس کا باپ کہاں ہے؟ جواب دیا: اس کا انتقال ہو گیا۔ کہا: تم نے سچ کہا۔ تم اپنے بھتیجے کو لے کر اس کے شہر کو واپس جاؤ اور یہودیوں سے اس کی حفاظت کرو۔ خدا کی قسم! اگر انہوں نے دیکھ لیا اور اس کے متعلق جو کچھ میں نے جانا، انہوں نے بھی جان لیا تو ضرور اسے ضرر پہنچائیں گے کیونکہ تمہارے اس بھتیجے کی بڑی شان ہونے والی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، پس اسے لے کر جلد اس کے شہر چلے جاؤ۔ (میں نے بحیرا کے واقعے سے متعلق تفصیلات سیرت ابن ہشام حصہ اول ترجمہ مولانا عبدالجلیل صدیقی صفحات ۲۰۴ تا ۲۰۷ سے نقل کی ہیں... مترجم)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک باصلاحیت نوجوان کی حیثیت سے پروان چڑھے، اس کے باوجود ۲۵ سال کی عمر تک آپؐ میں اس عظمت کے بہت کم آثار دکھائی دیے۔ مکہ میں آپؐ ''امین'' یعنی قابلِ اعتماد شخص کے طور پر مشہور ہوئے۔ آپؐ میں یہ استعداد موجود تھی کہ آپؐ زندگی بھر دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور سرچشمہ بنے رہے۔ آپؐ نہایت حسین وجمیل اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ آپؐ کا قد درمیانہ تھا، سر اور داڑھی کے بال گھنے اور گھنگریالے تھے، چہرہ مبارک خاص طور پر نورانی، روشن اور تاباں تھا جس کا تمام ذرائع نے تذکرہ کیا ہے۔ آپؐ کا کردار فیصلہ کن اور خلوص کا آئینہ دار تھا جس میں ہر چیز روزِ روشن کی طرح واضح تھی۔ آپؐ جو کام کرتے، اس پر پوری توجہ دیتے اور جسمانی طور پر اس کا مکمل اظہار ہوتا۔ اگر آپؐ کا چغہ کسی خاردار جھاڑی سے الجھ جاتا تو بھی آپؐ شانے کے اوپر سے نہ دیکھتے۔ بعد میں آنے والے برسوں میں صحابہ کرامؓ اس یقین کے ساتھ آپؐ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے آزادانہ گفتگو کرتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے کہ آپؐ ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھیں گے۔ اگر آپؐ کسی کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتے تو اس کی طرف جزوی طور پر متوجہ نہ ہوتے بلکہ پورے جسم کو اس کی طرف موڑ کر اس کے ساتھ روبرو گفتگو کرتے۔ جب آپؐ کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ چھوڑتا، آپؐ اس کا ہاتھ پکڑے رکھتے۔ آپؐ کے چچاؤں نے آپؐ کو عسکری تربیت دے رکھی تھی۔ آپؐ اعلیٰ پائے کے تیرانداز، بہترین شمشیر زن اور کشتی لڑنے کے فن کے ماہر تھے البتہ آپؐ کے نوجوان چچا حمزہؓ، جو غیر معمولی جسمانی توانائی کے مالک تھے، میدانِ جنگ میں حیرت انگیز شجاعت اور جوانمردی کا مظاہرہ کرتے۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ ایک ساہوکار بن گئے اور آپؐ نے تجارت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ آپؐ شام اور عراق جانے والے تجارتی قافلوں کی قیادت کرتے تھے۔ مغرب میں پیغمبر اسلامؐ کو عام طور پر شتربان کے نام سے پکارا جاتا ہے جو ایک ذمے دار انتظامی فریضہ ادا کرنے والے شخص کے لیے توہین آمیز نام ہے۔ لیکن حال ہی میں بعض مغربی اسکالرز نے آپؐ کے پیشے کے متعلق استفسار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ کے پاس شام اور دوسرے مہذب ملکوں کے بارے میں کوئی ابتدائی معلومات نہیں تھیں اور یہ کہ قرآنِ حکیم میں سریانی مسیحیت کے حیرت انگیز اور پرکشش جلوسوں اور تعلیمات کا کبھی کوئی تذکرہ نہیں ہوا جن سے جزیرہ نما کے ہم عصر شاعروں کو مہمیز ملتی۔ (Andrae: Muhammad, PP.50-1)۔ لیکن ایک تاجر کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ابتدائی کیریئر کے بارے میں روایتی نقطہ نظر پر شکوک وشبہات کا اظہار کرنا گمراہی کے مترادف ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر اس اختراع کا مقصد کیا ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام اعلیٰ صفات کے باوجود یتیم ہونے کی وجہ سے آپؐ کو وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے آپؐ مستحق تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی اور ہم دیکھیں گے کہ آپؐ کو زندگی بھر یتیموں کی حالت اور ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر ہمیشہ گہری تشویش رہی ہے۔ کمزور مالی حالت کے پیش نظر کسی خاتون کے ساتھ عقد کرنا آپؐ کے لیے مشکل ہو گیا۔ ایک مرحلے پر آپؐ ابو طالب کی بیٹی فاختہ کے ساتھ، جو آپؐ کی ہم عمر تھیں، شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ابو طالب نے آپؐ پر واضح کیا کہ ابھی آپؐ شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں چنانچہ انہوں نے اپنی بیٹی کو مخزوم قبیلے کے ایک امیر گھرانے میں بیاہ دیا جس سے انہیں فائدے کی توقع تھی۔ ابو طالب خواہ کتنے ہی مہربان اور معاملہ فہم کیوں نہ ہوں، ان کے اس جواب سے آپؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عورتوں سے محبت کرتے تھے اور آپؐ کو ایک خاتون کی ضرورت تھی۔ اس معاملے میں آپؐ کا طرزِ عمل اپنے بیشتر ہم عصروں سے مختلف تھا۔ بعد میں آپؐ کے بعض انتہائی قریبی صحابہؓ نے، جنہیں واضح طور پر یقین تھا کہ عورتوں کو ان کی جگہ پر رکھنا چاہیے، یہ بیان کیا کہ اسلام سے پہلے کے دور میں مکہ کے اکثر باشندے عورتوں کے بارے میں بہت کم سوچا کرتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں خواتین کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ کئی سرکردہ مسلمان بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ سخت سلوک روا رکھتے تھے۔ لیکن حضورؐ عورتوں کی رفاقت سے لطف اٹھاتے اور ان کی محبت اور دل جوئی کے متمنی تھے۔ آنحضرتؐ اپنی زندگی میں خواتین کے ساتھ شفقت آمیز سلوک کرتے اور ان سے نرمی اور رحم دلی کے ساتھ پیش آتے جس پر آپؐ کے بعض قریبی صحابہ کرامؓ حیرت اور استعجاب کا اظہار کرتے۔ مغربی روایات میں رسول اللہؐ کو (نعوذ باللہ... مترجم) ایک کج رو شہوت پرست انسان ظاہر کیا گیا ہے لیکن آپؐ کے بارے میں یہ تاثر تعصب اور دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کو ایک ایسی رفیقۂ حیات کی ضرورت تھی جو ایک محبوب دوست اور چاہنے والی خاتون کی حیثیت سے آپؐ کا ساتھ دے سکے۔

تقریباً ۵۹۵ عیسوی میں آپؐ کی قسمت ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گئی۔ ایک دور کی رشتے دار خاتون خدیجہؓ بنت خویلد نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ اس کا سامانِ تجارت لے کر شام چلے جائیں۔ شہری زندگی کئی خواتین کو کاروبار اور تجارت کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ بارہویں صدی میں یورپ میں بعض خواتین نے بینکاری، تجارت اور دکانداری کے پیشے میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور ایسا لگتا ہے کہ مکہ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ خدیجہؓ کی دو مرتبہ شادی ہو چکی تھی اور وہ کئی بچوں کو جنم دے چکی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کا تعلق بنی اسد سے تھا جو ساتویں صدی کے اوائل میں بنی ہاشم کے مقابلے میں زیادہ طاقتور قبیلہ تھا۔ ایک تاجر خاتون کی حیثیت سے ان کی بود و باش بھی بہت امیرانہ تھی۔ حضورؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ایک فیصلہ کن سفر پر روانہ ہو گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت خدیجہؓ کا ایک غلام میسرہ بھی آپؐ کے ہمراہ تھا۔ میسرہ نے سفر کے دوران کئی معجزانہ واقعات کا مشاہدہ کیا اور واپسی پر حضرت خدیجہؓ کو ان تمام باتوں سے آگاہ کر دیا۔ میسرہ نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے شام پہنچ کر ایک راہب کے کلیسا کے قریب ایک درخت کے سائے میں نزول فرمایا۔ اس راہب نے اوپر سے دیکھ کر میسرہ سے کہا: یہ کون ہے جو اس درخت کے نیچے اترا ہے؟ میسرہ نے جواب دیا: یہ شخص حرم والے قریشیوں میں سے ہے۔ راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے نبی کے سوا کبھی کوئی شخص نہیں اترا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب دوپہر کا وقت ہوتا اور گرمی سخت ہو جاتی تو میسرہ دیکھا کرتا کہ دھوپ سے بچاؤ کے لیے دو فرشتے آپؐ پر سایہ فگن رہتے اور حضورؐ اونٹ پر چلے جاتے۔ حضرت خدیجہؓ نے میسرہ سے جب یہ حالات سنے تو وہ سیدھی اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ بن نوفل دینِ حنیف پر کاربند تھا اور اس نے عیسائی بن کر الہامی صحیفوں کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ وہ خود بھی عرب میں ایک پیغمبر کے ظہور کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے حضرت خدیجہؓ کی خبریں سنیں تو بلند آواز سے چلا کر کہنے لگا: ''اگر یہ سچ ہے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قوم کے پیغمبر ہیں''۔ (محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۲۱: The Life of Muhammad P.83)۔

حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ کو عقد کا پیغام بھیج دیا۔ وہ صرف ورقہ کے جوش و خروش سے متاثر نہیں ہوئی تھیں بلکہ اپنے نوجوان قرابت دار کے ذاتی محاسن کا بھی ان پر گہرا اثر ہوا تھا۔ اپنی عمروں میں تفاوت سے قطع نظر انہیں ایک نوجوان شوہر کی ضرورت تھی اور مکہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے موزوں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ ''اے میرے چچا کے بیٹے''! حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ سے کہا: ''آپؐ سے رشتے داری، قوم میں آپؐ کے شرف، امانت داری، حسنِ اخلاق اور سچائی کی وجہ سے آپؐ کی جانب میرا میلانِ خاطر ہے''۔ (محمد ابن اسحاق سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۲۰، The Life of Muhammad P.82)۔ روایت ہے کہ اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی اور اگرچہ آپؐ کے فرزند ابراہیمؑ کے سوا آپؐ کی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ ہی سے پیدا ہوئی (القاسمؓ، جن کے نام سے آپؐ کنیت فرمایا کرتے تھے، طاہرؓ، طیبؓ، رقیہؓ، زینبؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ)، اس کے باوجود وہ قدرے جوان لیکن اپنے شوہر کے مقابلے میں عمر میں خاصی بڑی تھیں۔ مغرب میں اس معمر لیکن دولت مند بیوہ کے ساتھ حضورؐ کی شادی پر عموماً طنز کی جاتی ہے اور اس جانب اشارہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے محض ذاتی مفاد کی بنا پر حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تھی۔ حالت یہ ہے کہ میکسم روڈنسن Maxime Rodinson نے بھی اپنی ہمدردانہ سیرت میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے یہ شادی جنسی اور جذباتی اعتبار سے مایوس کن ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آپؐ اپنے پیغمبرانہ مشن کے ابتدائی برسوں میں حضرت خدیجہؓ کی معاونت اور ان کی روحانی مشاورت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بغیر تبلیغ کا کام جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ ایک ممتاز اور نابغہ روزگار خاتون تھیں اور محمد ابنِ اسحٰق نے لکھا ہے: خدیجہؓ ایک اولوالعزم، شریف اور عقل مند خاتون تھیں۔ دشمن جب بھی رسول اللہؐ پر حملہ کرتے یا آپؐ روحانی مشاہدے کی قوت سے مغلوب ہوتے تو اطمینانِ خاطر اور غم خواری کے لیے اپنی اہلیہؓ کے پاس جاتے۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے اپنے شوہر کی بے مثل صلاحیتوں کا اعتراف کیا: ''آپؐ کی تقویت کا باعث بنیں، آپ کا بوجھ ہلکا کیا ور آپؐ کی صداقت کا برملا اعلان کیا''۔ (محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۵۵: The Life of Muhammad P.111)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت محبت اور انسانی جذبات سے لبریز تھی لیکن آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں کسی اور نوجوان خاتون سے شادی نہ کی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں آپؐ کی کثیر الازدواجی پر نکتہ چینی کرنے والوں کو اس کا ادراک کرنا چاہیے۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ جب حضرت خدیجہؓ کی تعریف کرتے تو آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اکثر اس سے مشتعل ہو جاتیں۔ ایک موقعے پر جب آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی رحلت کے بعد ان کی آواز سنی تو فرطِ غم سے آپؐ کا چہرہ مبارک سفید ہو گیا۔ آپؐ نے دنیاوی آسائشوں اور آسودگی کے لیے حضرت خدیجہؓ سے شادی نہیں کی تھی بلکہ حضورؐ اپنے خاندان کی آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں کو دے دیتے لیکن خود آپؐ کا خاندان نہایت کفایت شعاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا۔

اس سادگی کے باوجود آپؐ کا گھرانہ مطمئن اور مسرور تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپؐ کے کم سے کم چھ بچے پیدا ہوئے۔ آپؐ کے دو بیٹے القاسمؓ اور عبداللہؓ کم سنی میں وفات پا گئے البتہ آپؐ کی چار بیٹیاں، زینبؓ، رقیہؓ، اِم کلثومؓ اور فاطمہؓ زندہ رہیں۔ آنحضرتؐ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پوری زندگی میں آپ محبت اور گرم جوشی سے ان کے ساتھ لپٹ جاتے، ان کا منہ چومتے اور ان کے ساتھ کھیلوں میں شریک ہو جاتے۔ عربوں میں ایک اعزازی لقب اختیار کرنے کا دستور تھا اور جب ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوتا تو اس کے نام کی مناسبت سے ان کی کنیت مشہور ہو جاتی۔ چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابوالقاسم (قاسم کے باپ) کی کنیت سے پکارا جاتا جس سے آپؐ کو خصوصی راحت اور طمانیت حاصل ہوتی۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ کو امِ قاسم (قاسم کی والدہ) کے نام سے پکارا جاتا۔ (اس کتاب میں بعض عربوں کے نام کنیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں مثلاً ابوطالب، ابوسفیان، اور امِ سلمہ)۔ لیکن خدا نے آپؐ کو اپنے بیٹوں کی رحلت کے نقصان کی کسی حد تک تلافی کر دی۔ جنابِ خدیجہؓ نے حضورؐ سے شادی کے روز شمالی عرب کے کلب قبیلے کا ایک نوجوان غلام لڑکا ہدیے میں پیش کیا تھا۔ زید بن حارث کو اپنے آقاؐ کے ساتھ اس قدر محبت ہو گئی کہ جب اس کے خاندان نے اس کا سراغ لگا لیا اور اس کا باپ اس کی رہائی کے عوض رقم لے کر مکہ پہنچا تو اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہؐ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے زید سے کہا کہ تم چاہو تو میرے پاس رہو اور چاہو تو اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ۔ لیکن زید نے کہا: میں آپؐ ہی کے پاس رہوں گا۔ حضورؐ نے زید کو آزاد کر دیا اور زید آپؐ کے متبنیٰ بن گئے۔ چند سال بعد جب آپؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی عمر چار برس تھی تو آپؐ کے خاندان میں مزید ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ اس وقت تک ابو طالب شدید مالی مشکلات میں گھر چکے تھے، خاص طور پر قحط کے برسوں میں ان کی حالت سخت مخدوش ہو چکی تھی۔ ان حالات میں عباسؓ ابو طالب کا بوجھ کم کرنے کے لیے جعفرؓ کو اور حضورؐ ابو طالب کے سب سے چھوٹے بیٹے علیؓ کو پرورش کی غرض سے اپنے گھر لے گئے جن کی عمر پانچ سال تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو خود یتیم تھے، رضاعی تعلقات کو بہت اہمیت دیتے تھے اور آپؐ کے رضاعی والدین جب بھی ملاقات کے لیے آپؐ کے پاس آتے تو آپؐ انہیں اناج یا بھیڑ کا تحفہ دیتے۔ زیدؓ اور علیؓ دونوں نے حضورؐ کی نگرانی میں پرورش پائی اور دونوں کو ابتدائی مسلمانوں میں ممتاز لیڈروں کی حیثیت حاصل ہوئی، خاص طور پر حضرت علیؓ میں اپنے دوستوں میں گہرے خلوص کے جذبات ابھارنے کی بے پناہ قوت اور استعداد موجود تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی کے نزول سے پہلے چند برسوں میں مکہ میں آپؐ کی حالت بہتر ہو گئی اور غریبوں اور غلاموں کے ساتھ شفقت کی بنا پر آپؐ کی شہرت پھیلنے لگی۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے آپؐ کی پیغمبرانہ بصیرت کا شہرہ ہو گیا۔ ۶۰۵ عیسوی میں جب حضورؐ کی عمر تقریباً ۳۵ برس تھی، قریش نے کعبے کو دوبارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت کعبۃ اللہ کے کئی پتھر اپنی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔ کعبے کو ایک نئی چھت کی ضرورت تھی اور حال ہی میں بعض لوگوں نے وہ خزانہ چرا لیا تھا جو کعبے کے اندر ایک چہ بچہ میں رہا کرتا تھا۔ لیکن خانہ کعبہ کی عمارت کے تقدس کی وجہ سے یہ کام بہت نازک اور خطرناک تھا۔ بیشتر روایتی معاشروں میں مقدس چیزوں کو ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے اور ان کے انتظام و انصرام کے معاملے میں نہایت احتیاط برتی جاتی ہے۔ قریش اس عظیم مقدس عمارت کو گرانے میں بے حد متذبذب تھے لیکن انہوں نے اس منصوبے پر کام جاری رکھا۔ چنانچہ مخزوم قبیلے کے سردار ابن المغیرہ نے، جو مکہ میں نہایت با اثر شخص تھا، کدال سے کعبے میں سے ایک پتھر نکالا تو وہ اس کے ہاتھ میں اچھل کر پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس پر ولید نے کہا: ''یا اللہ! تجھے کوئی خوف نہیں۔ خدایا! ہم تو بھلائی ہی کے طالب ہیں''۔ کعبے کی از سرِ نو تعمیر کا کام شروع ہو گیا اور ہر قبیلے نے عمارت کے مخصوص حصے کو تعمیر کرنے کی ذمے داری لے لی جس کا مقصد تعمیر کعبہ میں تمام قبیلوں کی شرکت کو یقینی بنانا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ کعبے کی بنیاد تک پہنچے تو سارے مکے میں ایک کڑاکا سنائی دیا جس سے پورا شہر لرز گیا۔ چنانچہ قریش ابراہیمی اساس کو ڈھانے سے رک گئے۔

کعبے کی نئی دیواریں تعمیر ہو گئیں لیکن جب تعمیر حجرِ اسود کے مقام تک پہنچی تو قبائل میں جھگڑا ہو گیا۔ ہر قبیلہ چاہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ حجرِ اسود کو اس کے مقام پر خود رکھے، نہ کہ کوئی دوسرا۔ غرض چار پانچ روز تک لوگ حالتِ جنگ میں رہے۔ یہ صورتِ حال مکہ میں قبائلی اتحاد کی تباہی کے لیے خوفناک علامت تھی۔ پھر ابو امیہ بن مغیرہ نے، جو اس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، کہا: ''اے گروہِ قریش! اس مسجد کے دروازے سے جو پہلا شخص داخل ہو، اسے آپس کے اختلافی مسئلے میں فیصلہ کرنے والا بناؤ''۔ انہوں نے یہ رائے مان لی۔ پھر ان کے پاس آنے والے پہلے شخص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے جو شام کے تجارتی سفر سے ابھی ابھی لوٹے تھے اور معمول کے مطابق سب سے پہلے کعبے کا طواف کرنے آئے تھے۔ جب لوگوں نے آپؐ کو دیکھا تو کہا: ''یہ تو وہ امین ہے جسے سب جانتے ہیں۔ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ ہم راضی ہیں''۔ (محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہؐ، صفحات ۱۲۴، ۱۲۵: The Life of Muhammad PP. 85,86)۔ جب آپؐ ان کے پاس پہنچے اور آپؐ کو معاملے کی خبر دی گئی تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس ایک کپڑا لاؤ۔ آپؐ کے پاس ایک چادر لائی گئی تو آپؐ نے حجرِ اسود لیا اور اسے اپنے ہاتھ سے چادر میں رکھ کر فرمایا: ہر قبیلے کا ایک ایک نمائندہ اس چادر کا ایک ایک کونہ پکڑ لے اور سب کے سب مل کر اسے اٹھائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب وہ اسے لے کر اس کے مقام تک پہنچے تو آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے رکھ دیا اور اس پر تعمیر ہونے لگی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عالمِ اسلام کے مرکز میں زیادہ اساسی طریقے سے کعبے کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اس کے ساتھ ہی اللہ کی مقدس عمارت کے اردگرد رہنے والے قریش کے اتحاد کو بھی مستحکم بنیادوں پر استوار کر دیا۔ (رسول اللہؐ کے زمانے میں کعبۃ اللہ اٹھارہ ہاتھ کا تھا اور اس پر سفید سوتی کپڑا اڑا جاتا تھا۔ پھر دھاریوں والی لمبی چادریں ڈالی گئیں۔ پہلا شخص جس نے اسے دیبا کا ریشمی غلاف پہنایا، وہ حجاج بن یوسف تھا۔ محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۲۱... مترجم)۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حضورؐ کی عمر چالیس سال تھی کہ آپؐ نے باقاعدگی کے ساتھ روحانی گوشہ نشینی شروع کر دی۔ آپؐ کی بیوی حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ اس زمانے میں حضورؐ نے زیادہ وقت تنہائی میں خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپؐ ایسے خواب دیکھنے لگے جو وعدوں اور امید سے فروزاں ہوتے اور جن کی مثال ''صبح سویرے پو پھٹنے'' جیسی تھی۔ خلوت کے ان دنوں میں آنحضرتؐ ان روحانی قواعد کی مشق کرتے جنہیں عرب ''تحنث'' کہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ غریبوں میں کھانا بھی تقسیم کرتے۔ چنانچہ نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو اللہ کے دین کا اہم جزو قرار دے دیا گیا۔ اس دوران حضورؐ اپنا زیادہ وقت غور و فکر میں گزارتے۔ ہمیں آپؐ کے بعد کے کیرئر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے مکہ میں پائے جانے والے اضطراب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر لی تھی۔ یہ صورتِ حال آپؐ کے لیے یقیناً مایوس کن تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ میں کوئی شخص آپؐ کے نظریات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دے رہا تھا اور آپؐ کے قبیلے کی کمزور پوزیشن شہری زندگی میں قائدانہ کردار ادا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ اس کے باوجود آپؐ اپنی بے مثل خوبیوں سے، جنہیں استعمال نہیں کیا جارہا تھا، جبلی طور پر پوری طرح آگاہ تھے۔ قرآنِ حکیم میں اس حقیقت کا اکثر تذکرہ کیا گیا ہے کہ خدا نے قریش کی طرف کبھی کوئی پیغمبر نہیں بھیجا تھا حالانکہ اس نے روئے زمین پر بسنے والی تمام قوموں کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پختہ یقین تھا کہ صرف خدا کا فرستادہ پیغمبر ہی آپؐ کے شہر کو درپیش مسئلوں کا مداوا کرسکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ آپؐ پیغمبر کے مرتبے پر فائز ہونے والے ہیں۔ (آپؐ کو تو کبھی اس کا خیال بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ کی طرف کتاب نازل فرمائی جائے گی۔ لیکن یہ آپؐ کے رب کی مہربانی سے اترا۔ اب آپؐ کو ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا چاہیے۔ (سورہ القصص آیت ...۸۶ مترجم)۔ حضرت موسیٰؑ کی طرح پیغمبر اسلام بھی تمام اہم موقعوں پر اپنے پہاڑ پر چڑھ جاتے۔ چنانچہ ۶۱۰ عیسوی کے ماہِ رمضان کی سترہویں شب کو آپؐ کی اپنے خدا سے ملاقات ہوگئی۔

ہمیں تحنث کے بارے میں زیادہ علم نہیں لیکن غالباً اس سے مراد یک سو ہوکر عبادت کرنا ہے۔ بیشتر مذہبی روایات کے مطابق اس سے عبادت کرنے والا شخص عام مشاہدے کی حدوں کو پار کر کے درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعد میں اس مشاہدے کے متعلق، جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں، بتایا کہ میرے پاس جبریلؑ اس وقت آئے جب میں سو رہا تھا۔ وہ ایک ریشمی کپڑا لائے جس پر کچھ لکھا تھا، پھر کہا: ''پڑھیے''۔ بعض عبرانی پیغمبروں کی طرح، جو خدا کے کلام کو زبان پر لانے میں متذبذب تھے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی پڑھنے سے انکار کردیا۔ ''مجھے پڑھنا نہیں آتا''۔ آپؐ نے اصرار کیا۔ آپؐ کا خیال تھا کہ یہ فرشتہ عرب کے کسی بدنام نجومی کاہن کے بجائے غلطی سے آپؐ کے پاس آگیا ہے۔ ''لیکن فرشتے نے مجھے پکڑ کر اس قدر زور سے بھینچا یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اب موت ہے۔'' (محمد ابن اسماعیل البخاری، جن کا مارٹن لنگز کی کتاب Muhammad : His Life Based on the Earliest Sources کے صفحات ۴۳، ۴۴ میں حوالہ دیا گیا ہے)۔

آخر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآنِ پاک کے یہ پہلے الفاظ پڑھے:

پڑھ اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا
جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا
تو پڑھتا رہ، تیرا رب بڑے کرم والا ہے
جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا (سورہ العلق آیات ۱ تا ۵)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حواس بحال ہوئے تو آپؐ پر خوف اور دہشت کی کیفیت طاری تھی۔ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ آپؐ کو جب یہ خیال گزرا کہ آپؐ اپنی مرضی کے خلاف جن رکھنے والے کاہن بن گئے ہیں تو آپؐ اس قدر پریشان ہو گئے کہ آپؐ زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ آپؐ نے غارِ حرا سے تیزی کے ساتھ نکل کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا شروع کر دیا تا کہ خود کو پہاڑ سے نیچے گرا کر زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن جب آپؐ پہاڑ کے درمیان میں تھے تو وہی فرشتہ دوبارہ نظر آیا اور آپؐ پہچان گئے کہ یہ جبریلؑ ہیں۔

جب میں پہاڑ کے درمیان پہنچا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی جو یہ کہہ رہی تھی: ''اے محمدؐ! آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں''۔ میں نے دیکھنے کے لیے اپنا سر آسمان کی جانب اٹھایا تو دیکھتا ہوں کہ آسمان کے کنارے پر ایک آدمی کی شکل میں جبریل ہیں جن کے قدم افقِ سما میں ہیں..... میں ان کی طرف دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ میں آگے بڑھتا ہوں، نہ پیچھے ہٹتا ہوں۔ میں آسمان کے جس کونے میں نظر ڈالتا ہوں، انہیں کو اس حالت میں دیکھتا ہوں۔

(محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۵۳: The Life of Muhammad P.106)۔

یہ فرشتہ کوئی حسین وجمیل مخلوق نہیں، قوانینِ فطرت کے عین مطابق ایک انسان کی صورت میں تھا جیسا کہ بعض اوقات کرسچن آرٹ میں اس کی صورت گری کی جاتی ہے۔ اسلام میں جبریلؑ حق وصداقت کی روح اور پیغمبروں تک وحی پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ایک ایسی شخصیت کی موجودگی کا بے پناہ اور سر بہ فلک مشاہدہ تھا جس نے پورے افق کو ڈھانپ رکھا تھا اور جس سے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک ایسی غالب روحانی حقیقت کا فہم وادراک حاصل ہوا تھا جس نے کئی نبیوں، زاہدوں اور عابدوں کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ عیسائیت میں اسے mysterium terrible et fascinans اور یہودیت میں Kaddosh یعنی تقدس مآب ذات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس سے خدا کی خوف اور دہشت پیدا کرنے کی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔

مختلف راویوں نے حضورؐ کے اصل وژن Vision کے بارے میں متضاد روایات بیان کی ہیں۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے جبریلؑ کو غارِ حرا میں دیکھا تھا۔ کئی دوسرے راویوں کے مطابق رسول اللہؐ نے اس فرشتے کو افق پر دیکھا تھا۔ لیکن تمام راویوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے وقت حضورؐ پر خوف اور دہشت کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ عبرانی پیغمبر بھی ذاتِ مقدس کے جلوۂ صفات کو دیکھ کر چیخ اٹھے تھے اور انہوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ موت کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ''یہ کیسی مصیبت ہے''! معبد میں خدا کا جلوہ دیکھ کر یسعیاہ پکار اٹھا تھا: ''میرا وجود کھو گیا ہے''! تجلی ذات کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ اس سے بچنے کے لیے فرشتے بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔لیکن اس نے اپنی ناپاک آنکھوں سے دونوں جہانوں کے مالک کا مشاہدہ کرلیا۔(یسعیاہ۶:۱-۹)۔یرمیاہ نے شدید کرب کی حالت میں ذاتِ حق کا مشاہدہ کیا جس سے اس کے جسم کا ایک ایک عضو تڑپ اٹھا۔جس طرح جبریلؑ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو زور سے بھینچا، اسی طرح اس نے وحی کے عمل کا ایک طرح کے ربانی جبر کی طرح مشاہدہ کیا۔(یرمیاہ ۲۰: ۷-۹)۔اس تجلی نے ایک دہشت ناک قوت کے ساتھ اس کی ذات پر حملہ کیا اور اس کے فطری وجود کو، جو اس ربانی تصادم کے لیے نہیں بنایا گیا تھا، چکنا چور کر دیا۔ان تمام پیغمبروں نے ذاتِ حق کا جو مشاہدہ کیا، وہ انسانی عقل وفہم سے بالاتر تھا۔یہ ایک ماورائے ادراک حقیقت تھی جسے توحید پرست ''خدا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔یہ مشاہدہ دہشت انگیز تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ہر پیغمبر ایک ایسی وسیع قلمرو کا مالک بن گیا جو معمول کی دل جمعی اور تسلی وتشفی سے بہت دور واقع تھی اور جہاں کی ہر شے دل کو ہلا دینے والی تھی۔بہر حال اس تجلی میں ایک عجیب کشش اور دلربائی موجود تھی کیونکہ یہ پہلے سے معلوم ہر چیز کی دوبارہ یاد دہانی کراتی تھی اور جس کا وجود کی اتھاہ گہرائیوں سے دھندلا تعلق پہلے سے موجود تھا۔لیکن یسعیاہ اور یرمیاہ کے برعکس پیغمبر اسلامؐ کے لیے کسی مسلمہ دین سے تشفی کا کوئی سامان موجود نہیں تھا جس سے آپؐ کو اس روحانی مشاہدے کی تشریح کرنے میں مدد ملتی۔یوں لگتا ہے کہ آپؐ کو یہ دولت بن مانگے مل گئی تھی جس کے بعد آپؐ قنوطیت کا شکار ہو گئے۔حضورؐ کو ایک ایسے بلند مرتبے پر فائز کر دیا گیا جو آپؐ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا اور جسے خود کو باور کرانا مشکل تھا۔خوف اور دہشت کی اس کیفیت میں آپؐ فطری طور پر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رسول اللہؐ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اس حال میں جنابِ خدیجہؓ کے پاس پہنچے کہ آپؐ پر کپکپی طاری تھی۔آپؐ نے خود کو حضرت خدیجہؓ کی آغوش میں گرا دیا اور زور سے کہا: ''مجھے ڈھانپ دو! مجھے ڈھانپ دو۔'' حضورؐ نے خدیجہؓ سے کہا کہ وہ آپؐ کو خوف اور ڈر کی کیفیت سے نجات دلائیں۔کاہنوں سے نفرت کے باوجود، جو استخارے اور فال نکالنے کے وقت لبادہ اوڑھ لیتے تھے، آنحضرتؐ نے جبلی طور پر یہی انداز اختیار کر لیا۔آپؐ خوف اور دہشت سے کانپ رہے تھے اور حضرت خدیجہؓ نے آپ کو بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔خوف دور کرنے کی غرض سے وہ آپؐ کو دلاسہ دے رہی تھیں۔تمام سیرت نگاروں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس بحران کے دوران نبی کریم حضرت خدیجہؓ پر مکمل بھروسا کرتے رہے۔بعد میں اسی پہاڑ پر پھر وحی نازل ہوئی جس کے بعد آپؐ ہر مرتبہ سیدھے حضرت خدیجہؓ کے پاس جا کر ان سے لبادہ اوڑھانے کے لیے کہتے اور وہ آپؐ کو تسلی تشفی دیتیں۔لیکن حضرت خدیجہؓ صرف ڈھارس بندھانے والی ایک شفیق اور مہربان خاتون ہی نہیں، حضورؐ کی روحانی مشیر بھی تھیں۔یہ خدیجہؓ ہی تھیں جنھوں نے آنحضرتؐ کو وہ امداد بہم پہنچائی جو دوسرے مستحکم مذاہب نے اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روحانی پیشواؤں اور پیغمبروں کو فراہم کی تھی۔ پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد جب خوف اور ڈر ختم ہوا تو حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ سے پوچھا کہ آیا وہ کاہن بن گئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ وجدان اور الہام کی صرف اسی صورت سے واقف تھے اور تقدس کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود وحی کا مشاہدہ، جن رکھنے والے عربوں سے گہری مماثلت رکھتا تھا۔ چنانچہ یثرب کے شاعر حسانؓ ابن ثابت نے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، کہا ہے کہ جب ان پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہوتی تو ان کا جن ظاہر ہو کر انہیں زمین پر گرا دیتا اور الہامی الفاظ ان کے منہ سے کہلواتا۔ (Andrae: Mohammad P.59)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نزدیک جن کی کوئی توقیر نہیں تھی جو وسوسے ڈالتا اور غلطیوں کا ارتکاب کر سکتا تھا۔ اللہ نے حضورؐ کو زہد اور ریاضت کا صلہ دیا تھا لیکن آپؐ زندہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ قرآنِ حکیم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پوری زندگی میں جب کوئی شخص آپؐ کو جن رکھنے والا مجنوں کہتا تو آپؐ ہمیشہ شدید ردِ عمل ظاہر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآنِ کریم کی آیات اور عرب کی روایتی شاعری کے درمیان احتیاط کے ساتھ حدِ فاصل کھینچی گئی ہے۔

جنابِ خدیجہؓ نے فوراً آپؐ کی دوبارہ ڈھارس بندھائی، خدا اس قدر بے رحمی اور سنگدلی سے عمل نہیں کرتا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایمانداری سے خدا کی پسندیدہ راہ پر چل کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بدلے میں وہ آپؐ کو ناکام بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا: ''آپؐ اپنے عزیز و اقارب کے لیے مہربان اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ہیں۔ غریبوں اور بے کسوں کی امداد کرتے اور ان کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ آپؐ اپنی قوم میں وہ اخلاقی قدریں بحال کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جن سے وہ محروم ہو چکی ہے۔ آپؐ مہمانوں کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آتے ہیں اور مفلوک الحال اور تنگ دست لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ میرے محبوب! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا''۔ (محمد ابنِ اسحاق، سیرت رسول اللہ، صفحہ ۱۵۳: The Life of Muhammad P. 106)۔ حضرت خدیجہؓ پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آپؐ کو دوبارہ یقین دہانی کرانے کے لیے انہوں نے تجویز کیا کہ انہیں اس معاملے میں اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے ساتھ مشورہ کرنا چاہیے۔ ورقہ بن نوفل نے تورات اور انجیل پڑھی تھی اور وہ انہیں ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے ان سے وہ سب باتیں بیان کیں جن کے دیکھنے اور سننے کی خبر رسول اللہؐ نے دی تھی۔ ''قدوس، قدوس''! پاک ہے، پاک ہے! ورقہ فوراً چلا اٹھا: ''قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے، اے خدیجہؓ! اگر تم نے مجھ سے سچ کہا ہے تو ناموسِ اکبر، جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا، وہ ان کے پاس آ پہنچا اور بے شک وہ اس امت کے نبی ہیں''۔ اگلی مرتبہ ورقہ کی حضورؐ سے کعبۃ اللہ میں ملاقات ہوئی تو ورقہ نے، جو عیسائیت اختیار کر چکا تھا، فوری طور پر سر جھکا کر ایک خدا کے نئے پیغمبرؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں ہم اس مشاہدے کی نوعیت پر غور کرنے کی غرض سے کچھ دیر کے لیے توقف کرتے ہیں۔ ہم ایسے تمام رویا یا وجدان کو ہسٹر یا یا الحاد کہہ کر انہیں فوری طور پر مسترد نہیں کر سکتے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں وجدان کو فنی اور مذہبی اصطلاح میں حلم اور شفقت کی صفات سے متصف کیا گیا ہے۔ کوئی بھی شاعر اور تخلیقی فنکار اپنی شاعری اور فنی شہ پاروں کے ذریعے جو پیغام دیتا ہے، اس سے اس کے خالق کی بے پناہ حاکمانہ قوت کی عکاسی ہوتی ہے جس کا وہ برملا اعلان کرتا ہے۔ اسی طرح ایک سچا تخلیقی مفکر بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل میں بھی الہام اور وجدان کی وجہ سے کوئی لطیف خیال پیدا ہوا ہے اور اس نے آزاد وجود رکھنے والی کسی غیر تخلیقی حقیقت کو پالیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور مثال ارشمیدس کی ہے جو اپنا مشہور اصول دریافت ہونے پر چیخ چیخ کر ''Eureka! میں نے پالیا ہے'' کہتا ہوا تیزی کے ساتھ غسل خانے سے باہر آ گیا تھا۔ جب اس کے اوسان بحال ہوئے تو وہ اثر پذیری کی ذہنی کیفیت میں تھا اور مسئلے کا حل اس کے دماغ میں اس طرح جاگزیں ہو گیا جیسے یہ حل پہلے سے اس کے اپنے ذہن میں موجود تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں کوئی بھی تخلیقی فکر داخلی بصیرت سے حاصل ہونے والا وجدان ہے جو کسی غیر تخلیقی حقیقت کو تاریک دنیا میں جست لگانے کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وجدان عقل سے علیحدگی نہیں بلکہ اس سے عقل کو جلا ملتی ہے، کسی خاص مسئلے کا اختصار کے ساتھ فوری حل مل جاتا ہے اور جاں گسل منطقی تیاریوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک تخلیقی استعداد رکھنے والا غیر معمولی ذہین انسان غیر دریافت شدہ سلطنت سے اس طرح واپس آتا ہے گویا وہ زمانہ قدیم کا ہیرو ہے جو دیوتاؤں سے کوئی چیز چھین کر اسے بنی نوع انسان میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مذہبی وجدان کو بھی غالباً اسی نقطہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ شاعر، جو نظم کو غور سے سنتا ہے، دراصل وہ بے ہوشی کے عالم میں شاعری کی دیوی کے پیغام یا عطیے کا حامل ہوتا ہے۔ مکہ جیسے مختصر معاشرے میں لوگوں کے ذہن عام طور پر شعور اور آگہی سے نا آشنا تھے اور اگر دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ہم عصروں کو درپیش مسئلوں کی تہ تک پہنچ گئے تھے لیکن آپؐ اپنی قوم کے لیے وہ چیز لائے تھے جسے صرف چند لوگ ہی سننے کو تیار تھے۔ ہم دیکھیں گے کہ جیسے ہی آپؐ نے دن کی روشنی میں ایک ایک آیت اور سورت کی شکل میں لوگوں کے سامنے قرآنِ پاک کی تلاوت کی تو اکثر لوگ عمیق سطح پر اس کے قائل ہو گئے تھے۔ قرآن نے ان کے تعصبات، پریشانیوں اور نظریاتی اعتراضات کا ایک ایسا فکری، روحانی اور سماجی حل پیش کر دیا جو آپؐ سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور جس سے ان کی امنگوں اور خواہشات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ دنیا کے تمام مذاہب میں خدا یا حقیقت مطلق کا تصور ثقافتی قدروں سے مشروط ہے۔ حجاز کے عرب اپنی مخصوص ضروریات کے لیے موزوں مذہبی حل کے متلاشی تھے۔ مثال کے طور پر وہ خدا کے بارے میں اس مسیحی تصور کو اپنانا نہیں چاہتے تھے جو استدلالی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفے اور یونان کے قدیم نظریات سے آلودہ ہو چکا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا میلان فطری طور پر عظیم عبرانی پیغمبروں کے سامی مذہبی مشاہدے کی طرف تھا جو مشرقِ وسطیٰ کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شام، عراق، ایران اور شمالی افریقہ کے لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ان ملکوں کے باشندوں نے خدا کے متعلق یونانی تصور اس لیے مسترد کر دیا کیونکہ یہ نظریہ ان کی ضروریات کے موافق نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سامی مذہب کے قریب ترین دین کی طرف لوٹ آئے۔

لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ آپؐ ایک نئے عالمی مذہب کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ یہ دین صرف عربوں کے لیے تھا جنہیں اب تک خدائی پلان سے باہر رکھا گیا تھا۔ خدا نے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے صحیفے بھیج رکھے تھے اور قرآنِ کریم میں انہیں اہلِ کتاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے البتہ عرب ابھی تک کسی خصوصی وحی کی نعمت سے محروم تھے۔ رسول اللہؐ نے غارِ حرا میں نازل ہونے والے جس ربانی کلام کی تلاوت شروع کی، وہ عربی زبان میں قرآن تھا۔ یہ وہ پیغام تھا جس میں عرب کی اتھاہ ضرورتوں کا جواب دیا گیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شعور کی نئی سطح تک پہنچنے کے لیے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا تھا جہاں وہ اپنے معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کی نشان دہی کر کے عربوں کے سامنے بتدریج ان مسئلوں کا خصوصی حل پیش کر سکتے تھے۔

اکثر اوقات ہم حقیقی فکر یا کشف کے لیے الہام کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن علمِ لسانیات کے مطابق اس لفظ کا مطلب ہے، بے نقاب یا منکشف کرنا۔ جہاں تک اس کی نوعیت کا تعلق ہے، کسی بھی مذہبی مشاہدے یا نظریے کو حقیقی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اصل میں یہ پہلے سے موجود حقیقت کا پرتو ہوتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بیشتر مذہبی پیشواؤں کے مقابلے میں اس حقیقت کا بہتر اور واضح ادراک تھا۔ غارِ حرا میں وحی کا نزول کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ تو خدا کا وہ دین تھا جس کی بار بار تکرار کی گئی تھی البتہ اسے عرب میں متعارف کرانے کا فریضہ حضورؐ کو سونپا گیا تھا۔ اللہ کا وہ دین، جس کی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں عنقریب تبلیغ شروع کرنے والے تھے، اس کا آغاز کوہِ حرا سے نہیں، کائنات کی تخلیق کے دن سے ہو گیا تھا۔ خدا نے آدمؑ کو زمین پر اپنا خلیفہ یا نائب بنایا تھا جس کے بعد اس نے کرۂ ارض پر بسنے والی ہر قوم کے لیے یکے بعد دیگرے اپنے پیغمبر بھیجے۔ (ہم نے ہی آپؐ کو حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔ سورہ فاطر، آیت ۲۴)۔ تمام انسانوں کے لیے خدا کا پیغام ایک جیسا ہے، اس لیے تمام مذاہب بھی ایک تھے۔ قرآنِ کریم نے سابق الہامی صحیفوں کو مسترد نہیں کیا بلکہ اصولی طور پر ہر مسلک، ہر روایت اور ہر صحیفہ ایک دوسرے کی طرح اچھا اور مقدس ہے۔ اصل چیز خدا کی اطاعت کا معیار تھا نہ کہ اس کے کسی بندے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اپنا معبود بنالینا! انسانوں کو صرف خدا کے دین کا طلب گار ہونا چاہیے۔ (کیوں نہیں (مواخذہ ہوگا) البتہ جو شخص اپنا قرار پورا کرے اور پرہیز گاری اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔ سورہ آل عمران، آیت ...٧٦ مترجم)۔ تمام پیغمبر الہامی کتابوں کی تصدیق اور تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے پیش گوئی کی تھی کہ ان کے بعد ''فارقلیط'' (جس کا بعض عربوں نے ''احمد'' ترجمہ کیا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہم معنی ہے) کا ظہور ہوگا۔ قرآنِ حکیم میں حضرت عیسیٰ کی اس خوش خبری کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اور جب مریم کے بیٹے نے کہا
اے (میری قوم) بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں
مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں
اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوش خبری سنانے والا ہوں
جن کا نام احمدؐ ہے (سورہ الصف، آیت ٦)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہونے والی وحی میں فرق صرف یہ ہے کہ خدا نے پہلی مرتبہ قریش کی طرف اپنا پیغمبر اور ان کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا تھا۔

وحی کی تاریخی ترتیب کے معاملے میں ہمارا رویہ عام طور پر لاپروائی پر مبنی ہوتا ہے حالانکہ اس نکتے پر گہرے غور وخوض کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مغرب کے لوگ اسلام میں رواداری کے جوہر کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جیسا کہ اگلے باب میں ظاہر ہوگا، اسلام میں عدم رواداری ان نظریاتی اختلافات کے باعث پیدا نہیں ہوئی جس نے عیسائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا ہے بلکہ اس کا سبب بالکل مختلف ہے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا گیا اور اسلامی سلطنت میں انہیں اپنے آبائی مذہب پر آزادانہ طور پر عمل کرنے کی مکمل اجازت تھی۔ بعد میں زرتشتیوں، ہندوؤں، بدھ مت کے پیروکاروں اور سکھوں کو بھی اہلِ کتاب کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے میں کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی سلطنت کئی صدیوں تک عیسائیوں اور یہودیوں کی مہمان داری کرتی رہی ہے لیکن مغربی یورپ اپنے عیسائی علاقے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے وجود کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

کوہِ حرا میں ٦١٠ عیسوی میں وحی کا نزول اسلامی تاریخ میں نہایت اہم واقعہ ہے لیکن یہ محض نقطہ آغاز تھا۔ آج بیشتر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کوہِ حرا میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو وحی نازل ہوئی، وہ ایک ایسا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معجزہ تھا جس نے شروع میں نہ صرف مکہ اور بعد میں مدینہ کے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دی بلکہ اس نیرِ تاباں کی روشنی میں دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں عورتوں اور مردوں کی مسلسل رہنمائی کرنے اور انہیں زندگی کے ارفع مقاصد اور اس کی قدر و قیمت سے روشناس کرنے کی بھرپور استعداد موجود ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح دینِ اسلام کا مطمحِ نظر بھی اپنے پیروکاروں کی زندگیوں کو بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا اور ان میں حقیقی روحانی بصیرت پیدا کر کے آنے والی تمام نسلوں میں جدت پسندی کی روح کو اجاگر کرنا تھا۔

قرآنِ حکیم میں رسول اللہؐ کو امی یا ناخواندہ پیغمبر کہا گیا اور ناخواندگی کے اس نظریے میں آپؐ کے کشف اور الہام کی معجزانہ صفت پر زور دیا گیا ہے البتہ بعض مغربی اسکالرز کا دعویٰ ہے کہ امی کے لقب سے یہ مراد نہیں کہ حضورؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان اسکالروں کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک تاجر کی حیثیت سے لکھنے پڑھنے کی مبادیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں یقین ہے کہ آنحضرتؐ خود کو اس ''ناخواندہ'' قوم کا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے جس پر خدا کی طرف سے کوئی صحیفہ نازل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں امی کا مطلب ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح کوئی الہامی کتاب نہ رکھنے والی قوم کی طرف بھیجا گیا پیغمبر۔ کئی دوسرے مصنفوں نے امی کی غلط تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امی کے لفظ کا تعلق لفظ امہ یا جماعت سے ہے اور اس لقب کا مطلب ہے ''لوگوں کا پیغمبر''۔ واقعہ یہ ہے کہ امی اور امہ کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں اور مسلمان اس تشریح کو توہین آمیز سمجھتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کے لوگ کوئی ایک ہزار برس سے یہ باور نہیں کر سکے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حقیقی پیغمبرانہ بصیرت اور استعداد موجود تھی۔ امی کے لفظ کی غلط تشریح بھی اس سلسلے کی ایک اور کوشش ہے۔ اصل میں امی کی روایتی اسلامی تشریح کو چیلنج کرنا گمراہی کے مترادف ہے۔ ابتدائی سیرت نگاروں نے حضورؐ کے پڑھنے یا لکھنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ آپؐ کو جب کوئی مکتوب بھجوانا ہوتا تو آپؐ حضرت علیؓ جیسے کسی خواندہ شخص سے املا لکھوا لیتے۔ پوری زندگی میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو چھپائے رکھنا ایک بہت بڑا فریب ہے۔ لیکن آنحضرتؐ چونکہ اپنے لوگوں کے بہت قریب رہتے تھے، اس لیے انہیں دھوکا دینا بہت مشکل تھا۔ امی کا ترجمہ ناخواندہ بہت قدیم ہے اور مسلمانوں کے نزدیک اس کی بے حد اہمیت ہے۔ جس طرح مسیحیت میں حضرت عیسیٰؑ کی کنواری ماں مریمؑ کے ہاں پیدائش کی علامتی اہمیت ہے، اسی طرح وحی الٰہی کو بنی نوع انسان تک پہنچانے والے مرد یا عورت کی عفت و پاکیزگی کو بھی حد درجہ اہمیت حاصل ہے۔ وحی کو صرف انسانوں کی تائید و حمایت حاصل نہیں ہونی چاہیے۔

یہ تصور غلط ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فعال اور متحرک نہیں تھے اور آپؐ خدا اور انسانوں کے درمیان محض ایک ٹیلی فون کا کردار ادا کرتے تھے۔ دوسرے پیغمبروں کی طرح آپؐ کو بھی اس وحی کی تفہیم کے لیے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بعض اوقات مبہم اور زبانی شکل میں ہوتی تھی، جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ کئی مرتبہ یہ وحی لفظوں کے بجائے خواب کی صورت میں نازل ہوتی۔ (یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے جو قوت والا ہے، عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ جس کی (آسمان میں) اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔ اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے اس (فرشتے) کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا بھی ہے۔ اور وہ غیب کی باتیں بتلانے میں بخیل بھی نہیں۔ سورہ التکویر، آیات ۱۹ تا ۲۴ ... مترجم)۔ رسول اللہؐ کی اہلیہ ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ پہلی چیز جس سے حضورؐ کی رسالت کی ابتدا ہوئی، وہ سچے خواب تھے۔ جب اللہ نے آپؐ کی کرامت اور آپؐ کے ذریعے بندوں پر رحمت نازل کرنا چاہی تو آپؐ نیند میں جو خواب دیکھتے، وہ صبح صادق کی طرح ظاہر ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے تنہائی کو آپؐ کے لیے محبوب بنا دیا تھا اور کوئی چیز آپؐ کو تنہائی میں رہنے سے زیادہ پسندیدہ نہ رہی تھی۔ (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۵۱: The Life of Muhammad P. 105)۔ صبح صادق کی معنی خیز اصطلاح سے مراد وہ وقت ہے جب مشرقی ملکوں میں رات کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور سورج تاریکی کا پردہ چاک کر کے دنیا کو اچانک روشن کر دیتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو مشاہدہ کیا، وہ ایک صریح پیغام نہیں، امید کا ایک ہوشربا خواب تھا۔

مسلمانوں کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پیغامِ خداوندی کو لفظوں کی صورت میں پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رسولِ کریمؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''مجھ پر ایک دفعہ بھی وحی کی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی کہ میں نے یہ خیال نہ کیا ہو کہ میری روح کو بے دردی کے ساتھ مجھ سے جدا کیا جا رہا ہے۔ (جلال الدین سیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، میکسم روڈنسن: Mohammad صفحہ ۷۴)۔ یہ ایک کربناک تخلیقی عمل تھا۔ حضورؐ نے فرمایا: ''بعض اوقات زبانی مضمون پوری طرح واضح ہوتا اور میں فرشتے (جبریلؑ) کو انسان کی صورت میں دیکھتا اور اس کے الفاظ سنتا لیکن کئی مرتبہ یہ ایک تکلیف دہ اور نا قابلِ فہم الہام ہوتا۔ بعض اوقات یہ ایک گھنٹی کی گونج کی طرح سنائی دیتا ہے جو میرے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن جب میں اس پیغام سے آگاہ ہو جاتا ہوں تو گھنٹیوں کی یہ گونج مدھم پڑ جاتی ہے''۔ (بخاری حدیث ۱:۳: Lings: Muhammad PP. 44, 45)۔ ہم دیکھیں گے کہ آپؐ اس شاعر کے برعکس، جو کسی نظم کو سن کر بتدریج روشنی کی طرف آتا ہے، باطنی طور پر روحانیت کی طرف متوجہ ہوتے اور اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کر ایک مسئلے کا حل تلاش کرتے تھے۔ قرآنِ کریم آپؐ کو خبردار کرتا ہے کہ آپؐ اس کے مبہم مطالب کو نہایت غور سے سنیں جسے ورڈز ورتھ Wordsworth دانش مندانہ عدم مزاحمت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ کو قرآن کے الفاظ عجلت میں ادا نہ کرنے کی بھی تلقین کی گئی تھی:

(اے نبیؐ) آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کا جمع کرنا اور (آپؐ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمے ہے
ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپؐ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں
پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمے ہے (سورہ القیمہ، آیات ۱۶ تا ۱۹)

یہ ربانی آواز حضورؐ کو آسمان سے اچانک گرج کی صورت میں پیغام نہیں پہنچا رہی تھی، نہ ہی خدا کوئی ایسی حقیقتِ مطلق تھا جس کی تعریف و تشریح کی جا سکے۔ یہ آواز صرف دل کی گہرائیوں میں سنی جا سکتی تھی۔ بعد میں مسلمان صوفیائے کرام نے خدا کی اس منشا اور ارادے کو ہمارے وجود کی بنیاد قرار دیا اور بعض صوفیوں کو یہ ربانی آواز سنائی دی: ''خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے!''

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان ابتدائی دنوں میں رسول اللہؐ پر کتنی مرتبہ وحی نازل ہوئی تھی البتہ ہمیں یہ علم ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، خدیجہؓ اور ورقہ نزولِ وحی کے بارے میں خاموش رہے تھے۔ حضورؐ کے مغربی دشمن آپؐ پر شہرت کا دلدادہ ہونے کا الزام لگاتے ہیں لیکن یہ الزام جھوٹا، من گھڑت اور بے بنیاد ہے۔ چند ابتدائی سورتیں نازل ہونے کے بعد تقریباً دو سال تک مکمل خاموشی چھائی رہی۔ آنحضرتؐ کے لیے یہ تنہائی اور کسمپرسی کا دور تھا اور کئی مسلمان مصنفوں نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ حد درجہ مایوس اور دل شکستہ رہے۔ آپؐ کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا کہ آپؐ صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں؟ یا خدا نے آپؐ کو تنہا چھوڑ دیا ہے؟ یہ ایک ہولناک مصیبت تھی۔ لیکن اس کے بعد سورہ الضحیٰ نازل ہوگئی جس میں روشن و تاباں اور بصیرت افروز یقین دہانی کرائی گئی:

قسم ہے چاشت کے وقت کی
اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے
نہ تو تیرے رب نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ وہ بیزار ہو گیا ہے
یقیناً تیرے لیے انجام آغاز سے بہتر ہو گا
تجھے تیرا رب بہت جلد (انعام) دے گا اور تو راضی (اور خوش) ہو جائے گا
کیا اس نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟
اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی؟
اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا؟
پس یتیم پر تو بھی سختی نہ کیا کر
اور نہ سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ

نبی کریمؐ اب اپنا مشن شروع کرنے والے تھے۔ آپؐ کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ آپؐ پر براہِ راست خدا کی طرف سے وحی نازل ہو رہی ہے اور یہ کہ آپؐ راہ بھولے کاہن نہیں ہیں۔ ایمان کا یہ جذبہ جرأت اور جوانمردی کے اظہار کا متقاضی تھا لیکن اب آپؐ نے ایک ایسا قدم اٹھانے کا عزم کر لیا جس کے لیے اس سے بھی زیادہ ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی۔ حضورؐ نے اپنے مشاہدے کے بارے میں ورقہ کی تشریح کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ آپؐ قریش کے پیغمبر کے نام سے موسوم ہو گئے۔ اور اب آپؐ کو اپنی قوم کو خدا کا پیغام پہنچانا تھا۔ ورقہ نے آپؐ کو خبردار کیا تھا کہ اب آپؐ کو جھٹلایا جائے گا اور تکلیفیں پہنچائی جائیں گی، آپؐ کو خارج البلد کیا جائے گا اور آپؐ سے جنگ کی جائے گی۔ اس نے حضورؐ کو بتایا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اسے وہ دن دیکھنا نصیب ہوا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے دینِ حق کی مدد کرے گا۔ پھر اس نے سر جھکا کر رسول اللہؐ کے سر مبارک کے درمیان بوسہ دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ورقہ کی یہ باتیں سن کر سخت دھچکا لگا اور آپؐ نے مایوسی کے عالم میں اس سے پوچھا کہ آیا آپ کی قوم آپؐ کو مکہ سے واقعی نکال دے گی؟ ورقہ نے افسردگی سے جواب دیا کہ کسی نبی کی اس کی اپنی قوم میں عزت و تکریم نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، حضورؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپ نہایت محتاط تھے۔ آپؐ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؐ کی تبلیغ کا مذاق اڑایا جائے گا اور عیسائی حنیف عثمان ابن الحویرث کی طرح آپؐ کو بھی بازنطینیوں کا ایجنٹ سمجھا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قریش آپؐ پر دغا بازی اور روایتی دین میں تحریف کرنے کا الزام لگائیں۔ اس کے باوجود آنحضرتؐ اس خطرناک مشن کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ دینِ حق کا یہ راستہ آپؐ کو کس سمت لے جائے گا، اس کا آپؐ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

انسانیت کو شعور و آگہی بخشنے والا پیغمبرؐ

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوہِ حرا پر دہشت انگیز لیکن تاباں و درخشاں تجلی کا جو مشاہدہ ہوا تھا، وہ فرشتے کے ساتھ مقابلہ کرنے والے یعقوب علیہ السلام کے تجربے سے بالکل برعکس تھا۔ اب آپؐ اپنی قوم کو وہ پیغام پہنچانے والے تھے جو آسمانی بادشاہت سے اچانک زمین پر اتر آیا تھا۔ سورہ والضحیٰ میں اس سماجی حکم کا واضح اعلان کر دیا گیا کہ ہر مرد اور عورت کو اپنے قبیلے کے بے کس اور نادار لوگوں کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ یہ کوئی نیا حکم نہیں تھا بلکہ اس میں ''مروہ'' کے پرانے مثالی نصب العین کی تکرار کی گئی تھی۔ لیکن یہ ارفع نصب العین اب قریش کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس پیغام کو دنیا بھر میں مبعوث ہونے والے تمام سابق پیغمبروں پر نازل ہونے والی وحی میں مرکزی خیال کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مسلمانوں کی روایت میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان پیغمبروں کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ یہ اعداد و شمار علامتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان پیغمبروں کی تعداد ان گنت اور لامحدود تھی۔ خدا نے بنی نوع انسان کو زندگی بسر کرنے کے صحیح طریقے سے آگاہ کرنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا لیکن انسانوں نے عام طور پر خود رائی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خدائی پیغام کو نظر انداز کر دیا۔ اب خدا نے اپنے آخری پیغمبرؐ کو قریش کی طرف بھیج دیا جن کی طرف اس سے پہلے کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہؐ نے ۶۱۲ عیسوی میں اپنے مشن کا آغاز کیا تو آپؐ کو اپنے رول کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت آپؐ کوئی نجات دہندہ یا مسیح نہیں تھے اور نہ ہی آپ کا مشن آفاقی نوعیت کا تھا۔ شروع شروع میں تو آپؐ کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ آپؐ کو جزیرہ نما کے دوسرے عربوں میں تبلیغ کرنی چاہیے۔ آپؐ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو پیغمبروں کی لمبی قطار میں آخری نبی کی حیثیت سے مکہ اور اس کے قریب و جوار میں بسنے والوں کو خدا کا پیغام پہنچانا تھا۔ (اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف عربی قرآن کی وحی کی ہے تاکہ آپؐ مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو خبردار کریں۔ سورہ الشوریٰ آیت ۷......مترجم)۔ آپؐ کوئی سیاسی فریضہ انجام دینے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ (پس آپؐ نصیحت کر دیا کریں (کیونکہ) آپؐ صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپؐ کچھ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔ سورہ الغاشیہ، آیات ۲۱، ۲۲... مترجم)۔ حضورؐ صرف نذیر، یاد کرانے والے اور انسانیت کو شعور و آگہی بخشنے والے پیغمبر تھے۔ بعد میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنے فرضِ منصبی کے بارے میں نظریہ تبدیل ہو گیا۔ لیکن جب آپؐ نے تبلیغ کا مشن شروع کیا تو اس وقت آپؐ کو یقین تھا کہ آپؐ صرف قریش کو اس پر خطر راستے کے خطرات سے ڈرانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں جو انہوں نے حال ہی میں اختیار کر لیا تھا۔

اے کپڑا اوڑھنے والے
کھڑا ہو جا اور آگاہ کر دے
اور اپنے رب ہی کی بڑائیاں بیان کر
اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر
ناپاک کو چھوڑ دے (سورہ المدثر آیات ۱ تا ۵)

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حضورؐ نے اپنے تبلیغی مشن کا آغاز قیامت کے پیغام سے کیا تھا۔ قرآنِ حکیم میں روزِ جزا کا ذکر صرف ابتدائی سورتوں میں مختصر طور پر ہوا ہے۔ بہر حال ابتدائی پیغام نہایت مسرور کن تھا۔ آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ مکہ میں بسنے والا ہر مرد اور ہر عورت خدا کی رحمت اور جود و سخا کے جوہر سے روشناس ہو جائے جس کا مشاہدہ وہ اس فطری دنیا میں کر سکتے تھے۔ خدا نے انسان کو تخلیق کیا، اس کی رہنمائی کی، بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبود کے لیے وہ پوری کائنات کے نظام کے حسنِ ترتیب کی حفاظت کر رہا ہے۔ کائنات میں خدائی سرگرمی اور اللہ کی نشانیوں (آیات) پر غور و فکر اور تدبر کے نتیجے میں سب قریش یہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ کائنات خدا نے ہی تخلیق کی ہے۔ وہ خدا کے جود و کرم اور اپنی گمراہی و سرکشی اور ناشکری کے بھی معترف تھے:

اللہ کی مار انسان پر! کیسا ناشکرا ہے!
اسے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا
ایک نطفے سے! پھر اندازے پر رکھا اس کو
پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر اسے موت دی اور پھر قبر میں دفن کیا
پھر جب چاہے گا، اسے زندہ کر دے گا
ہرگز نہیں، اس نے اب تک اللہ کے حکم کی بجا آوری نہیں کی
انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کو دیکھے!
کہ ہم نے خوب پانی برسایا
پھر پھاڑا زمین کو اچھی طرح
پھر اس میں سے اناج اگائے
اور انگور اور ترکاری
اور زیتون اور کھجور
گھنے درختوں کے باغات
اور میوہ اور (گھاس) چارہ (بھی اگایا)
تمہارے استعمال اور فائدے کے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے (سورہ عبس آیات ۱۷ تا ۳۲)

اس کے باوجود انسانوں نے خدا کے متعین کیے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے سے انکار کر دیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انسانی ضروریات کی کوئی لمبی فہرست جاری نہ کی بلکہ آپؐ نے سب سے پہلے عرب کے اس پرانے ضابطۂ اخلاق اور آئینِ غیرت میں اصلاح پر توجہ دی جس سے قریش بخوبی آگاہ تھے۔ قرآنِ کریم کا صرف یہی مطمح نظر ہے کہ تمام مرد اور عورتیں انصاف کے اصولوں پر مبنی ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کریں جس میں کمزوروں اور بے کسوں کے ساتھ شائستہ سلوک کیا جائے۔ یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر قرآنی پیغام کی پوری عمارت ایستادہ ہے۔ اگر آج مسلمان ہمارے ساتھ تعصب یا عدم رواداری کا سلوک کر رہے ہیں تو ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ مغربی مسیحیت کے برعکس ہمیشہ تنگ نظر اور متعصب نہیں رہے اور انہوں نے حقیقت کے بارے میں حریفانہ بصیرت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ ناانصافی کے مخالف رہے ہیں، خواہ یہ ناانصافی ان کے اپنے لیڈروں ایران کے شاہ محمد رضا پہلوی اور مصر کے صدر انور السادات نے کی ہو یا طاقتور مغربی ملکوں نے! قرآنِ مجید کا یہ ابتدائی پیغام نہایت سادہ اور قطعی ہے کہ ذاتی امارت اور خوش حالی کے لیے دولت اکٹھی کرنا غلط اور خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور معاشرے کی دولت کو تقسیم کرنا صحیح ہے۔

مغربی اسکالرز ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سوشلسٹ کہنا غلط ہے۔ ان کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشارہ اس جانب ہے کہ حضورؐ نے قریش کی سرمایہ داری پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی اور یہ کہ آپؐ نے غربت و افلاس کو ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی حالانکہ ساتویں صدی کے عرب میں غربت کا خاتمہ ایک ناممکن کام تھا۔ جیسا کہ مغرب میں اظہار کیا گیا ہے، رسول اللہ کا پیغام سوشلزم کے حالیہ نظریات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا البتہ اگر فکر کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو آپؐ یقیناً سوشلسٹ تھے اور اسلام کی تہذیب وثقافت پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ نے مال و دولت اور جائیداد کی مذمت نہیں کی اور نہ ہی مسلمانوں کو اپنی ہر چیز لٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دولت کو فراخ دلی سے خرچ کریں اور اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ باقاعدگی کے ساتھ غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کریں۔ آخر خیرات (زکوٰۃ) کو اسلام کے پانچ اہم ستونوں (ارکان) میں ایک رکن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ (اور ان کے مال میں مانگنے والوں کا اور سوال سے بچنے والوں کا حق تھا۔ سورہ الذٰریٰت آیت ۱۹۔ اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے مانگنے والوں کا بھی اور سوال سے بچنے والوں کا بھی۔ سورہ المعارج آیات ۲۴، ۲۵..... مترجم)۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی ضابطۂ اخلاق میں صدقہ اور خیرات دینے کو لازمی قرار دیا گیا۔ (ڈبلیو منٹگمری واٹ: Muhammad at Mecca صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۹)۔ قرآنِ کریم میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ دولت اکٹھی نہ کریں اور نہ ہی مسابقت اور رقابت پیدا کی جائے۔ (جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے۔ سورۃ اللیل آیت ۱۸..... مترجم، آپؐ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے جس کے ذریعے سے آپؐ ان کو پاک صاف کر دیں۔ سورہ التوبۃ آیت ۹..... مترجم، اور جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے، اس میں سے (ہماری راہ میں) اس سے پہلے خرچ کرو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ سورہ المنٰفقون آیت ۱۰..... مترجم، زیادتی کی چاہت نے تمہیں غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے۔ سورہ التکاثر آیات ۱، ۲..... مترجم)۔ خدا نے قرآن میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ غریبوں کی دیکھ بھال کریں اور بہت سے قریش کے طرزِ عمل کے برعکس یتیموں کی جائیداد کا انتظام و انصرام کرتے وقت جعل سازی اور دھوکے سے ان کی جائیداد کو خورد برد نہ کریں۔ (اور یتیموں کو ان کا مال دے دو اور پاک اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو، اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کا مال ملا کر نہ کھاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ بے عقل لوگوں کو اپنا مال نہ دو جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، ہاں انہیں اس مال سے کھلاؤ، پلاؤ، پہناؤ، اوڑھاؤ اور انہیں معقولیت سے نرم بات کہو۔ جو لوگ ناحق ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ میں جائیں گے۔ سورہ النساء آیات ۲، ۵، ۱۰..... مترجم، اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے۔ سورہ الانعام آیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۲......مترجم، اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ بجز اس طریقے کے جو بہت ہی بہتر ہو، یہاں تک وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جائے، سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۴......مترجم، اور ان کے مال میں مانگنے والوں کا اور سوال سے بچنے والوں کا حق تھا۔ سورہ الذریات آیت ۱۹......مترجم، اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے، سورہ المعارج آیت ۲۴......مترجم)۔ مسلمان جب دنیا کی بڑی طاقت بن گئے اور ان میں سے بہت سے مسلمان بے حد امیر ہو گئے تو بھی اپنی ثقافتی زندگی میں وہ اسی دستور پر کاربند رہے۔ اسلام نے مساوات اور تمام انسانوں کو برابر حقوق دے کر انہیں ترقی کرنے کے یکساں مواقع فراہم کیے اور استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کا جو مقدس قانون مقرر کیا گیا، اس کی بدولت خلیفۃ المسلمین کسی حقیقی سیاسی طاقت سے محروم ہو کر صرف مسلمانوں کے اتحاد کی علامت بن گیا۔ خالص اسلامی معاشرے میں یہ ممکن ہے کہ شاہی دربار دولت مند ہو لیکن اسلامی سلطنت میں مذہبی زندگی کے تمام شعبوں میں پاکباز اور متقی مسلمانوں، فقیہوں، صوفیوں اور عارفوں کا یہ دعویٰ تھا کہ دولت کی نمائش اور خودنمائی غیر اسلامی ہے۔ جب کوئی مقامی حکمران اپنے مسلمان ہونے کی سند پیش کرنا چاہتا تو اسے سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑتا کہ وہ کفایت شعاری سے سادہ زندگی بسر کرتا اور مساوات اور تمام انسانوں کے یکساں حقوق کے مثالی اسلامی اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں نور الدین اور صلاح الدین دونوں نے، جنہوں نے عیسائیوں کے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے مسلمانوں کو منظم کیا، اپنی جائیداد اور اثاثوں کا بڑا حصہ غریبوں کو دے دیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عام لوگوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اس طرح مسلمان ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان حکمرانوں نے مسلمان رعایا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ مشرق قریب میں کسی دوسرے حکمران کے مقابلے میں کہیں بہتر مسلمان ہیں۔ انہوں نے ایسی سلطنتیں قائم کیں جو اسی مقبول نصب العین اور عوامی جوش وخروش کی آئینہ دار تھیں۔ مسلمان ان حکمرانوں کو اس لیے مستند اور قابلِ اعتماد سمجھتے تھے کیونکہ ان کی زندگی پیغمبر اسلامؐ کی زندگی جیسی تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب عرب میں سب سے طاقتور سید بن گئے، اس وقت بھی آپؐ نہایت سادہ اور تصنع سے پاک زندگی گزارتے۔ آپؐ کو تعیشات سے نفرت تھی اور حالت یہ تھی کہ آپؐ کے گھر میں اکثر کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ ہوتی۔ آپؐ کے پاس پہننے کے لیے ایک وقت میں کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہوتا اور صحابہ کرامؓ جب بھی آپؐ سے امیرانہ اور پرتکلف لباس پہننے کی درخواست کرتے تو آپؐ ہمیشہ انکار کر دیتے۔ حضورؐ اس موٹے اور کھردرے لباس کو ترجیح دیتے جسے اکثر لوگ پہنتے تھے۔ جب آپؐ کو تحائف یا مالِ غنیمت سے کوئی چیز پیش کی جاتی تو آپؐ اسے غریبوں میں بانٹ دیتے اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح مسلمانوں کو یہ بتاتے کہ غریب لوگ آسمانی بادشاہت میں امیروں سے پہلے داخل ہوں گے۔ یہ کوئی ناگہانی واقعہ نہ تھا۔ دینِ اسلام قبول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے والے بیشتر لوگوں کا تعلق مکہ کے محروم طبقے سے تھا۔ غلام اور عورتیں دونوں یہ اعتراف کرتے تھے کہ اسلام نے انہیں امید کا پیغام دیا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اگرچہ دولت مند قبیلوں کو بھی اسلام کی دعوت دی لیکن قریش کے بیشتر طاقتور اور امارت پسند خاندان اسلام سے الگ تھلگ رہے اور جب مسلمان خانہ کعبہ میں اکٹھے ہوتے تو قریش اس بات کا تمسخر اڑاتے کہ عظیم عبدالمطلب کا پوتا نیچ ذات کے لوگوں کا ہم نشین ہے۔ اسلام جب زیادہ طاقتور ہو گیا تو اونچے طبقے کے دولت مند مسلمان نہیں، قریش کے غریب خاندانوں کے کمزور لوگ اس کے معاون اور ساتھی تھے۔ لیکن یہ ذاتی ترجیح کا معاملہ نہیں تھا۔ رسول اللہؐ جانتے تھے کہ آپؐ کو اولیں مسلمانوں کے سامنے ایک مثال قائم کرنا ہے اور یہ کہ اللہ کو ناانصافی اور استحصال سے نفرت ہے۔ خدا کی مرضی اور منشا کے مطابق ایک مہذب اور شائستہ معاشرہ قائم کرنے کے لیے سماجی انصاف اور مساوات کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے کی ضرورت ہے۔

ایک ماڈرن لادین اور آزاد خیال شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوہِ حرا پر ہونے والے ہولناک مشاہدے پر تدبر کرنے کے بجائے سماجی اصلاح کے لیے تحریک کیوں شروع نہیں کی تھی؟ اصل میں آپؐ جانتے تھے کہ اس مسئلے کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس مرحلے پر اس قسم کی اصلاحات محض عارضی، سطحی اور نمائشی ہوں گی۔ جب تک قریش کی زندگیوں میں روحانی انقلاب برپا نہیں ہو جاتا، سماجی اصلاح کی کوششیں موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں گی۔ حضورؐ اپنے ہم چشموں کے مقابلے میں اس حقیقت سے سب سے زیادہ آگاہ تھے کہ مکہ کے باشندوں کے اضطراب کی جڑیں زعم و تکبر (یطغیٰ)، بے پروائی اور تونگری (استغنیٰ) کے غیر صحت مند اور غیر حقیقت پسندانہ رویے میں پیوست ہیں۔ (سچ مچ انسان تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا (یا تونگر) سمجھتا ہے۔ یقیناً لوٹنا تیرے رب کی طرف ہے۔ سورہ العلق آیات ٦ تا ٨......مترجم)۔ پہلے زمانے میں، جب قبیلے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، تمام عرب یہ محسوس کرتے تھے کہ قبیلے کے ہر فرد کا دوسرے پر دار و مدار ہے۔ عرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں ان کی زندگی ہر وقت خطرے میں رہتی تھی لیکن تجارتی کامیابیوں نے انہیں ان خطرات سے باہر نکال دیا تھا جو عرب کی معمول کی زندگی کی حقیقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے دولت کو ہی اپنا نیا دین بنا لیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی قسمت کے آپ مالک ہیں۔ قرآن کریم میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض عرب تو یہ باور کرنے لگے تھے کہ دولت انہیں امر کر دے گی حالانکہ زمانہ قدیم میں صرف قبیلہ ہی انہیں لافانی بنا سکتا تھا۔ (بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا، غیبت کرنے والا ہو، جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا جائے۔ وہ سمجھتا ہے اس کا مال سدا رہے گا۔ سورہ الھمزہ آیات ۱ تا ۳......مترجم)۔ عرب معاشرے کی بنیاد گویا جماعتی یا گروہی تصور پر مبنی تھی لیکن اب ہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاندان دوسرے خاندان کے خلاف برسرِ پیکار ہوگیا اور بنی ہاشم جیسے خاندان بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ خود ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ قبیلے کی پرانی وحدت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وحدت اور یک جہتی کو بالآخر پارہ پارہ ہونا تھا۔ خود حضورؐ کے کیریئر میں اس بصیرت کا جواز موجود تھا۔ آخر بیس سال کے بعد آپؐ نے نہ صرف اپنی مہارت، ہنر مندی اور حکمتِ عملی (اگرچہ اس میں مہارت کا خاص عمل دخل تھا) بلکہ اس وجہ سے قریش کے متحدہ محاذ کو شکست دے دی کیونکہ اب اس محاذ میں آپؐ کی مخالفت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ رسول اللہؐ نے جب اپنے مشن کا آغاز کیا، اس وقت یہ نظریہ کہ افراد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے، قدیم گروہی ضابطۂ اخلاق پر غالب آ رہا تھا۔ قرآنِ مجید نے اس ضمن میں اس شخص کی ہوشربا مثال دی ہے جو قیامت کے دن اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے تمام قریبی رشتے داروں کو قربان کرنے کو تیار ہوگا۔ (گناہ گار اس دن کے عذاب کے بدلے فدیے میں اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو اور روئے زمین کے سب لوگوں کو دینا چاہے گا تاکہ یہ اسے نجات دلا سکے۔ سورہ المعارج آیات ۱۱ تا ۱۴...... مترجم)۔ اس زمانے میں جب خونی رشتوں کو بے حد مقدس سمجھا جاتا تھا، اس قسم کی صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے قریش کو اپنے اندر ایک نیا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس وقت بیشتر سیاسی حل مذہبی نوعیت کے تھے۔ نبی کریمؐ نے جب قریش سے کہا کہ وہ آسمانوں اور زمین کے خالق اللہ پر اپنے عقیدے کے اثرات پر غور کریں تو آپؐ ان کے سامنے کوئی نئی چیز پیش نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے جدید مفہوم کے مطابق اٹھارویں صدی سے پہلے پوری دنیا خاص طور پر مغرب میں کفر اور الحاد نفسیاتی اعتبار سے ممکن نہیں تھا۔ تمام قریش خداوندِ قدس کے وجود پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ وہی خدا ہے جس کی یہودی اور عیسائی پرستش کرتے تھے۔ اب آنحضرتؐ ان لوگوں سے اس عقیدے کے نتائج پر غور کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ آپؐ کو اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی البتہ آپؐ نے یہ عندیہ دیا کہ اگر قریش واقعی ان چیزوں پر یقین رکھتے ہیں جن کے متعلق وہ باتیں کرتے ہیں تو اب انہیں اس معاملے پر غور و فکر کرنی چاہیے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو یقین تھا کہ خدا قیامت کے روز تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ تصور گو عربوں کے قدیم عقیدۂ قضا و قدر سے متصادم تھا لیکن اس سے ہر فرد کی روح کے لیے گہرے نتائج مرتب ہوتے یہاں تک کہ ان کے قبیلے کا کمزور ترین فرد بھی دائمی مقدر کا حامل ہوتا چنانچہ اس نظریے کو مقدس درجہ حاصل تھا۔ اگر قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ ہی کائنات کا خالق ہے تو انہیں خدا کی مخلوق کو ایک نئے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

پیغمبر آخر الزماںؐ نے اپنے مشن کے ابتدائی برسوں میں، جب آپؐ صرف چند منتخب افراد میں تبلیغ کرتے تھے، قریش کو گراں قدر عقائد کی یاد دہانی کراتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ ان عقائد پر نظرثانی کر کے انہیں موجودہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورتِ حال پر منطبق کریں۔ خوشحالی اور تونگری کا نیا مسلک ہاتھیوں کے سال کی ان قابلِ فخر یادوں سے کس طرح ہم آہنگ ہوسکتا تھا جب خدا نے ایک طاقتور معجزے کے ذریعے مکہ کو تباہی سے بچا کر ان کی عزت اور وقار میں بے حد اضافہ کردیا تھا؟ یہ ایک اور ''نشانی'' تھی جس پر قریش کو نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنا چاہیے تھا۔

کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟

کیا ان کے مکر کو بےکار نہیں کردیا؟

اور ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے

جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے

پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کردیا (سورہ فیل)

قریش اس واقعے کے بارے میں ڈینگیں مار کر اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے یہ طاقت اور کامیابی اپنی کوششوں کے ذریعے حاصل نہیں کی تھی۔

قرآنِ کریم کے پیغام میں کوئی انوکھی اور نئی بات بیان نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ محض ''یاددہانی'' تھی (قرآن تو نصیحت کی چیز ہے... مترجم)۔ اس میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ہر شخص پہلے سے جانتا ہے۔ قرآن میں پرانے حقائق کو واضح اور شفاف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کسی نئے مضمون اور سورت کا آغاز عام طور پر ان لفظوں سے کیا گیا ہے: ''کیا تم نے نہیں دیکھا؟'' یا ''کیا تم نے غور نہیں کیا؟'' خدا کا کلام کڑکتے گرجتے احکام کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ اس میں قریش کو مذاکرات کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں قریش کو ایک ایسا چیلنج دیا گیا تھا جو ماضی کو غارت کرنے کے بجائے عربوں کی قدیم روایات اور روحانی مشاہدوں کی بنیاد پر ایک نئی فکری عمارت تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ مثال کے طور پر قرآنِ مجید میں قریش کو یاد دلایا گیا ہے کہ کعبہ، جس پر انہیں بے حد فخر ہے، اصل میں اللہ کا گھر اور ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہاتھیوں کے سال کے دوران یہی کعبہ حبشہ والوں کے حملے کا سبب بنا تھا۔ اگر اللہ انہیں اس حملے سے محفوظ نہ رکھتا تو وہ اس قسم کی کامیاب منڈی قائم نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے شہر مکہ پر دوسرے قبیلوں کے حملوں کا خطرہ منڈلاتا رہتا اور انہیں عربوں کی بھوک کی بیماری سے کبھی نجات نہ ملتی۔

قریش کے مانوس کرنے کے لیے

(یعنی) انہیں جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے لیے (اس کے شکریے میں)

پس انہیں چاہیے کہ اسی گھر کے رب کی عبادت کرتے رہیں

جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور ڈر (اور خوف) میں امن و امان دیا (سورہ قریش)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن ان سے یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور ہر چیز کو اللہ پر چھوڑ دیں بلکہ یہ پیغام، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، اس کے بالکل برعکس تھا۔ خدا کے پیغام کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ قریش اپنے بعض عقائد کا موجودہ حالات کی روشنی میں از سرِ نو جائزہ لیں۔ قریش کو کعبۃ اللہ کا طواف کرنا بے حد مرغوب تھا لیکن جب انہوں نے اپنی ذات کو مادی کامیابی اور اپنی دنیا کا محور بنالیا تو وہ اپنے قدیم دستور کو فراموش کر بیٹھے۔ دل جمعی اور اطمینان (ایلاف) اور کعبۃ اللہ کے اردگرد رہنے والے قریش کے درمیان اتحاد اس لیے خطرے میں پڑ گیا تھا کیونکہ انہوں نے پرانے گروہی نصب العین کو پسِ پشت ڈال کر کمزور خاندانوں، یتیموں، غریبوں، بڑھے بوڑھوں اور ناداروں کی دیکھ بھال کرنے کا چلن چھوڑ دیا تھا۔ اگر ان کا یہی وطیرہ رہتا تو وہ دنیا میں اپنے حقیقی مقام کو کھو دیتے۔

قرآنِ کریم نے ابتدائی مرحلے میں مکہ کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اپنی حالیہ کامیابی اور بظاہر سلامتی کے باوجود ان پر اللہ کے کس قدر احسان ہیں۔ انہیں اللہ کے لطف وعنایات اور طاقت پر مبنی نشانیوں (آیات) پر غور کرنا چاہیے جو فطری دنیا میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ اگر وہ اپنے معاشرے میں اس کریم النفسی اور فیض رسانی کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اشیا کی حقیقی ماہیت کو نہیں پہچانا۔

رحمٰن نے قرآن سکھایا
اسی نے انسان کو پیدا کیا
اور اسے بولنا سکھایا
آفتاب اور ماہتاب (مقررہ) حساب سے ہیں
اور ستارے اور درخت دونوں سجدہ کرتے ہیں
اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی
تاکہ تم تولنے میں تجاوز نہ کرو
انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کم نہ دو
اور اسی نے مخلوق کے لیے زمین بچھادی
جس میں میوے ہیں اور خوشے والے کھجور کے درخت ہیں
اور بھس والا اناج ہے اور خوشبودار پھول ہیں
پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (سورہ الرحمٰن آیات ۲ تا ۱۳)

اس کائنات کی تمام دوسری مخلوقات خدا کی ہستی کا اقرار اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے ذاتِ مطلق کا اعتراف کرتی ہیں جو ان کے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس کے بغیر ان کے وجود کا تسلسل ممکن نہیں۔ خدا وہ لازمی قوت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا توانائی ہے جو تمام چیزوں کو مطلع کرتا اور انہیں جاری وساری اور توانا رکھتا ہے۔ اس نے پوری کائنات میں توازن قائم کر رکھا ہے، وہ سب اشیا کا ایک دوسرے کے ساتھ صحیح تعلق برقرار رکھتا ہے اور جب تک قریش اپنے معاشرے میں انصاف نہیں کرتے، اس وقت تک وہ اشیا کی ماہیت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ خدا کی ذات کے ذمے دارانہ اعتراف کا رویہ پیدا کرنے کے لیے حضورؐ نے اسلام قبول کرنے والے ابتدائی مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ بھی ستاروں اور درختوں کی طرح دن میں دو مرتبہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ (یہ حکم پانچ وقت نماز کے حکم سے پہلے کے دور کے لیے تھا)۔ اس نماز (صلوٰۃ) کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن کا درجہ حاصل ہو گیا چنانچہ نماز ادا کرنے کے دوران جسمانی اعضا کی حرکت اور معنی خیز خارجی اشارت سے مسلمانوں کے داخلی رویے میں تہذیب اور شائستگی پیدا کرنے میں مدد اور ان کی زندگیوں کو بنیادی سطح پر از سرِ نو صحیح خطوط پر استوار کرنے کا موقع ملتا ہے۔

آخر اللہ کا یہ دین، جسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر آئے تھے، اسلام کے نام سے مشہور ہو گیا جس کی رو سے ہر مسلمان خدا کی کامل اطاعت کو لازم سمجھتا ہے۔ مسلمان مرد اور عورت وہ ہے جو اپنے پورے وجود کو خالق کے سپرد کر دے۔ لیکن شروع شروع میں مسلمان اپنے دین کو ''تزکی'' کہتے تھے۔ یہ ایک مبہم لفظ ہے جس کا ترجمہ کرنا آسان نہیں۔ اس نئے دین میں داخل ہونے کے بعد حضورؐ کے پیروکار رحم، خدا ترسی اور فیاضی کی نعمتوں سے سرفراز ہو جاتے اور اپنی ذہانت اور عقل وفہم کو بروئے کار لا کر ایک محتاط اور ذمے دار روح پیدا کر لیتے جس کی بدولت وہ خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ لطف وکرم سے پیش آتے۔ تخلیق کے اسرار ورموز پر دانش مندی سے تدبر کرنے سے مسلمانوں میں ہمدردی اور شفقت کا جوہر نمایاں ہو جاتا۔ خود سپردگی کے اس فراخدلانہ رویے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے روحانی بالیدگی کا نصب العین حاصل کر لیا ہے۔ اس معاملے میں اللہ کی ذات سب سے بڑی مثال تھی۔ مسلمانوں کو اللہ کی ''نشانیوں'' پر تدبر کرنے کی اس لیے بار بار تاکید کی گئی تھی تاکہ انہیں پوری فطری دنیا میں جاری وساری خدا کی رحمت اور ربوبیت کا ادراک ہو سکے۔ یہ خدا ہی کی حکمت اور دانائی ہے جس کی بدولت اس کائنات میں انتشار، ابتری اور خود غرضانہ بربریت کے بجائے کامل نظم وضبط پایا جاتا ہے اور اس میں انسانی آرزوؤں کی تکمیل اور فائدے کا سامان موجود ہے۔ اگر وہ خدائی احکام پر عمل کریں تو ان کی اپنی زندگیاں بھی سنور سکتی ہیں۔

دوسری تمام مخلوق اور موجودات فطری طور پر مسلمان ہیں جن کے اعمال اپنی مرضی اور خواہش کے تابع نہیں بلکہ وہ سب خدائی پلان کی مکمل اطاعت کرتی ہیں۔ (اور ان کے لیے ایک نشانی (خشک) زمین ہے جس کو ہم نے زندہ کر دیا اور اس سے غلہ نکالا جس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگور کے باغات پیدا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کردیے اور جن میں ہم نے چشمے بھی جاری کردیے ہیں تاکہ وہ (لوگ) اس کے پھل کھائیں اور اس کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ پھر کیوں شکرگزاری نہیں کرتے؟ وہ پاک ذات ہے جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہوں، خواہ خود ان کے نفوس ہوں، خواہ وہ چیزیں ہوں جنہیں یہ جانتے بھی نہیں۔ اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے جس میں ہم دن کو کھینچ دیتے ہیں تو وہ یکا یک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ اور سورج جو مقررہ راہ ہے، وہ اسی پر چلتا رہتا ہے۔ یہ ہے مقرر کردہ غالب علم اللہ تعالیٰ کا۔ اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ لوٹ کر پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن پر آگے بڑھ جانے والی ہے اور سب کے سب آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سورہ یٰسین آیات ۳۳ تا ۴۰.....مترجم)۔ اس پوری کائنات میں صرف انسان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ دینِ اسلام پر رضا کارانہ عمل کرے اور اپنی زندگی کو اس ذاتِ خداوندی کے احکام کی پیروی کرنے کا خوگر بنائے جو زندگی کا سرچشمہ اور حی و قیوم ہے۔ اس طرح وہ کسی ظالم اور جابر شخصیت کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ ان قوانین کی اتباع کرتا ہے جو پوری کائنات کی روحِ رواں ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کی سفاکی اور قدرتی آفات کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا جائے جنہیں ہم قانونی محاورے میں ''خدائی افعال'' کہتے ہیں؟ قرآنِ حکیم ان معاملات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ میں نے ابھی ابھی جن قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے، ان سے اگلی آیتوں میں یہ تذکرہ اس طرح جاری ہے:

> اوران کے لیے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری کشتی میں سوار کیا
> اوران کے لیے اسی جیسی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں
> اور اگر ہم چاہتے تو انہیں ڈبو دیتے۔ پھر نہ تو کوئی ان کا فریاد رس ہوتا، نہ وہ بچائے جائیں
> لیکن ہم اپنی طرف سے رحمت کرتے ہیں اور ایک مدت کے لیے انہیں فائدے دے رہے ہیں (سورہ یٰسین آیات ۴۱ تا ۴۴)

اس فطری دنیا کی تلخیوں اور دشواریوں کو عربوں سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ مظاہر پرستی اور مشرق کی دوسری مذہبی روایات میں مختلف دیوتا محض اس بنیادی طاقت کے اظہار کی علامتیں ہیں جو سب سے بلند و برتر، انسانی فہم و ادراک سے پرے اور بے صورت ہے۔ ان میں سے بعض دیوتا ذاتِ خداوندی کی کریم النفسی اور رحمت کی خصوصیات اور انسان کے روپ میں محبت، بارآوری، قانون یا عقل و دانش کے مظہر ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کئی دیوتا اور دیویاں ان تاریک پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں جن کا مردوں اور عورتوں نے اس دنیا میں مشاہدہ کیا ہے۔ ہندوؤں کی روایات میں کہا گیا ہے کہ برائی حدِ ادراک سے ماورا ہستی مطلق کا ایک نقاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ بت پرستوں کا وہم و گمان، جو برسر پیکار دیویوں اور دیوتاؤں کو ظاہر کرتا ہے، ایک المناک لیکن اس تنازعے کا جرأت مندانہ اور سچا اظہار تھا جس کا ہر شخص اس مادی دنیا اور خود اپنی ذات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ مظاہر پرستی میں اس تنازعے کی کوئی قابل فہم عقدہ کشائی نہیں کی گئی۔ عرب میں خانہ بدوشی کی مدت کے دوران قدیم دیوتاؤں کی حقیقی علامتی اہمیت ختم ہوگئی تھی اور عربوں کے مذہب میں اس مشرکانہ نقطہ نظر کے اظہار کے لیے کوئی دیومالائی کہانیاں وضع نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں اس بصیرت کے اجزا واضح طور پر نظر آتے ہیں جس کے ذریعے دنیا میں اللہ کی نشانیوں سے خدا کے ان اسرار کا پتا چلتا ہے جن کی کنہ تک پہنچنا انسان کے بس میں نہیں اور جن کا دوسرے نظاموں میں دیوتاؤں کے ذریعے علامتی اظہار کیا گیا تھا۔

قرآنِ حکیم کے مطابق اللہ کی ذات یہودی صحیفوں کے یہوواہ یا مسیح کی صورت میں متشکل ہونے والے باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بے صورت ہے۔ عبرانیوں کے ابتدائی قبائلی مذہب میں ان کا خدا یہوواہ مردوں اور عورتوں پر تباہی لاتا یا انہیں فائدے پہنچاتا تھا۔ لیکن مثال کے طور پر جب اللہ لوگوں کو پانی میں غرق کر دیتا ہے تو اس کا یہ فعل کسی ذاتی عداوت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ فطرت اور عبرانی پیغمبروں کے اس بلند مرتبت خدا کے قریب تر ہوتا ہے جو صحیح اور غلط، نیکی اور بدی کے متعلق تمام خالص انسانی تصورات سے ماورا ہے:

میرے تصورات تمہارے نظریات جیسے نہیں
میرا راستہ تم سے جدا ہے... یہوواہ کا کلام ہے
ہاں! آسمان زمین سے بہت بلند ہیں
جس طرح میری راہ تم سے الگ اور میرے خیالات تم سے بہت بلند ہیں (یسعیاہ ۵۵:۸۔۹)

خدا کی طرف سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو غیر معمولی روحانی اور تخلیقی صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، وہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ حضورؐ کا اپنے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ عملی طور پر کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ ہی آپؐ کو ابتدائی آسمانی صحیفوں کا کوئی علم تھا۔ اس کے باوجود آپؐ کو خدا کی وحدانیت کے نظریے کی روح کا مکمل ادراک تھا۔ قرآنِ حکیم میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارے انسانی تصورات خدا کی ذات کا احاطہ کرنے سے عاجز ہیں اور ہم صرف اس کی ان نشانیوں اور علامتوں کے ذریعے ہی اس کی ذات اور صفات پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں جن میں سے بعض ظاہر اور کچھ پوشیدہ ہیں اور جن کو بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں۔ قرآنِ کریم میں گفتگو کا پورا اسلوب اشاراتی ہے اور اس میں ان عظیم ''تماثیل'' کا تواتر کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے جن پر تدبر کرنے کی مسلمانوں کو بار بار تلقین کی گئی ہے۔ اس میں خدا کے بارے میں کوئی نظریات پیش نہیں کیے گئے اور نہ ہی خدا کی تشریح کی گئی ہے۔ قرآن میں محض خدائی نوازشات اور اس کی ''نشانیوں'' کا ذکر کیا گیا ہے جن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا انسان مشاہدہ کر سکتا ہے۔

مغرب کے لوگ عام طور پر قرآن میں بیان کیے گئے خدا اور اسلامی عقائد کی استعاری نوعیت کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہم صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن قرونِ وسطیٰ میں عیسائیوں نے اپنے صحیفوں کو پڑھنے کے لیے مکمل طور پر ایک علامتی اسلوب وضع کر لیا تھا جو مسلمانوں کے قرآن کے مطالعے کے طریقِ کار سے مختلف نہیں۔ قرآنِ کریم میں بعض پیغمبروں کی زندگی کے واقعات یا قیامت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ ربانی صداقتوں کی علامتی نمائندگی کرتی ہیں اور انہیں لفظ بہ لفظ مبنی بر حقائق نہیں سمجھنا چاہیے۔ جس طرح بدھ مت کے پیروکار مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کو اپنی ذات کو پرتو سمجھتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ''ایک روح کا موسیٰ'' اور ''دل کا قرار یوسفؑ'' کی تشبیہوں اور استعاروں سے نیکی اور بدی کے درمیان ازلی کشمکش کا علامتی اظہار کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ایسے اشاروں کی بار بار تکرار کی گئی ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی میں کھیلا جانے والا وہ روحانی ڈراما ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ چنانچہ مسلمان جب قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے ہیں تو وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ کفارہ مسیح کی معروضی تاریخ نہیں، خود ان کی اپنی ذات کی تاریخ ہے۔ اس طرح وہ اپنی تخلیق کے سرچشمے کی طرف لوٹنے کی جدوجہد اور روح کی گہرائیوں میں برائی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے سلسلے میں اپنے داخلی تجربے کے ضمن میں تخیلاتی کوشش کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے یہ تخیلاتی اور اشاراتی رویہ پیدا کرنے کی غرض سے شروع ہی سے مردوں اور عورتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ فطرت کی ''نشانیوں'' کی عظیم تصریحات میں یہ رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ مسیحیت میں بعض اوقات فطری دنیا کے بارے میں قنوطیت پسندانہ نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے جس کے مطابق انسان کے گناہ کی وجہ سے یہ دنیا حقیقی کاملیت سے محروم ہوگئی ہے۔ لیکن یہودیت کی طرح اسلام بھی ہبوطِ آدم اور حقیقی گناہ کے نظریے پر یقین نہیں رکھتا جو مسیحی نقطہ نظر کے برعکس ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان کو موت، دکھ درد اور رنج و غم آدمؑ کے اولیں گناہ کی سزا کے طور پر نہیں دیے گئے بلکہ یہ سب چیزیں پر اسرار خدائی منصوبے کا حصہ ہیں۔ یہ مادی دنیا زوال پذیر نہیں، خدائی اوصاف اور طاقت کا مظہر اور اس عظیم المرتبت ذات کے مشاہدے کا پرتو ہے جسے بیان کرنے کے لیے معمول کی انسانی زبان میں کوئی الفاظ موجود نہیں ہیں۔ رنگا رنگ عجائبات سے معمور اس دنیا میں ذاتِ مطلق کا مشاہدہ کرنا قوتِ متخیلہ، آرٹ اور مذہب کا ہمیشہ سے مطمع نظر رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا کو بغور دیکھنے کی تخیلاتی اور شعوری کوشش کریں۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا، اور بادل، جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان میں عقل مندوں کے لیے قدرت الٰہی کی نشانیاں ہیں۔(سورہ البقرہ آیت ۱۶۴)۔

مسلمانوں کی روایت میں قوتِ متخیلہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ عظیم صوفی فلاسفر محی الدین العربی (وفات ۱۲۴۰ء) قوتِ متخیلہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے خداداد صلاحیت قرار دیتے ہیں جس کی بدولت انسان کو عرفانِ ذات یا معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اس غیر معمولی استعداد کے ذریعے مردوں اور عورتوں میں انسان کو ورثے میں ملنے والے صدمے اور الیے برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ وہ عقل وخرد سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں، جو سمجھتے ہیں، جو جانتے ہیں۔ مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ فطری دنیا میں موجود نشانیوں کو دیکھ کر ان کا نہایت احتیاط کے ساتھ جائزہ لیں۔ (وہ صبح نکالنے والا ہے، اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے۔ اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرائی بات ہے ایسی ذات کی جو کہ قادر ہے، بڑے علم والا ہے۔ اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے ستاروں کو پیدا کیا تا کہ تم ان کے ذریعے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو۔ بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں ان لوگوں کے لیے جو خبر رکھتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔ پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی، بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں ان کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات کو نکالا۔ پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ اس سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں۔ اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھے میں سے، خوشے ہیں جو نیچے کو لٹکے جاتے ہیں۔ اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار کہ بعض ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور کچھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو، ان میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (سورہ الانعام آیات ۹۶ تا ۹۹ ... مترجم)۔ یہ رویہ اس تیز فہم تجسس کی خو کو مہمیز دینے میں بھی معاون ثابت ہوا جس کی بدولت مسلمان نیچرل سائنس اور ریاضی کے علوم میں اعلیٰ روایات کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلام میں عقلی بنیادوں پر سائنسی تحقیق اور مذہب کے درمیان کبھی کوئی تنازع نہیں رہا۔ لیکن اسلام کے برعکس عیسائیت میں انیسویں صدی میں سائنس اور مذہب کے درمیان اس وقت تصادم ہو گیا جب عیسائیوں نے محسوس کیا کہ ڈارون Darwin اور لائیل Lyell کے سائنسی اکتشافات سے ان کے مذہب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں انقلابی شیعہ فرقے کے بعض صوفی سائنس اور ریاضی کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غور وفکر اور تدبر کی تمہید قرار دیتے ہیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب قریش سے کہا کہ وہ قرآن کو الہامی کلام تسلیم کرلیں تو آپؐ نے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ دینِ اسلام کے عقائد یا ان کے مذہبی نظریات کو مان لیں۔ یہودیت کی طرح اسلام میں بھی تقلید پسندی کا کوئی مسلک موجود نہیں اور یہاں خدا کے بارے میں تصورات اور نظریات کو خالص نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ اصل میں قرآن دین کے متعلق فرضی قیاس آرائیوں کو غایت درجے کی بدگمانی اور سوئے ظن قرار دیتا اور اسے محض انسانی تشہیر اور جھوٹی امنگوں اور آرزوؤں کی تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ مختلف مذہبی عقائد کے بارے میں اس قسم کی سوچ، جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر منطبق ہو، فرضی تخمینے (ظن) کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جن نازک معاملوں کو بیان کرنے کے لیے الفاظ میسر نہ ہوں، ان کے متعلق بے کار تاویلیں پیش کرنے کی وجہ سے اہلِ کتاب مختلف فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ (آپؐ کہہ دیجیے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں، وہ کامیاب نہ ہوں گے۔ سورہ یونس آیت ۶۹......مترجم)۔ (مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمٰن اولاد والا ہے (غلط ہے)۔ اس کی ذات پاک ہے بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں۔ وہ ان کے آگے پیچھے کے تمام امور سے واقف ہے۔ وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے بجز ان کے جن سے اللہ خوش ہو۔ وہ تو خود ہیبتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی بھی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں لائقِ عبادت ہوں تو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین باہم ملے جلے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔ سورہ الانبیاء آیات ۲۶ تا ۳۰......مترجم)۔ اسلام اور یہودیت دونوں نے اندھی تقلید پرستی یا محض عقائد کو فروغ دینے کے بجائے روایتی طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں دینِ مسیح کے عقائد یا ۳۹ ارکان کی طرح مفروضوں اور قیاس آرائیوں کی فہرست کو درست تسلیم کرنے والے شخص کو مسلمان نہیں کہا گیا بلکہ مسلمان وہ ہے جسے اس حقیقتِ مطلق کا فوری اور دل ہلا دینے والا ادراک حاصل ہو جس کی کامل اطاعت کرتے ہوئے اس نے اسلام کے جڑواں ارکان نماز (صلوٰۃ) اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے (زکوٰۃ) کا عہد کر رکھا ہے:

بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں

جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں، ان کے لیے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور مغفرت اور عزت کی روزی ہے (سورہ الانفال آیات ۲ تا ۴)

اس کے برعکس کافر وہ نہیں جو اللہ کے وجود کا انکار کرے یا غلط مذہب اختیار کرے بلکہ کافر وہ ہے جو خدا کا ناشکرا ہو۔ قرآنِ کریم میں لفظ کفر کے مادے کی وضاحت کرتے ہوئے اسے گمراہی اور سرکشی قرار دیا گیا ہے۔ مکہ کے کفار اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ خدا کی نشانیوں کا مطلب کیا ہے لیکن وہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے غرور اور تکبر سے خدا کی مخالفت کرتے تھے۔ اور ان کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کی کتاب کو سچا کرنے والی آئی، حالانکہ پہلے یہ خود (اس کے ذریعے) کافروں پر فتح چاہتے تھے تو باوجود آ جانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کافروں پر۔ سورہ بقرہ آیت ۸۹......مترجم۔ انہوں نے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے صرف ظلم اور تکبر کی بنا پر۔ پس دیکھ لیجیے کہ ان فتنہ پرداز لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہوا۔ سورہ النحل آیت ۱۴......مترجم۔

رسولِ عربیؐ نے اگرچہ ابتدائی برسوں میں اپنے معمول سے ہٹ کر کعبے کے بارے میں قریش کے جوش اور ولولے کو ابھارنے کی کوشش کی لیکن آپؐ جبلی طور پر جانتے تھے کہ قریش آپؐ کے پیغام کی سخت مخالفت کریں گے۔ جن لوگوں کے ساتھ آپؐ رابطہ کر رہے تھے، ان کے بارے میں آپؐ نہایت محتاط تھے۔ اپنے مشن کے ابتدائی تین برسوں میں آپؐ نجی طور پر اپنا پیغام پہنچاتے رہے اور یہ پیغام غیر رسمی طور پر پھیلتا گیا البتہ آپؐ جاں نثار پیروکاروں کی ایک ایسی مختصر جماعت بنانے میں کامیاب ہو گئے جس نے آپؐ کے پیغام کو فوری طور پر بلا تامل قبول کر لیا۔ یہ مختصر جماعت ہر صبح اور شام کو نماز ادا کرتی اور ایسا لگتا ہے کہ اس صلوٰۃ سے قریش میں شدید ردِ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ عربوں کو، جو صدیوں سے آزادانہ طور پر خانہ بدوش زندگی گزارنے کے خوگر تھے، نماز میں غلاموں کی طرح زمین پر سجدہ ریز ہونا سخت ناگوار گزرا۔ اس فوری ردِ عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے اپنی انگلی کو حساس جگہ پر رکھنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ چنانچہ خدائے واحد کی بندگی اور توقیر نے قریش کے نئے احساسِ تفاخر اور تونگری کو اس قدر شدت سے چیلنج کر دیا کہ مسلمانوں کے لیے کھلے بندوں نماز ادا کرنا ممکن نہ رہا اور انہیں مکہ کے مضافات میں واقع گھاٹیوں میں پناہ لینا پڑی۔ انہوں نے اخلاقی پاکیزگی کے لیے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا دستور العمل بھی اپنا لیا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر خدا کے حضور نماز ادا کرنے لگے جس میں قرآن پڑھا جاتا۔

یہ طریقِ کار غالباً شام کے ریگستان میں رہنے والے ان عیسائی راہبوں کی شب بیداری سے ماخوذ تھا جو راتوں کو اٹھ کر خدا کی مناجات کرتے تھے۔ اس سے کسی آسمانی صحیفے کے مطلب کے بارے میں عربوں کے تصور پر اثر پڑا۔ یہ کتاب ذاتی مطالعے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے نماز کے دوران بلند آواز سے پڑھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ اگرچہ آج مسلمان نجی طور پر قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کا اب بھی یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی تلاوت کا مکمل اثر اسے بلند آواز سے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس مترنم آواز کا مطلب نہایت پراسرار ہے۔ یہ آواز قرآنِ پاک کی زبان میں ایسی موسیقیت پیدا کرتی ہے جس کی مدد سے ذاتِ مطلق کا ایک ایسا طاقتور اور مکمل مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے آرٹ کے ذریعے ممکن نہیں۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے اللہ کو دور افتادہ خدا نہیں بننے دیا۔ نبی کریمؐ کے ابتدائی سیرت نگاروں نے بعض لوگوں کے قبولِ اسلام کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اسلام اس کے دل میں داخل ہو گیا''۔ میں اس کتاب کے اگلے باب میں قرآن کے رول اور ابتدائی مسلمانوں کے تجربے کے بارے میں اپنے تاثرات مزید تفصیل کے ساتھ لکھوں گی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جن لوگوں نے عربی میں قرآن سنا، وہ اس کے غیر معمولی حسن اور رعنائی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اس کی آیات میں اپنی خفتہ امنگوں اور خواہشوں کا عکس نظر آنے لگا۔ ہم سب جب بھی کوئی نظم یا موسیقی سنتے ہیں تو ہمیں بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کچھ دیر کے لیے اس جہانِ رنگ و بو سے پرواز کر کے کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں ایک بڑی حقیقت کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے نزولِ وحی کا مشاہدہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آپؐ جب روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہوتے تو بھی وحی کا سلسلہ جاری رہتا۔ شدید سردی کے دنوں میں بھی، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ پر غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور آپؐ پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ بعض دوسرے راوی بیان کرتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ سخت بوجھ محسوس کرتے اور جب آپؐ وحی کے الفاظ سنتے تو اپنے سر کو نیچا کر کے گھٹنوں کے درمیان کر لیتے۔

اسلام قبول کرنے والے ابتدائی مسلمان کون تھے؟ حضرت خدیجہؓ نے شروع ہی سے وحی کی صداقت کو تسلیم کر لیا جن کے بعد حضورؐ کے اہلِ خانہ حضرت علیؓ، زیدؓ اور آپؐ کی چاروں صاحبزادیاں ایمان لے آئیں۔ لیکن اپنے چچاؤں ابوطالب، عباس اور حمزہ کی طرف سے کوئی دلچسپی نہ لینے پر آپؐ کو سخت مایوسی ہوئی۔ ابوطالب نے آپؐ کو بتایا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہوں نے بعض تحفظات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ انہیں دوسرے قریش کی بدگمانی کا خوف ہے۔ حضورؐ جانتے تھے کہ بت پرستی کی قدیم روایات کے باوجود قدامت پسند قریش اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی وحی سے خطرہ محسوس کرنے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مشن کے ابتدائی تین برسوں میں آپؐ نے تبلیغِ دین کا کام دھیمے انداز میں جاری رکھا۔ لیکن ابوطالب ذاتی طور پر حضورؐ کا بے حد احترام کرتے تھے اور سخت مشکلات کے دور میں بھی وہ آپؐ کی حفاظت اور سرپرستی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بنی ہاشم کے سردار کی حیثیت سے ابوطالب کی حمایت آنحضرتؐ کے لیے زبردست اہمیت کی حامل تھی۔ پرانی قبائلی اقدار کی شکست و ریخت کے باوجود اب بھی کوئی شخص قبیلے کی حفاظت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن خاندان کے دوسرے افراد نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیغمبر تسلیم کرلیا۔ ان میں ابوطالب کے دوسرے بیٹے جعفر، خصوصی رفیق اور پھوپھی زاد عبداللہ ابن جحش، ان کی بہن زینب اور بھائی عبیداللہ شامل تھے۔ عبیداللہ حنیف اور وحدانیت کی کسی متبادل صورت کے متلاشی تھے۔ عباس اور حمزہ دونوں کی بیویوں نے شوہروں کے تذبذب کو برداشت نہ کیا اور اس طرح اِم فضل اور سلمٰی دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اسی طرح جعفر کی بیوی اسما، حضورؐ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب اور آپؐ کی آزاد کردہ لونڈی اِم ایمن بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئیں۔ اِم ایمن کمسن لونڈی تھیں جنہیں حضورؐ کے والد عبداللہ نے پانچ اونٹوں کے ساتھ حضرت آمنہ کے لیے ورثے میں چھوڑا تھا۔ آپؐ نے اِم ایمن کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا: ''جو شخص کسی جنتی خاتون کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے، اسے اِم ایمن سے شادی کر لینی چاہیے''۔ (محمد ابنِ سعد: کتاب الطبقات الکبیر: Martin Lings: Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources P.51)۔ جب زیدؓ نے نبی کریمؐ کی یہ بات سنی تو وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کے باوجود کہ اِم ایمنؓ کی عمر ان سے بہت زیادہ تھی، حضورؐ سے ان کا رشتہ مانگ لیا۔ اِم ایمنؓ رضامند ہوگئیں اور اس جوڑے کے ہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پہلے پوتے اسامہ پیدا ہوئے جو اسلام کی آغوش میں آنکھیں کھولنے والے پہلے بچے تھے۔

طلوعِ اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی کریمؐ نے خاندان سے باہر اپنے پرانے دوست عتیق ابنِ عثمان کو، جو اپنی کنیت ابوبکر کے حوالے سے مشہور ہیں، دائرہ اسلام میں داخل کر کے ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل کرلی۔ حضورؐ نے بعد کے برسوں میں فرمایا: ''میں نے جس کسی کو اسلام کی دعوت دی، اس کے قبول کرنے میں ایک طرح کی تاخیر، سوچ بچار اور پس وپیش تھا بجز ابوبکر کی حالت کے کہ جب میں نے ان سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے نہ تو اس میں تاخیر کی اور نہ ہی پس وپیش کیا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۶۲: The Life of Muhammad P.116)۔ چند دوسرے نومسلموں کا مکہ میں بے حد اثر ورسوخ تھا لیکن محمد ابن اسحاق نے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں لکھا ہے:

> ابوبکرؓ اپنی قوم میں بہت تعلقات رکھنے والے، محبوب، نرم اخلاق اور قریش میں بہترین نسب والے تھے۔ قریش کے انساب کا انہیں سب سے زیادہ علم تھا اور ان کی اچھائی برائی کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ تجارت کرتے تھے، خوش مزاج تھے، ہر ایک سے نیک سلوک کرتے تھے۔ علم، تجارت اور حسنِ معاملت کے سبب سے قوم کے تمام افراد آپ کے پاس آتے اور آپ سے تعلقات رکھتے تھے۔ آپ نے قوم کے ان تمام افراد کو اسلام کی جانب بلانا شروع کر دیا جن پر آپ کو بھروسا تھا اور جو آپ کے پاس آتے جاتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۶۱: The Life of Muhammad P. 115)۔

ابوبکرؓ نے مکہ کے کئی نوجوانوں کو، جن میں بعض کا تعلق زیادہ طاقتور قبیلوں سے تھا، دائرہ اسلام میں داخل کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہیں خوابوں کی تعبیر بتانے میں شہرت حاصل تھی چنانچہ ایک دن عبد شمس قبیلے کے ایک بڑے ساہوکار کے بیٹے خالد ابنِ سعید نے سخت پریشانی کے عالم میں ابوبکرؓ کے پاس آ کر کہا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ آگ سے بھرے وسیع وعریض گڑھے کے کنارے کھڑا ہے اور یہ دیکھ کر اس پر دہشت طاری ہوگئی کہ اس کا والد اسے اس گڑھے کے اندر دھکیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد اسے محسوس ہوا کہ دو ہاتھوں نے اسے کمر سے پکڑ کر گڑھے میں گرنے سے بچالیا ہے۔ نیند سے بیدار ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ اس کے نجات دہندہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ اس خواب سے ان دھندلے لیکن ذاتی اندیشوں کی عکاسی ہوتی ہے جس سے نئی نسل کے اکثر نوجوان دوچار تھے۔ ریگستان کی سخت کوش زندگی ایک دور افتادہ حقیقت بن چکی تھی اور اب وہ نئی سرمایہ داری سے اپنے ان آباء واجداد کے مقابلے میں کم مسحور تھے جن کے ساتھ ان کا خاموش اور گہرا تنازع پیدا ہوگیا تھا۔ رسول اللہؐ ان نوجوانوں کے خام اور خفتہ جذبات کو چھو رہے تھے جو مکہ میں پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ خالد مسلمان ہوگئے لیکن جب تک ممکن تھا، اپنے دین کو والد سے چھپائے رکھا۔

خواب کے ذریعے ایک اور شخص کے مسلمان ہونے کے واقعے سے قرآنی اثر کے زیادہ مثبت پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔ نوجوان دولت مند تاجر عثمان ابنِ عفان، جن کا تعلق عبد شمس قبیلے سے تھا، کاروباری سفر کے سلسلے میں شام سے مکہ لوٹ رہے تھے کہ انہوں نے ایک بیابان میں خواب کے دوران یہ اونچی آواز سنی: ''سونے والو بیدار ہو جاؤ! مکہ میں احمدؐ کا ظہور ہو چکا''۔ (ابنِ سعد، طبقات: Martin Lings: Muhammad P.47)۔ عثمان پر اس آواز کا گہرا اثر ہوا اور وہ حواس کھو بیٹھے۔ یہ آواز ان کے دل میں اتر گئی حالانکہ ان الفاظ کے معنی پوری طرح ان پر واضح نہیں ہوئے تھے۔ اسلام کے تجربے سے مسلمان جلد ہی یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ غفلت اور بے حسی کی طویل مدت کے بعد اچانک جاگ اٹھے ہیں۔ اگلے روز تیم قبیلے کے ایک اور نوجوان تاجر طلحہ ابنِ عبیداللہ، جو ابوبکرؓ کے چچازاد بھائی تھے، شاہراہ پر عثمان سے آملے۔ طلحہ بھی شام سے واپس آرہے تھے۔ انہوں نے عثمان کو بتایا کہ انہوں نے شام میں ایک عیسائی راہب سے ملاقات کی تھی جس نے انہیں ایک پیغمبر احمدؐ کے بارے میں بتایا ہے جو عنقریب حجاز میں مبعوث ہونے والے ہیں۔ انہوں نے یہ حیرت انگیز خبر بھی سنائی کہ ''احمد'' اصل میں بنی ہاشم کے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابنِ عبداللہ ہیں۔ دونوں نوجوان جلدی سے مکہ پہنچ کر ابوبکرؓ کے پاس چلے گئے۔

مکہ کے مورخ ابنِ شہاب الزہری، جو حضورؐ کی رحلت کے چالیس سال بعد پیدا ہوئے اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی ابتدائی مسلمانوں کے دور کی تحقیق کے لیے وقف کر رکھی تھی، ہمیں بتاتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلد ہی کامیاب اور کامران ہوگئے تھے:

پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کو خفیہ اور علانیہ دونوں طریقوں سے اسلام کی دعوت دی اور نوجوانوں اور کمزوروں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اس دعوت پر لبیک کہی یہاں تک کہ آپؐ پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اب حالت یہ تھی کہ مشرک قریش آپؐ کی باتوں پر نکتہ چینی نہ کرتے۔ جب قریش مختلف ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ہوتے اور آپؐ ان لوگوں کے پاس سے گزرتے تو وہ کہتے: ''وہ دیکھو! عبدالمطلب کے گھرانے کا وہ نوجوان جا رہا ہے جو آسمان سے نازل ہونے والی باتیں کرتا ہے''۔

(Quoted in Watt: Muhammad at Mecca P. 87)۔

محمد ابنِ اسحاق نے بھی اس ابتدائی کامیابی کی توثیق کی ہے۔ (محمد ابنِ اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۶۶: The Life of Muhammad P.117)۔ زہری نے واضح کیا ہے کہ شروع شروع میں دو مخصوص گروہوں نے اسلام قبول کیا جو نوجوانوں اور کمزور لوگوں پر مشتمل تھے۔ نئے دین میں کئی حد درجہ محروم لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے اسلام کی سماجی تعلیم کی فطری کشش کی وجہ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر مسلمانوں میں زبردست اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ان میں ایک چرواہے عبداللہؓ ابنِ مسعود بھی شامل تھے جن میں قرآن کو حفظ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کی تلاوت کرنے والے ابتدائی مسلمانوں میں سند کا درجہ حاصل کر لیا۔ ایک لوہار اور تلواریں بنانے والے خباب بن الارت بھی اسی گروہ کے ایک فرد تھے۔ ان کے علاوہ دو آزاد کردہ غلام صہیب ابنِ سنان اور عمار بن یاسر بھی، جنہیں بنی مخزوم کے طاقتور قبیلے نے اپنا حلیف بنالیا تھا، دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ کئی غلام مرد اور لونڈیاں بھی ان سابقین الاولین میں شامل تھیں۔ ان میں سب سے مشہور حبشہ کے بلالؓ تھے جو مسلمانوں کو نماز کی دعوت دینے والے پہلے موذن تھے۔

لیکن یہ سب مسلمان بے کس اور تنگدست نہیں تھے۔ یہ ایک فنی قبائلی اصطلاح تھی جس سے مختلف خاندانوں کی سماجی حیثیت کا حوالہ دیا گیا تھا۔ جب حضورؐ نے اپنا مشن شروع کیا، اس وقت قریش تین بڑے گروہوں میں تقسیم تھے۔ ڈبلیو منٹگمری واٹ W. Montgomery Watt نے قریش کی درجہ بندی اس طرح کی ہے:

اے	بی	سی
ہاشم	عبدشمس	مخزوم
المطلب	نوفل	سہم
زہرہ	اسد	جمح
تیم	عامر	عبدالدار
الحارث ابن فہر		
عدی		

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گروپ اے میں شامل تمام خاندانوں کا تعلق قدیم حلف الفضول سے تھا اور وہ مکہ شہر میں سب سے کمزور تھے۔ ان میں صرف عدی خاندان کے لوگ متمول تھے البتہ وہ بھی حال ہی میں تنزل کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن اسد (حضرت خدیجہؓ کا خاندان) مضبوط اور طاقتور تھے۔ شروع میں جو لوگ نبی کریمؐ پر ایمان لائے، ان کا تعلق گروپ اے سے تھا۔ مثال کے طور پر ابوبکرؓ اور طلحہؓ دونوں تیم خاندان کے فرد تھے۔ اسی طرح ہونہار نوجوان تاجر عبدالکعبہ (جن کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھ دیا گیا تھا) کا تعلق زہرہ خاندان سے تھا۔ ان ''کمزور'' گھرانوں کے بعض افراد ذاتی طور پر بہت کامیاب ہوئے مثلاً ابوبکرؓ ایک دولت مند شخص تھے۔ لیکن ان خاندانوں کی طاقت کم ہو جانے کے باعث شہر میں ان کا مقام بہت گر گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے بیشتر بدترین دشمنوں کا تعلق، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، گروپ بی اور سی کے طاقتور گھرانوں سے تھا اور وہ حالات کو جوں کا توں رکھنے میں مسرور تھے۔ ان اہم قبیلوں میں سے اسلام قبول کرنے والے بعض اشخاص، جن میں خالدؓ اور عثمانؓ شامل تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ قبیلے کے صفِ اول کے لوگوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ اس خلیج سے بھی آگاہ تھے جو بے حد کامیاب اور دوسرے درجے کے لوگوں کے درمیان حائل تھی۔ اس قسم کا نظامِ مراتب، عدم مساوات اور گروہ بندی عرب روح اور مزاج کے خلاف تھی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کا خیر مقدم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں اسلام نوجوانوں اور ان لوگوں کی تحریک تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ انہیں مکہ شہر کے ایک کونے میں لگا دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ طاقتور اور کمزور لوگوں کے درمیان تصادم اب ناگزیر ہو چکا تھا۔ یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی کہ اسلام نے ان دونوں طبقوں کے لوگوں کو دو مخالف گروپوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ قریش کے درمیان نفاق کا مداوا نہ ہو سکا اور معاملات بد سے بدتر ہونے لگے۔ رسول کریمؐ نے جب عام لوگوں کے سامنے کھلے بندوں تبلیغ شروع کی تو یہ صورتِ حال ڈرامائی طور پر کھل کر سامنے آ گئی۔ تبلیغ کا مشن شروع کرنے کے تین سال بعد حضورؐ کو وحی کے ذریعے یہ حکم دیا گیا کہ آپؐ اپنے پورے قبیلے کو اسلام میں داخل ہونے کی اعلانیہ دعوت دیں۔ (اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرا دے۔ سورہ الشعرا آیت ۲۱۴......مترجم)۔ شروع شروع میں رسول اللہؐ نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام آپؐ کی طاقت سے باہر ہے، اس کے باوجود آپؐ نے اپنا مشن جاری رکھا اور بنی ہاشم کے چالیس سرکردہ افراد کو کھانے کی دعوت دے دی۔ یہ سادہ دعوت خود ایک پیغام تھی۔ آنحضرتؐ کو خودنمائی کی غرض سے کی جانے والی وہ تعیش آمیز مہمان نوازی پسند نہیں تھی جو عربوں میں طاقت اور اعتماد کی نمائش کے لیے ایک روایت بن گئی تھی۔ آپؐ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ طریقِ کار پرانے غرور اور تکبر کا آئینہ دار ہے۔ (اور تجھے ان سے منہ پھیر لینا پڑے اپنے رب کی اس رحمت کی جستجو میں، جس کی تو امید رکھتا ہے تو بھی تجھے چاہیے کہ عمدگی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نرمی سے انہیں سمجھا دے۔ اپنا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ ہی اسے بالکل کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا درماندہ بیٹھ جائے۔ یقیناً تیرا رب جس کے لیے چاہے، روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر اور خوب دیکھنے والا ہے۔ اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو، ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیات ۲۸ تا ۳۱......مترجم)۔ کئی برسوں کے بعد حضرت علیؓ نے، جنہوں نے دعوت میں کھانا کھلایا، پانچ روٹیوں اور مچھلی کے معجزے کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ دعوت میں اگرچہ صرف ایک آدمی کے لیے کھانا موجود تھا، اس کے باوجود ہر شخص کے لیے ضرورت سے زیادہ کھانا دستیاب تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس دعوت میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے بعض اصولوں کی وضاحت کی۔ لیکن اس دوران ابو طالب کے سوتیلے بھائی ابولہب نے نہایت گستاخانہ انداز میں حضورؐ کے سلسلہ کلام میں مداخلت کی جس کے نتیجے میں دعوت کے شرکا منتشر ہوگئے۔ اگلے روز آپؐ کو دوبارہ ان لوگوں کو مدعو کرنا پڑا۔ چنانچہ آپؐ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی پھر وضاحت کی اور آخر میں ان لوگوں سے کہا کہ وہ اسلام قبول کرلیں:

اے عبدالمطلب کے بیٹو! میں ایسے کسی عرب کو نہیں جانتا جس نے اپنی قوم کے سامنے مجھ سے بہتر اور افضل پیغام پیش کیا ہو۔ میں تمہارے لیے اس دنیا اور آخرت کے لیے بہترین چیز لایا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچاؤں۔ سو تم میں سے جو شخص اس مشکل کام میں میرے ساتھ تعاون کرے گا، وہ میرا بھائی، میرے احکام کی تعمیل کرنے والا اور میرا قائم مقام جانشین ہوگا۔

اس پر مجمع میں گہری خاموشی چھا گئی یہاں تک کا ابو طالب یا حضورؐ کے ہم عمر عباس یا حمزہ نے بھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ آخر حضرت علیؓ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی کمسنی کے باوجود سب لوگوں سے اس طرح مخاطب ہوئے: ''اگرچہ میں سب سے کمسن ہوں اور آشوب چشم میں مبتلا ہوں، میرا جسم بہت موٹا اور ٹانگیں پتلی ہیں، اس کے باوجود اے خدا کے نبی! میں اس معاملے میں آپؐ کی اعانت کروں گا''۔ یہ سن کر حضورؐ نے حضرت علیؓ کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''یہ میرا بھائی، میرے احکام کی تعمیل کرنے والا اور تم لوگوں میں میرا جانشین ہے۔ اس کی بات توجہ سے سنو اور اس پر عمل کرو''

حاضرین کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ سب لوگ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ خوشی سے چلاتے ہوئے ابو طالب سے کہہ رہے تھے: ''اس نے تمہیں اپنے بیٹے کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے''۔

(ابوجعفر الطبری: تاریخ الرسول والملوک صفحہ ۱۱۷۲۔ The Life of Muhammad PP. 117-118)۔

عام لوگ اگرچہ اللہ کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن آپؐ خاندانوں کو تقسیم کر رہے تھے۔ حضرت خدیجہؓ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بھانجے ابوالعاص ابن الربیع کی شادی حضورؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ سے ہوئی تھی۔ ان کا تعلق قبیلہ عبدشمس سے تھا۔ وہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور ان کا کنبہ انہیں یہ ترغیب دے رہا تھا کہ وہ زینبؓ کو طلاق دے دیں۔ لیکن ابوالعاص اور زینبؓ کو ایک دوسرے سے محبت تھی چنانچہ ابوالعاص نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ نئے دین میں داخل نہ ہونے کے باوجود وہ زینبؓ سے قطع تعلق کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ حضرت خدیجہؓ کے خاندان میں اسلام کی وجہ سے تقسیم کا عمل شدت کے ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ ان کے بھتیجے حکیم ابن حزام کے دل میں حضرت خدیجہؓ کی محبت اب بھی موجود تھی لیکن اس نے اسلام قبول نہ کیا تاہم اس کا بھائی خالد مسلمان ہوگیا تھا۔ ابوبکرؓ بھی اسی قسم کے مسئلوں سے دوچار تھے۔ ان کی بیوی اُمِ رومان اپنے دو بچوں عبداللہ اور اسما کے ساتھ اللہ کے دین میں داخل ہو چکی تھیں لیکن ان کا بیٹا عبدالکعبہ اسلام کا سخت مخالف تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرح رسول عربیؐ نے بھی باپ کو بیٹے اور بھائی کو بھائی کے خلاف کھڑا کر دیا تھا جس کی وجہ سے خاندانی زندگی کے اٹوٹ رشتوں، فرائض اور حفظ مراتب کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ آنے والے وقت میں اس مسئلے کی شدت نے مزید نازک صورت اختیار کر لی۔

ان ابتدائی برسوں میں لوگوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام میں کون سی قابل اعتراض بات نظر آئی تھی؟ ہر چند کہ مکہ کے زیادہ کامیاب خاندانوں نے آپؐ کے پیغام کی مخالفت کی لیکن ان میں سے کسی شخص نے آپؐ کی سماجی تعلیم پر کوئی نکتہ چینی نہ کی۔ ان کی اس مخالفت کے پس پردہ نہ صرف خود غرضی اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی ہوس کارفرما تھی بلکہ وہ ذاتی اغراض اور مادہ پرستی کا بھی دفاع کر رہے تھے۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفین نے شروع میں روز قیامت کے نظریے پر سب سے زیادہ تنقید کی جو حضورؐ نے غالباً یہودی اور عیسائی روایات سے اخذ کیا تھا۔ قرآن میں روز جزا کے نظریے کو بتدریج مرکزی مقام حاصل ہوگیا جس میں انسان کے افعال اور اس کے ابدی مقدر پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ یوم حشر کو تمثیل کے انداز میں پیش کرنے سے فرد کی انفرادیت کے تصور کو تقویت ملی۔ یہ نظریہ افراد کو محض جماعتی ذمے داریاں نبھانے کا آلہ کار قرار دینے کے برعکس تھا۔ یہ نظریہ کہ افراد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے، عربوں میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوا۔ قرآن حکیم میں قریش کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز دولت اور قبیلے کی طاقت سے، جس پر بیشتر لوگ بھروسا کرتے ہیں، انہیں کچھ مدد نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک مرد اور عورت سے یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے یتیموں کی دیکھ بھال کیوں نہ کی اور غریبوں کی ضروریات کیوں پوری نہ کیں؟ انہوں نے خود غرضی سے دولت کیوں جمع کی اور قبیلے کے بیکس اور کمزور لوگوں کو اپنی دولت میں کیوں شریک نہ کیا؟ دولت مند قریش کے لیے یہ ایک دھمکی آمیز نظریہ تھا۔ اگرچہ یہ لوگ شعوری طور پر اچھی طرح جانتے تھے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے اس طرزِ عمل سے ان کے آباء واجداد کی روایات کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس کے باوجود وہ مساوات اور تمام انسانوں کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنے کے اصول کی بنیاد پر استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے نظریے پر سنجیدگی سے غور کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے لیے آسان راستہ یہی تھا کہ وہ یوم حساب کے نظریے کا تمسخر اڑا کر اسے ''پرانے لوگوں کی پریوں کی داستان'' یا ''محض جادو'' قرار دے دیں۔ (جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔ سورہ المطففین آیت ۳۱..... مترجم۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل کھلم کھلا جادو ہے۔ سورہ الصفّٰت آیت ۵۱..... مترجم)۔ وہ جسم جو زمین میں گل سڑ گئے ہیں، دوبارہ کس طرح زندہ ہوں گے؟ کیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سنجیدگی سے یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے وہ آباء واجداد جو مدتوں پہلے مر گئے تھے، قبروں سے پھر نکل آئیں گے؟ (بلکہ تو تعجب کر رہا ہے اور یہ مسخرا پن کر رہے ہیں اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے، یہ نہیں مانتے۔ اور جب کسی معجزے کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل کھلم کھلا جادو ہی ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈی ہو جائیں گے، پھر کیا (سچ مچ) ہم اٹھائے جائیں گے؟ کیا ہم سے پہلے کے ہمارے باپ دادا بھی؟ آپ جواب دیجیے کہ ہاں ہاں اور تم ذلیل (بھی) ہو گے۔ وہ تو صرف ایک زور کی جھڑکی ہے کہ یکا یک یہ دیکھنے لگیں گے۔ سورہ الصفّٰت آیات ۱۲ تا ۱۹..... مترجم)۔ یہ لوگ عربوں کے اس پرانے عقیدے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے لیکن قرآن کریم اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ یہ لوگ اس عقیدے کو ثابت نہیں کر سکتے۔ یہ محض انسانی قیاس آرائیاں (ظن) ہیں۔ (انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مار ڈالتا ہے۔ (دراصل) انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں۔ یہ تو صرف (قیاس اور) اٹکل سے ہی کام لے رہے ہیں۔ سورہ الجاثیہ آیت ۲۴..... مترجم)۔

قرآن مجید میں یہ عندیہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ اعتراضات احساسِ جرم اور مادہ پرستی کی وجہ سے کیے گئے ہیں جس نے لوگوں کے شعور اور حواس کو مختل کر دیا ہے۔ روزِ قیامت کی حقیقت کا انکار کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہیں علم ہے کہ ان کا سماجی رویہ غلط ہے۔ (یہ تو لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس دن جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہے۔ جو جزا اور سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔ اسے صرف وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے آگے نکل جانے والا (اور) گناہ گار ہوتا ہے۔ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔ یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ (چڑھ گیا) ہے۔ سورہ المطففین آیات ۹ تا ۱۴..... مترجم)۔ یوں لگتا ہے کہ قرآن پاک کی بعض آیات میں ''نشانیوں'' کی جو تشریح کی گئی ہے، اس کا مقصد ان اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ اگر خدا انسان کو ایک غلیظ قطرے سے پیدا کر سکتا ہے اور اپنی حکمت سے عجائباتِ عالم کو تخلیق کر سکتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے تو وہ ایک مردہ جسم کو دوبارہ کیوں زندہ نہیں کرسکتا؟

کیا انسان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکا یک وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپؐ جواب دیجیے کہ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔ وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کردی جس سے تم یکا یک آگ سلگاتے ہو۔ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے۔ اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (بینا) ہے۔ وہ جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہو جا، وہ اسی طرح ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ (سورہ یٰسین آیات ۷۷ تا ۸۳..... مترجم)۔

روز محشر نے اس آخری واپسی کے ایک طاقتور مثالی پیکر کی حیثیت اختیار کرلی جب تمام مخلوق کو آخر کار اپنے خالق، حی وقیوم، حیات کے سرچشمے اور معبودِ حقیقی کے روبرو پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

لیکن ان تمام اعتراضات کے باوجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے مشن کے ابتدائی برسوں میں نہایت کامیاب رہے۔ ایک مرحلے پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کو اللہ کے اصلاح شدہ دین کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ۶۱۶ عیسوی میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ اس وقت تک حضورؐ نے عرب کے دوسرے معبودوں کا باضابطہ طور پر کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور بیشتر قریش نے غالباً یہ مفروضہ قائم کرلیا تھا کہ وہ لات، عزیٰ اور منات کی روایتی طور پر پرستش کرتے رہیں گے۔ رسول اللہؐ نے اب تک خدا کی توحید کے پہلو کے بارے میں وحی کے احکام پر زور نہیں دیا تھا لیکن آخر آپؐ کو توحید کے متعلق اظہار خیال کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چنانچہ آپؐ نے جب اسلام قبول کرنے والوں کو بنات اللہ کی پوجا کرنے سے منع کیا تو آپؐ کو پتا چلا کہ آپؐ راتوں رات اپنے بیشتر حامیوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ قرآن کریم اب قریش کے قبیلے کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹاباب

www.KitaboSunnat.com

شیطانی آیات

اس پریشان کن صورت حال کی پہلی علامت غیر متوقع طور پر ظاہر ہوئی۔ ایک دن رسول اللہؐ کے صحابیوں کی ایک جماعت مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز (صلواۃ) پڑھ رہی تھی کہ بعض قریش نے نماز کے دوران ان پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی جوابی کارروائی کی اور اسلام کے لیے خون کے پہلے قطرے اس وقت گرے جب سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک حملہ آور کو اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سے مار کر زخمی کر دیا۔ اس واقعے سے مکہ کے ہر شخص کو سخت صدمہ پہنچا۔ قریش عام طور پر بردبار لوگ تھے لیکن رسول کریمؐ نے جیسے ہی عرب کے پرانے معبودوں کی پرستش کی ممانعت کی، قریش کی اکثریت اور مسلمان اقلیت کے درمیان شکوک وشبہات اور نفرت کی خلیج پیدا ہوگئی۔ چنانچہ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے:

جب رسول اللہؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اسلام کا علانیہ اظہار فرمایا تو قوم نے آپؐ سے دوری اختیار کی، نہ آپؐ کو رد کیا البتہ جب ان کے بتوں کا ذکر آیا اور ان پر عیب لگائے گئے تو انہوں نے اس معاملے کو اہمیت دی۔ وہ آپؐ سے اجنبیت برتنے لگے اور مخالفت اور دشمنی میں یک دل ہو گئے بجز ان لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اسلام کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔ ایسے لوگ تھوڑے اور چھپے ہوئے تھے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحات ۱۶۶۔۱۶۷: The Life of Muhammad, P 118)۔

لیکن قریش اس قدر پریشان کیوں تھے؟ ان میں سے بعض لوگ پہلے ہی خدا کی وحدانیت کی طرف مائل ہو کر یہودیت اور عیسائیت کو عربوں کی قدیم بت پرستی کے مقابلے میں بہتر دین سمجھنے لگے تھے۔ خدا کی بیٹیوں (بنات اللہ) کا مذہب طائف، نخلہ اور قضید کے معبودوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور مکہ کی مذہبی زندگی پر اس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت کم اثر رہ گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ بعض قریش ان خانہ بدوش قبائل کے خطرے کو محسوس کرتے تھے جو کعبۃ اللہ کے محافظ قبیلوں کو ان کے فسق و فجور کے باعث پہلے ہی مکہ سے نکال باہر کر چکے تھے البتہ قریش کو درپیش مسئلہ اس سے بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ قرآن حکیم ظاہر کرتا ہے کہ مکہ شہر کے تمام سرکردہ افراد نے جبلی طور پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جتھہ بندی کر کے آپؐ کو قوم کا دشمن قرار دے دیا تھا۔ یہ نظریہ کہ خدا صرف ایک ہے، ان لوگوں کے لیے غیر معمولی طور پر ایک نئی ایجاد تھا۔ وہ بنات اللہ کی پرستش کو مقدس فریضہ سمجھتے تھے جس نے عرب کے تمام لوگوں کو ایک ہی بندھن میں باندھ رکھا تھا۔ (اور کافروں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک شخص ڈرانے والا آ گیا اور کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر اور جھوٹا ہے۔ کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود کر دیا، واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ ان کے سردار یہ کہتے چلے کہ چلو جی اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض ہے۔ ہم نے تو یہ بات پچھلے دین میں بھی نہیں سنی، کچھ نہیں یہ تو صرف گھڑنت ہے۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر کلام الٰہی نازل کیا گیا ہے؟ دراصل یہ لوگ میری وحی کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ (صحیح یہ ہے کہ) انہوں نے اب تک میرا عذاب چکھا ہی نہیں۔ (سورہ ص آیات ۴ تا ۸......مترجم)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب ابوطالب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے آباءواجداد کے دین کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمارے لیے ماضی کے ساتھ اس قسم کے فطری لگاؤ اور وابستگی کی قدردانی کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہمارے جدید معاشرے نے تبدیلی کے عمل کو ایک روایت کا درجہ دے دیا ہے اور ہم مسلسل ترقی کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم اشیا کو ان کی حقیقی صورت میں دیکھنے کی قدر کرتے ہیں اور کسی جدت یا ایجاد کو دیکھ کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔ (کیا وہ کہتے ہیں کہ اسے تو اس نے خود گھڑ لیا ہے، آپؐ کہہ دیجیے کہ اگر میں ہی اسے بنا لایا ہوں تو تم میرے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے۔ تم اس (قرآن) کے بارے میں جو کچھ کہہ سن رہے ہو، اسے اللہ خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے وہی کافی ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ الاحقاف آیت ۸......مترجم)۔

لیکن زیادہ روایتی معاشروں میں ماضی کے تسلسل کو مقدس درجہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلی، جسے ہم درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، معاشرے کے بنیادی ڈھانچے پر مسلسل نظرثانی کی متقاضی ہوتی ہے اور ہم سے پہلے کوئی معاشرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جدید دور سے پہلے بعض معاشروں میں مذہب کی رو سے عاید ہونے والی ذمے داریوں کو ایک معاہدے کی طرح پورا کیا جاتا تھا۔ انسانی تہذیب و تمدن اور ثقافت کو پرخطر کامیابیاں تصور کیا جاتا ہے اور سرپرست دیوتاؤں کی توہین کر کے ان کے وجود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ ایجاد اور اختراع عام طور پر چند منتخب لوگوں تک محدود ہوتی ہے چنانچہ سقراط کے انجام سے، جسے ۳۹۹ قبل مسیح میں ایتھنز میں سزائے موت دی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئی، ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کی متلاشی کسی بے چین روح کا عام لوگوں کے سامنے اظہار حقیقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سقراط پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے نظریات ملحدانہ ہیں اور یہ کہ وہ نوجوانوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کو بھی اسی قسم کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا اور آپؐ کئی مرتبہ بال بال بچے۔

نبی کریمؐ جب مکہ کے لوگوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ دوسرے معبودوں کی پوجا کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی پرستش کریں تو اصل میں آپؐ ان لوگوں سے ایک ایسا نیا مذہبی رویہ اختیار کرنے کے لیے کہہ رہے تھے جسے آپؐ کے قبیلے کے بیشتر لوگ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحدت پرستی کا دین محض عقلی تسلیم و رضا کا نہیں، ضمیر کی تبدیلی کا متقاضی تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ کے بارے میں گہرے شکوک وشبہات اس لیے پیدا ہوئے کیونکہ اس سے ان مقدس چیزوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا جن پر معاشرے کی بقا کا انحصار تھا۔ شروع میں رومن سلطنت میں عیسائیوں کو بھی اسی قسم کے تجربے سے گزرنا پڑا جہاں مستقبل کی طرف بے خوف وخطر گامزن ہونے کو نہیں، مثالی ماضی کی طرف لوٹنے کو ''ترقی'' سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت مظاہر پرست رومیوں کے دیوتاؤں کو ریاست کا محافظ تصور کیا جاتا تھا اور اگر اس عقیدے کو نظر انداز کر دیا جاتا تو یہ دیوتا مملکت کی محافظت سے سبکدوش ہو جاتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رومی مظاہر پرستی کے مذہب میں رواداری موجود نہیں تھی۔ رومن ایمپائر کے باشندوں کو اس وقت تک، جب تک کہ وہ کوئی نیا دیوتا تلاش نہ کر لیتے، مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اس معاشرے میں کسی بھی نئے مذہب کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی اور لوگوں کا تعلق مختلف فرقوں اور مسلکوں سے تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کے تبدیل مذہب یا دوسرے تمام فرقوں کو مسترد کر دینے کا ایک بھی واقعہ رونما نہ ہوا۔ یہ درست ہے کہ یہودی صرف ایک خدا کی پوجا کرتے اور بت پرستی کی مذمت کرتے تھے لیکن ہر شخص جانتا تھا کہ یہودیت ایک پرانا اور مقدس مذہب ہے۔ یہودی جب تک یہ سمجھتے رہے کہ عیسائی ان کی مذہبی رسوم پر عمل کرتے ہیں، اس وقت تک وہ عیسائیوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے رہے لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ عیسائی قدیم یہودی مذہب پر کاربند نہیں، ان پر فسق وفجور، آبائی مذہب کی بے ادبی اور کفر والحاد کے الزامات عاید کر دیے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے روم کے دیوتاؤں کی پوجا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ عیسائیوں نے بت پرستی کے ان دیوتاؤں سے قطع تعلق کر کے ممنوعہ باتوں کی خلاف ورزی کی تھی چنانچہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی بڑی تباہی سے دوچار ہو جائیں گے۔ اس پر یکے بعد دیگرے ہر شہنشاہ عیسائیوں کو ایذائیں پہنچانے کا حکم جاری کرتا رہا۔ ''شہیدوں'' کے بے پناہ مصائب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رومی قوت کے لیے کس قدر سنگین خطرہ تھے۔ ان کے مسخ شدہ جسم دیوتاؤں کے حضور قربانی کے مصداق تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ لوگوں نے اس ''بے دینی'' کو قبول نہیں کیا تھا۔

اگر طاقتور رومی سلطنت میں یہ حالات تھے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب قدیم دیویوں کو ماننے سے انکار کر دیا تو اس وقت اس ''الحاد'' پر قریش کس قدر پریشان ہوئے ہوں گے! خانہ بدوشی کی زندگی کے طور طریقے قدامت پسندانہ تھے کیونکہ یہ ایک خطرناک زندگی تھی۔ مثال کے طور پر اس معاشرے کا کوئی بھی فرد اپنے آباء واجداد کے کنوؤں تک رسائی کے لیے نیا راستہ دریافت کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ قریش صرف دو نسل پہلے لق ودق صحرا میں رہتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ تونگری کے شیخی بگھارنے والے مسلک کے باوجود ان کی تجارتی کامیابی کمزور اور بودی ہے۔ رومیوں کی طرح وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا تسلسل ماضی کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ان کی کامیابی کا دارومدار اپنے باپ دادا کی مقدس روایات کا احترام کرنے پر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اور اسلام کے دوسرے ابتدائی ماخذوں کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمن آپؐ کی شخصیت کو معاشرے کے لیے مسلسل خطرہ سمجھتے اور آپؐ پر اپنے اسلاف کے مذہب کو نظر انداز کرنے اور کفر و الحاد کے الزامات عاید کرتے تھے۔ اس کی مثال ان رومی باشندوں کی سی تھی جو شدت جذبات سے مغلوب ہو کر غصے اور دہشت سے ہجوم کی صورت میں قدیم اکھاڑوں میں جمع ہو جاتے تھے۔

بعض ابتدائی مسیحی عالموں نے استدلال پیش کیا ہے کہ بت پرستی کا مذہب ملحدانہ اختراع نہیں تھا چنانچہ فلسطین کے مشہور مذہبی عالم جسٹن Justin نے ۱۵۰ اور ۱۶۰ عیسوی میں دو کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ عیسائی ایک خدا کو ماننے والے سقراط اور دوسرے واجب الاحترام فلاسفروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی ایک ایسے لمحے کا حوالہ دیا گیا ہے جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش کے خوف اور خدشات کو دور کرنے اور ان کے ساتھ از سر نو دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی امید میں قریش کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ قرآن میں خدا آنحضرتؐ کو یاد دلاتا ہے:

یہ لوگ آپؐ کو اس وحی سے، جو ہم نے آپؐ پر اتاری ہے، بہکانا چاہتے تھے کہ آپؐ اس کے سوا کچھ اور ہی ہمارے نام سے گھڑ گھڑا لیں، تب تو یہ لوگ آپؐ کو اپنا ولی دوست بنا لیتے

اگر ہم آپؐ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی طرف قدرے مائل ہو ہی جاتے (سورہ بنی اسرائیل آیات ۷۳، ۷۴)۔

مغرب میں بعض اسکالروں نے یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ ان قرآنی آیات میں، جن میں اب نام نہاد ''شیطانی آیات'' کے قصے کا ذکر کیا گیا ہے، ان اسکالروں کے بقول حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عارضی طور پر کئی خداؤں کو ماننے کی رعایت دے دی تھی۔

اس قصے میں، جیسا کہ ابن سعد اور طبری کی تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے، کہا گیا ہے کہ شیطان نے ایک مرتبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول کریمؐ پر نزول وحی کے دوران مداخلت کی تھی۔ ایک روایت کے مطابق جس وقت سورہ النجم نازل ہو رہی تھی، آنحضرتؐ سے دو ایسی آیتیں کہلوا دی گئیں جن میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان مفاہمت کے لیے لات، عزیٰ اور منات کی عزت و توقیر کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ قریش بنات اللہ کو مقدس سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے غلطی سے یہ باور کر لیا کہ قرآن نے بنات اللہ کو خدا کا ہم مرتبہ قرار دے دیا ہے۔ مشرک قریش یہ سمجھ کر کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی دیویوں کو اللہ کے برابر رتبہ دے دیا ہے، نماز میں مسلمانوں کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے اور یہ شدید تنازع بظاہر ختم ہو گیا۔ چونکہ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ قرآن نے قریش کے آباء واجداد کے روایتی عقیدے کی توثیق کر کے اپنے وحدانیت کے پیغام کو ترک کر دیا ہے اس لیے اب ان کی نظروں میں مقدس چیزوں کی بے حرمتی کرنے کا خطرہ ٹل گیا جس سے مکہ کے لوگوں کے لیے تباہی آ سکتی تھی۔ اس کہانی میں آگے چل کر یہ کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ پر بعد میں ایک اور وحی نازل ہوئی جس میں یہ عندیہ دیا گیا کہ آپؐ کو بنات اللہ کی پوجا کے عقیدے کو بظاہر قبول کرنے کی ترغیب ''شیطان'' نے دی تھی۔ آخر ان دونوں سورتوں کو قرآن سے حذف کر کے ان کی جگہ دو متبادل سورتیں نازل کر دی گئیں جن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ تینوں دیویاں عربوں کے خیالی پیکر ہیں اس لیے وہ ہرگز قابل پرستش نہیں۔

یہاں پر ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ بیشتر مسلمان اس قصے کو وضعی اور غیر مستند سمجھتے ہیں۔ وہ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ایسے کسی واقعے کا واضح انداز میں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث مبارکہ کے ان عظیم مجموعوں میں ایسا کوئی بیان موجود ہے جو نویں صدی میں بخاری اور مسلم نے مرتب کیے تھے۔ مسلمان ان روایات کو اس لیے مسترد نہیں کرتے کہ ان میں تنقید کا پہلو نکلتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان روایات کی کوئی معتبر سند موجود نہیں ہے۔ لیکن مغرب کے اسلام دشمنوں نے اس فرضی قصے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حضورؐ کی ہرزہ سرائی کی ہے اور کہا ہے کہ جو شخص وحی الٰہی کو تبدیل کر دے، وہ سچا نبی کیسے ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی بھی حقیقی پیغمبر خدا کے کلام اور شیطانی القا کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے۔ کیا خدا کا کوئی رسول صرف زیادہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف راغب کرنے کی غرض سے وحی میں تصرف کر سکتا ہے؟ لیکن حال ہی میں میکسم روڈنسن Maxime Rodinson اور ڈبلیو منٹگمری واٹ W.Montgomery Watt جیسے اسکالروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر یہ کہانی درست ہو، تب بھی اس کی منفی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود اس واقعے کو کم سے کم ۱۹۸۸ء تک عالم اسلام کے مقابلے میں مغربی دنیا میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

یہ تنازع اس سال شائع ہونے والے سلمان رشدی کے ناول The Satanic Verses کی وجہ سے پیدا ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کے بعد اس قصے کی دوبارہ تشہیر ہوگئی۔ مسلمانوں نے اس ناول میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کی مضحکہ خیز نقل کرنے پر شدید احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ ناول میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں تمام پرانے مغربی قصے کہانیوں کو دہرایا گیا ہے اور آپؐ کو (نعوذ باللہ...... مترجم) خالص سیاسی خواہشات رکھنے والا ایک دغاباز شخص ظاہر کیا گیا ہے جس نے وحی کو زیادہ سے زیادہ عورتیں رکھنے کے لائسنس کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ناول میں یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی گئی کہ آپؐ کے ابتدائی صحابہؓ نااہل اور سنگدل تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ رشدی کی کتاب میں قرآن کریم کی صداقت پر بلاجواز تنقید کی گئی ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ شیطانی آیات کے واقعے کو، جو اس ناول کا سرورق ہے، یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب نیکی کو برائی سے ممیز نہیں کرسکتی جیسا کہ مغربی نقادوں کا ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے۔ نیز اس میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ خالص انسانی بلکہ فاسد الہام بھی خدا کی مشیت ہیں۔

اگرچہ ابتدائی مسلمانوں نے ایک بڑی، اعلیٰ اور شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی اور عقل واستدلال پر مبنی فلسفے کی بہترین روایت قائم کی جو قرون وسطیٰ کے اسکالروں کے لیے روحانی فیضان کا سرچشمہ تھا، اس کے باوجود رشدی کے بہت سے جادو بیان حامیوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں علوم وفنون کی آزادی کو ویٹو کیا گیا ہے۔ رشدی نے نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی جوانوکھی تصویر کشی کی ہے، وہ حقیقت کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس میں ایک کردار کے خوابوں کو بیان کیا گیا ہے جو نفسیاتی مریض ہے۔ ایک بھارتی فلم اسٹار جبریل فرشتہ نے، جو اپنی ثقافتی جڑیں کھو چکا ہے، اس نفرت اور حقارت پر مبنی صورت گری کی ہے جو کوئی ایک ہزار برس سے مغرب میں پرورش پاتی رہی ہے۔

چونکہ مغرب اور عالم اسلام کے درمیان حالیہ تصادم نے پرانے زخموں کو پھر کھول دیا ہے، اس لیے یہ وضاحت ضروری ہوگئی ہے کہ آیا شیطانی آیات کا واقعہ رونما ہوا بھی تھا یا نہیں؟ کیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مزید لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے اپنے وحدانیت کے پیغام پر مصالحت کے لیے تیار ہوگئے تھے؟ کیا قرآن ایک لمحے یا ایک پل کے لیے شیطان کے اثر سے کسی آلائش سے آلودہ ہوگیا تھا؟ روڈنسن اور واٹ دونوں نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ اس کہانی سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی کریمؐ ایک خشک مزاج اور مکار شخص تھے۔ (نعوذ باللہ...... مترجم)۔ یہ جاننے کے لیے ہم طبری سے رجوع کرتے ہیں جس نے اپنی تاریخ اور قرآن پاک کی تفسیر میں اس قصے کے بارے میں دو مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ طبری نے ان حالات کو قریش اور حضورؐ کے درمیان آخری ناچاقی قرار دیا ہے۔ محمد ابن اسحاق کی طرح وہ بھی یہ کہتا ہے کہ قریش شروع میں آنحضرتؐ کا پیغام قبول کرنے کو تیار تھے۔ طبری نے رسول اللہؐ کے دور کے ایک رشتے دار عروہ ابن الزبیر کی ایک روایت کا حوالہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتے ہوئے آپؐ کی وفات کے ستر سال بعد حضورؐ کی ابتدائی کامیابی پر زور دیا ہے۔عروہ کا کہنا ہے کہ ابتدا میں قریش حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پیچھے نہ ہٹے" بلکہ آپؐ کی طرف خاصے مائل ہو گئے تھے"۔ جب تک آپؐ اللہ کے دین کی تبلیغ اور غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد کی ترغیب دیتے رہے، مکہ کا ہر شخص اللہ کی قدیم ذات اور اصلاح شدہ دین کی طرف متوجہ ہو گیا۔لیکن جب آپؐ نے یہ اعلان کیا کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے آبائی معبود کی پرستش نہ کی جائے تو قریش نے نبی کریمؐ کی اس تبلیغ کی پوری قوت کے ساتھ تردید کی اور حضورؐ اور آپؐ کے پیرکاروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ماسوائے ان لوگوں کے جنہیں خدا نے محفوظ رکھا اور ان کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اسلام راتوں رات ایک حقیر اقلیتی فرقہ بن گیا۔عروہ نے اس واقعے کی دلچسپ تفصیل بیان کرتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ کی مخالفت کرنے والے افراد قریش کے وہ لوگ تھے جن کی طائف میں جائیدادیں تھیں۔(W. Montgomery Watt: Muhammad at Mecca P. 100)۔

بہت سے قریش مکہ کی شدید گرمی سے پناہ لینے کے لیے طائف چلے جاتے تھے۔لات کا شہر طائف نسبتاً سرد اور حجاز کا زرخیز حصہ تھا اور بڑے بڑے قریش نے گرمیاں گزارنے کے لیے وہاں مکان بنا رکھے تھے۔ لات کا معبد ان کے لیے اس وجہ سے اہم تھا کیونکہ یہ لوگ کعبہ سے غیر حاضری کے دوران وہاں قدیم مذہبی رسوم ادا کر سکتے تھے۔حضورؐ نے جب اپنے قبیلے کے لوگوں کو لات کی پوجا کرنے سے منع کیا تو وہ اس بات سے سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آپؐ نے طائف میں ان کی پوزیشن کو نقصان پہنچایا ہے۔طبری نے ابوالعالیہ کی ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ قریش اس معاملے میں حضورؐ کے ساتھ مصالحت کرنے سے خوف زدہ تھے۔ اگر آپؐ ان تین بنات اللہ کے متعلق مفاہمتی کلمات کہنے کا وعدہ کر لیتے تو قریش مکہ کی طاقت کے داخلی حلقوں میں آپؐ پر ایمان لے آتے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو آیتیں پڑھ دیں جن میں لات ،عزیٰ اور منات کو شفاعت کرنے والی دیویاں قرار دیا گیا تاہم بعد میں آپؐ نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ الفاظ شیطان کی طرف سے القا ہوئے تھے۔ (تفسیر XVII صفحات ۱۱۹ تا ۱۲۱۔ Watt: Muhammad at Mecca P. 102)۔لیکن یہ کہانی دوسری روایات اور خود قرآن مجید سے متصادم ہے۔ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ طبری جیسا مسلمان مورخ ان تمام روایتوں کی توثیق نہیں کرتا جو اس نے نقل کی ہیں۔ وہ قاری سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ ان روایتوں کا موازنہ کر کے ان کی صداقت کا تعین خود کرے۔رسول اللہؐ کو اپنے پیغمبرانہ کیرئر کے ابتدائی مرحلے میں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ ابوالعالیہ کی کہانی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔خود قرآن کریم نے ،جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس وقت مکہ میں حضورؐ کو کوئی سیاسی فریضہ سونپے جانے کی تردید کی ہے۔ بعد میں آنحضرتؐ نے بھی سرکردہ قریش کے ساتھ اس قسم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی سودے بازی کے امکان کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔

طبری نے اپنی تاریخ میں ایک روایت کا حوالہ دیا ہے جو اس قصے کے بالکل برعکس ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کے ساتھ پریشان کن تنازعے کا حل تلاش کرنے کے لیے غور و فکر کر رہے تھے۔ اس دوران آپؐ کسی مادی فائدے کے لیے بنات اللہ کا کوئی خوش کن حوالہ نہیں دے رہے تھے جیسا کہ اس کہانی کی دوسری روایات میں عندیہ دیا گیا ہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضورؐ اس مسئلے کا ایک ایسا حقیقی حل تلاش کرنا چاہتے تھے جس کے ذریعے قریش آپؐ کے وحدانیت کے پیغام کو تسلیم کر لیتے:

جب پیغمبرِ خدا نے یہ دیکھا کہ آپؐ کی قوم نے اپنی پشت پھیر لی ہے اور اس پیغام سے، جو وہ خدا کی طرف سے لائے ہیں، اجنبیت اختیار کر لی ہے تو آپؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ آپؐ پر خدا کی جانب سے کوئی ایسی وحی نازل ہو جس کے ذریعے قوم کے ساتھ آپؐ کی صلح ہو جائے۔ اپنے لوگوں کے ساتھ محبت اور ان کی حالت پر تشویش کے سبب یہ خیال آپؐ کے لیے خوش کن تھا کہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے جس نے آپؐ کے کام کو مشکل بنا دیا ہے۔ چنانچہ آپؐ اس منصوبے کے سلسلے میں مصالحت پر غور کرنے لگے جو آپؐ کو بہت عزیز تھا اور جس کی آپؐ کو تمنا اور خواہش تھی۔

(تاریخ رسول والملوک صفحہ ۱۱۹۲ The Life of Muhammad P. 165:)

طبری نے لکھا ہے کہ ایک دن جب آپؐ کعبہ میں غور و فکر کر رہے تھے تو اس سوال کا وحی کی صورت میں جواب آ گیا جس میں وحدانیت کے اصول پر سودے بازی کیے بغیر تین دیویوں کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا چنانچہ جب سورہ النجم نازل ہوئی تو اس وقت بہت سے قریش کعبۃ اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے جب ان لفظوں کی تلاوت کی تو وہ اٹھ کر نہایت توجہ کے ساتھ اس سورت کو سننے لگے:

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا

اور منات تیسرے پچھلے کو (سورہ النجم آیات ۱۹، ۲۰)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنات اللہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہتے، اس کے دوررس نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ کیا آپؐ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ قرآن کریم نے قریش کے عقیدے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے یا آپؐ ان دیویوں کے متعلق زیادہ مثبت پیغام دیں گے؟ طبری نے لکھا ہے کہ یہی وہ ''لمحہ'' تھا جب ''شیطان'' نے یہ دو آیتیں آپؐ کے منہ سے کہلوا دیں:

یہ اعلیٰ درجے کے پرندے (غرانیق) ہیں

جن کی دعا قبول ہوتی ہے

روایت کے مطابق قریش ان نئی آیتوں کو سن کر بہت خوش ہو گئے۔ غرانیق غالباً شمالی افریقا کے علاقے نومڈیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا کونج نامی پرندہ ہے جو دوسرے پرندوں کے مقابلے میں سب سے اونچا اڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپؐ اپنے پیغام پر سودے بازی کیے بغیر فرشتوں اور جنوں کی طرح بنات اللہ کی موجودگی پر بھی یقین رکھتے ہوں اور لطیف پیرائے میں ان دیویوں کی تعریف بھی کی ہو لیکن غرانیق کا مرتبہ بہ ہر حال اللہ کے برابر نہیں تھا، نہ ہی کسی نے ان کو ہم مرتبہ قرار دیا تھا لیکن چونکہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان منڈلاتی تھیں اس لیے وہ ان فرشتوں کی طرح خدا اور بندوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہوں جن کی سفارش قبول ہونے کی توثیق سورہ النجم کی اگلی آیت میں کی گئی ہے۔ (اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لیے چاہے، اجازت دے دے۔ سورہ النجم آیت ۲۶ ..... مترجم)۔ قریش نے اس اچھی خبر کو پورے شہر میں مشتہر کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہایت شاندار انداز میں ان کے دیوتاؤں کی تحسین کی ہے۔ انہوں نے جو آیتیں پڑھی ہیں، ان میں غرانیق کو سراہا گیا ہے جن کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔'' (طبری: تاریخ صفحہ ۱۱۹۲: The Life of Muhammad P. 166)۔

جن لوگوں کی پرورش مسیحی دنیا میں ہوئی ہے، وہ اس واقعے میں مذکور لفظ ''شیطان'' سے غلط مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ عیسائی دنیا میں شیطان کو ایک دیوہیکل برائی کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کریم میں، جیسا کہ یہودی صحیفوں سے ظاہر ہوتا ہے، شیطان ایک فرمانبردار کردار ہے۔ قرآن میں اس کی بے توقیری کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ جب خدا نے انسان کو تخلیق کیا تو اس نے تمام فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا لیکن شیطان یا ابلیس نے خدا کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور راندہ درگاہ ہوگیا۔ قرآن حکیم میں شیطان کے اس فعل کو قطعی اور مطلق جرم قرار نہیں دیا گیا بلکہ یہ عندیہ دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن شیطان کو معاف کر دیا جائے گا۔ (اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لیے اس میں سامان رزق پیدا کیا، تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم ہی نے تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے جب کہ میں تجھ کو حکم دے چکا، کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا تو آسمان سے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے۔ سو نکل بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دیجیے قیامت کے دن تک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی۔ (سورہ الاعراف آیات ۱۰ تا ۱۵ ..... مترجم)۔ بعض صوفیائے کرام نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ شیطان نے محض ایک مخلوق کو سجدہ کرنے سے انکار کیا جس کا مستحق صرف خدا ہے۔ چنانچہ ''شیطانی آیات'' کے متنازع واقعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کریم میں کوئی آمیزش ہوئی ہے۔ اسلام میں ہبوط آدمؑ کے متعلق مسیحی نظریے کی توثیق نہیں کی گئی بلکہ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ آدم علیہ السلام شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تھے لیکن مسلمان یہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ بیشتر یہودیوں کا بھی عقیدہ ہے، کہ یہ آدمؑ کے اس خودمختار ارادے کی علامت ہے جو انسانی نشو ونما کے لیے ضروری مرحلہ تھا۔ آدمؑ کو ان کے گناہ کے باوجود عظیم المرتبت پیغمبر کے منصب پر فائز کیا گیا اور یہ کہ شیطان نے بنی نوع انسان کو تباہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آج اگر بعض مسلمان امریکا کو ''شیطان عظیم'' کہتے ہیں تو ہمیں ان کی یہ بات سنتے وقت لسانی امتیاز کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ شیعہ فرقے کے مطابق شیطان ایک ادنیٰ مخلوق ہے جو روح کے حقیقی جوہر کے بجائے کم مائیگی پر مطمئن ہو گیا تھا۔ شاہ کے زمانے میں بہت سے ایرانی امریکا کو The Great Trivialiser کہتے تھے جس کا مقصد اپنے عوام کو زوال پذیر مادہ پرستی کے خلاف اکسانا تھا۔(Religion and Politics in Islam: Shi'ism from Quietism to Revolution PP. 191,217)۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ قریش نے رسول کریمؐ کے ساتھ مفاہمت کے لیے حضورؐ سے کہا کہ وہ دوسرے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کیے بغیر ایک خدا کی پرستش کرنے کو تیار ہیں۔ قریش نے آنحضرتؐ سے یہ بھی کہا کہ آپؐ صرف اللہ کی پوجا کریں اور وہ خدا کے ساتھ اپنے آبائی معبودوں کی بھی پرستش کریں گے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ طبری نے نام نہاد ''شیطانی آیات'' کا جو قصہ بیان کیا ہے، اس میں حضورؐ نے ان دیویوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق ایک رات جبریلؑ رسول اللہؐ کے پاس آ کر کہنے لگے: ''آپؐ نے یہ کیا کیا ہے؟ آپؐ نے ان لوگوں کے سامنے وہ کلام پڑھا ہے جو میں خدا کی طرف سے آپؐ کے لیے نہیں لایا تھا۔ آپؐ نے وہ کچھ کہا ہے جو خدا نے آپؐ سے نہیں کہا تھا۔'' (تاریخ طبری صفحہ ۱۱۹۲: The Life of Muhammad P 166)۔ چنانچہ خدا نے حضورؐ پر نئی آیتیں نازل کر دیں جن میں بنات اللہ کو ''محض نام'' قرار دے کر انہیں مسترد کر دیا گیا۔ یہ دیویاں صرف انسانی اختراع تھیں اور خدا نے ان کے بارے میں کوئی وحی نازل نہیں کی تھی۔

در اصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ تو صرف اٹکل (ظن) کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ (سورہ النجم آیت ۲۳)۔

قرآن کریم میں دیویوں کی تحقیر کے لیے یہ سب سے سخت آیت ہے اور جب یہ آیت قرآن حکیم کا حصہ بن گئی تو قریش کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہا۔

طبری کی تاریخ میں ''شیطانی آیات'' کے بارے میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ رسول اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریش کے ساتھ کوئی بے ہنگم معاہدہ کرنے والے تھے۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سنا کہ آپؐ نے جو آیتیں پڑھی ہیں، وہ شیطان کی طرف سے القا کی گئی تھیں تو آپ سخت پریشان ہو گئے البتہ طبری نے لکھا ہے کہ خدا نے فوری طور پر وحی بھیج کر آپؐ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ تمام سابق پیغمبر بھی اس قسم کی ''شیطانی غلطی'' کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ یہ کوئی ہلاکت خیز چیز نہیں تھی کیونکہ خدا ہمیشہ ایسی آیتیں نازل کر کے معاملات کی اصلاح کرتا رہا ہے جو منسوخ کی جانے والی آیتوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہوتی تھیں۔ یہاں قرآن ''وحی'' کے تصور کے ضمن میں خطرات کی اس طرح نشان دہی کرتا ہے:

ہم نے آپؐ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا، اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے دل میں کوئی آرزو کرنے لگا تو شیطان نے اس کی آرزو میں کچھ ملا دیا، پس شیطان کی ملاوٹ کو اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے، پھر اپنی باتیں پکی کر دیتا ہے۔ (سورہ الحج آیت ۵۲)۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پہلے پیغمبر آدمؑ نے شیطان کی ایک تجویز مان لی تھی۔ بعد میں آنے والے پیغمبروں نے بھی اپنی اپنی قوم کو خدا کا پیغام پہنچاتے وقت شیطانی آیات کو شامل کر لیا تھا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان پیغمبروں کے صحیفے شیطانی اثر سے آلودہ ہو گئے تھے۔ عرب خالص انسانی مزاج کے اظہار کے لیے شیطان کے لفظ کو اشارے کنائے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی کریمؐ کے لیے وحی کی ٹھیک تشریح کرنا کس قدر مشکل تھا۔ وحی کے مضمرات اور انہیں اپنے الفاظ میں بیان کرتے وقت غلطی کا احتمال ہو سکتا تھا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کسی مصلحت کے تحت قرآن کریم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی اجازت مل گئی تھی۔ قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے کہ کوئی بھی فانی انسان خدا کے کلام کو تبدیل نہیں کر سکتا اور اگر حضورؐ نے ایسی کوئی کوشش کی تو اس کا انجام تباہ کن ہوگا۔ (جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں، اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لاتے ہیں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، سورہ البقرہ آیت ۱۰۶......مترجم)۔ اس طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان کا فرمان اتارا ہے۔ اگر آپؐ نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپؐ کے پاس علم آ چکا ہے تو اللہ (کے عذابوں) سے آپؐ کو کوئی حمایتی ملے گا اور نہ بچانے والا۔ (سورہ الرعد آیت ۳۷......مترجم)۔ اور جب ہم کسی آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نازل فرماتا ہے، اسے وہ خوب جانتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تو تو بہتان باز ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں۔ (سورہ النحل آیت ۱۰۱......مترجم)۔ یہ بھی منجملہ اس وحی کے ہے جو تیری جانب تیرے رب نے حکمت سے اتاری ہے۔ تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنانا کہ ملامت خوردہ اور راندہ درگاہ ہو کر دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۹......مترجم)۔ اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی آپؐ کی طرف ہم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتاری ہے، سب سلب کرلیں، پھر آپؐ کو اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی میسر نہ آ سکے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۶...... مترجم)۔ اللہ تعالیٰ کسی بھی مخصوص پیغمبر پر وحی نازل کرنے کے بعد ان صحیفوں میں ترمیم کر سکتا تھا۔ چنانچہ انسانی شعور کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریمؐ جب قرآن کریم کو عربوں تک پہنچا رہے تھے تو آپؐ پر مسلسل استغراق اور وجدان کی کیفیت طاری رہتی۔ یہ بتدریج آگے بڑھنے کا عمل تھا اور حضورؐ اپنے پیغام میں نئے مضمرات کا مشاہدہ کرتے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جب آنحضرتؐ کے پیغام نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا، آپؐ خدائے وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت پر زیادہ زور دینے لگے اور آپؐ نے توحید کو وحی کا سب سے اہم جزو قرار دے دیا۔ اس واقعے کے بعد آپؐ ایک حاسد توحید پرست بن گئے۔

ہم نے حال ہی میں روایتی مظاہر پرستی کے حسن اور رعنائی کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے جس میں بہت سی دیویاں اور دیوتا موجود ہیں اور جس کی صداقت اور جرأت مندانہ طور طریقوں کی بدولت انسان بے شمار المیوں اور مصائب کا سامنا کرتا اور قطعی حل کی عیش پسندی سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اس کے برعکس وحدانیت کا تصور ایک ہی پتھر سے بنائی گئی یادگار عمارت کے مصداق ہے اور اس میں یک رنگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے جس کی بنا پر ہر قسم کے فلسفیانہ مسائل جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ مظاہر پرستی کو گویا تمام دیوتاؤں کے مندر کی حیثیت حاصل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت مطلق تک رسائی کے لیے کئی راستے موجود ہیں۔ لیکن وحدت پرستی کا نظریہ، جس میں کہا گیا ہے کہ خدا صرف ایک ہے، بظاہر ناقابل برداشت ہے اور اس میں انسانی اختلاف کی اجازت نہیں دی گئی۔ یوں لگتا ہے کہ اصنام پرستی کا تعلق انسانی نسل کے ارتقا کے اس مرحلے سے ہے جب انسان کا شعور مکمل طور پر یکجا نہیں ہوا تھا اور جب اس دنیا اور عالم موجودات میں ایسے کئی عناصر شامل تھے جن میں کامل ہم آہنگی موجود نہیں تھی۔ جب مردوں اور عورتوں نے یہ دیکھا کہ خود ان کے وجود میں ایک ناقابل تحلیل اتحاد موجود ہے اور یہ پوری کائنات بھی واحد ہستی ہے جس پر ایک واحد قوت فرماں روائی کر رہی ہے تو لوگ توحید کے نظریے کی طرف راغب ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ قدیم دیوتا محض حقیقت مطلق کا پرتو یا وجود باری تعالیٰ کے عقیدے کی روایتی اصطلاح میں خدا کی صفات کے مظہر بن گئے ہیں۔

ہم رومن سلطنت کے رسوم پرستی کے آخری دور میں اس صورت حال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایک بھاری بھرکم سیاسی تشخص کے اندر رہنے کے تجربے سے لوگوں کو معلوم دنیا کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے دیکھنے میں مدد ملی اور اس طرح کسی بھی مخصوص علاقے کے مقامی دیوتا اور مذہبی رسوم اب ناکافی دکھائی دینے لگے، زیادہ سے زیادہ لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ عظیم خدا صرف ایک ہے۔ یونانی فلاسفروں کی تعلیمات بھی یہی تھیں۔ لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، خیالات میں تبدیلی کا یہ عمل بہت تکلیف دہ تھا۔ بعض لوگ خیالات میں انقلابی تبدیلی کے بعد توحید پرستی کے نظریے کو اپنانے کے لیے دوسروں کے مقابلے میں جلد تیار ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں جب عیسائیت کو رومن ایمپائر کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا تو اس کے بعد بھی مظاہر پرستی کا مذہب طویل عرصے تک پھلتا پھولتا رہا۔ خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اپنے مقدس ماضی کو پوری قوت کے ساتھ ایک طرف رکھ دیں۔ کئی لوگ ماضی کا تسلسل ٹوٹنے سے سخت پریشان ہو گئے۔ ساتویں صدی کے اوائل میں عرب میں بھی اسی قسم کا بحران تھا۔ اس وقت کے سیاسی منظر نے عربوں کی روحانی اور ذاتی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ عظیم سلطنتوں کے حصار میں گھرے ہوئے تھے اور انہیں ریگستان عرب کے اردگرد کی متحدہ دنیا کا مکمل ادراک تھا، عربوں نے اپنے آپ کو ایک فرد کی حیثیت سے پہچاننا شروع کر دیا تھا اور ان میں اپنے ناقابل تنسیخ حقوق اور فرائض کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ ان کے شعور اور آگہی میں تیز فہمی کا جوہر پروان چڑھنے لگا تھا۔ پرانا قبائلی نظام، جس میں ہر قبیلہ اپنی روش پر گامزن تھا، نئے زمانے کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام ہو گیا۔ حنیف کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے عرب توحید پرستی کا عقیدہ اپنانے کے لیے تیار ہو چکے تھے البتہ بعض دوسرے لوگ ابھی تک ماضی کے ساتھ تعلق کو یک لخت توڑنے اور اس تسلسل کو کھونے کے لیے تیار نہیں تھے جسے ان کی قدیم روحانیت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی استعداد اور شعور میں وسعت پیدا ہو رہی تھی تو آپؐ عربوں کے لیے مشترک نقطہ نظر تلاش کرنے کی ضرورت سے بھی یقیناً زیادہ آگاہ ہو گئے ہوں گے۔ خدا کی وحدانیت کا تصور قبائلی نظام کے لیے ناموافق تھا کیونکہ اس نظریے کا تقاضا یہ تھا کہ سب لوگ واحد برادری میں متحد ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسول اللہ ؐ عرب اتحاد کو اہم نصب العین سمجھنے لگے۔ لیکن ۶۱۶ عیسوی میں جب قریش کے ساتھ شدید بگاڑ پیدا ہوا تو آپؐ کو فطرت کی بوقلمونیوں کے پس منظر میں حقیقت مطلق کو تلاش کرنے کی مذہبی ضرورت کا زیادہ احساس ہو گیا۔ شیطانی آیات کے بدلے میں جو آیتیں نازل ہوئیں، ان میں واضح کیا گیا ہے کہ پرانے دیوتا اور بت محض انسانی اختراعیں ہیں اور ان کا اس بلند مرتبت اللہ کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو انسان کے محدود نظریات سے بالاتر ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ کے ''شریکوں'' یا ''ساجھیوں'' کے خلاف جو مباحث کیے گئے ہیں، ان میں یہودیوں کے بعض صحیفوں کی طرز پر بت پرستوں کے معبودوں کے غیر موثر ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ ان معبودوں کو اپنی دنیا کا مرکز اور محور بنانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ یہ آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ معبود اپنے پیروکاروں کو خوراک یا روزی مہیا نہیں کر سکتے، قیامت کے دن ان کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی اور جو مرد اور عورتیں ان کی پرستش کرتے رہے ہیں، وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ (تم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کی پوجا پاٹ کررہے ہو اور جھوٹی باتیں دل سے گھڑ لیتے ہو۔ سنو! جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا پاٹ کررہے ہو، وہ تو تمہاری روزی کے مالک نہیں۔ پس تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ ہی سے روزیاں طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کی شکر گزاری کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ (سورہ العنکبوت آیت ۱۸ ... مترجم)۔ کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا (اوروں کو) سفارشی مقرر کررکھا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ گو وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ (سورہ الزمر آیت ۴۳.....مترجم)۔ یہ معبود تو مردوں، عورتوں، فرشتوں اور جنوں کی طرح محض مخلوق ہیں جو کسی کی امداد کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ یہاں قرآن حکیم میں زبور کی طرز پر، جسے رسول اللہؐ نے نہیں پڑھا تھا، بعض دلائل اور براہین پیش کی گئی ہیں:

واقعی تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو، وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔ سو تم ان کو پکارو پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کردیں اگر تم سچے ہو

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ آپؐ کہہ دیجیے! تم اپنے شرکا کو بلا لو، پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو، پھر مجھ کو ذرا مہلت دو

یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی اور وہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے

اور تم جن لوگوں کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کرسکتے اور نہ ہی اپنی مدد کرسکتے ہیں

(سورہ الاعراف آیات ۱۹۴ تا ۱۹۷)

قرآن حکیم میں خدائے بزرگ و برتر کے تصور کو خالص عرب اصطلاح میں قبائلی نظام کے ایک ایسے موثر سربراہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنے لوگوں کو مکمل تحفظ (اولیا) فراہم کرسکے اور ان کی مدد (نصر) کرسکے۔ اس کے برعکس قدیم دیویوں کی حیثیت خطرناک حد تک ایک ایسے کمزور قبائلی سرداری سی تھی جو اپنے قبیلے کے لوگوں کی حفاظت نہیں کرسکتا۔

خدا کی وحدانیت کا نظریہ مسلمانوں کی روحانی زندگی کی اساس بن گیا اور وہ خود اپنی زندگی اور معاشرے میں بھی اتحاد اور یک جہتی کو فروغ دینے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ منتشر ذاتی اجزا کو یک جا کرنے کی جدوجہد تھی جس کا مقصد اجزائے ترکیبی کو مجتمع کرکے اپنی ذات کو ایک ہی مرکز اور ایک ہی منزل کے لیے وقف کردینا تھا۔ چنانچہ اسلام کا پہلا رکن شہادت ہے جس میں ہر مسلمان کے ذاتی عزم اور نصب العین کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' آخر مسلمانوں کو نہ صرف لات، عزیٰ اور منات جیسے معبودوں کی عزت و تکریم کرنے کی، خواہ وہ انتہائی محدود صورت ہی میں کیوں نہ ہوں، ممانعت کردی گئی بلکہ اللہ سے توجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہٹانے والی تمام دوسری نمایاں چیزوں کا احترام کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ انسانوں کے وضع کردہ نظریات، امنگیں اور خواہشات اور جوش وولولہ کچھ دیر کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں لیکن ان سب کا انجام مایوسی ہے۔ نہ صرف مال ودولت، کامیابی یا مادی سامان تعیش اور دوسرے مرغوبات بلکہ ان لادین جذبوں اور ولولوں پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے جو بظاہر پرکشش دکھائی دیتے ہیں لیکن بہت سے انسانوں کو آرٹ اور مذہب کے شعبوں میں آگے کی طرف لے جانے والے داخلی اضطراب اور اندرونی بے چینی کو کم نہیں کرسکتے۔ خود ہمارے اپنے عہد میں کئی اصلاح پسند رہنماؤں نے نیشنلزم اور سوشلزم جیسے غیر ملکی نظریات کی طرف راغب ہونے والے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ یہ نظریات ان کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرسکتے۔ اس قسم کے بیرونی نظریات نہ صرف مہلک وفاسد اور ناتمام ہیں بلکہ ان سے نہ تو انفرادی اور نہ ہی سماجی یا سیاسی سطح پر کوئی تحفظ مل سکتا ہے اور نہ امداد، نہ ہی یہ اطمینان کا ذریعہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ شرک (مخلوق کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے) کا گناہ مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہے کہ وہ محض کسی انسانی نظریے کو، خواہ وہ کتنا ہی خوش نما کیوں نہ ہو، زیادہ اہمیت نہ دیں مبادا کہ وہ بت پرست بن جائیں۔

قریش کے ساتھ آخری مقاطعے کے بعد سورہ اخلاص نازل ہوگئی جسے مسلمان روزانہ مسجد میں نماز کے دوران پڑھتے ہیں۔ یہ سورت مسلمانوں کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی یاد دلاتی ہے اور انہیں اپنی زندگیوں کو باہم مربوط کرنے اور اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کرنے میں زبردست معاون ثابت ہوتی ہے۔

آپؐ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

لیکن بہت سے قریش ماضی کے ساتھ قطع تعلق کرنے اور قدیم مقدس روایات کو بھولنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کئی پیروکار مرتد ہوگئے اور قریش کے بعض انتہائی طاقتور افراد نے آپؐ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مہم شروع کردی۔ وہ آپؐ کو (نعوذباللہ......مترجم) ایک ملحد اور بے دین شخص تصور کرتے جو ان کے معاشرے کی بے حد مقدس اور قابل احترام اقدار کا دشمن تھا۔ چنانچہ قریش کے ایک وفد نے حضورؐ کے قبیلے کے سردار ابوطالب کے پاس جاکر ان سے درخواست کی کہ وہ آپؐ کی محافظت (اولیا) سے دست بردار ہوجائیں۔ عرب میں کسی سرپرست کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر چند کہ قبائلی نظام روبہ زوال تھا لیکن قبیلے یا خاندان کو اب بھی معاشرے کے بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی اور ایسے کسی گروپ سے باہر رہ کر زندگی واقعی ناممکن تھی۔ اس شخص کو، جس کا کوئی محافظ نہ ہو، سزا کے خطرے کے بغیر قتل کیا جاسکتا تھا۔ قریش کے وفد نے ابوطالب سے کہا: ''اے ابوطالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کو گالیاں دیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے دین میں عیب نکالے، ہم میں سے عقل مندوں کو بے وقوف بنایا اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ بتایا۔ اب یا تو اسے ان باتوں سے روک دیجیے یا ہمارے اور اس کے درمیان دخل نہ دیجیے کیونکہ آپ بھی ان کے خلاف اسی (دین) پر ہیں جس پر ہم ہیں۔ ہم آپ کی جانب سے بھی اس کا بندوبست کرلیں گے۔'' (اور وہ دوسروں کو معبود بناتے ہیں تا کہ وہ مدد کیے جائیں۔ سورہ یٰسین آیت ۷۴..... مترجم)۔ یہ صورت حال انتہائی نازک تھی۔

ابوطالب کو حضورؐ سے محبت تھی لیکن وہ دوسرے تمام قبیلوں کو دشمن بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور انہیں آنحضرتؐ کی طرف سے پرانے دین کی مذمت بھی گوارا نہیں تھی۔ لیکن اگر وہ اپنے بھتیجے (حضورؐ) کو قتل کرنے کے لیے قریش کے حوالے کر دیتے تو ایک سردار کی حیثیت سے اپنے قبیلے کے ایک فرد کی حفاظت کرنے کا فریضہ انجام دینے میں ناکام ہو جاتے۔ اس طرح بنی ہاشم کے وقار کو سخت ٹھیس پہنچتی جو شدید مالی مشکلات کے باعث پہلے سے زوال پذیر تھا۔ ابوطالب نے وقتی طور پر کوئی حامی نہ بھری۔ انہوں نے قریش کے وفد کو گول مول جواب دے کر ٹال دیا اور رسول اللہؐ ان کی سرپرستی میں دین کی تبلیغ کرتے رہے۔

لیکن کچھ دیر کے بعد قریش نے دوبارہ ابوطالب کے پاس جا کر یہ دھمکی دی: ''اے ابوطالب! ہم نے آپ سے استدعا کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو ہم سے روکے رکھیں لیکن آپ نے انہیں نہیں روکا۔ واللہ ہم اس حالت پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہمارے بزرگوں کو گالیاں دی جائیں اور عقل مندوں کو بے وقوف بنایا جائے اور ہمارے معبودوں میں عیب نکالے جائیں۔ یا تو ہم اسے اپنے متعلق ایسی باتیں کرنے سے روک دیں گے یا اس سے مقابلے کی ٹھہرائیں گے۔ پھر آپ اس میں دخل نہ دینا یہاں تک کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک برباد ہو جائے''۔ قریش نے محسوس کیا کہ وہ اس پورے طرز زندگی کے لیے جنگ کر رہے ہیں جس کی جڑیں ہر روز کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ سمجھوتے کا کوئی امکان نہیں اور یہ کہ اس جنگ میں صرف ایک فریق ہی جیت سکتا ہے۔

ابوطالب یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بلا بھیجا اور آپؐ سے التجا کی: ''مجھ پر رحم کر اور خود اپنی جان پر بھی رحم کر۔ مجھ پر ایسا بار نہ ڈال جسے میں برداشت نہ کر سکوں''۔ حضورؐ کے دل میں خیال گزرا کہ ابوطالب بھی آپؐ کی حمایت سے دست کش ہو رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؐ نے کہا کہ میں مرنے کو تیار ہوں۔ ''چچا جان! واللہ اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں اور شرط یہ ہو کہ میں اس معاملے کو چھوڑ دوں تو بھی میں اسے نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اسے غلبہ عطا کرے یا میں مر جاؤں''۔ اس کے بعد آپؐ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب آپؐ وہاں سے واپس ہو گئے تو ابوطالب نے آپؐ کو پکارا اور کہا: ''بھتیجے ادھر آؤ''۔ رسول اللہؐ ان کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: ''جاؤ اور جو چاہو کہو۔ اللہ کی قسم! میں کسی معاوضے پر بھی تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحات ۱۶۷۔ ۱۶۸: The Life of Muhammad P. 119)۔ نبی کریمؐ عارضی طور پر محفوظ ہو گئے۔ جب تک ابو طالب آپؐ کے محافظ تھے اور موثر طور پر آپؐ کی حمایت کر سکتے تھے، مکہ میں کوئی شخص آپؐ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

ابو طالب مکہ کے نہایت باصلاحیت شاعر تھے چنانچہ انہوں نے بنی ہاشم کے ان تمام اتحادی قبیلوں کی مذمت کے لیے ایک پرسوز قصیدہ لکھا جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے مخالف قوتوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ المطلب کے خاندان نے بنی ہاشم کے ساتھ یک جہتی کا اعلان کر دیا لیکن اس اچھی خبر کے ساتھ ہی ایک اہم شخصیت کے منحرف ہونے کی اطلاع بھی مل گئی۔ رسول اللہؐ کے متعلق ابولہب کا رویہ شروع ہی سے جارحانہ تھا البتہ اس نے اپنے بھتیجے کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لیے اپنے دو بیٹوں کی منگنی آنحضرتؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ سے کر دی تھی۔ لیکن جب حضورؐ نے بنات اللہ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا تو ابولہب نے اپنی بیوی کے قبیلے عبد شمس کے ساتھ قریبی اتحاد قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹوں کو مجبور کیا کہ وہ رسول کریمؐ کی صاحبزادیوں سے منگنی توڑ دیں۔ اسلام قبول کرنے والے نوجوان نفیس الطبع اور خوش وضع عثمانؓ بن عفان حضرت رقیہؓ کے بے حد مداح تھے جو حضورؐ کی صاحبزادیوں میں سب سے خوبصورت تھیں۔ چنانچہ عثمانؓ نے ان کا رشتہ مانگ لیا۔

ابولہب نے اب رسول اللہؐ کے تمام بڑے بڑے دشمنوں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ ان میں سب سے بڑا دشمن مخزوم قبیلے کے معمر سردار ولید کا بھتیجا ابوالحکم تھا۔ وہ حضورؐ کے مخالفوں کا لیڈر بن گیا۔ مسلمانوں نے اس کا نام ''ابوجہل'' (جہالت کا باپ) رکھ دیا۔ ابوجہل ذاتی طور پر جاہ طلب اور آنحضرتؐ کی سیاسی صلاحیتوں سے حسد کرتا تھا۔ اسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام سے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ ابوجہل کے ساتھ جو دوسرے اہم سردار تھے، ان میں عبد شمس کا سردار ابوسفیان بھی شامل تھا جو بے حد ذہین اور ایک زمانے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذاتی دوست تھا۔ اس کا سسر عتبہ ابن ربیعہ اور اس کا بھائی شیبہ بھی حضورؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح جمح قبیلے کا لحیم شحیم بوڑھا سردار امیہ ابن خلف بھی آپؐ کے مخالفین میں شامل تھا۔ آخر بنی عامر کا سربراہ سہیل ابن عمرو بھی، جو سخت بت پرست اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح روحانی اعتکاف کا عادی تھا، ان لوگوں کے ساتھ مل گیا۔ لیکن سہیل ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اس نے نبی کریمؐ کے پیغام میں بعض مذہبی معاملات کو تسلیم کر لیا تھا۔ ان سرداروں کو نئی نسل کے کئی نوجوانوں کی حمایت بھی حاصل تھی جن میں بہادر جنگجو اور عسکری حکمت کار خالد ابن ولید اور صفوان ابن امیہ شامل تھے۔ لیکن ان میں سب سے پرجوش عمر ابن الخطاب تھے جن کی عمر حضورؐ کے ساتھ مقاطعے کے وقت چھبیس برس تھی۔ عمر انتہائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اوران کی چھاتی پر بھاری پتھر رکھ کر انہیں دھوپ کی تمازت میں چھوڑ دیتا۔ بلالؓ کسی خوف وخطر کی پروا کیے بغیر خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہتے: ''احد! احد!''۔ ان کی غیر معمولی طاقتور آواز پورے علاقے میں گونج اٹھتی۔ ابوبکرؓ جو قریب ہی رہتے تھے، بلالؓ کے مصائب کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے بلالؓ کو امیہ سے خرید کر آزادی دلا دی۔ ابوبکرؓ نے سات دوسرے غلاموں کو بھی آزاد کرا دیا۔ لیکن اعلیٰ خاندانوں کے کئی مسلمانوں کو اپنے ہی گھرانوں کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ نوجوان خالد ابن سعید کو، جو آگ کے گڑھے کو خواب میں دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے، ان کا والد ایک کمرے میں بند کر کے بھوکا پیاسا رکھتا۔ مخزوم قبیلے نے آزاد کیے جانے والے غلام عمار بن یاسر کے خاندان کے ساتھ اس قدر برا سلوک کیا کہ ان کی والدہ آخر دم توڑ گئیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان مسلمانوں کے لیے، جنہیں شدید مصائب کا سامنا تھا، محفوظ جگہ تلاش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور حبشہ کے عیسائی حکمران نجاشی سے کہا کہ وہ ان مسلمانوں کو پناہ دے۔ اگرچہ ہاتھیوں کے سال سے قریش مکہ سے اس کی دشمنی تھی، اس کے باوجود وہ رضامند ہو گیا اور ۶۱۶ عیسوی میں ۸۳ مسلمان اپنے خاندانوں کو لے کر حبشہ چلے گئے۔ ان مہاجرین کی قیادت عثمانؓ ابن مظعون کر رہے تھے جو توحید پرست اور ایمان لانے سے پہلے ایک عابد وزاہد شخص تھے۔ رسول اللہؐ کے خاندان کے بعض افراد بھی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جن میں ابوطالب کے بیٹے جعفرؓ، حضورؐ کی صاحبزادی رقیہؓ اور ان کے شوہر عثمانؓ بن عفان شامل تھے۔ جدید مغربی اسکالروں کا کہنا ہے کہ بعض مسلمانوں کی طرف سے حبشہ میں پناہ لینے کے پیچھے کئی اور عوامل کارفرما تھے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان مسلمانوں کے لیے، جنہیں ابوجہل کی تجارتی پابندیوں کے باعث شدید مشکلات کا سامنا تھا، جنوب کی سمت میں ایک آزاد تجارتی راستہ بحال کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بعض اختلافات پائے جاتے تھے جس کی وجہ سے کئی مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ عثمانؓ ابن مظعون اور عبیداللہ ابن جحش جیسے کئی مسلمانوں نے خود توحید پرستی کا راستہ اختیار کیا تھا اور وہ ابوبکرؓ اور حضورؐ کے دوسرے نو وارد رشتے داروں کے اثر و رسوخ سے حسد کرتے تھے۔ لیکن اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف موجود تھا تو یہ سنجیدہ نوعیت کا نہیں تھا۔ عبیداللہ نے حبشہ ہی میں عیسائیت اختیار کر لی لیکن عثمانؓ حالات کے سازگار ہوتے ہی مکہ لوٹ آئے اور رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے بدستور وفادار رہے۔

یہ مسلمان جیسے ہی حبشہ پہنچے، قریش نے انہیں مکہ واپس لانے کے لیے اپنے دو وفد نجاشی کے پاس بھیج دیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی اجتماعی صورت میں ہجرت قریش کے لیے خطرہ تھی۔ وفد کے ارکان نے نجاشی کو بتایا کہ ان مسلمانوں نے مکہ کے لوگوں کے دین کی توہین کر کے معاشرے کو درہم برہم کر دیا ہے اس لیے یہ بہت

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

اوران کی چھاتی پر بھاری پتھر رکھ کرانہیں دھوپ کی تمازت میں چھوڑ دیتا۔ بلالؓ کسی خوف وخطر کی پروا کیے بغیر خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہتے: ''احد! احد!''۔ ان کی غیر معمولی طاقتور آواز پورے علاقے میں گونج اٹھتی۔ ابوبکرؓ جو قریب ہی رہتے تھے، بلالؓ کے مصائب کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے بلالؓ کو امیہ سے خرید کر آزادی دلا دی۔ ابوبکرؓ نے سات دوسرے غلاموں کو بھی آزاد کرا دیا۔ لیکن اعلیٰ خاندانوں کے کئی مسلمانوں کو اپنے ہی گھرانوں کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ نوجوان خالد ابن سعید کو، جو آگ کے گڑھے کو خواب میں دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے، ان کا والد ایک کمرے میں بند کر کے بھوکا پیاسا رکھتا۔ مخزوم قبیلے نے آزاد کیے جانے والے غلام عمار بن یاسر کے خاندان کے ساتھ اس قدر برا سلوک کیا کہ ان کی والدہ آخر دم توڑ گئیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان مسلمانوں کے لیے، جنہیں شدید مصائب کا سامنا تھا، محفوظ جگہ تلاش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور حبشہ کے عیسائی حکمران نجاشی سے کہا کہ وہ ان مسلمانوں کو پناہ دے۔ اگرچہ ہاتھیوں کے سال سے قریش مکہ سے اس کی دشمنی تھی، اس کے باوجود وہ رضامند ہو گیا اور ۶۱۶ عیسوی میں ۸۳ مسلمان اپنے خاندانوں کو لے کر حبشہ چلے گئے۔ ان مہاجرین کی قیادت عثمانؓ ابن مظعون کر رہے تھے جو توحید پرست اور ایمان لانے سے پہلے ایک عابد وزاہد شخص تھے۔ رسول اللہؐ کے خاندان کے بعض افراد بھی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جن میں ابوطالب کے بیٹے جعفرؓ، حضورؐ کی صاحبزادی رقیہؓ اور ان کے شوہر عثمانؓ بن عفان شامل تھے۔ جدید مغربی اسکالروں کا کہنا ہے کہ بعض مسلمانوں کی طرف سے حبشہ میں پناہ لینے کے پیچھے کئی اور عوامل کارفرما تھے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان مسلمانوں کے لیے، جنہیں ابوجہل کی تجارتی پابندیوں کے باعث شدید مشکلات کا سامنا تھا، جنوب کی سمت میں ایک آزاد تجارتی راستہ بحال کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بعض اختلافات پائے جاتے تھے جس کی وجہ سے کئی مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ عثمانؓ ابن مظعون اور عبیداللہ ابن جحش جیسے کئی مسلمانوں نے خود توحید پرستی کا راستہ اختیار کیا تھا اور وہ ابوبکرؓ اور حضورؐ کے دوسرے نو وارد رشتے داروں کے اثر و رسوخ سے حسد کرتے تھے۔ لیکن اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف موجود تھا تو یہ سنجیدہ نوعیت کا نہیں تھا۔ عبیداللہ نے حبشہ ہی میں عیسائیت اختیار کر لی لیکن عثمانؓ حالات کے سازگار ہوتے ہی مکہ لوٹ آئے اور رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے بدستور وفادار رہے۔

یہ مسلمان جیسے ہی حبشہ پہنچے، قریش نے انہیں مکہ واپس لانے کے لیے اپنے دو وفد نجاشی کے پاس بھیج دیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی اجتماعی صورت میں ہجرت قریش کے لیے خطرہ تھی۔ وفد کے ارکان نے نجاشی کو بتایا کہ ان مسلمانوں نے مکہ کے لوگوں کے دین کی توہین کر کے معاشرے کو درہم برہم کر دیا ہے اس لیے یہ بہت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خطرناک لوگ ہیں اوران پر بھروسانہیں کرنا چاہیے۔نجاشی نے مسلمان مہاجرین کودربار میں بلاکران سے کہا کہ وہ اپنا موقف پیش کریں۔اس پر جعفرؓ نے واضح کیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے خدا کے پیغمبر ہیں جنہوں نے عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی وحی کی تصدیق کی ہے۔انہوں نے اپنے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اوراس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریمؑ کی جانب ڈال دیا۔انہوں نے اس سلسلے میں قرآن کریم کی سورہ مریم کی یہ آیات پڑھیں:

اس کتاب میں مریم کا واقعہ بھی بیان کیجئے جب کہ وہ اپنے گھر کےلوگوں سے علیحدہ ہوکرمشرقی جانب آئیں اوران لوگوں سے پردہ کرلیا۔پھرہم نے اس کے پاس اپنی روح (جبرائیل علیہ السلام) کوبھیجا پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کرظاہر ہوا

یہ کہنے لگیں، میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگرتو کچھ بھی اللہ سے ڈرنے والا ہے

اس نے جواب دیا کہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں، تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے آیا ہوں

کہنے لگیں بھلا میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ مجھے توکسی انسان کا ہاتھ تک نہیں لگا اور نہ میں بدکار ہوں

اس نے کہا بات تو یہی ہے لیکن تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ مجھ پر بہت ہی آسان ہے۔ہم تو اسے لوگوں کے لیے نشانی بنادیں گے اوراپنی خاص رحمت، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے

پس وہ حمل سے ہوگئیں اوراس وجہ سے یکسو ہوکرایک دور کی جگہ چلی گئیں (سورہ مریم آیات ۱۶ تا ۲۲)

جعفرؓ نے جب ان آیات کی تلاوت ختم کی توقرآن اپنا کام کرچکا تھا۔نجاشی اس قدر دھاڑیں مارکررونے لگا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔جب اس کے علما نے یہ کلام سنا تو وہ بھی اتنا روئے کہ ان کے صحیفے بھیگ گئے۔

قریش کے وفد نے نجاشی سے یہ کہہ کرفتنہ کھڑا کرنے کی کوشش کی کہ قرآن حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کوتسلیم نہیں کرتا۔اس کے باوجود نجاشی نے مسلمانوں کوحبشہ سے نکالنے اور واپس مکہ بھیجنے سے انکار کردیا۔حبشہ کے عیسائی نجاشی کی طرف سے مسلمانوں کی حمایت کرنے پر پریشان ہوگئے جو بظاہر مسیحی عقائد کے خلاف تھے۔ چنانچہ نجاشی کواپنے طرزعمل کے جواز میں عیسائیوں کے ساتھ ایک مبہم سمجھوتا کرنا پڑا تاہم مسلمانوں کوحبشہ میں قیام کے دوران دین اسلام کی تعلیمات پر آزادانہ عمل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، حبشہ کا قصہ نا تمام ہے، ممکن ہے کہ رسول اللہؐ کے پاس کوئی اقتصادی یا سیاسی منصوبہ موجود ہو لیکن جب محمد ابن اسحاق نے سیرت لکھنا شروع کی تو اس وقت یہ باتیں ذہنوں سے محو ہوچکی تھیں۔ممکن ہے کہ مکہ کے سفیروں نے نجاشی کہ یہ بتایا ہو کہ مسلمان اتنا طاقتور گروپ نہیں جس قدر وہ سمجھتا ہے، اس لیے ان کی حمایت کا کوئی فائدہ نہیں۔

اب ہم واپس مکے جاتے ہیں جہاں ابوجہل اوراس کے ساتھی رسول کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو بدستور ہراساں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے نئے حیلے بہانے تراش لیے تھے۔ اللہ نے الولید جیسے اہم شخص کی موجودگی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ رسول اللہؐ معجزے کیوں نہیں دکھاتے؟ جس طرح اللہ نے کوہ طور پر موسیٰ پر وحی نازل کی تھی، اس طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ٹکڑوں کے بجائے ایک ہی مرتبہ قرآن کیوں نازل نہیں ہوا؟ خدا نے کسی عام انسان کے بجائے کسی فرشتے کو اپنا پیامبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا؟ بعض قریش کا خیال تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اللہ کی طرف سے براہ راست وحی نازل نہیں ہوتی بلکہ کوئی یہودی یا عیسائی آپؐ کو تعلیم دیتا ہے۔ لیکن قریش حضورؐ کی شکایت کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب کمزور ترین مسلمانوں نے حبشہ میں پناہ لے لی تو قریش کے پاس باقی مسلمانوں پر عقوبت کے طور پر تجارتی پابندیاں لگانے یا انہیں برا بھلا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ خود رسول اللہؐ کے ساتھ بدسلوکی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ عمرو ابن العاص نے، جو قریش کی جانب سے نجاشی کو بھیجے جانے والے وفد میں شامل تھا اور جس نے ایک طویل عرصے تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، کعبے میں حضورؐ کو جھٹلایا اور تہمتیں لگائیں۔ ایک مرتبہ آپؐ جس وقت کعبۃ اللہ کا طواف کر رہے تھے تو قریش کے لیڈر کعبے کے قریب بیٹھ کر آپؐ کی شکایتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا: ''ہم نے تو اس شخص کے متعلق اتنا صبر کیا کہ کسی دوسرے معاملے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے ہمارے عقل مندوں کو احمق بنایا، ہمارے بزرگوں کو گالیاں دیں، ہمارے دین میں عیب نکالے، ہماری جماعت کو منتشر کر دیا اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ ہم نے اس کی بڑی بڑی باتوں پر صبر کیا''۔ ان لوگوں نے یہی الفاظ یا اسی طرح کے الفاظ کہے۔ وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ کا یک تیسری مرتبہ طواف کرنے ان کے پاس سے گزرے۔ قریش کے سرداروں نے کچھ باتیں طعن کے طور پر کہیں جس کا اثر نبی کریمؐ کے چہرہ مبارک پر نظر آنے لگا۔ آپؐ ٹھہر گئے اور فرمایا: ''اے گروہ قریش! کیا تم سن رہے ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہارے پاس ایک پاک چیز لایا ہوں''۔ آپؐ کے ان الفاظ نے ان لوگوں کو گرفت میں لے لیا اور ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ لیکن اگلے روز تک ان لوگوں کی ہمت بحال ہو چکی تھی چنانچہ رسول اللہؐ جب خانہ کعبہ پہنچے تو انہوں نے حضورؐ کو گھیرے میں لے کر آپؐ پر حملہ کر دیا اور آپؐ کی چادر کو دونوں پلو ملنے کی جگہ سے پکڑ لیا۔ پھر ابو بکرؓ آپؐ کی مدافعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ روتے اور یہ کہتے جاتے تھے: ''اے لوگو! کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے''۔ پھر وہ سب لوٹ گئے۔ راوی کہتا ہے: ''یہ بدترین سلوک تھا جو اس نے قریش کی جانب سے رسول اللہؐ کے ساتھ دیکھا''۔ یہ ایک مایوس کن اور حوصلہ شکن صورت حال تھی لیکن اس میں بظاہر پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ قریش اب شرمسار تھے اور تشدد بھی کم ہو گیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعہ یہ ہے کہ قریش کے اس قسم کے رویے کے منفی نتائج برآمد ہو رہے تھے جس کی وجہ سے کئی لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مثال کے طور پر ایک دن ابوجہل نے حضورؐ کے ساتھ بدزبانی کی تاہم آنحضرتؐ نے اس سے کچھ نہ کہا اور اپنے گھر واپس آ گئے۔ لیکن اسی روز بعد میں شہ زور حمزہؓ شکار کھیل کر گھر جانے سے پہلے طواف کرنے کے لیے اس حال میں خانہ کعبہ پہنچے کہ تیر کمان ان کے شانوں سے لٹک رہی تھی۔ محمد ابن اسحاق کہتا ہے: ''وہ قریش میں اعزاز رکھنے والے جواں مرد اور سخت طبیعت تھے۔ وہ جب کبھی شکار سے واپس آتے تو گھر والوں کے پاس جانے سے پہلے کعبۃ اللہ کا طواف کرتے۔ طواف کرنے کے بعد وہ قریش کی مجلسوں میں ٹھہرتے اور ان سے بات چیت کیے بغیر نہ جاتے''۔ اس روز جب رسول اللہؐ گھر واپس جا چکے تھے تو ایک لونڈی نے انہیں بتایا: ''اے ابو عمارہ! کاش آپ اس آفت کو دیکھتے جو آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کی جانب سے آئی۔ اس نے انہیں یہاں بیٹھا ہوا پایا تو ایذا پہنچائی اور گالیاں دیں، جو باتیں ناپسند تھیں ان کی انتہا کر دی اور چلتا بنا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے بات بھی نہ کی''۔ حمزہؓ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن جب انہوں نے یہ سنا تو غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ ابوجہل لوگوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ تیزی سے ابوجہل کی طرف بڑھے اور اس زور سے کمان اس کے سر پر ماری کہ اس کا سر زخمی ہو گیا۔ انہوں نے کہا: ''کیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دیتا ہے؟ لے میں بھی انہیں کے دین پر ہوں۔ میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو وہی برتاؤ مجھ سے بھی کر''۔ پس بنی مخزوم کے لوگ حمزہؓ کی جانب اٹھ کھڑے ہوئے کہ ابوجہل کی امداد کریں۔ لیکن ابوجہل نے کہا: ''ابو عمارہ کو جانے دو کیونکہ واللہ میں نے بھی ان کے بھتیجے کو بری بری گالیاں دی ہیں۔'' (محمد بن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۸۵: The Life of Muhammad P. 131)۔ حمزہؓ کے قبول اسلام سے قریش پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ رسول اللہؐ کو تنہا چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

لیکن زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن حکیم تھا۔ ۶۱۶ عیسوی میں حج کے دوران پورے عرب سے زائرین مکہ پہنچے تو ابوجہل نے اپنے ساتھیوں کو شہر کے تمام دروازوں پر تعینات کر دیا جو زائرین کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف خبردار کرتے۔ ایک زائر طفیل ابن عمرو، جو شاعر تھا اور جس کا تعلق دوس کے مغربی قبیلے سے تھا، قریش سے سنی سنائی باتوں سے اس قدر خائف ہو گیا کہ اس نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ نبی کریمؐ کی سحر انگیز گفتگو نہ سن سکے، اپنے کانوں میں روئی ٹھونس دی۔ لیکن جب وہ کعبہ میں پہنچا اور اس نے رسول اللہؐ کو کعبے کے سامنے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے اچانک محسوس کر لیا کہ اس کی یہ حرکت نہایت مضحکہ خیز ہے: ''میری ماں مجھ پر روئے! واللہ میں عقل مند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں اور شاعر ہوں۔ اچھا برا مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر کون سی چیز مجھے اس سے روکتی ہے کہ یہ شخص جو کچھ کہتا ہے اسے سنوں؟ جو بات وہ پیش کرتا ہے، اگر اچھی ہو تو اسے قبول کروں اور بری ہو تو اسے چھوڑ دوں۔'' چنانچہ طفیل دوسی حضورؐ کے پیچھے پیچھے آپؐ کے گھر میں پہنچ گیا۔ آپؐ نے اس کے سامنے دین اسلام کی وضاحت کی اور قرآن کریم کی تلاوت کی۔ یہ سن کر طفیل نے چلا کر کہا: ''واللہ! اس سے بہتر بات میں نے کبھی نہیں سنی''۔ (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۴۲)۔ غرض وہ اسلام قبول کر کے اپنے قبیلے میں واپس چلا گیا اور اگلے چند برسوں میں اس نے اپنے قبیلے کے کوئی ستر خاندانوں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا۔

قرآن حکیم کا حسن اور رعنائی لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتر گئی۔ طفیل نے کانوں سے روئی نکال کر خوف اور اندیشوں کی خلیج کو رضا کارانہ طور پر پاٹ دیا تھا لیکن دوسرے لوگ قرآن سے لاتعلق رہے اور انہوں نے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش نہ کی۔ ایک دن قریش نے ایک نیا حربہ استعمال کرنا چاہا اور عبدشمس قبیلے کے عتبہ ابن ربیعہ کو مصالحت کے لیے رسول اللہؐ کے پاس بھیجا۔ اگر آپؐ خاموشی اختیار کرنے کا وعدہ کریں تو وہ آپؐ کو مال و دولت، حکومت بلکہ اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔ قریش کی مایوسی کی یہ انتہا تھی۔ قریش کے نزدیک دولت کو مقدس درجہ حاصل تھا اور اپنی حاکمیت اور بادشاہت جیسے ادارے کو حضورؐ کے سپرد کرنا بھی ان کی شکست تھی۔ آنحضرتؐ عتبہ کی باتیں سنتے رہے اور جب وہ گفتگو ختم کر چکا تو آپؐ نے کہا: ''اے ابوالولید! تجھے جو کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب مجھ سے سن لو''۔ عتبہ بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ کمر پر رکھ دیے۔ آپؐ نے سورہ حٰم السجدہ کی تلاوت شروع کر دی جس کے مطابق بعض قریش کی طرف سے خدا کے پیغام کو دلوں میں داخل ہونے سے روکنے کی غرض سے ایک پردہ ڈال دیا گیا تھا:

اور انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے، ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے

اور ہم میں اور تجھ میں ایک حجاب ہے

قرآن کریم میں اس حجاب کا اکثر تذکرہ ہوا ہے جو اس کے پیغام کے خلاف دلوں کو سخت کرنے والی ایک ناگزیر قوت کا واضح ثبوت ہے۔ عتبہ اس حجاب کو دل سے ہٹانے کے لیے ابھی تک تیار نہیں تھا چنانچہ قرآنی آیات کی تلاوت کے بعد رسول اللہؐ جب سجدے میں گر پڑے تو وہ آپؐ کے ساتھ سجدہ ریز نہ ہوا۔ لیکن جب عتبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلا گیا تو بعض نے کہا: ''ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں، ابوالولید کا تمہارے پاس آنا اس طرح نہیں، جس طرح کا جانا تھا''۔ جب وہ ان کے پاس جا کر بیٹھا تو انہوں نے کہا: ''اے ابوالولید! وہاں کی کیا خبر ہے؟'' عتبہ نے کہا: ''وہاں کی خبر یہ ہے کہ میں نے ایسی بات سنی ہے کہ واللہ کبھی نہیں سنی۔ وہ نہ شعر ہے، نہ جادو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ کہانت''۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مخالفین نے آپؐ پر یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ آپؐ پر نازل ہونے والی وحی جعلی یا بناوٹی ہے۔ ان کی نظروں میں قرآن ایک عجیب چیز تھی جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ آخر میں عتبہ نے قریش کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''اس شخص کو اس کی حالت پر چھوڑ دو اور اس سے الگ رہو۔ خدا کی قسم! اس کی جو بات میں نے سنی ہے، ایک دن وہ پوری دنیا میں آگ لگا دے گی''۔

(محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحات ۱۸۶، ۱۸۷: The Life of Muhammad PP. 132-3)۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریمؐ نے مکمل طور پر ایک ایسی نئی ادبی صنف دریافت کر لی تھی جس کے لیے بعض لوگ تیار تھے لیکن کئی دوسرے لوگوں کو اس سے صدمہ پہنچا اور وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ اس قدر نئی، طاقتور اور اثر انگیز صنف تھی کہ خود اس کا وجود ہی معجزہ تھا اور انسانی فہم وادراک اس کا احاطہ کرنے سے عاجز تھا۔ قرآن کریم میں رسول اللہؐ کے دشمنوں کو بار بار چیلنج کیا گیا ہے کہ وہ اس جیسا کلام پیش کریں۔ قرآن حکیم، جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بے مثل ہے، خود الہامی کلام ہونے کا ثبوت تھا اور اس کی آیات ''نشانیاں'' اور خدائے واحد کے ساتھ رابطے کا ذریعہ ہیں۔ (اچھا اگر یہ سچ ہے تو بھلا اس جیسی ایک (ہی) بات یہ (بھی) تو لے آئیں۔ (سورہ الطور آیت ۳۴.....مترجم)۔ ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے، اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو۔ (سورہ البقرہ آیت ۲۳.....مترجم)۔ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ آپؐ نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت لاؤ اور جن جن غیر اللہ کو بلا سکو، بلا لو اگر تم سچے ہو۔ (سورہ یونس آیت ۳۸.....مترجم)۔ مسلمان اب بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے یا اپنی مساجد کی دیواروں پر لکھی گئی قرآنی آیات کے سامنے بیٹھتے وقت ایک پراسرار ذات کی موجودگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جس طرح عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں، ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم مسلمانوں کی روحانی زندگی کا مرکز اور محور ہے۔ بعض مسلمانوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ سینٹ پال کی انجیل کے دیباچے میں درج کلمات کی مانند قرآن کی آیات بھی معمول کی انسانی گفتار کے ''غیر تخلیقی الفاظ'' پر مشتمل ہیں چنانچہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم صرف مخصوص معلومات کا ذریعہ نہیں، تورات کے اشاروں کنایوں، عیسیٰؑ کی ذات یا رحمتِ خداوندی کو متوجہ کرنے کی طرح، جسے ہمارے درمیان موجود دوسرے مذاہب پر کاربند لوگ ''خدا کی نشانیاں'' سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ایک ''نشانی'' ہے۔

کوئی کتاب پڑھنے، فن کے کسی نادر نمونے کو دیکھنے یا موسیقی سننے سے ''حقیقی موجودگی'' یا عقل وحواس سے پرے ذاتِ حقیقی کے مشاہدے کا جو تصور اجاگر ہوتا ہے، اس نے حال ہی میں جارج اسٹینر George Steiner اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیٹر فلر Peter Fuller جیسے مغربی نقادوں کے لیے مہمیز کا کام دیا ہے۔ محمد ابن اسحاق اور دوسرے ابتدائی سیرت نگار جس وقت یہ بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے جب قرآن حکیم کو پوری توجہ سے سنا تو ''اسلام اس کے دل میں داخل ہو گیا'' جس سے اس کا تعصب یا خوف دور ہو گیا تو اس سے ان کی مراد وہ جمالیاتی مشاہدہ ہے جس کا ذکر اسٹینر نے اپنی کتاب Real Presences : Is there any thing in what we say? میں کیا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ قرآن مجید میں کوئی حسن دیکھ نہیں پاتے، انہیں اسٹینر کے بقول غالباً خود ان میں اپنی روایات، سنجیدہ آرٹ، لٹریچر اور موسیقی میں وہ حسن نظر نہیں آتا جو ہمیں اپنی ذات کا ادراک حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اسٹینر کا استدلال یہ ہے کہ اس قسم کا آرٹ اصل میں ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ہم ''اپنی زندگیوں کو بدل دیں''۔ یہ اس کثیر الجہات ہستی مطلق سے اچانک ملاقات ہے جو ''ہماری تنبیہہ آموز ذات کے چھوٹے سے گھر'' کو منہدم کر دیتی ہے۔ اگر ہم ایک مرتبہ ایسے آرٹ کی دلفریبی سے مسحور ہو جائیں تو یہ گھر اس طرح رہائش کے قابل نہیں رہتا جس طرح وہ پہلے تھا: George Steiner: Real Presences: Is there anything in what we say? (PP. 142-143)۔ اسٹینر خدا کو نہیں مانتا اور اس کا خیال ہے کہ شکوک و شبہات کی اس دنیا میں انسان کو صرف آرٹ ہی کے ذریعے ماورائے ادراک ہستی سے آگہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسٹینر کے نظریے اور ان مسلمانوں کے مشاہدے کے درمیان اہم اختلافات موجود ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی خوبصورتی نے ان کی زندگیوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ جن لوگوں نے شروع شروع میں اسلام کی اس مقدس کتاب کو پڑھا، ان کی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ مدرکہ بھی مختل ہو گئی تھی، وہ خواب غفلت سے بیدار ہو گئے اور انہیں فکر و استغنا کی وہ جھلک دکھائی دی جس کی بدولت انہوں نے خوف اور اندیشوں کی تمام رکاوٹوں کو پھلانگ لیا۔ اسٹینر کی کتاب شائع ہوئی تو اسے خاصی پذیرائی ملی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے قارئین کے تجربے کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسٹینر کے نظریے سے ہمیں یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ عربی لٹریچر کی کلاسیکی کتاب قرآن کا بھی اس کے پڑھنے والوں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر اور پیغمبر کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے قرآن کریم بنی نوع انسان کے لیے ایک نشانی کے طور پر مذہبی اور روحانی رشتے اور فنی مشاہدے کا بے مثال نمونہ ہیں۔

اس غلبے یا تشہیر کے بغیر، جیسا کہ اسٹینر کہتا ہے، صحابہ کرامؓ ماضی کے ساتھ گہرے تعلق کو توڑنے، قدیم مقدس روایات کی خلاف ورزی کرنے اور ورثے میں ملنے والے تعصب پر قابو پانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن مجید کی دل کشی اور خوبصورتی نے ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر اپنی موسیقیت کے ذریعے دلوں کے تار ہلا دیے اور ان پر ''خدا کی نشانیوں'' کو ظاہر کر دیا تھا۔ اس سے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوران کے دل ایک نئی حقیقت سے آشنا ہو گئے۔ آج مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کے معجزے میں اب بھی وہ تاثیر موجود ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان عربی نہیں، وہ بھی اس سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ایران کے ممتاز اسکالر سید حسین نصر نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ قرآن حکیم اس وقت بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو بدل دیں۔ پورے قرآن، خاص طور پر ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہونے والی بے ربط آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زبان آسمانی کلام کے بوجھ تلے دب کر چکنا چور ہو گئی ہے۔ اس سے فرد میں بے ربطگی کا بھی پتا چلتا ہے۔ قرآن کریم کے داخلی اور علامتی مطلب کو دریافت کرنے کے لیے ہر مسلمان مرد اور عورت کو اپنی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ قرآن کی تلاوت یا اسے سننا معلومات یا واضح ہدایات حاصل کرنے کا دماغی تجربہ نہیں بلکہ روحانی نظم وضبط پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ تاویل (علامتی تشریح) کا عمل اس داخلی مطلب کی تلاش ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ تاویل کا لغوی مطلب کسی چیز کو اس کے آغاز یا اصل کی طرف واپس لے جانا ہے اور قرآن کریم بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمان جب اس کی مقدس آیات کی تلاوت کریں تو انہیں اپنے ظاہری وجود سے باطن کی طرف رجوع کر کے اس کے مبدا اور بنیاد کو دریافت کرنے کی جستجو کرنی چاہیے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ اس ضمن میں مغرب میں رہنے والے کسی بھی شخص کا تجربہ مکمل طور پر مختلف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمے میں عربی زبان کا قدرتی حسن اور دل کشی برقرار نہیں رہتی اور نہ ہی ہم میں سے بیشتر لوگ آسانی سے عربی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ عربی کے معیاری اشارت کے بغیر محض دماغی اعتبار سے اس کا مطالعہ کرنے سے قاری پر وہ کیفیت طاری نہیں ہو سکتی جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں، نہ ہی اس سے روحانی بالیدگی کا کوئی سامان میسر ہوتا ہے، خاص طور پر اس حالت میں کہ قرآن کو پڑھنے والے کا رویہ جارحانہ ہو یا وہ تفوق اور برتری کے احساس سے اس کا مطالعہ کرے۔ اس کی واضح مثال گبن Gibbon ہے۔ یہ کوئی اثر انگیز اور تخلیقی جذبہ نہیں، نہ ہی اس سے جمالیاتی مشاہدے میں کوئی مدد ملتی ہے۔

۶۱۶ عیسوی کے آخر میں قرآن کریم نے انتہائی حیرت انگیز معجزہ دکھا کر ایک نامور شخص کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا۔ عمر ابن خطاب رسول اللہؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر کے مکہ کی گلیوں میں سے نکل پڑا، اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ جبل صفا کے نیچے اس گھر کی جانب جا رہا تھا جہاں اسے معلوم تھا کہ نبی کریمؐ سہ پہر کے وقت آرام کر رہے تھے۔ اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کی بہن فاطمہؓ اور اس کا شوہر سعیدؓ (دین حنیف کے پیرو زید کا بیٹا) مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ عمر آج ان کے گھر نہیں آئے گا اور وہ اس سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک مسلمان لوہار خبابؓ بن الارت کو دعوت دے دی کہ وہ ان کے گھر آ کر انہیں قرآن کی تازہ سورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھ کر سنائیں۔ لیکن عمر کوہ صفا پر جانے کے لیے ابھی راستے میں ہی تھے کہ خفیہ طور پر مسلمان ہونے والے اپنے ہی قبیلے کے ایک شخص سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے عمر کی توجہ ہٹانے کے لیے ان سے کہا کہ وہ واپس جا کر دیکھیں کہ خود ان کے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ عمر دوڑتے ہوئے واپس گئے اور جب گلی کے کونے سے مڑے تو انہیں اپنی کھڑکی سے قرآن مجید کے الفاظ سنائی دیے۔ ''یہ کس کے گنگنانے کی آواز تھی جو میں نے سنی؟'' عمر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔ ان کی بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا: ''نہیں، تم نے کچھ نہیں سنا۔'' عمر نے کہا: ''کیوں نہیں، واللہ! میں نے سنا ہے اور مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ تم دونوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے''۔ جب عمر مارنے کے لیے فاطمہؓ اور سعیدؓ کی طرف لپکے تو خبابؓ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ عمر کی بہن اٹھیں کہ انہیں اپنے شوہر سے روکیں۔ عمر نے فاطمہؓ کو زمین پر پٹخ دیا اور انہیں ایسا مارا کہ ان کا سر زخمی ہوگیا۔ عمر نے اپنی بہن کا خون دیکھا تو اپنے کیے پر پچھتائے، ان کا چہرہ متغیر ہوگیا اور وہ مارنے سے رک گئے۔ عمر نے قرآن کی سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا جو خبابؓ سے تیزی میں گر گئی تھیں۔ عمر قریش کے ان چند لوگوں میں شامل تھے جو روانی سے لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ''یہ کلام کس قدر اچھا اور کتنا عظمت والا ہے!''۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ قرآن کریم کے حسن نے عمر کی اسلام سے شدید نفرت اور تعصب کو اس داخلی اثر پذیری میں تبدیل کر دیا جس سے وہ اب تک روشناس نہیں تھے۔ عمر نے اپنی تلوار کو تیزی سے دوبارہ اچک لیا اور مکہ کی گلیوں میں دوڑتے ہوئے جبل صفا کے اس مکان پر پہنچ گئے جہاں رسول اللہؐ قیام فرما رہے تھے۔ حضورؐ نے یہ سوچ کر کہ حملہ کرنا ہی دفاع کا بہترین طریقہ ہے، عمر کو ان کے چوغے سے پکڑ لیا اور انہیں خوب بھینچ کر فرمایا: ''اے خطاب کے بیٹے! تجھے کون سی چیز یہاں لے آئی ہے؟'' عمر نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! میں آپؐ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس چیز پر ایمان لاؤں جو اللہ کی طرف سے آپؐ لائے ہیں''۔ (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۵۶–۱۵۷ The Life of Muhammad P. 157:۲۲)۔

پھر رسول اللہؐ نے اس قدر زور سے تکبیر کہی کہ جو صحابہؓ عمر کی دہشت کی وجہ سے اس وسیع گھر میں چھپ گئے تھے، جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے ہیں۔

لیکن محمد ابن اسحاق نے قبول اسلام کے بارے میں خود حضرت عمرؓ کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے جو یہاں نقل کرنے کے قابل ہے: ''میں اسلام سے بہت دور بھاگنے والا تھا اور جاہلیت کے زمانے میں شراب پیا کرتا تھا۔ اس کا بڑا شوقین اور خوب پینے والا تھا۔ ہماری ایک مجلس عمر بن عبد (بن عمران المخزومی) کے کنبہ والوں کے پاس تھی جس میں قریش جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک رات میں ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کے پاس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے کے ارادے سے اس مجلس کی طرف چلا اور وہاں پہنچا تو ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ پایا۔ میں نے سوچا کہ فلاں شراب فروش کے پاس، جو مکہ میں شراب بیچا کرتا تھا، جانا چاہیے، شاید وہاں سے شراب مل جائے اور میں کچھ پی سکوں۔ پھر میں چلا اور اس کے پاس پہنچا تو اسے بھی نہ پایا۔ میں نے سوچا، بہتر ہو میں کعبۃ اللہ جاؤں اور اس کے سات یا ستر چکر لگاؤں۔ پھر میں مسجد میں آیا کہ کعبۃ اللہ کا طواف کروں تو رسول اللہؐ کو دیکھا، آپؐ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب میں نے آپؐ کو دیکھا تو دل میں کہا: واللہ! آج رات محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف توجہ کروں اور سنوں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ میں کعبۃ اللہ کے غلاف کے اندر ہو گیا اور آہستہ آہستہ آپؐ کے قریب پہنچ گیا۔ رسول اللہؐ کھڑے ہوئے نماز پڑھتے اور قرآن کی تلاوت فرماتے رہے یہاں تک کہ میں آپؐ کے مقابل ہو گیا۔ آپؐ کے اور میرے درمیان غلاف کعبہ کے سوا کوئی اور چیز حائل نہیں تھی۔ جب میں نے قرآن سنا تو اس سے میرے دل میں رقت پیدا ہوئی۔ میں رو پڑا اور اسلام مجھ میں داخل ہو گیا''۔ (محمد ابن اسحاق، میرت رسول اللہ صفحہ ۲۲۸: The Life of Muhammad. P.158)۔

حضرت عمرؓ کبھی ادھورا کام نہیں کرتے تھے۔ اگلی صبح انہوں نے اپنے ماموں ابوجہل کو یہ خبر سنانے کا فیصلہ کر لیا گویا سیدھے شیر کی کچھار میں چلے گئے۔ ''اے میرے بھانجے! تو اپنے سزاوار مقام پر آیا۔ آ تیرے لیے وسیع جگہ موجود ہے۔ آخر کس لیے آنا ہوا؟'' ابوجہل نے دروازہ کھول کر خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں کہا: ''میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں مطلع کر دوں کہ میں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لا چکا ہوں۔ میں نے ان چیزوں کی تصدیق کی ہے جو وہ لائے ہیں''۔ پھر تو ابوجہل نے دروازہ میرے منہ پر مارا اور کہا: ''اللہ تجھے اور اس چیز کو، جو تو لایا ہے، برباد کرے''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۲۳۰: The Life of Muhammad P.159)۔ حضرت عمرؓ کا قبول اسلام قریش کے لیے اس تنکے کے برابر تھا جس کا اضافہ انتہائی بوجھ کے بعد ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد تنہا نماز پڑھنے سے قطعی انکار کر دیا اور سب لوگوں کے سامنے کعبۃ اللہ میں کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ ابوجہل اور ابوسفیان اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ عمرؓ اپنے قبیلے عدی کی حفاظت میں تھے۔

ابوجہل نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فاقہ کشی پر مجبور کر کے اپنے سامنے سر تسلیم خم کرانے کی کوششیں شروع کر دیں اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کا مقاطعہ کرنے کے لیے مسلمانوں کے خطرے سے نمٹنے کی غرض سے تمام قبیلوں سے ایک معاہدہ لکھوا لیا۔ اس معاہدے کی رو سے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے شادی بیاہ یا خرید و فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ ان دونوں قبیلوں کے افراد، مسلمان اور غیر مسلم شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے جو ایک یہودی باڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حضرت خدیجہؓ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپؐ کے اہل خانہ جب وہاں پہنچے تو ابولہب اور اس کا خاندان ابوشمس کے علاقے میں وارد ہو گیا۔ یہ بائیکاٹ تقریباً دو سال تک جاری رہا۔ ابو طالب اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے دوسرے افراد نے، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، خالص قبائلی اصول کے تحت قرابتداری سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس پابندی کو قبول عام نہ ہوا کیونکہ وہ لوگ، جن کی بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے رشتے داریاں تھیں محصورین کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے مسلمان (جن کا تعلق دوسرے قبیلوں سے تھا) دوست محصورین کو باقاعدگی کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجتے رہے۔ ہشام ابن عمرو نامی شخص، جس کے بنی ہاشم میں کئی رشتے دار تھے، غلے کے اونٹ اکثر رات کے وقت لاد کر شعب ابی طالب میں لایا کرتا تھا۔ جب وہ درے کے دھانے پر آتا تو اونٹ کی نکیل نکال ڈالتا اور اس کے پہلو پر مارتا۔ اس طرح وہ اونٹ درے کے اندر ان لوگوں کے پاس پہنچ جاتا۔ ایک دن ابوجہل نے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم ابنِ حزام کو روکا جو اپنی پھوپھی کے لیے کچھ گیہوں اٹھا کر لیے جا رہا تھا۔ اس پر دونوں میں سخت تکرار ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے ایک شخص (ابوالبختری ...... مترجم) نے حکیم کی حمایت کر دی۔ کیا ابوجہل سنجیدگی سے حکیم کو اپنی پھوپھی کے لیے لے جانے والا غلہ روک رہا تھا؟ جب ابوجہل نے انکار کیا تو ابوالبختری نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی لے کر اسے مارا، اس کا سر زخمی کر دیا اور خوب لاتیں لگائیں۔

چار مقدس مہینوں میں، جب مکہ میں تشدد کی ممانعت تھی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمان شعب ابی طالب سے باہر نکل کر باقاعدگی کے ساتھ کعبہ جاتے رہے۔ اس دوران آپؐ کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا۔ ابولہب کی بیوی، جو خود کو شاعرہ سمجھتی تھی، اس وقت جب آپؐ اس کے قریب سے گزرتے، بلند آواز سے توہین آمیز اشعار کہتی۔ ایک مرتبہ اس نے رسول اللہؐ کے راستے میں کانٹے ڈال دیے جس پر سورہ تبت نازل ہوئی:

> ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا
> نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی
> وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا
> اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے
> اس کی گردن میں پوست کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہو گی

جو لوگ کوہ زیتون کے واعظ کی نصیحتیں سن کر پلے بڑھے ہیں، وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے دوسرا گال پیش نہ کرنے پر حیرت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ لیکن انجیل کی رو سے خود عیسیٰ علیہ السلام اکثر گول مول لفظوں میں اپنے دشمنوں پر لعنت بھیجتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے بہستون اور کورعاشان کے شہروں کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوفناک انجام کی پیش گوئی کی تھی جہاں کے باشندوں نے ان کا وعظ نہیں سنا تھا۔ اور متی کی انجیل کے مطابق انہوں نے یہودیوں کے فریسی اور صدوقی فرقوں پر سب وشتم کیا تھا اور گالیاں دی تھیں جو یقیناً یہودیوں کی توہین تھی۔

اس وقت قرآن پاک میں ایک نئی تبدیلی در آئی۔ قرآن میں مکہ شہر کی تباہی کی مسلسل پیش گوئی کی جاتی رہی جس نے خدا کا کلام سننے سے انکار کر دیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ مشکلات کے اس دور میں یہودی صحیفوں کے بارے میں مسلمانوں کے علم میں وسعت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اب قرآن کریم میں مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے سابق پیغمبروں کے متعلق نئے قصے بیان کرنے کا آغاز ہو گیا جس سے کسی نئی دریافت پر پائے جانے والے جوش وخروش اور ہیجان کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان قصوں کا آغاز عام طور پر ایسے سوالوں سے ہوتا ہے: ''کیا آپ کو موسیٰ کا قصہ بھی معلوم ہے؟'' یا ''کیا آپ فرعون کے قصے کو جانتے ہیں؟'' حضرت موسیٰ اپنے زمانے میں بہت مقبول پیغمبر تھے۔ قرآن حکیم میں بار بار یہ ذکر ہوا ہے کہ موسیٰ نے فرعون کو کئی مرتبہ یہ انتباہ کیا تھا کہ وہ احکام خداوندی کی تعمیل کرے لیکن مصریوں نے موسیٰ کی بات نہ سنی جس کے بعد خدا کی طرف سے ان پر عذاب بھیجا گیا۔ دوسرے پیغمبر یوسفؑ، نوحؑ، یونسؑ یعقوبؑ اور عیسیٰؑ بھی اپنی اپنی قوم کو خبردار کرتے رہے کہ اگر وہ تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو راست بازی کی زندگی گزاریں اور انصاف اور کشادہ دلی کی بنیاد پر فلاحی معاشرہ قائم کریں۔ قرآن مجید میں بعض ایسے جلیل القدر پیغمبروں کا بھی ذکر ہوا ہے جن کا تورات اور انجیل میں تذکرہ نہیں ہوا۔ ان میں ہودؑ، شعیبؑ اور صالحؑ شامل ہیں جنہیں خدا نے یہی پیغام دے کر عاد، مدین اور ثمود کی عرب قوموں کی طرف بھیجا تھا البتہ سابق الہامی کتابوں کے بارے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علم اب بھی محدود تھا۔ انجیل کے نبی نے عربوں کے قابل احترام پیغمبروں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ سب پیغمبر مرتبے کے لحاظ سے برابر تھے اور قرآن کریم میں بھی تمام سچے مذاہب کی تصدیق کی گئی ہے۔ رسول اللہؐ اس تاریخ وار واقعہ نگاری کو نہیں جانتے تھے جس کے مطابق پہلی الہامی کتابوں میں پیغمبروں کا ترتیب سے تذکرہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آپؐ کے خیال میں عیسیٰؑ کی ماں مریمؑ یہودی صحیفوں میں درج موسیٰ کی بہن مریمؑ تھیں۔ ان پیغمبروں کے قصوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے قصے سے رسول اللہؐ کی ان مشکلات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو آپؐ کو مکہ کے اکابرین کی مجلس کی طرف سے آپؐ کی نبوت پر کیے جانے والے مختلف اعتراضوں کی وجہ سے پیش آئی تھیں:

یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا

اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (اس سے) نہیں ڈرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی قوم کے کافر سرداروں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے
یہ تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے
اگر اللہ ہی کو منظور ہوتا تو کسی فرشتے کو اتارتا
ہم نے تو اسے اپنے اگلے باپ دادوں کے زمانے میں سنا ہی نہیں
یقیناً اس شخص کو جنون ہے (سورہ المومنون آیات ۲۳ تا ۲۵)

لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن حکیم اس قسم کے ان تمام قصوں کو خدا کی ''نشانیاں'' اور صحیح تاریخی واقعات کے بجائے انسان کے ساتھ خدا کی معاملت کے علامتی واقعات کے طور پر بیان کرتا اور ان کو، جن سے عرب بخوبی آگاہ تھے، اپنے پیغام کی اساس قرار دیتا ہے۔

جب قوم نے نوح علیہ السلام کو مسترد کر دیا تو اللہ نے انہیں ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دے دیا اور جن لوگوں نے ان کے انتباہ پر کوئی توجہ نہ دی تھی، انہیں پانی میں غرق کر دیا۔ قرآن میں قیامت کے دن کو ایک بھیانک واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ ان عظیم علامتی منظر ناموں کے مطابق اس روز نیک لوگوں کو بروں سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے ''بڑی نشانیاں'' ہیں جو اگلی دنیا میں عذاب سے ڈرتے ہیں۔ (یقیناً اس میں لوگوں کے لیے نشان عبرت ہے جو قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ، وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ سورہ ہود آیت ۱۰۳...... مترجم)۔ لیکن قرآن کریم اس بات کو پوری طرح واضح کرتا ہے کہ سزا ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر نہیں دی جائے گی بلکہ اس سزا کے مستوجب وہ شہر اور لوگ ہوں گے جنہوں نے خدا کے رسولوں کا پیغام سننے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے تباہی ان کے سروں پر منڈلانے لگی۔ (ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ خود انہوں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور انہیں ان کے معبودوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، جب کہ تیرے پروردگار کا حکم آ پہنچا، بلکہ اور ان کا نقصان ہی انہوں نے بڑھا دیا۔ تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب کہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے، بے شک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور نہایت سخت ہے۔ سورہ ہود آیات ۱۰۱ تا ۱۰۲...... مترجم)۔ اب مکہ شہر کے لوگ تباہی کا سامنا کرنے والے تھے کیونکہ قریش نے اپنا طرز زندگی تبدیل کرنے اور احکام خداوندی کے مطابق منصفانہ معاشرہ قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن قرآن کریم صرف یوم حساب اور تباہی کا پیغام لے کر ہی نہیں آیا تھا بلکہ اس میں مسلمانوں کو بار بار صبر سے کام لینے، موجودہ مصائب کا حوصلے، استقلال اور وقار کے ساتھ مقابلہ کرنے اور دشمنوں سے ذاتی انتقام لینے کے موقعے سے فائدہ نہ اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ پچھلے پیغمبروں کے واقعات بیان کرنے کا مقصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی دل جوئی کرنا اور ان پر یہ واضح کرنا تھا کہ آباء واجداد کے دین سے منہ پھیر لینے کے باوجود ان کا دین ''عجیب الخلقت'' اختراع نہیں۔ ان کا ایک اپنا روحانی گھرانا ہے جس کا شجرہ نسب بنی نوع انسان کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرنے والے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام کے ساتھ جا ملتا ہے۔ اس وقت تک رسول اللہؐ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ قریش کے ساتھ ان کی دشمنی قطعی ہے اور ابوجہل کی نسبت کم انتہا پسندوں سے بھی صلح ممکن نہیں۔ قریش کی طرف سے بائیکاٹ کے تھوڑی دیر بعد ایک وفد نے اس امید کے ساتھ حضورؐ سے رابطہ کیا کہ اس مسئلے کا کوئی پرامن حل تلاش کرلیا جائے گا۔ اس وفد کی قیادت بنی مخزوم کے ایک معزز شخص ولید نے کی اور اس میں عبد شمس، اسد اور جمح قبیلوں کے تین افراد شامل تھے۔ یہ قبیلے پرانے حلف الفضول کے رکن تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ اس مقاطعے کی وجہ سے ابوجہل کو مکہ میں بہت زیادہ طاقت حاصل ہو جائے گی۔ یہ لوگ آنحضرتؐ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف تھے اور انہیں یہ احساس تھا کہ آپؐ کمزور قبیلوں کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

وفد کے ارکان نے مصالحت کے لیے تجویز پیش کی کہ مسلمان اللہ کی پرستش کر سکتے ہیں لیکن دوسروں کو لات، عزیٰ اور منات کی پوجا کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس معاملے پر پہلے ہی غور وخوض کر چکے تھے۔ آپؐ نے وفد کو سورہ کافرون کے ذریعے اپنے جواب سے آگاہ کر دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور کافروں کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں:

آپؐ کہہ دیجیے کہ اے کافرو!

نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو

نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں

اور نہ میں عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے

شعب ابوطالب میں دو سال تک محصور رہنے کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے صورت حال اچانک بہتر ہوگئی اور ایسا لگتا تھا کہ آپؐ کو استقلال کا معاوضہ مل گیا ہے۔ آپؐ کے خاندان کا مقاطعہ تیزی کے ساتھ غیر مقبول ہوتا گیا اور لوگ اپنے خونی رشتوں کی پاسداری کرنے لگے۔ کسی کو بھوکا مارنا عربوں کی روایات کے منافی تھا اس لیے آپؐ کے خاندان کو باقاعدگی کے ساتھ چوری چھپے کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جاتی رہیں۔ آخر چار قریش نے، جو بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے قریبی رشتے دار تھے، مقاطعے کو ختم کرنے کے لیے تحریک چلانے کی غرض سے منصوبہ بندی کر لی۔ ہشام ابن عمرو نے، جو اکثر غلے کے اونٹ رات کو لا کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعب ابی طالب میں لاتا تھا، چار دوسرے ہم خیال افراد کو اپنے ساتھ ملا کر قریش کے بائیکاٹ کے معاہدے کو توڑنے اور اس سلسلے میں ابوجہل سے گفت وشنید کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ان میں سے تین اشخاص مطعم ابن عدی، ابوالبختری ابنِ ہشام اور زمعہ ابنِ الاسود کا تعلق قدیم حلف سے تھا۔انہیں غالباً مقاطعے کے دوران مکہ میں ابوجہل کے قبیلے مخزوم کے عروج حاصل ہونے پر تشویش تھی۔لیکن چوتھا شخص زہیر ابنِ امیہ، جو ابوطالب کا رشتے دار تھا،خود بھی مخزومی قبیلے کا تھا چنانچہ یہ طے پا گیا کہ بائیکاٹ کے خاتمے کی کارروائی کا آغاز اسے کرنا چاہیے۔

مقررہ دن کو زہیر صبح سویرے ایک قیمتی سفید چوغہ پہن کر خانہ کعبہ گیا۔اس نے سات مرتبہ کعبے کا طواف کیا، پھر لوگوں کے پاس آیا اور شہر کے تمام معززین سے کھلے عام خطاب کیا: ''اے مکہ والو! کیا ہم تو کھانا کھائیں اور کپڑے پہنیں اور بنی ہاشم مرتے رہیں؟'' اس پر ابوجہل نے غصے سے احتجاج کیا لیکن باقی چاروں افراد نے زہیر کی تحریک کی حمایت میں گفتگو کی۔آخر مطعم اس معاہدے کو تلاش کرنے کے لیے اس نوشتے کی طرف بڑھا جس پر سب قبیلوں نے دستخط کر رکھے تھے تاکہ اسے چاک کر ڈالے۔لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ''باسمک اللھم'' کے الفاظ کے سوا دیمک نے اس پورے نوشتے کو کھا لیا تھا۔اب سب لوگوں نے اس مقاطعے کو ختم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاندان پر پابندیاں ختم ہوئیں تو سب مسلمانوں میں زبردست خوشیاں منائی گئیں اور ایسا لگتا تھا کہ بہتر زمانہ شروع ہو گیا ہے۔حبشہ میں پناہ لینے والے جلاوطن مسلمانوں نے یہ خبر سنی تو عثمانؓ ابن مظعون کی قیادت میں تقریباً تمیں خاندان واپس مکہ آ گئے اور باقی مسلمانوں کو ابوطالب کے بیٹے جعفرؓ کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا۔رسول اللہؐ اور حضرت خدیجہؓ اپنی صاحبزادی رقیہؓ اور ان کے شوہر عثمانؓ ابن عفان کے ساتھ دوبارہ مل کر بہت خوش ہوئے۔لیکن یہ جلاوطن مسلمان بہت جلد واپس آ گئے تھے۔مقاطعے کے آخر میں کھانے پینے کی چیزیں ملنے کے باوجود حضورؐ کے خاندان کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔پھر ۶۱۹ عیسوی میں ایک شخصیت کی وفات کے باعث آنحضرتؐ کا مکہ میں قیام ناممکن ہو گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

ہجرت اور ایک نیا قبلہ

رسول اللہؐ کے سیرت نگار ۶۱۹ عیسوی کو عامتہ الحزن یعنی غم کا سال قرار دیتے ہیں۔ مقاطعہ ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد حضرت خدیجہؓ انتقال کر گئیں۔ وہ ساٹھ کے عشرے میں تھیں اور کھانے پینے کی چیزوں کی شدید قلت کے باعث ان کی صحت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی قریب ترین ساتھی اور حقیقی مددگار تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کا کوئی متبادل نہیں تھا بلکہ وفا شعار ابوبکرؓ یا پر جوش عمرؓ بھی آنحضرتؐ کو حضرت خدیجہؓ جیسی قلبی حمایت فراہم نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نقصان نے آپؐ پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک اور شخص کی وفات کے زیادہ عملی نتائج برآمد ہو گئے۔ ابوطالب سخت بیمار پڑ گئے اور یہ بات ظاہر تھی کہ وہ صحت یاب نہیں ہوں گے۔ ان کی وفات سے پہلے قریش نے امن کے لیے آخری کوشش کی۔ ہر چند کہ انہوں نے ابوطالب پر شدید دباؤ ڈالا تھا، اس کے باوجود وہ جانتے تھے کہ ابوطالب ایک سچے عرب سید کی طرح اپنے قبیلے کے لوگوں کی غیر متزلزل حمایت کرتے ہیں۔ چنانچہ ابوجہل کی قیادت میں ایک وفد نے ان کے پاس جا کر حضورؐ سے مصالحت کرانے کی درخواست کی اور کہا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے مذہب کو تسلیم کر لیں تو وہ آپؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ لیکن رسول اللہؐ اس مسئلے پر دو سال پہلے ہی گہرے غور و خوض کے بعد قریش کو یہ بتا چکے تھے کہ اللہ ہی واحد معبود ہے۔ اس پر قریش کا یہ وفد غضب ناک ہو گیا اور وفد کے ارکان یہ دعویٰ کرتے ہوئے واپس چلے گئے کہ خود اللہ ہی حضورؐ اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

جب یہ وفد چلا گیا تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابوطالب کی زبانی یہ سن کر حیرت ہوئی کہ آپؐ نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصالحت کو مسترد کر کے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے چچا سے کہا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اللہ کی اطاعت قبول کر لیں۔ لیکن ابو طالب نے آہستہ سے آنحضرتؐ سے کہا: ''بھتیجے! اگر میرے بعد تم پر اور تمہارے بھائیوں پر طعنہ زنی اور قریش کی اس بدگمانی کا خوف نہ ہوتا کہ میں نے یہ الفاظ موت کی سختی پر صبر نہ کر کے کہہ دیے ہیں تو ضرور کہتا۔ جس طرح میں اپنے آباء و اجداد کے دین پر زندہ رہا ہوں، اسی طرح ان ہی کے دین پر مروں گا''۔ لیکن زندگی کے آخری لمحوں میں حضرت عباسؓ نے کان لگا کر سنا تو ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا: ''اے میرے بھائی کے بیٹے! واللہ میرے بھائی نے وہ کلمہ کہا جس کے کہنے کا آپؐ نے انہیں حکم دیا تھا''۔ لیکن رسول اللہؐ نے اپنا سر ہلا دیا۔ آپؐ جانتے تھے کہ ابو طالب اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

ابولہب بنی ہاشم کا نیا سردار بن گیا۔ اس کا تقرر رسول اللہؐ کے لیے تشویش کا باعث تھا لیکن ابولہب نے شروع میں حضورؐ کو قدرے تحفظ فراہم کیا۔ چونکہ اب وہ قبیلے کا سربراہ تھا، اس لیے اس سے یہی توقع تھی۔ لیکن ابولہب کی حفاظت ابو طالب جیسی موثر نہ تھی کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ اس محافظت کے پیچھے حسد اور عداوت کارفرما ہے۔ چنانچہ قریش نے حضورؐ کی نئی کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ آپؐ کے ہمسائے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہوئے آپؐ کو پریشان کرنے کے لیے نماز کے دوران بھیڑ کی اوجھڑی آپؐ کے سامنے رکھ دیتے بلکہ ایک مسخرے نے تو اوجھڑی کو کھانا پکانے کے برتن میں ڈال دیا۔ ایک دن جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہر سے گزر رہے تھے تو قریش کے ایک نوجوان نے آپؐ پر غلاظت ڈال دی۔ جب آپؐ گھر لوٹے تو آپؐ کی صاحبزادی آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ روتے ہوئے آپؐ کے جسم مبارک سے گندگی کو صاف کرتی جاتی تھیں۔ ''میری ننھی بچی مت رو''۔ حضورؐ نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا: ''خدا تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا''۔ پھر آپؐ نے رنج اور افسردگی کے ساتھ اپنے آپ سے کہا: ''ابو طالب کی زندگی میں قریش نے میرے ساتھ اس قسم کا سلوک کبھی نہیں کیا تھا''۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۷۸: The Life of Muhammad , P. 191)۔

نبی کریمؐ کی اس نئی کمزوری سے دوسرے مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر قریش کے مقاطعے کی وجہ سے ابوبکرؓ کا کاروبار تباہ ہو گیا اور ان کے پاس جو چالیس ہزار درہم تھے، وہ گھٹ کر پانچ ہزار رہ گئے۔ وہ جمح قبیلے کے علاقے میں رہتے تھے اور جب سے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا، اس قبیلے کے معمر اور فربہ سردار امیہ بن خلف کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ امیہ قریش کی ایذا رسانیوں کے ابتدائی دور میں اپنے مسلمان غلام بلالؓ کو تپتی دھوپ میں کھڑا رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ مکہ کے ایک معزز تاجر کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہتا تھا۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ابوبکرؓ اور ان کے عم زاد طلحہؓ کو اکٹھے باندھ کر انہیں اس شرمناک حالت میں تپتے ہوئے سورج کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا قبیلہ تیم ابوبکرؓ کی حفاظت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ ابوبکرؓ کو یہ احساس ہو گیا کہ مکہ میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ انہوں نے رسول کریمؐ سے اجازت لے کر مکہ کو چھوڑ دیا اور دوسرے مہاجرین کے ساتھ شامل ہونے کی غرض سے حبشہ روانہ ہو گئے۔ لیکن راستے میں قریش کے ان اتحادی خانہ بدوش قبائل کے سردار ابن دغنہ سے ان کی ملاقات ہو گئی جو احابیش کے نام سے مشہور تھے۔ ابن دغنہ نے کہا: اے ابوبکر! کہاں؟ ابوبکرؓ نے کہا: میری قوم نے مجھے نکال دیا، تکلیفیں دیں اور تنگ کر دیا۔ اس نے کہا: یہ کیوں؟ واللہ! تم تو خاندان کی زینت ہو، آفتوں میں تم مدد کرتے ہو، نیکی تمہارا شیوہ ہے اور ناداروں کو کمائی پر لگاتے ہو۔ واپس چلو، تم میری پناہ میں ہو۔ چنانچہ ابوبکرؓ خوشی سے ان کے ساتھ واپس ہو گئے۔ لیکن قریش نے ابن دغنہ سے کہا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ابوبکرؓ لوگوں کے سامنے نہ تو نماز پڑھیں گے اور نہ ہی قرآن کی تلاوت کریں گے۔ انہوں نے کہا: ابوبکر طلسماتی شخصیت کے مالک ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان کے آباء واجداد کے دین سے منحرف کر دیں گے۔ ابن دغنہ نے قریش کی یہ شرطیں مان لیں اور ابوبکرؓ نے وعدہ کر لیا کہ وہ صرف اپنے گھر کے اندر ہی عبادت کریں گے۔

لیکن دوسرے مسلمانوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون ایک صوفی تھے اور ان کا تعلق قبیلہ مخزوم سے تھا۔ وہ ولید کی مضبوط اور موثر حفاظت میں تھے لیکن انہوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ خود تو محفوظ رہیں اور ان کے مسلمان بھائی نامساعد حالات میں زندگی بسر کریں۔ چنانچہ وہ ولید کے پاس گئے اور اسے اس کی پناہ لوٹا دی۔ یہ بات بوڑھے ولید کے لیے تعجب انگیز تھی۔ رضاکارانہ طور پر عقوبت نفس کا بظاہر یہ ایک بہترین موقع تھا جو مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں کے تقوے اور پرہیز گاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ رومیوں کے ایذا رسانیوں کے دور میں بعض عیسائیوں نے شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے خود کو حکام کے حوالے کر دیا تھا لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قسم کی نفس کشی، زیادتی اور رویے کی کبھی اجازت نہ دی۔ یہ طرز عمل عرب روایت کے بھی خلاف تھا۔ یوں بھی عرب میں اضافی خطرات اور مشکلات کے بغیر ہی زندگی بہت کٹھن اور دشوار تھی۔ اس واقعے کے چند روز بعد حضرت عثمانؓ نے ایک مشاعرے میں شرکت کی جس میں اس زمانے کے سب سے بڑے عرب شاعر لبید بن ربیعہ نے اپنا کلام سنایا۔ قریش کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ لبید ان کے شہر میں آیا تھا۔ لیکن جب عثمانؓ نے لبید کو ٹوکا تو قریش سخت شرمندہ ہو گئے۔ لبید نے جب یہ شعر پڑھا: ''سن لو کہ خدا کے سوا ہر چیز باطل ہے'' تو عثمانؓ نے کہا: ''تو نے سچ کہا''۔ لیکن جب اس نے یہ شعر پڑھا: ''ہر نعمت زائل ہونے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں'' تو حضرت عثمانؓ نے کہا: ''یہ تم نے جھوٹ کہا، جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں گی''۔ ایک معزز مہمان کے ساتھ اس قسم کا رویہ نا قابل معافی تھا جس سے لبید سخت دل گرفتہ ہو گیا۔ ''اے گروہ قریش''! اس نے کہا: ''تمہارے ہم نشینوں کو تو کبھی تکلیف نہیں دی جایا کرتی تھی۔ یہ تم میں نئی بات کب سے پیدا ہو گئی''؟'' اس کی بات سے تم اپنے دل پر کوئی اثر نہ لو''۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا: ''چند کم ظرفوں میں سے، جو اس کے ساتھ والے ہیں، یہ بھی ایک کم ظرف شخص ہے جس نے ہمارے دین سے علیحدگی اختیار کر لی ہے''۔ عثمانؓ نے بھی اس کا جواب دیا یہاں تک کہ دونوں کا جھگڑا بڑھ گیا۔ وہ شخص اٹھا اور عثمانؓ کی آنکھ پر ایسا تھپڑ مارا کہ اسے نیلا کر دیا۔ ولید، جو ایک مہذب شخص تھا، پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور عثمانؓ کی حالت دیکھ رہا تھا، کہنے لگا: ''اے بھتیجے! اگر تم میری حفاظت میں ہوتے تو تمہاری آنکھ کو یہ صدمہ نہ پہنچتا''۔ لیکن عثمانؓ نے غصے سے اپنا دوسرا گال بھی حاضرین کی طرف کر دیا اور انہیں چیلنج کیا کہ وہ دوسری آنکھ کو بھی نیلا کر دیں۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۴۴ :The Life of Muhammad P. 169-170)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس ناخوشگوار واقعے کا علم ہوا تو آپؐ نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ (محمد ابن اسماعیل البخاری: احادیث ۲۶، ۶۳: Muhammad: His Life Based on the Earliest sources, P. 94)۔ حضورؐ نے اس غیر شائستہ طرز عمل پر ناگواری ظاہر کی اور یہ محسوس کیا کہ عثمانؓ کو ایسا اشتعال انگیز رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے بعد ایک اور بحران کھڑا ہو گیا۔ ابوجہل کے ایما پر ابولہب نے رسول اللہؐ سے یہ سوال کیا کہ کیا آپؐ کے دادا عبدالمطلب، جو بچپن میں آپؐ سے بے حد محبت کرتے اور آپؐ پر فخر کرتے تھے، دوزخ میں ہیں؟ یہ ایک پرفریب سوال تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں اور عیسائیوں کا نظریہ اختیار کیا تھا کہ صرف اہل ایمان ہی جنت میں جائیں گے۔ توحید پرستوں نے حالیہ برسوں میں اس مسئلے کے کئی جواب ایجاد کر لیے ہیں لیکن آپؐ کے پاس اس کا کوئی فوری جواب موجود نہیں تھا۔ اگر آپؐ یہ کہتے کہ قدیم بت پرستی عبدالمطلب جیسے لوگوں کو نجات دلا سکتی ہے تو قریش قدرتی طور پر یہ جواب دیتے کہ اس صورت میں بت پرستی کو ختم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپؐ یہ تسلیم کر لیتے کہ عبدالمطلب دوزخ میں جائیں گے تو ابولہب یہ کہتا کہ آپؐ نے ایک محبوب مورثِ اعلیٰ پر بے جا نکتہ چینی کی ہے۔

ان حالات میں رسول اللہؐ کو ایک نئے سرپرست کی ضرورت تھی چنانچہ لات کے شہر طائف میں نیا محافظ تلاش کرنے کی کوشش سے آپؐ کی حد درجہ مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ طائف مکہ کی طرح تاجروں کا شہر تھا البتہ اسے اس قدر کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہ عرب کا زرخیز ترین علاقہ تھا اور پہاڑ پر واقع شہر کی فصیل میں داخل ہوتے وقت آپؐ یقیناً پرکشش باغوں اور غلے کی فصلوں سے گزرے ہوں گے۔ قبیلہ عبدشمس اور حضورؐ کے اپنے قبیلے بنی ہاشم کے کئی لوگوں نے طائف میں گرمائی محل تعمیر کر رکھے تھے اس لیے ان لوگوں کے ساتھ آپؐ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلقات موجود تھے۔ لیکن یہ ایک پر خطر سفر تھا کیونکہ آپؐ کی طرف سے لات دیوی کی مذمت سے اس قدیم معبد کے محافظ قبیلے ثقیف کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ آپؐ تین بھائیوں کے پاس گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے توہین آمیز طریقے سے آپؐ کے پیغام کو ٹھکرا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بنی ثقیف کے یہ تینوں بھائی دعوت اسلام سے اس قدر مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اپنے غلاموں اور اوباش نوجوانوں کو آپؐ کا تعاقب کرنے کے لیے بھیج دیا۔

اس ہجوم سے بچنے کے لیے حضورؐ عتبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی شیبہ کے باغ میں جانے پر مجبور ہو گئے جو اس وقت باغ میں بیٹھے یہ واقعہ دیکھ رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی مکہ میں آنحضرتؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے لیکن انصاف پسند اور با اخلاق تھے۔ انہوں نے قریش کے ایک شخص کو اس افسوس ناک حالت میں دیکھا تو سخت رنجیدہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام سے کہا کہ وہ انگوروں کا ایک خوشہ تھالی میں رکھ کر آپؐ کے پاس لے جائے۔ اس باغ میں آپؐ کو یہ خیال گزرا کہ آپؐ کے اپنے وسائل ختم ہو گئے ہیں۔ اس لمحے آپؐ کو یقیناً حضرت خدیجہؓ یاد آئی ہوں گی۔ وہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ آپؐ کے زخموں کا مداوا کرتی رہی تھیں اور اس وقت آپؐ کو ان کے مشورے کی اشد ضرورت تھی۔ عربوں میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ وہ ہنگامی حالات میں کسی دیوی یا جن کی پناہ حاصل کرتے تھے لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس موقعے پر خدا کی پناہ لی:

اے اللہ! میں اپنی کمزوری، ضعف تدبیر اور لوگوں میں اپنی ذلت کی شکایت تجھی سے کرتا ہوں۔ اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے! تو کمزوروں کو ترقی پر پہنچانے والا ہے اور تو میری پرورش کرنے والا ہے، تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ (کیا) ایسے دور والے کے جو مجھ سے ترش رو ہو کر پیش آتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملے کا مالک بنا دیا گیا ہے، اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں تو میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ مگر تیری عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے اندھیرے دور ہوتے ہیں، دنیا و آخرت کے معاملے سدھرتے ہیں۔ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا مجھ پر تیری خفگی ہو، (مجھے) تیری ہی رضامندی کی طلب ہے حتیٰ کہ تو راضی ہو جائے اور تیرے سوا کسی میں نہ تو ضرر دور کرنے کی قوت ہے اور نہ نفع حاصل کرنے کی۔ (محمد ابن اسحاق۔ سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۸۰؛ The Life of Muhammad P. 193)۔

محمد ابن اسحاق نے رسول اللہؐ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ ایک غیر معمولی کام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طائف میں حد درجہ مایوسی حضورؐ کی روحانی ترقی میں ایک بحران کا درجہ رکھتی ہے۔ اب آپؐ کسی انسان کی معیت پر بھروسا نہیں کرتے بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی محافظ نہیں ہے۔

خدا نے آپؐ کی دعا کا فوری جواب دیا اور اس کی طرف سے یہ ''نشانی'' اس وقت ظاہر ہوئی جب ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلام عداس انگوروں کا ایک خوشہ تھالی میں رکھ کر آپؐ کے پاس پہنچ گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انگور کھانے سے پہلے جب بسم اللہ پڑھی تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ جدید عراق کے شہر نینویٰ کا عیسائی تھا۔ حضورؐ کو بھی یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ عداس کا تعلق حضرت یونسؑ کے شہر نینویٰ سے تھا۔ آپؐ نے اسے بتایا کہ آپؐ بھی خدا کے رسولؐ اور یونسؑ کے بھائی ہیں۔ یہ سنتے ہی عداس رسول اللہؐ پر جھک پڑا اور آپؐ کا سر مبارک، ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ، جو اس پورے واقعے کا مشاہدہ کر رہے تھے، سخت پریشان ہو گئے۔ یہ واقعہ نوجوانوں پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پراسرار گرفت کی ایک اور مثال تھا۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص کے ساتھ حضورؐ کے اس رابطے کے بعد آپؐ کا احساس تنہائی کم ہو گیا۔ اس واقعے کو عرب کے باہر وسیع و عریض دنیا میں بسنے والے لوگوں کے لیے بھی یاد دہانی کی حیثیت حاصل تھی جو حجاز کے عربوں کے برعکس آنحضرتؐ کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ طائف سے واپسی پر جنوں کی ایک جماعت نے رسول اللہؐ سے قرآن سنا اور جن اس کے حسن سے دنگ رہ گئے۔ اس واقعے سے بھی آپؐ کی دل جوئی ہوئی۔ (اور یاد کرو جب کہ ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو تیری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، پس جب وہ (نبیؐ کے) پاس پہنچ گئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے، خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب پڑھ کر ختم ہو گیا تو اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے واپس چلے گئے۔ اے ہماری قوم! ہم نے یقیناً وہ کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور سچے دین اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ (سورہ الاحقاف، آیات ۲۹، ۳۰..... مترجم)۔

لیکن اللہ کی پناہ میں آنے کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ نبی کریمؐ انسانی تحفظ کے قانون سے آزاد ہو گئے تھے۔ قرآن حکیم میں واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی نگہداشت کے لیے ہر ممکن انسانی کوشش کرنی چاہیے اور ہر چیز کو سستی اور لاپروائی کے ساتھ خدا پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ ''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہ بدلے''۔ (سورہ الرعد، آیت ۱۱)۔ یہ قرآن کی وہ آیت ہے جس کا سیاسی جدوجہد کرنے والے مسلمان آج اکثر حوالہ دیتے ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے واپسی پر مکہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے دوسرے قبیلوں کے تین سرداروں کو پیغام بھیج کر ان سے کہا کہ وہ آپؐ کو اپنا حلیف تسلیم کر لیں۔ اگر قریش کو پتا چل جاتا کہ آپؐ مکہ کو چھوڑ کر طائف جانے والے ہیں تو اس سے آپؐ کی پوزیشن مزید خطرناک ہو جاتی۔ حضورؐ نے سب سے پہلے جن دو سرداروں سے رابطہ کیا، وہ بنی زہرہ کا اخنس بن شریق اور عامر قبیلے کا سہیل ابن عمرو تھا۔ ان دونوں نے قبائلی اصولوں کی بنا پر انکار کر دیا البتہ بنی نوفل کے سربراہ مطعم نے، جس نے قریش کا بائیکاٹ ختم کرانے کی تحریک چلائی تھی، رسول اللہؐ کو اپنی حفاظت میں لے لیا جس کے بعد شہر میں آپؐ کا داخلہ ممکن ہوا۔

لیکن یہ کوئی طویل المیعاد حل نہیں تھا۔ حضورؐ نے تقریباً اسی زمانے میں حج کے لیے آنے والے خانہ بدوش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زائرین میں اس امید کے ساتھ تبلیغ شروع کر دی کہ آپؐ کو مستقل تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ آپؐ نے دوسرے عربوں کو شامل کر کے دعوت اسلام کا دائرہ وسیع کرنے کے کام کا آغاز کر دیا۔ شروع شروع میں بدو قبیلوں کا رویہ جارحانہ اور توہین آمیز تھا اور انہوں نے حضورؐ کے دین میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ یہ دل شکستگی کا دور تھا لیکن چونکہ آنحضرتؐ کے فطری وسائل اپنے اختتام کو پہنچ چکے تھے، اس لیے ۶۲۰ عیسوی میں خدا نے آپؐ کو زندگی کے سب سے بڑے روحانی تجربے کا موقع بہم پہنچایا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معراج کی رات کو حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ کی بہن ام ہانیؓ کے گھر موجود تھے جو خانہ کعبہ کے قریب رہتی تھیں۔ آپؐ نصف شب کو بیدار ہوئے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ بعد میں حضورؐ نے کعبے سے ملحق شمال مغربی علاقے میں کچھ دیر کے لیے سونے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر جبرئیل نے آپؐ کو جگایا اور براق پر سوار کیا۔ (براق ایک چوپایہ ہے جو اپنا سم اپنی نظر کی انتہا پر رکھتا ہے ......مترجم)۔ حضورؐ کو راتوں رات معجزانہ طور پر بیت المقدس لے جایا گیا جسے قرآن مجید میں مسجد اقصیٰ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ خوب سننے، دیکھنے والا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۱......مترجم)۔ رات کے اس سفر (اسرا) کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جبرئیلؑ بیت المقدس پہنچے جہاں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور کئی دوسرے پیغمبر آپؐ کا استقبال کرنے کے لیے جمع تھے۔ مسجد اقصیٰ میں حضورؐ نے تمام انبیا کی امامت کرائی اور انہیں نماز پڑھائی۔ پھر آپؐ کے پاس تین برتن لائے گئے۔ ایک برتن میں دودھ، دوسرے میں شراب اور تیسرے میں پانی تھا۔ آپؐ نے دودھ پی لیا جو اسلامی تعلیمات کے مطابق فطرت کی راہ پانے، میانہ روی اختیار کرنے اور انتہا پسندی اور لذائذ دنیوی میں درمیانی راستہ اپنانے کی علامت ہے۔ اس کے بعد ایک سیڑھی لائی گئی جس کے ذریعے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جبرئیلؑ سات میں سے پہلے آسمان پر پہنچ گئے۔ ہر آسمان پر ایک عظیم المرتبت پیغمبر موجود تھا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں آپؐ کو دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا۔ عیسیٰ اور یحییٰؑ دوسرے، یوسفؑ تیسرے، ادریسؑ چوتھے، ہارونؑ پانچویں، موسیٰؑ چھٹے اور ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر موجود تھے۔ پھر حضورؐ کو پروردگار کے پاس پہنچا دیا گیا۔

محمد ابن اسحاق نے ذات خداوندی سے ملاقات کا نہایت تقدس آمیز لہجے میں مبہم تذکرہ کیا ہے البتہ انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے کے عملی استدلال کا پتا چلتا ہے۔ بہ ہر حال قرآن کریم میں اس ملاقات کے بارے میں کوئی آیت شامل نہیں۔ رسول اللہؐ جب عرش عظیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر پہنچے تو خدا نے آپؐ کو بتایا کہ مسلمانوں پر روزانہ پچاس نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ واپسی پر حضرت موسیٰ نے کہا کہ نماز بڑی بوجھل چیز ہے اور آپؐ کی امت کمزور ہے۔ آپؐ اپنے پروردگار کے پاس واپس جا کر نمازوں کی تعداد میں تخفیف کرائیں۔ حضرت موسیٰ حضورؐ کو خدا کے پاس واپس بھیجتے رہے یہاں تک کہ نمازوں کی تعداد گھٹ کر پانچ رہ گئی۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ تعداد بھی زیادہ ہے لیکن آنحضرتؐ نے فرمایا: میں اپنے پروردگار کے پاس بار بار گیا اور درخواست کی حتیٰ کہ مجھے شرم آنے لگی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد مسلمان مسلسل دن میں پانچ نمازیں ادا کرتے چلے آ رہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام نے اپنے پیروکاروں پر کوئی بھاری بوجھ نہیں ڈالا اور ہر مسلمان آسانی کے ساتھ پنجگانہ نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ (محمد ابن اسحاق سیرت رسول اللہ صفحہ ۱۷۲: The Life of Muhammad P. 186)۔

نبی کریمؐ کے اس روحانی تجربے کو اسلامی تصوف کے ارتقا میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ہر سال ساتویں قمری مہینے رجب کی ۲۷ویں تاریخ کو شب معراج کا جشن مناتے ہیں اور صوفیائے عظام، فلسفی اور شاعر صدیوں سے اس واقعے کی اہمیت پر خیال آرائی کرتے چلے آ رہے ہیں بلکہ معراج کے واقعے نے مغربی فکر اور ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ معراج کے بارے میں مسلمانوں کے نظریات اور نبی کریمؐ کا آسمانی سفر ڈیوائن کامیڈی Divine Comedy میں دانتے کے دوزخ کے تخیلاتی سفر پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ لیکن دانتے نے مغرب کے مخصوص روایتی تعصب کے زیر اثر پیغمبر اسلامؐ کو دوزخ کے ایک زیریں حلقے میں دکھایا ہے۔ (نعوذ باللہ......مترجم)۔ صوفیائے کرام نے نبی کریمؐ کے اس روحانی تجربے میں خاص طور پر گہری دلچسپی لی ہے اور یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ قرآن حکیم کی سورہ نجم میں رسول اللہؐ کے مشاہدۂ جمال کا ذکر کیا گیا ہے:

یقیناً اس نے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا
سدرۃ المنتہیٰ کے پاس
اس کے پاس جنۃ الماویٰ ہے
جب کہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی
نہ تو نگاہ بہکی، نہ حد سے بڑھی

یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں (سورہ نجم آیات ۱۳ تا ۱۸)

ہندوؤں کی روایات کے مطابق بیری کا درخت انسانی فہم وادراک کی آخری حد ہے۔ قرآن کریم میں یہ بات پوری طرح واضح کی گئی ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خدا کو نہیں، اس کی بعض نشانیوں کو دیکھا تھا۔ (Annemarie Schimmel: And Muhammad is His Messenger PP. 161-175)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان صوفیوں نے رسول کریمؐ کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے جنھوں نے خدا تک رسائی کے لیے ایک نیا اور منفرد انداز اختیار کیا۔ آپؐ کا یہ روحانی تجربہ کئی دوسرے مذاہب کی پاکباز شخصیتوں کے مشاہدے سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ تیرھویں صدی میں فارسی کے عظیم شاعر فریدالدین عطارؒ نے اسرا اور معراج کے واقعے کو نہایت دل نشین پیرائے میں بیان کیا۔ اس ضمن میں وہ دوسرے تمام انسانی نظریات اور تجربات کو پس پشت ڈال کر قرآن مجید میں مذکور سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے نکل گئے جو انسانی علم اور شعور کی آخری حد ہے۔ عطارؒ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آخرکار ہر چیز پیچھے چھوڑنا پڑی یہاں تک کہ آسمانی سفر کے آخری مرحلے میں جبرئیل بھی حضورؐ کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس پرواز کے دوران آنحضرتؐ معمول کے حواس، منطق اور استدلال سے آگے نکل کر تجربے کی ایک نئی اقلیم میں داخل ہو گئے البتہ اپنی ذات کو پیچھے چھوڑنے کی تیاری کا عمل ابھی جاری تھا:

جبرئیلؑ نے حاضرِ خدمت ہو کر کہا: اے پاکیزہ ہستی! آپؐ زمین پر کیوں ہیں؟ آسمانوں پر قدم رکھیے
جب آپؐ عزت و شرف کی بدولت عرش کے بادشاہ ہیں تو پھر فرش سے عرش پر صدر نشین ہو جائیے
جب آپؐ کی ذات گرامی دونوں جہانوں کے لیے رحمت ہے اور آپ کی رحمت دونوں جہانوں کی میزبان ہے
کچھ عرصہ آپؐ نے زمین کو سرفراز فرمایا ہے، اب آسمانوں کی باری ہے کہ وہاں آپؐ کا فیضان عام ہو
آپؐ اپنے فقر سے ان ممالک کو کیمیا بنائیے، اپنی خاک پا کو فرشتوں کا سرمہ بننے دیجیے
جب سرور کائناتؐ کا براق روانہ ہوا تو بجلی کی طرح ساتویں آسمان پر پہنچ گیا
آپؐ براق پر سواری کی حالت ہی میں کرسی پر پہنچے کیوں کہ آپؐ صاحب براق و منبر ہیں
آپؐ کے دائیں جانب آسمان کو اٹھانے والے فرشتے تھے اور بائیں طرف زمین کی نگرانی کرنے والے فرشتے
آسمان آپؐ کے براق کے لیے زمین تھا اور روح الامینؑ آپؐ کے دربان تھے
آپؐ کا جھنڈا عرش کی وسعتوں پر لہرایا، آپؐ نے مقعد صدق میں قدم رکھا
آسمانوں میں رہنے والوں میں غل مچ گیا کہ کائنات کے سردار وعدۂ ملاقات کے مطابق آن پہنچے ہیں
وہ یتیم جنھیں ابو طالب نے پالا پوسا، اب اللہ تعالیٰ کے دُرِ یتیم بن کر آ گئے (فریدالدین عطارؒ: الٰہی نامہ)

یہ تجربہ، جو تصوف کی تمام روایات میں مشترک ہے، اس عقیدے کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ کوئی شخص ذات خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فنا کے بعد اعلیٰ روحانی مرتبے پر فائز ہو گئے۔ آپؐ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد واپس تشریف لے آئے اور آپؐ نے عرفانِ ذات کے بارے میں انسانی استعداد میں وسعت پیدا کر دی۔ اسرا اور معراج کو اسلامی تصوف میں تمثیل کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درجہ حاصل ہو گیا۔ صوفیائے عظام نے ہمیشہ ذات خداوندی میں فنا ہو جانے کا ذکر کیا ہے جس کے بعد انسان کے درجات بلند ہو جاتے ہیں اور وہ بقا کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

بعض مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ اصرار رہا ہے کہ رسول اللہؐ نے معراج کا سفر جسمانی طور پر کیا تھا البتہ محمد ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حضور کا معراج کا سفر خالصتاً روحانی نوعیت کا تھا۔ بہر حال ہم اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ صوفیانہ تجربہ انسانی زندگی کی حقیقت ہے اور دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں اسے یکساں اہمیت حاصل ہے۔ بدھ مت کے پیروکار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسے روحانی تجربات، جن میں انسان شعور کی سطح سے بلند ہو کر مشاہدہ کرتا ہے، خالص فطری نوعیت کے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انسانی شعور اپنی انتہا پر پہنچ کر ایک مخصوص منظر یا افسانوی تصویر کے ذریعے اپنے روحانی مشاہدے کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ موت کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں، وہ بھی اپنی واردات کی اسی طرح کی منظر کشی کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد کسی عمارت کے دروازے پر کسی شخص سے ان کی ملاقات ہو جاتی ہے جو انہیں اسی دروازے سے واپس بھیج دیتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب سے تعلق رکھنے والے کئی مردوں اور عورتوں میں اس قسم کی سرگرمی کے لیے مخصوص استعداد موجود ہوتی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معراج، جیسا کہ مسلمان مصنفوں نے لکھا ہے، دوسری سے دسویں صدی تک پروان چڑھنے والی یہودی روایات سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ اس روحانی سفر کے لیے وہ فاقہ کشی کرتے ہیں اور ایسی مناجات اور دعائیں پڑھتے ہیں جس سے ان میں اس سفر کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی روایات بھی موجود ہیں کہ جب انہیں یہ تجربہ ہوتا ہے تو وہ اپنا سر گھٹنوں میں دے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ بھی نزول وحی اور روحانی استغراق کے موقعے پر اپنا سر گھٹنوں میں دے دیتے تھے۔ ان ریاضتوں کے دوران یہ لوگ سانس لینے کی مشقیں بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں عرش عظیم تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی ذات مطلق کے ساتھ ملاقات کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک صوفیانہ روایت ہے اور اس کے بانیوں کو برگزیدہ انسان سمجھا جاتا ہے جنہوں نے خدا تک پہنچنے کا نیا راستہ دریافت کیا اور اس مشکل کام کے دوران اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا۔

اسرا اور معراج کے بعض پہلو صوفیانہ شروعات سے، جب لوگ زندگی کو ایک اسلوب سے دوسری روش میں تبدیل کرتے وقت تکلیف دہ سفر کرتے ہیں، گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تجربہ شفا خانے کی نوجوان عیسائی منتظمہ پرپیچوا Perpetua سے خاصا ملتا جلتا ہے جو ۲۰۳ عیسوی میں سیورس میں ایذا رسانیوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور میں کارتھیج میں ہلاک ہوگئی تھی۔ اس کی موت کے فوراً بعد The Acts of Perpetua and Felicitas کے نام سے ایک کتاب مرتب ہوئی جسے بیشتر اسکالرز مستند اور درست سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ پرپیچوا جب جیل میں اپنے خلاف مقدمے کی کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہی تھی تو اس کے ساتھیوں نے اس پر زور دیا کہ وہ روحانی وجدان کے ذریعے خدا سے یہ دریافت کرے کہ آیا انہیں واقعی پھانسی کی سزا ملنے والی ہے؟ انہوں نے پرپیچوا سے یہ بات اس لیے کہی کیونکہ اس خاتون کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ غیر معمولی روحانی صلاحیتوں کی حامل ہے۔ چنانچہ پرپیچوا نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اگلے روز ان کے سوال کا جواب دے دے گی۔ جس طرح آج کے ماہرین نفسیات خوابوں کے ذریعے مختلف امراض کی تشخیص کرتے ہیں، اسی طرح پرپیچوا نے بھی اپنے لاشعور میں اثر پذیری کی مخصوص کیفیت طاری کر لی۔ اس رات خواب میں اس نے دیکھا کہ اس کے لیے ایک سیڑھی لائی گئی ہے جو آسمان تک جاتی تھی۔ اس زینے کے ذریعے سفر کرنا بہت دشوار تھا اور ایک موقع پر اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس کے آخر تک نہیں پہنچ پائے گی۔ لیکن اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی پر وہ بڑھتی چلی گئی اور آخر اسے عبور کر گئی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور خوبصورت باغ میں کھڑے پایا۔ وہاں ایک چرواہا ایک بھیڑ سے دودھ دوہ رہا تھا۔ اس نے کچھ دہی پرپیچوا کو کھانے کے لیے دی۔ وہ دہی کھا رہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوگئی اور اس نے دیکھا کہ جاگنے کے باوجود وہ کوئی میٹھی اور لذیذ شے کھا رہی ہے۔ اب اسے علم ہوگیا کہ اس کی موت یقینی ہے۔ اس نے اپنے قیدی ساتھیوں کو بتایا کہ ان کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس نے کئی اور خواب بھی دیکھے جن کی تفصیلات اس نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیں۔ ان خوابوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ موت کے ساتھ، جو اس کے قریب آ رہی تھی، لاشعوری طور پر سمجھوتا کرنے، ابدی زندگی پانے اور اس شہادت کے مقام پر فائز ہونے کی تیاری کر رہی ہے جسے مسیحیت کے ابتدائی دور میں آخری مذہبی تجربہ تصور کیا جاتا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات مقدسہ اپنے اختتام کو نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ حضورؐ اپنے مشن کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کرنے والے تھے۔ یہ صورت حال ماضی کے ساتھ، جو موت ہی کی ایک ماہیت تھی، مکمل قطع تعلق کی متقاضی تھی۔ لیکن رسول کریمؐ کا رویا باعثِ تسکین اور فرحت بخش تھا کیونکہ آنحضرتؐ نے ایک چرواہے سے نہیں، ماضی کے عظیم پیغمبروں کے ہاتھ سے دودھ پیا تھا۔ حضورؐ کا یہ عمل آپؐ سے پہلے نازل ہونے والی الہامی کتابوں کے تسلسل کی واضح علامت ہے۔

شمالی ایشیا اور شمالی امریکا کے بعض علاقوں میں مذہبی اور روحانی شخصیت کو شمن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ معراج کا واقعہ شمن کے روحانی تجربے سے مماثلت رکھتا ہے۔ امریکی اسکالر آنجہانی جوزف کیمبل Joseph Campbel کے مطابق شمن سائبیریا سے لے کر امریکا تک پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسی کیفیت میں داخل ہونے کے لیے، جہاں انہیں روحانی تجربات ہوں، مقدس مذہبی رقص کرنے لگتے ہیں۔ جوزف کیمبل نے ایک شمن کے تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

جب میں اپنے آپ میں سے ظاہر ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں اوپر چڑھ رہا ہوں۔ میں دھاگوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر جا رہا تھا۔ یہ دھاگے جنوب کی سمت میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں ایک دھاگے پر چڑھتا اور پھر اسے چھوڑ تا دیتا...... آخر میں وہاں جا پہنچا جہاں خدا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا ہو گیا۔ انسان خدا کے قریب پہنچ کر بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہاں تمہیں جو کچھ کرنا ہوتا ہے، کرتے ہو۔ پھر تم لوگوں کے پاس لوٹ آتے ہو...... اور آخر تم اپنے جسم میں واپس آ جاتے ہو۔ (The Power of Myth, P 87)۔

یہ شمن فنا کے مقام سے گزر کر ان علاقوں میں داخل ہو گیا تھا جہاں دوسرے لوگوں کا گزر ممکن نہیں۔ اس کے بعد اسے ان اساطیری مورتوں کی اقلیم تک رسائی حاصل ہو گئی اور اسے اگلے جہان کی خبریں ملنے لگیں۔

معراج کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ ادراک ہو گیا تھا کہ آپؐ کی حیثیت محض قریش کو خبردار کرنے والے ایک منکسر المزاج شخص سے کہیں زیادہ بالا اور برتر ہے۔ اس کے باوجود آپؐ ایک نئے محافظ انسان کی تلاش میں مصروف تھے۔ حج کے زمانے میں حضورؐ زائرین سے جا کر ملتے اور انہیں اسلام کی تبلیغ کرتے، خاص طور پر جب وہ منیٰ کی وادی میں تین روز تک قیام کرتے تو آپؐ ایک ایک خیمے میں جا کر ان سے ملاقات کرتے۔ ۶۲۰ عیسوی میں حج کے موقعے پر رسول اللہؐ کی ملاقات یثرب سے آنے والے چھ عرب بت پرستوں سے ہوئی جو مکہ کے قریب وادی منیٰ میں خیمہ زن تھے۔ آنحضرتؐ ان کے پاس بیٹھ گئے، انہیں اپنے مشن سے آگاہ کیا اور قرآن کریم کی تلاوت کی۔ لیکن اس مرتبہ ان لوگوں کا رویہ جارحانہ نہیں تھا بلکہ انہوں نے پوری توجہ اور غور سے آپؐ کی باتیں سنیں۔ جب حضورؐ نے گفتگو ختم کی تو وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ یقیناً یہ وہ نبی ہیں جن کے بارے میں یثرب کے یہودی ہمیشہ باتیں کرتے ہیں۔ یہ یہودی کئی برسوں سے اپنے بت پرست ہمسایوں کو لعن طعن کرتے اور ان سے ایک پیغمبر کے قصے بیان کرتے جو عاد اور ارم کے قدیم عرب قبیلوں کی طرح انہیں برباد کر کے ان کا صفایا کر دے گا۔ انہوں نے سوچا اگر یہ نبی واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہیں تو یہودیوں سے پہلے ان کے ساتھ رابطہ کر لینا چاہیے۔ ان زائرین نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یثرب کو درپیش سنگین مسائل کو بھی حل کر سکتے ہیں۔

اس زمانے میں یثرب ابھی تک مکہ کی طرح شہر نہیں بنا تھا بلکہ یہ صرف ایک نخلستان اور کوئی بیس مربع میل کے رقبے پر محیط ایک زرخیز جزیرہ تھا جس کے چاروں طرف آتش فشاں پہاڑیاں، چٹانیں اور بنجر پتھریلی زمین تھی۔ یثرب کوئی تجارتی مرکز نہیں، ایک زرعی بستی تھی جس میں مختلف قبائلی گروپ اپنے گھروندوں اور چھوٹے چھوٹے دیہات میں ایک دوسرے کے خلاف سخت دشمنی کے ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اصل میں اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاقے میں یہودی آباد کار کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ یہودی کہاں سے آئے تھے؟ ممکن ہے کہ وہ فلسطین کے مہاجر ہوں جو ۱۳۵ عیسوی میں رومیوں کی طرف سے بغاوت کو کچلنے کے بعد فرار ہو کر عرب میں آ بسے تھے۔ یہ امکان بھی موجود ہے کہ یہ لوگ یہودیت اختیار کرنے والے عرب قبیلے ہوں۔ تیسرا امکان یہ ہے کہ بعض منتشر عربوں نے متحد ہو کر عبرانیوں کا ایک گروپ تشکیل دینے کے بعد یہودیت اختیار کر لی ہو۔ ساتویں صدی کے شروع میں یثرب میں یہودیوں کے تین قبیلے بنی قریظہ، بنی نضیر اور چھوٹا اور نسبتاً کم اہمیت رکھنے والا قبیلہ قینقاع آباد تھے۔ یہودیوں کا علیحدہ مذہبی تشخص تھا لیکن دوسرے معاملوں میں ہمسایہ بت پرست عربوں سے انہیں ممیز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے نام بھی عبرانی نہیں، عرب تھے۔ وہ قبائلی روایات پر کاربند تھے اور دوسرے عرب قبیلوں کی طرح ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔

چھٹی صدی کے دوران بنی قیلہ جنوبی عرب سے نقل مکانی کر کے دوسرے یہودیوں کے ساتھ نخلستان میں آباد ہو گئے۔ یہ نو وارد بعد میں اوس اور خزرج قبیلوں میں بٹ گئے۔ اوس اور خزرج منفرد قبائلی حیثیت کے حامل اور مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ شروع شروع میں وہ دوسرے یہودیوں کے مقابلے میں کمزور تھے لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی زمین حاصل کر لی، قلعے تعمیر کر لیے اور یہودیوں کے ہم پلہ بن گئے۔ ساتویں صدی کے شروع میں اوس اور خزرج یہودیوں کی نسبت قدرے طاقتور تھے لیکن پھر انہوں نے آپس میں لڑائیاں شروع کر دیں۔

خانہ بدوشی سے آبادیوں میں منتقل ہونے کے عمل سے یثرب میں ایک بحران پیدا ہو گیا جو مکہ میں پائے جانے اضطراب اور بے چینی سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لق و دق ریگستانوں میں جن قبائلی روایات پر عمل کیا جاتا تھا، اب انہیں برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ صحرا میں خانہ بدوش اپنے آباء و اجداد کی زمینوں کی نہایت بے جگری سے حفاظت کرتے تھے۔ ایسا کرنا ان کے لیے بہت آسان تھا کیونکہ ان کی زمینوں کے درمیان وسیع فاصلے حائل تھے۔ لیکن جب یہ لوگ ایک چھوٹے سے نخلستان میں آباد ہو گئے جس میں ہر قبیلے کے پاس صرف چند ایکڑ زمین تھی تو پرانا نظام ٹوٹنے پھوٹنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گروپ نے دشمن کے علاقے پر حملے شروع کر دیے جس کے جواب میں انتقام لینے کا سلسلہ چل پڑا۔ رفتہ رفتہ یثرب کے مختلف قبائل میں تشدد آمیز کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے زمین تباہ ہو گئی، فصلیں برباد ہو گئیں اور یثرب کی دولت اور طاقت کے وسائل ختم ہونے لگے۔ اس تنازعے میں یہودی قبائل پوری طرح ملوث اور برسر پیکار قبیلوں اوس اور خزرج دونوں میں سے کسی ایک کے حلیف تھے۔ ۶۱۷ عیسوی تک دونوں فریق مسلسل لڑائی سے زچ ہو گئے اور کوئی بھی فریق مخالفین کو زیر نہ کر سکا۔ چنانچہ دونوں قبیلے اور ان کے اتحادی اس لڑائی کے باعث تھک ہار گئے۔ اسی سال خانہ جنگی کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگِ بعاث شروع ہوگئی جس میں اوس اور اس کے حلیف یہودی قبیلے بنی نضیر کو معمولی فتح حاصل ہوئی لیکن وہ اس فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان حالات میں ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ عربوں میں بادشاہت کے بارے میں پائے جانے والے گہرے شکوک وشبہات کے باوجود صرف ایک اعلیٰ اور بااختیار حاکم کا وجود ہی یثرب کے لیے واحد امید ہے۔ خزرج کے ایک سردار عبداللہ بن اُبی نے جنگ بعاث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ یہ جنگ بے کار ہے۔ اس طرح اسے ایک غیر جانبدار سردار کی حیثیت حاصل ہوگئی اور لوگ اس کے بارے میں یہ سوچنے لگے کہ مستقبل میں وہی یثرب کا بادشاہ یا حاکم اعلیٰ ہوگا۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ لوگ اس حل سے مطمئن نہیں تھے۔ اوس کے لوگ خزرج قبیلے کے ایک شخص کو کلی اختیارات دینے میں متذبذب تھے۔ اس کے علاوہ خزرج کے کمزور قبیلے بھی ابنِ اُبی کو اپنا حاکم ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔

نبی کریمؐ نے ۶۲۰ عیسوی کے حج کے دنوں میں یثرب کے چھ زائرین سے ملاقات کی تو ان لوگوں نے فطری طور پر یہ بھانپ لیا کہ آپؐ اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے عبداللہ ابنِ اُبی کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر جانبدار رہنما ثابت ہوں گے۔ انہیں حضورؐ کے توحید پرستی کے عقیدے سے بھی کوئی صدمہ نہ ہوا۔ وہ ایک طویل عرصے سے یہودیوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور اس عقیدے کو سننے کے عادی تھے کہ اللہ صرف ایک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ پرانی دیویوں کو جنوں اور فرشتوں کا درجہ دینے پر رضامند تھے۔ وہ طویل مدت تک خود کو اس لیے یہودیوں سے کمتر سمجھتے چلے آرہے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی الہامی کتاب موجود نہیں تھی اور نہ ہی وہ عالم فاضل لوگ تھے۔ (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۳۴: The Life of Muhammad P 93)۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس دعوے سے ان کے دلوں میں ہیجان پیدا ہوگیا کہ آپؐ عربوں کے پیغمبر ہیں اور ان کے لیے عربی زبان میں قرآن لے کر آئے ہیں۔ یہ سن کر ان میں یثرب کے لیے بڑی امیدیں پیدا ہوگئیں اور انہوں نے فوراً خدا کی اطاعت قبول کر لی: ''ہم نے اپنی قوم کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ عداوت اور فتنہ جس قدر ان میں ہے، کسی اور قوم میں نہیں۔ شاید آپؐ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان میں اتحاد پیدا کر دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپؐ کے معاملہ (نبوت) کی جانب انہیں بھی مدعو کریں گے۔ انہیں بھی آپؐ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کر لیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپؐ کے متعلق متفق کر دیا تو کوئی آپؐ سے زیادہ طاقتور نہ ہوگا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۸۷: The Life of Muhammad P. 198)۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے وعدہ کیا کہ وہ ایک سال کے بعد آپؐ سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ آنحضرتؐ کے لیے نخلستان میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ آزادانہ نقل وحرکت کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حمایت حاصل کرنا ضروری تھا۔ آپؐ کو ہمیشہ سے یقین تھا کہ یہود آپؐ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کریں گے کیونکہ آپ کا پیغام ان جیسا تھا۔ ان زائرین کا تعلق خزرج کے چھوٹے قبیلوں سے تھا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے یثرب کو متحد کرنے کے لیے قبیلہ اوس کے بعض لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنا ناگزیر تھا۔

چند برسوں سے مسلمانوں کے نصب العین کی رفتار مدھم پڑ گئی تھی لیکن یہ اس بات کی علامت تھی کہ حالات کا رخ بہتری کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس سال آنحضرتؐ نے اپنے گھریلو امور میں بھی کئی اہم تبدیلیاں کیں۔ آپؐ کو ایک بیوی کی ضرورت تھی اور آپؐ اپنی زندگی میں ایک خاتون کی موجودگی کے آرزومند تھے چنانچہ یہ تجویز کیا گیا کہ آپؐ کو بنی عامر کے سردار سہیل کی عم زاد اور خواہر نسبتی حضرت سودہؓ کے ساتھ شادی کر لینی چاہیے۔ وہ اور ان کے شوہر سکران، جو سہیل کے بھائی تھے، ۶۱۶ عیسوی میں ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے۔ مکہ واپسی کے تھوڑی دیر بعد سکران وفات پا گئے۔ حضرت سودہؓ حضورؐ کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو گئیں اور سہیل کے ایک اور بھائی حاطب ابن عمرو نے آنحضرتؐ سے ان کا عقد کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ بھی، جو پچھلے کئی برسوں سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر رسول کریمؐ کے ساتھ مکمل وفاداری کا اظہار کر چکے تھے، حضورؐ کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ۶۲۰ عیسوی میں ان کی چھوٹی بیٹی حضرت عائشہؓ کی عمر صرف چھ سال تھی اور نبی کریمؐ کے نئے سرپرست، نوفل قبیلے کے سردار مطعم کے بیٹے سے ان کی پہلے ہی منگنی ہو چکی تھی۔ لیکن مطعم اس رشتے کو چھوڑ دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی بیوی کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کا بیٹا مسلمان ہو جائے گا۔ آخر ایک تقریب میں حضرت عائشہؓ کی حضورؐ کے ساتھ باضابطہ منگنی ہو گئی جس میں وہ خود موجود نہیں تھیں۔ بعد میں وہ بتایا کرتی تھیں کہ انہیں اپنی نئی حیثیت کا پہلا اشارہ اس وقت ملا جب والدہ نے انہیں بتایا کہ اب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گلی میں نہیں کھیل سکتیں بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی سہیلیوں کو کھیلنے کے لیے گھر بلا لیا کریں۔

مغرب میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہراتؓ کے بارے میں بھیانک اور فحش قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں اور جیسا کہ میں اس کتاب کے پہلے باب میں لکھ چکی ہوں، حضورؐ کو (نعوذباللہ ..... مترجم) ایک نفس پرست شخصیت کے طور پر ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ بعد میں قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہو گیا کہ ایک مسلمان چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا البتہ رسول اللہؐ کو زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس زمانے میں عرب میں صرف چند لوگ ہی ایک بیوی رکھتے تھے۔ آنے والے برسوں میں جب آنحضرتؐ عظیم عرب رہنما بن گئے تو بڑے حرم کو آپؐ کی بلند حیثیت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت قبائلی معاشرے میں کثیر الازدواجی کو کسی شخص کی حیثیت کا معیار اور نمونہ تصور کیا جاتا تھا۔ انجیل میں داؤد بادشاہ کی جنسی زندگی اور سلیمان بادشاہ کے وسیع حرم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوتنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ ان پیغمبروں سے موازنہ کیا جائے تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معاملہ بالکل بے ضرر معلوم ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ کی طرح یہ دونوں پیغمبر بھی ایسے زمانے میں رہتے تھے جب لوگ ایک قبائلی نظام سے اپنا تعلق توڑ کر شہری معاشرے میں ڈھل رہے تھے۔ لیکن یہ سوچنا بالکل غلط ہوگا کہ رسول اللہؐ (نعوذ باللہ ...... مترجم) دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی کئی ازواج مطہراتؓ، جیسا کہ ہم دیکھیں گے نعمتِ خداوندی ثابت ہوئیں۔ اس ضمن میں ہمیں دو باتوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ میں سے کسی کا انتخاب جنسی کشش کی وجہ سے نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ شادی کے وقت بہت چھوٹی تھیں اور حضرت سودہؓ عمر کی تیسری دہائی گزار رہی تھیں اور عمر کے اس حصے میں فربہ ہونے لگی تھیں۔ ہمیں ان کے متعلق مزید کچھ معلوم نہیں۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ شادی کسی محبت کا نتیجہ نہیں، محض ایک عملی ضرورت کے تحت عمل میں آئی تھی۔ وہ حضورؐ کے گھر کو سنبھال سکتی تھیں۔ شادی کے بعد ان کی قدرومنزلت اور حیثیت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، خاص طور پر مسلمانوں کے نزدیک تو وہ ام المومنین کا درجہ رکھتی تھیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں شادیوں میں سیاسی مصلحتوں کا بھی دخل تھا۔ آنحضرتؐ کو سہیل سے، جو ایک کٹر مذہبی شخص تھے، اب بھی بڑی توقعات تھیں۔ حضرت سودہؓ کے ساتھ شادی کے بعد حضورؐ کی ان سے عزیز داری قائم ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ سے قریبی اور خاندانی تعلقات قائم کرنا بھی رسول اللہؐ کے لیے بہت اہم تھا۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خونی رشتوں کے بجائے نظریے کی بنیاد پر ایک متبادل برادری تشکیل دینے میں مصروف تھے۔ اس کے باوجود خونی رشتوں کو اب بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ کے ساتھ قرابتداری قائم کر کے بڑی خوشی ہوئی ہوگی کیونکہ وہ مکہ میں ایک مرتبہ پھر تنہا ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے مکان کے دروازے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کر لی جس سے قبیلہ جمح ان کے خلاف ہو گیا۔ ''ابوبکرؓ ایک رقیق القلب شخص تھے''۔ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے: ''اور جب وہ قرآن کی تلاوت کرتے تو روتے، اس وجہ سے لڑکے، غلام اور عورتیں آپ کے پاس کھڑی ہو جاتیں اور آپ کی اس ہیئت کو سب کے سب پسند کرتے''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۴۶ The Life of Muhammad P 171)۔ ابن الدغنہ نے جب ابوبکرؓ کو پناہ دی تھی تو قریش کا خیال تھا کہ اب وہ لوگوں کے سامنے عبادت نہیں کریں گے چنانچہ قریش کے چند لوگ بدوی سردار کے پاس گئے اور طیش میں آ کر کہنے لگے:

اے ابن الدغنہ! کیا تو نے اس شخص کو اس لیے پناہ دی ہے کہ وہ ہمیں تکلیف پہنچائے؟ وہ ایسا شخص ہے کہ جب نماز میں وہ کلام پڑھتا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لایا ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے اور (وہ) روتا ہے۔ اس کی ایک خاص ہیئت اور طریقہ ہوتا ہے کہ بچوں، عورتوں اور کمزور لوگوں کے متعلق ہمیں خوف ہوتا ہے، شاید وہ انہیں فتنے میں ڈال دے۔ تو اس کے پاس جا اور حکم دے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ اپنے گھر کے اندر رہے اور اس میں جو چاہے، کرے۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۴۶ :The Life of Muhammad P. 171)

لیکن ابوبکرؓ نے اپنی مسجد کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ غالباً انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس معاملے میں مزید کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے اور یہ کہ جتنا ہو سکا، سو ہو چکا، اب اس سے زیادہ برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ کفار نے ایک مرتبہ پھر انہیں توہین آمیز کارروائیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ جب وہ شہر سے گزرتے تو لوگ ان کے سر پر مٹی پھینک دیتے۔ اس پر قریش کے سرداروں نے حقارت کے ساتھ ان سے کہا: ''یہ تو وہ مٹی ہے جسے تم خود اپنے سر پر اٹھا کر لائے ہو''۔

۶۲۱ عیسوی میں حج کے موسم میں یثرب کے وہ چھ افراد واپس مکہ آئے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے عقبہ میں حضورؐ سے پھر ملاقات کی اور اس عہد کو دہرایا کہ وہ صرف ایک اللہ کی پرستش اور اس کے احکام کی تعمیل کریں گے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے بعد میں بتایا:

ہم نے رسول اللہؐ سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، نہ چوری کریں گے، نہ زنا کے مرتکب ہوں گے، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گے، نہ جان بوجھ کر اپنے سامنے کسی پر جھوٹا الزام لگائیں گے اور نہ کسی اچھی بات میں آپؐ کے حکم کے خلاف جائیں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: پھر اگر تم نے اس کی پوری تعمیل کی تو تمہارے لیے جنت ہے اور اگر ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کیا تو تمہارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے، وہ چاہے سزا دے اور چاہے بخش دے۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۸۹ :The Life of Muhammad P.199)

اس ملاقات میں، جو بعد میں پہلی بیعت عقبہ کے نام سے موسوم ہوئی، سیاست کے بجائے دین پر زیادہ زور دیا گیا۔ قدیم بت پرستی یثرب کو درپیش بحران کو حل کرنے میں ناکام ہو گئی تھی اور لوگ ایک نئے نظریے کو قبول کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین نے مسلمانوں کو ایک فرد کی حیثیت سے دوسرے لوگوں اور ان کے ناقابل تنسیخ حقوق کا احترام کرنے کا درس دیا۔ یہ نیا ضابطہ اخلاق اب قبیلے کے اس پرانے اجتماعی نصب العین کی جگہ لینے والا تھا جس میں افراد کے مقابلے میں گروپ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ انفرادیت کا یہ نیا نظریہ ایک نئے معاشرے کی بنیاد بننے والا تھا کیونکہ اس سے یثرب کے باشندے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ریگستان کی طرح، جہاں ضروریات زندگی وافر مقدار میں دستیاب نہیں تھیں، ایک شخص کے فائدے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اس سے دوسرے شخص کو نقصان پہنچے۔

یہ حاجی جب مکہ سے واپس یثرب روانہ ہوئے تو نبی کریمؐ نے حبشہ سے لوٹنے والے ایک نہایت باصلاحیت مسلمان مصعبؓ بن عمیر کو ان لوگوں کے ساتھ بھیج دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو قرآن پڑھائیں، اسلام کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم دیں اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں۔ اوس اور خزرج کے درمیان قبائلی نفرت اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ وہ نماز میں ایک دوسرے قبیلے کا امام بننے یا اس سے قرآن سننے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ یہ فرائض ایک غیر جانبدار نووارد مصعبؓ کو ادا کرنا پڑے۔ شروع شروع میں نئے دین کے بارے میں قبیلہ اوس کے سرکردہ افراد کا رویہ نہایت جارحانہ تھا۔ لیکن ایک نامور قبیلے بنی عبدالاشہل کا سردار سعد ابن معاذ ایک دن یہ سن کر غضب ناک ہو گیا کہ مصعبؓ اس کے علاقے میں باغ میں بیٹھ کر اس کے قبیلے والوں کو اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ بہ ہر حال حضرت مصعبؓ اس کے خالہ زاد بھائی اسعدؓ بن زرارہ کے مہمان تھے اور اسعدؓ یثرب کے ابتدائی چھ نو مسلموں میں شامل تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ سعد کے لیے کسی مہمان کی توہین کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے نائب اسید ابن حضیر سے کہا کہ وہ مصعبؓ کو اس کے علاقے سے باہر نکال دے۔ اُسید نے اپنی برچھی پکڑی اور باغ کی طرف چل پڑا۔ جب اس نے چند لوگوں کو حلقہ بنائے مصعبؓ کے ارد گرد بیٹھے دیکھا تو وہ سخت مشتعل ہو گیا اور مصعبؓ سے کہنے لگا: تم ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بنانے کے لیے ہمارے پاس کیوں آئے ہو؟ حضرت مصعبؓ نے جواب دیا: کیا آپ بیٹھ کر میری بات نہیں سنیں گے؟ اگر کوئی بات آپ کی مرضی کے مطابق ہو تو قبول کیجیے اور اگر ناپسند ہو تو اس سے اپنے آپ کو بچایئے۔ چنانچہ اُسید نے اپنی برچھی زمین میں گاڑ دی اور ان کے پاس بیٹھ کر قرآن سننے لگے۔ قرآن کا حسن حسبِ معمول اپنا کام کر گیا اور اُسید کے دل میں اتر گیا۔ اُسید کے قبیلے والوں نے اس کے چہرے کی چمک سے آثار اسلام کی شناخت کر لی۔ مصعبؓ نے قرآن کی تلاوت ختم کی تو اُسید نے کہا: یہ چیز تو بہت ہی خوب اور بہترین ہے۔ جب تم کسی کو اپنے دین میں داخل کرنا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟ حضرت مصعبؓ نے ان سے کہا کہ وہ غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہن لیں، کلمہ توحید پڑھیں اور کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کر لیں۔ جب اُسید نے یہ تقاضے پورے کر لیے تو وہ سعد کو تلاش کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

جب سعد نے انہیں دیکھا تو کہا: میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اُسید جس حالت میں گیا تھا، اس سے بالکل جدا حالت میں واپس آ رہا ہے۔ سعد نے ان کے ہاتھ سے برچھی لے لی اور کہا: واللہ! میں تو سمجھتا ہوں کہ تم نے کچھ کام کی بات نہیں کی۔ پھر وہ باغ کی طرف چل پڑے۔ ان کے ساتھ بھی ٹھیک وہی واقعہ پیش آیا۔ حضرت مصعبؓ نے ان سے کہا کہ وہ بیٹھ کر ان کی بات سنیں۔ سعد نے اپنی برچھی زمین میں گاڑ دی اور ان کے دل پر بھی قرآن اپنا اثر کر گیا۔ حضرت سعدؓ کا قبولِ اسلام فیصلہ کن ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے ان سے دریافت کیا کہ وہ اپنے درمیان انہیں کیسا سمجھتے ہیں؟ ان لوگوں نے جواب میں کہا: آپ ہمارے سردار، ہم سب میں زیادہ خویش پرور، سب سے بہترین رائے رکھنے والے اور بڑی عقل والے ہیں۔ سعدؓ نے ان سے کہا: جب تک تم لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہ لاؤ، تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحات ۲۹۱۔ ۲۹۲: The Life of Muhammad PP. 200-201)۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے قبیلے نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کر لیا۔ اس واقعے میں صدیوں سے زیب داستاں کے لیے کچھ اضافے کیے گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سعدؓ یثرب کے انتہائی سرگرم اور پر جوش مسلمان ثابت ہوئے۔ ان کے قبول اسلام سے ان لوگوں پر گہرا اثر ہوا جو ایک نئی اور مضبوط قیادت اور ان کے بظاہر ناقابل حل مسئلے کو طے کرنے کے لیے مضطرب تھے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نخلستان کے ہر گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد مسلمان ہو گیا البتہ اوس قبیلے میں اس کے سردار اور شاعر ابو قیس بن الاسلت کی وجہ سے کچھ بت پرستوں کی طرف سے قدرے مزاحمت کی گئی۔ اس زمانے میں قبیلے کے تشخص کو اجاگر کرنے میں شاعروں کا بڑا عمل دخل تھا اور جس طرح آج میڈیا اپنا کردار ادا کر رہا ہے، اس دور میں یہ کردار شاعروں کا تھا جو کسی شخص کی نیک نامی اور شہرت کو برباد کر سکتے تھے۔ عرب میں مخالفانہ شعری پروپیگنڈا اس قدر تباہ کن تھا جس طرح ایک بڑی فوجی شکست! چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا مذاق اڑانے والے شاعروں کے بارے میں جو جارحانہ رویہ اختیار کیا، اس پر غور کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ یثرب میں آزمائش کے سال ابو قیس نے اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ وہ عربوں کے توحید پرستی کے مسلمہ عقیدے پر سختی سے قائم رہیں اور قرآن کو تسلیم نہ کریں جس میں بقول اس کے بیرونی عقائد شامل کیے گئے ہیں۔ جب وہ اسلام کو سمجھا تو اس کے متعلق اور لوگوں کے اس میں اختلاف کرنے کے باب میں اس نے اللہ سے، جسے یثرب کے باشندے پہلے ہی خدائے واحد تسلیم کرتے تھے، یوں خطاب کیا:

اے پروردگار! چند چیزیں گڈمڈ ہو گئی ہیں جن میں دشواریاں آسانیوں کے ساتھ خلط ملط کر دی جاتی ہیں
اے پروردگار عالم! اگر ہم گمراہ ہوں تو تُو ہمیں نیکی کے راستے کی توفیق عطا فرما
اگر ہماری پرداخت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو ہم یہودی ہو جاتے اور یہودیوں کا دین بھی ایسی کوئی چیز نہیں جسے حقائق سے کوئی مشابہت ہو
اگر تو ہماری پرداخت کرنے والا نہ ہوتا تو ہم نصرانی ہو جاتے اور راہبوں کے ساتھ کوہ جلیل میں رہنے لگتے
لیکن جب ہمیں پیدا کیا تو ایسے دین والا بنا کر پیدا کیا گیا کہ ہر قسم کے لوگوں سے ہمارا دین توحید الگ تھلگ ہے
ہم قربانی کے جانور لے جاتے ہیں تو وہ جھولوں میں کھلے بازو اس طرح فرمانبرداری سے چلتے ہیں گویا مقید ہیں

ابو قیس نے مکہ کے نئے دین میں اہل کتاب کی کئی باتیں دیکھیں تو اسے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ پہلی بیعت عقبہ میں رسول اللہؐ نے یہودیوں کی بعض اہم مذہبی عبادات کو متعارف کرایا تھا۔ آپؐ نخلستان کے یہودیوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہاں تھے اور آپؐ کی خواہش تھی کہ تنہائی کے طویل عرصے کے بعد اس قدیم مذہب کے پیروکاروں سے مل کر کام کیا جائے اور ان کے ساتھ عبادت کی جائے۔ حضورؐ نے حضرت مصعبؓ کو ہدایت کی کہ وہ جمعہ کی سہ پہر کو اس وقت، جب یہودی سبت کی تیاری کر رہے ہوں، مسلمانوں کے ایک خصوصی اجتماع کا اہتمام کریں۔ نماز جمعہ کا اجتماع یہودی تہوار سے ربط پیدا کرنے کی کوشش تھی تاہم آنحضرتؐ نے اعلیٰ حکمت عملی اور تدبر کے ذریعے ان دونوں تہواروں کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا۔ اس کے بعد آپؐ نے یہودیوں کے یوم کفارہ کے موقع پر، جو یہودیوں کی تقویم کے ساتویں مہینے تشری کے دسویں روز منایا جاتا تھا، مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے روزے کو عاشورہ کے نام سے موسوم کیا گیا جس کا آرامی اور عربی زبانوں میں مطلب ہے دسواں۔ اب مسلمانوں کو دوپہر میں، جیسا کہ یہود کرتے تھے، نماز پڑھنے کا بھی حکم دے دیا گیا۔ اس سے پہلے مسلمان صرف فجر اور مغرب اور رات کو عشا کی نمازیں پڑھتے تھے۔ اب مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ وہ یہودی عورتوں سے شادی کر سکتے اور ان کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں۔ مسلمان کھانے میں حلال حرام کے سلسلے میں یہودیوں کے قوانین پر عمل کرتے البتہ مسلمانوں کے قوانین اصلاح شدہ صورت میں نافذ کیے گئے۔ (کل پاکیزہ چیزیں آج تمہارے لیے حلال کی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے، اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں، ان کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں جب کہ تم ان کے مہر ادا کرو، اس طرح کہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کرو یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو، منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں اور آخرت میں وہ ہارنے والوں میں سے ہیں۔ (سورہ المائدہ آیت ۵ ...... مترجم)۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا۔ معراج کی رات آنحضرتؐ کو بیت المقدس لے جایا گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ قدیم مقدس شہر مسلمانوں کا بھی مرکز ہے۔ اسی طرح بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنا لینے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت کا مسلسل احساس رہے اور نئے دین کا پرانے ادیان کے ساتھ رابطہ قائم رہے۔ اب مسلمان دن میں تین مرتبہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، وہ اپنے جسمانی رویے سے یہ بات ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کا نصب العین اہل کتاب سے مختلف نہیں ہے۔

قرآن کریم میں یثرب کے لیے وہی آرامی نام استعمال کیا گیا جس نام سے یہودی اسے پکارتے تھے یعنی مدنتا جس کا مطلب ہے شہر۔ عربی زبان میں یہ لفظ المدینہ بن گیا جو اب مدینہ ہے۔ پانچ سال پہلے جب حضورؐ اپنے بعض صحابہؓ کے لیے ایک نئی جائے پناہ تلاش کر رہے تھے تو آپؐ نے حبشہ کے عیسائیوں سے بھی درخواست کی تھی البتہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کن وجوہ کی بنا پر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خود یہ احساس ہو گیا کہ آپؐ کا مکہ میں رہنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن عربوں کے لیے بھیجے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے والے پیغمبر کے لیے عرب کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس مرتبہ آپؐ نے پوری مسلمان برادری پر زور دیا کہ وہ آپؐ کے ہمراہ مدینہ کے نخلستان کی جانب ہجرت کرے، اسی لیے آپؐ وہاں پہلے سے موجود یہودی قبیلوں سے امداد اور حمایت کی اپیل کر رہے تھے۔

۶۲۲ عیسوی میں حج کے موسم کے دوران زائرین کی ایک بڑی جماعت مدینہ سے مکہ روانہ ہوئی۔ ان میں سے بعض لوگ اب بھی مشرک تھے البتہ ۷۳ افراد اور دو خواتین مسلمان تھیں۔ یہ لوگ مدینہ کے نہایت با اثر خاندانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس سفر میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے آئندہ کے واقعات کی حیرت انگیز طور پر پیش بینی ہوتی تھی۔ قبیلہ خزرج کے ایک سردار براءؓ بن معرور نے تذبذب کے ساتھ دوسرے ہم سفر مسلمانوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں حج کے دوران اپنا قبلہ تبدیل کر لینا چاہیے۔ یہ سب لوگ بڑے اشتیاق اور ولولے کے ساتھ مکہ جا رہے تھے جہاں اللہ کا اہم ترین معبد موجود تھا اور جہاں ان میں سے بیشتر لوگ پہلی مرتبہ رسول اللہؐ سے ملاقات کرنے والے تھے۔ جب یہ لوگ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تو مکہ کی جانب ان کی پیٹھ ہو جاتی جس سے ان کی سرکشی ظاہر ہوتی۔ دوسرے مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ براءؓ کا کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا غلط ہے کیونکہ جہاں تک انہیں معلوم تھا، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قبلہ بیت المقدس تھا اور یہ لوگ بھی اسی قبلے کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ لیکن براءؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور سفر کے دوران مکہ ہی ان کا قبلہ رہا۔ ان کے دل میں قبلہ کے بارے میں شبہ پیدا ہو گیا اور جب وہ مکہ پہنچے تو آنحضرتؐ کو تلاش کرنے کے لیے فوراً کعبہ پہنچ گئے اور اس معاملے میں حضورؐ کی رائے دریافت کی۔ رسول اللہؐ نے براءؓ کے سوال کا مبہم انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''تم ایک قبلے پر مامور تھے، کاش تم نے اس پر صبر کیا ہوتا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۹۵: The Life of Muhammad P. 202)۔ لیکن چونکہ نبی کریمؐ ابھی تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس لیے حضرت براءؓ نے بھی حضورؐ کی پیروی کی۔ بعد میں ان کے قبیلے والے براءؓ کی روحانی بصیرت کو یاد کرتے۔ وہ مکہ سے واپس مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد انتقال کر گئے اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ قریب المرگ شخص کے وجدان پر نہایت سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔

منیٰ کی وادی میں مناسک حج کے دوران عقبہ میں ایک اور ملاقات ہوئی لیکن یہ ملاقات نصف شب کے قریب ہوئی۔ اس سال جو عہد کیا گیا، وہ بعد میں عہد جنگ کے نام سے مشہور ہوا: ''ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم تنگ حالی، تونگری، خوشی، مجبوری اور ہر قطعی حکم میں، جو ہمیں دیا جائے، رسول اللہؐ کی مکمل اطاعت کرتے ہوئے جنگ کریں گے، ہم جہاں کہیں بھی ہوں، حق بات کہیں گے اور اللہ (کے احکام) کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کریں گے''۔ (تاریخ رسول واللوک صفحہ ۱۲۸۱: ڈبلیو منٹگمری واٹ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Muhammad at Medina P.205)۔عہد جنگ کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اسلام اچانک ایک جارح اور عسکری دین بن گیا تھا۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستقبل قریب میں جو قدم اٹھانے والے تھے، یہ عہد اسی کے تقاضے پورے کرنے کی غرض سے لیا گیا تھا۔رسول اللہؐ اپنے صحابہؓ پر بار بار زور دے رہے تھے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں لیکن یہ ہجرت محض ایک جغرافیائی تبدیلی نہیں تھی۔مکہ کے مسلمان قریش سے تعلقات منقطع کر کے اس قبیلے کی مستقل پناہ حاصل کرنے والے تھے جس کے ساتھ ان کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔اس سے پہلے ایسی ہجرت کی کوئی مثال نہیں ملتی جو نہ صرف ذی ہوش عربوں کے خلاف ایک جارحانہ کارروائی تھی بلکہ اس سے قدیم دیویوں کے ساتھ بھی لاتعلقی کا اظہار ہوتا تھا۔عرب میں ہمیشہ سے کنفیڈریشن سسٹم چلا آ رہا تھا جس کی رو سے ایک فرد یا پورا خاندان دوسرے قبیلے کی اعزازی رکنیت قبول کر کے اس کی حفاظت میں آ جاتا تھا لیکن یہ کوئی مستقل تفریق نہیں تھی اور عرب میں خونی رشتوں کو مقدس حیثیت حاصل تھی اور یہی رشتے معاشرے کی اساس تھے۔خود ہجرت کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت کر کے مدینہ جانے کا فیصلہ کرنے والے مسلمان اس کارروائی کو حد درجہ تکلیف دہ علیحدگی تصور کرتے تھے۔لفظ ہجر یا ہجرہ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:"دوستانہ یا محبت آمیز تعلقات یا روابط کو منقطع کر لینا"۔(ڈبلیو منٹگمری واٹ:Muhammad in Mecca: History in the Quran P.25)

دوسری طرف مدینہ کے لوگوں کو یہ عہد کرنا تھا کہ وہ ان لوگوں کو، جو ان کے رشتے دار ہیں، تحفظ اور امداد فراہم کریں گے۔اس کے بعد انھیں نبی کریمؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی حفاظت اور امداد دینے والوں یعنی انصار کے نام سے موسوم کیا گیا۔انصار کا ترجمہ عام طور پر مددگار کیا جاتا ہے لیکن اس سے صحیح تاثر کی عکاسی نہیں ہوتی۔نصر کا مطلب یہ تھا کہ آپ جن لوگوں کو تحفظ اور امداد فراہم کر رہے ہیں، ضرورت پڑنے پر اس مقصد کے لیے آپ کو طاقت بھی استعمال کرنا ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے جنگ لڑنے پر بیعت کی تھی۔

یہ بیعت خفیہ طور پر کی گئی۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہتے تھے کہ آپؐ کے مکہ کے صحابہؓ کو ہجرت کے فیصلے کا علم نہ ہو کیونکہ اس وقت آپؐ کو سنگین خطرات کا سامنا تھا۔محمد ابن اسحاق نے ہجرت کے مثبت پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کرنے کا فیصلہ رضاکارانہ طور پر کیا گیا تھا۔لیکن قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو مکہ سے جبراً نکال باہر کیا گیا تھا۔(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور (خود) اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔تم تو دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس آ چکا ہے، کفر کرتے ہیں۔پیغمبرؐ کو اور خود تمہیں بھی محض اس وجہ سے جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو۔اللہ تعالیٰ تمہیں صرف ان لوگوں کی محبت سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائیاں لڑیں اور تمہیں دیس نکالے دیے اور دیس نکالا دینے والوں کی مدد کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(سورہ الممتحنہ آیات ۱ تا ۹ ...... مترجم)۔ ہم نے کتنی بستیوں کو، جو طاقت میں تیری اس بستی سے زیادہ تھیں جس سے تجھے نکالا، ہلاک کر دیا ہے جن کا مددگار کوئی نہ تھا۔ (سورہ محمد آیت ۹ ...... مترجم)۔ رسول کریمؐ کو معلوم تھا کہ کفار آپؐ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ (اور اس واقعے کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپؐ کی نسبت تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپؐ کو قید کر لیں یا آپؐ کو قتل کر ڈالیں یا آپؐ کو خارج وطن کر دیں، اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور سب سے مستحکم تدبیر کرنے والا اللہ ہے۔ (سورہ انفال آیت ۳۰ ...... مترجم)۔ غالباً مطعم نے طائف سے واپسی پر حضورؐ کو صرف اس شرط پر اپنی پناہ میں لیا تھا کہ آپؐ لوگوں کو دین اسلام میں داخل کرنے کا کام بند کر دیں گے۔ قرآن حکیم میں ہجرت کے فوائد کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ۶۲۲ عیسوی کے حج کے موقعے پر ہونے والی ملاقات پُر خطر تھی اور یہ بیعت تمام پلوں کو جلا کر کی گئی تھی۔ اس ملاقات کو خفیہ رکھنا ضروری تھا چنانچہ انصار نے اپنے ساتھ حج کے لیے آنے والے مشرکوں سے اس کا ذکر تک نہ کیا اور قریش مکہ کو مسلمانوں کی ہجرت کے منصوبے کا خفیف سا علم بھی نہ ہو سکا۔

بیعت عقبہ ثانی کی رات انصار نے اپنے مشرک ساتھیوں کو خیموں میں سونے دیا اور تیتر کی چال یعنی دبے پاؤں عقبہ کے مقام پر پہنچے۔ اس وقت حضورؐ کے چچا عباس ابن عبدالمطلب، جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ تھے۔ انہیں اپنے بھتیجے کے ساتھ محبت تھی اور ابتدائی ماخذوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ مدینہ میں حضورؐ مکمل طور پر محفوظ رہیں۔ انہوں نے کارروائی کا آغاز انصار کو خبردار کرتے ہوئے کیا اور ان سے کہا کہ وہ بیعت کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں کہ مدینہ میں وہ رسول اللہؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی قریش سے حفاظت کر سکیں گے یا نہیں؟ ''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں جس جانب بلا رہے ہو، وہاں ان کا پورا پورا حق ادا کرو گے اور انہیں مخالفوں سے بچاؤ گے تو جو بار اپنی خوشی سے سر لیتے ہو، لو۔ اور اگر انہیں لے جانے کے بعد مخالفوں کے حوالے کر دینے اور ان کی مدد سے دست بردار ہو جانے کا خیال ہو تو اسی وقت دست کش ہو جاؤ''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۹۲: The Life of Muhammad p. 203)۔

لیکن انصار اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ حضرت براءؓ نے اوس اور خزرج کے نمائندے کی حیثیت سے آنحضرتؐ کا دست مبارک تھام لیا اور کہا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، ہمیں یہ شرطیں قبول ہیں اور ہم ضرور ان چیزوں سے آپؐ کی حفاظت کریں گے جن سے ہم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ واللہ! ہم سپاہی اور مسلح لوگ ہیں۔ جنگ تو ہمیں ہمارے بزرگوں کی میراث میں ملی ہے''۔ لیکن براءؓ رسول کریمؐ سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ایک اور انصاری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں اور دوسرے لوگوں یعنی یہود میں خاص قسم کے تعلقات ہیں اور کی مسلمانوں کی حفاظت کرنے پر یہ تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو غلبہ عطا فرمایا تو کیا ایسا نہیں ہوگا کہ آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں؟''۔ اس پر نبی کریمؐ نے تبسم کرتے ہوئے فرمایا: ''ایسا نہیں ہوگا! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ جس سے تم جنگ کرو گے، میں بھی اس سے برسرِ پیکار رہوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے، میں بھی اس سے مصالحت کروں گا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۹۴ :The Life of Muhammad P 204)۔ جب دونوں فریق مطمئن ہو گئے تو انصار نے جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

انصار مدینہ لوٹ گئے تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ کے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی۔ یہ ایک ناقابلِ تنسیخ اور خوفناک قدم تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس منصوبے پر کس طرح عملدرآمد ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں اس سے پہلے کبھی کسی نے اس طرح ہجرت نہیں کی تھی۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ جس مسلمان نے اس سلسلے میں تذبذب کا اظہار کیا یا اسے اپنی طاقت سے باہر سمجھا، اسے مکہ ہی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ بعض اہم مسلمان بدستور مکہ میں ٹھہرے رہے اور ان پر ارتداد یا بزدلی کا کبھی الزام نہ لگایا گیا۔ لیکن ۶۲۲ عیسوی کے جولائی اور اگست کے مہینوں میں کوئی ستر مسلمان اپنے خاندانوں کے ہمراہ مدینہ چلے گئے جہاں وہ اپنے مکان بننے تک انصار کے گھروں میں مقیم رہے۔ قریش نے ان لوگوں کو روکنے کی زیادہ کوشش نہ کی البتہ بعض خواتین اور بچوں کو جبراً پکڑ لیا گیا اور ایک مسلمان کو اس کے اونٹ کے ساتھ باندھ کر فاتحانہ انداز میں واپس لے جایا گیا۔ چنانچہ مسلمان محتاط ہو گئے اور اکثر شہر سے باہر ملاقات کرتے۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں سفر کرتے۔ حضرت عمرؓ اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ چلے گئے اور حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ اور آنحضرتؐ کے خاندان کے دوسرے افراد کو لے کر حضرت زیدؓ اور حضرت حمزہؓ کے ہمراہ ہجرت کر گئے۔ جب تک تمام مسلمان مدینہ نہ چلے گئے، اس وقت تک رسول کریمؐ اور حضرت ابوبکرؓ مکہ میں ہی مقیم رہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر ہجرت کے فوراً بعد شہر میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا جس سے قریش کو، جو صرف دس سال پہلے بہت خوشحال اور متحد تھے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں زبردست گھاؤ لگا۔ حضورؐ کے پھوپھی زاد عبداللہ ابن جحش نے اہل خاندان اور بہنوں کے ساتھ ہجرت کی۔ جب انہوں نے مکہ کو چھوڑا تو ان کا وسیع وعریض مکان، جو مکہ کے وسط میں تھا، مکمل طور پر خالی ہو گیا۔ عتبہ بن ربیعہ جب مکہ کے بلند حصے کی جانب جاتے ہوئے وہاں سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ گھر میں کوئی نہیں اور کھنڈر ہونے کے سبب سے اس کے دروازے دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۱۶ :The Life of Muhammad P. 215)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر اگست میں رسول اللہؐ کے محافظ مطعم کا انتقال ہو گیا اور حضورؐ کی زندگی ایک مرتبہ پھر خطرے میں پڑ گئی۔
چنانچہ قریش کے سردار آپؐ کے متعلق صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے دارالندوہ میں جمع ہو گئے لیکن ابولہب احتیاطاً اس میں شریک نہ ہوا۔ بعض سردار حضورؐ کو مکہ سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے البتہ دوسروں نے محسوس کیا کہ آپؐ کا دوسرے مہاجرین کے ساتھ جا ملنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ہجرت کی تھی، اجلاس میں انہیں خطرناک اور بے اصولے غدار قرار دیا گیا جنہوں نے مقدس خونی رشتوں کو توڑ دیا تھا۔ اب وہ کسی مقام پر نہیں ٹھہریں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیادت میں مکہ کی سلامتی کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ آخر ابوجہل نے ایک پلان پیش کیا جس پر عمل کرنے سے قبائلی خوں ریزی کے بغیر حضورؐ کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ ہر قبیلے میں سے ایک جوان مرد، نوعمر، قوی اور شریف النسب شخص لے لیں، ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار دے دیں، یہ سب اس طرح ایک ساتھ آنحضرتؐ پر تلواریں ماریں گویا ایک ہی شخص کا وار ہے۔ اس طرح آپؐ کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے گا اور بنی ہاشم قریش کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے۔

اس منصوبے کے تحت جلد ہی قریش کے نوجوانوں کے ایک گروہ کا انتخاب کر لیا گیا۔ یہ نوجوان حضورؐ کے دروازے پر جمع ہو گئے لیکن جب انہیں کھڑکی سے حضرت سودہؓ اور آپؐ کی صاحبزادیوں کی آوازیں سنائی دیں تو وہ پریشان ہو گئے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ ایک شخص کو اس کے گھر کی خواتین کی موجودگی میں قتل کرنا ایک شرمناک فعل ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا حتیٰ کہ رسول اللہؐ صبح سویرے گھر سے نکل گئے۔ اس سازش میں شریک ایک شخص نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو حضورؐ چادر اوڑھے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں یہ محسوس نہ ہوا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنہیں جبرئیلؑ نے سازش سے خبردار کر دیا تھا، ایک پچھلی کھڑکی سے باہر نکل گئے ہیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ آپؐ نے انہیں بعض معاملات نمٹانے کے لیے مکہ میں روک رکھا تھا۔ حضرت علیؓ اگلی صبح جب حضورؐ کی چادر اوڑھے مکان سے باہر نکلے تو قریش کے نوجوانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ دھوکا کھا گئے ہیں۔ قریش نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص نبی کریمؐ کو مردہ یا زندہ پکڑ کر واپس لائے گا، اسے انعام میں ایک سو اونٹنیاں دی جائیں گی۔

اسی اثنا میں رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ مکہ کے باہر ایک پہاڑ کی غار میں چھپے رہے۔ انہوں نے غار ثور میں تین دن تک قیام کیا۔ آپؐ کے پیروکار وقتاً فوقتاً شہر کی خبریں اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر غار میں پہنچ جاتے۔ روایات کے مطابق ایک مرحلے پر آپؐ کو تلاش کرنے والی پارٹی غار ثور سے گزر گئی لیکن اس نے غار میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ مکڑی کے ایک بڑے چھتے نے غار تک جانے والے راستے کو ڈھانپ دیا، غار کے سامنے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاردار درخت معجزانہ طور پر راتوں رات پیدا ہو گیا۔ اور ٹھیک اس جگہ پر، جہاں کوئی شخص پاؤں رکھ کر غار میں داخل ہو سکتا تھا، ایک فاختہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان تین دنوں میں نبی کریمؐ نہایت مطمئن رہے اور آپؐ کو پروردگار کی موجودگی کا بھرپور احساس رہا۔ قرآن مجید میں اس طمانیت کو سکینہ کہا گیا ہے جس کا عربی زبان میں مطلب ہے آسودگی اور اطمینان۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ یہ لفظ عبرانی زبان کے شکینہ کے ہم معنی ہے جس سے مراد زمین پر خدا کی موجودگی ہے۔

اس وقت جب کہ کافروں نے آپؐ کو (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس جناب باری نے اپنی طرف سے تسکین اس پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں۔ (سورہ التوبہ آیت ۴۰)۔

حضورؐ نے جب یہ محسوس کیا کہ آپؐ محفوظ ہیں تو آپؐ ابوبکرؓ کے ہمراہ غار سے باہر آ گئے البتہ آپؐ نے یہ خیال رکھا کہ فاختہ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس کے بعد آپؐ ابوبکرؓ کی طرف سے فراہم کی جانے والی اونٹنی پر سوار ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کو بہترین اونٹنی دینا چاہتے تھے لیکن آنحضرتؐ نے اصرار کیا کہ آپؐ اونٹنی کی قیمت ادا کریں گے۔ چونکہ یہ آپؐ کی ذاتی ہجرت اور خدا کے حضور نذرانہ تھا لہٰذا یہ بات اہم تھی کہ آپؐ نے اس پورے واقعے کو مکمل طور پر نجی معاملہ ہی تصور کیا۔ آپؐ نے اس اونٹنی کا نام قصویٰ رکھا اور بقیہ زندگی میں یہ اونٹنی آپؐ کی پسندیدہ سواری رہی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ابوبکرؓ اب جس سفر پر روانہ ہوئے، وہ نہایت پرخطر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سڑک پر حضورؐ کو کسی شخص کی رسمی پناہ حاصل نہیں تھی۔ راستہ دکھانے والے شخص نے ایک پرپیچ راہ اختیار کی اور آپ ٹیڑھے میڑھے راستے پر آگے چلتے رہے تاکہ تعاقب کرنے والے آپؐ تک نہ پہنچ پائیں۔ اسی دوران مدینہ کے مسلمان بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت سے مہاجر نخلستان کے انتہائی جنوبی علاقے قبا میں رہ رہے تھے۔ وہ ہر روز فجر کی نماز پڑھ کر ایک پہاڑی مقام سے باہر رسول اللہؐ کے انتظار میں نکل جایا کرتے اور وہیں ٹھہرے رہتے یہاں تک کہ دھوپ سایہ دار مقامات پر پھیل جاتی۔ غرض ۴ ستمبر ۶۲۲ عیسوی کو ایک یہودی نے حضورؐ کو دیکھ لیا اور بلند آواز سے پکارا: اے بنی قیلہ! وہ ذی شان ہستی آ گئی جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ پھر مرد، عورتیں اور بچے رسول اللہؐ کی جانب امنڈ پڑے۔ اس وقت آپؐ ابوبکرؓ کے ہمراہ کھجور کے ایک درخت کے سائے میں آرام فرما رہے تھے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوبکرؓ کے ساتھ قبا میں تین دن تک قیام کیا جس کے بعد حضرت علیؓ بھی مکہ سے آ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن شہر کے مسلمان (نخلستان کے اس سب سے گنجان آباد علاقے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو شہر کہا جاتا تھا) حضورؐ کو دیکھنے کے لیے بے حد مضطرب تھے چنانچہ آپؐ ان مسلمانوں سے ملاقات اور اپنی قیام گاہ کے متعلق فیصلہ کرنے کی غرض سے چل پڑے۔ آپؐ قصویٰ پر سوار تھے جو اللہ کی طرف سے مامور تھی۔ حضورؐ نے اونٹنی کی مہار کھلی چھوڑ دی۔ راستے میں لوگوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ اونٹنی سے اتر کر ان کے ہاں قیام کریں لیکن آنحضرتؐ نے نہایت شائستگی کے ساتھ انکار کر دیا یہاں تک کہ قصویٰ آخر کار ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گئی جو دو یتیم بھائیوں کی ملکیت تھی اور جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ حضورؐ اونٹنی سے نیچے اتر گئے اور اپنا سامان ایک قریبی مکان میں رکھوا دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے ان یتیم بھائیوں سے وہ جگہ خریدنے کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ جب یہ دونوں بھائی معقول قیمت کے عوض وہ جگہ دینے پر راضی ہو گئے تو آپؐ نے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ آپؐ کے اہل خانہ کو بھی یہیں قیام کرنا تھا۔ تمام مسلمان مسجد تعمیر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مہاجرین بھی انصار کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ چونکہ تمام قریش ہاتھ سے کام کرنے کے عادی نہیں تھے اس لیے حضورؐ کے خوبصورت اور نفیس الطبع داماد عثمانؓ بن عفان اس محنت شاقہ کی وجہ سے تھکن سے چور ہو گئے۔ مسلمان مسجد کی تعمیر کا کام کرتے وقت یہ رجز بھی پڑھتے جاتے تھے:

زندگی تو صرف آخرت کی زندگی ہے

یا اللہ! انصار اور مہاجرین پر رحم فرما

لیکن نبی کریمؐ رجز کے دوسرے مصرعے کو اس طرح تبدیل کر دیتے: "یا اللہ! مہاجرین اور انصار پر رحم فرما"۔ رجز میں اس ترمیم سے اس کا قافیہ اور آہنگ تباہ ہو جاتا البتہ اس سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امی ہونے کا لطیف مظاہرہ ہوتا۔ آنحضرتؐ فطری طور پر شاعر نہ تھے اور آپؐ کی بظاہر ناموزوں طبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کس قدر معجز آفرین کلام ہو گا۔

لیکن مہاجرین اور انصار کو مل کر رجز گانے اور اکٹھے کام کرنے سے زیادہ ایک رسمی بندھن اور معاہدے کی ضرورت تھی چنانچہ مہاجرین، انصار اور یہودیوں کے درمیان ایک تاریخی معاہدہ طے پا گیا اور خوش قسمتی سے معاہدے کا مکمل متن ابتدائی ماخذوں میں محفوظ ہے۔ یہ پہلی اسلامی برادری کا بنیادی خاکہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ کے عرب اور یہود قبائل کے ساتھ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ تمام قبائل کے دین و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ اس معاہدے میں ان قبیلوں کے حقوق بھی واضح کیے گئے ہیں اور ان پر شرطیں بھی عاید کی گئی ہیں۔ اب نخلستان کے تمام قبیلوں کو پرانی دشمنی ختم کر کے ایک نیا اور برتر قبیلہ تشکیل دینا تھا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کو اس وقت تک مدینہ کے ان مشرکوں کے ساتھ پرامن طور پر رہنا تھا جب تک وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اہل مکہ کے ساتھ معاہدہ نہیں کرتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاہدے کی شق نمبر ۱۲ میں کہا گیا ہے: ''کوئی مشرک قریش کے مال اور جان کو پناہ نہ دے گا اور نہ ایماندار کے لیے اس سلسلے میں رکاوٹ بنے گا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۴۳: The Life of Muhammad P. 232)۔ اس نئی برادری کا سربراہ اور سلامتی کا واحد ضامن خدا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انہوں نے مکمل طور پر ایک نئی جماعت تشکیل دے دی۔ تمام قبائل ایک برادری (اُمہ) کے بندھن میں بندھ گئے۔ اب تک قبیلے کو معاشرے کی بنیادی اکائی کا درجہ حاصل تھا لیکن اب خونی رشتوں کے بجائے دین کی بنیاد پر ایک نیا معاشرہ معرض وجود میں آ گیا جس کی عرب میں اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ یہ قدم رسول اللہؐ کی طرف سے دنیا پر حکومت الہیٰہ قائم کرنے کے حقیقی مینڈیٹ کا حصہ نہیں تھا اور غالباً آپؐ حکومت الہیٰہ کے نظریے سے بھی واقف نہیں تھے تاہم حالات نے آپؐ کو اپنے اصل نصب العین سے بھی آگے بڑھ کر مکمل طور پر ایک نئے حل کی جانب گامزن کر دیا تھا۔ پچھلے چند برسوں سے اسلام نے معاشرے میں تصادم اور جارحیت کی فضا پیدا کر دی تھی اور نبی کریمؐ پر بچوں کو ان کے والدین سے جدا کرنے کا الزام لگایا جا رہا تھا لیکن ہجرت تک کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ قریش کے ساتھ قطع تعلق کر لے گا۔ اب پرانے قبائلی رشتے منسوخ ہو چکے تھے، قریش، اوس اور خزرج ایک امت میں ڈھل چکے تھے اور اسلام محاذ آرائی اور تقسیم کے بجائے اتحاد کی علامت بن گیا تھا۔

لیکن قبیلے کے نظریے کا اُمہ کے تصور پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا اور ابتدائی مسلمان نئی برادری کو اب بھی قبائلی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی، یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی، تمہارے لیے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا ضروری ہے سوائے ان لوگوں کے کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے۔ (سورہ الانفال آیت ۷۲)۔

اُمہ کی رکنیت کے لیے ہجرت کو لازم قرار دے دیا گیا۔ قبیلے کی طرح اُمہ بھی بذات خود ایک کائنات تھی البتہ روایتی طریقے کے مطابق دوسرے قبیلوں کو بھی حلیف یا اتحادی بنا لیا گیا۔ اُمہ کے اتحاد کا مقصد ذاتِ باری تعالیٰ کے اتحاد کی عکاسی کرنا تھا جس کا مسلمانوں کو اپنی نجی زندگیوں میں اظہار کرنے کا بھی حکم دیا گیا تھا۔ مسلم اُمہ کو متحارب کیمپوں میں تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے کسی خونی رشتے یا پرانی قبائلی وفاداری پر کاربند رہنے کی اجازت نہیں تھی اور قبیلے سے قطع نظر کوئی بھی مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف جنگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت تک حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُمہ کے سربراہ نہیں تھے۔ مدینہ میں آپؐ منکسر المزاجی کے ساتھ زندگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسر کرتے اور شروع شروع میں آپؐ کی حیثیت سعد ابن معاذ یا ابن اُبی جیسے سرداروں سے بھی کمزور تھی۔ آپؐ صرف مسلمانوں کے درمیان تنازعات طے کرنے کے لیے غیر جانبدار ثالث کے فرائض انجام دیتے تھے۔

یہ ایک انقلابی قدم تھا لیکن ابتدائی دنوں میں ہر شخص یثرب کے مسئلے کے اس حل کو آزمانے کے لیے تیار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے حالات انتہائی مخدوش تھے اور پرانی ناقابل علاج لڑائیوں کو روکنے کے لیے کسی بھی تبدیلی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مشرکوں کی طرف سے اس کی کوئی مخالفت نہ کی گئی۔ ایک عرب زاہد و عابد ابو عامر (جسے بعض اوقات الراہب کہا جاتا تھا) مرتد ہونے کے بعد فرار ہو کر مکہ چلا گیا لیکن اس کے بعد اسلام قبول نہ کرنے والے مشرک عام طور پر مسلمانوں کے حوالے سے خاموش ہی رہے یہاں تک کہ ابو قیس بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو کر ایک اچھا اور مخلص مسلمان بن گیا۔ شروع میں یہودی بھی اس نئے نظام کو قبول کرنے کو تیار تھے اور بعض یہودیوں نے عرب توحید پرستی کی اس نئی صورت کو تسلیم بھی کر لیا تاہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے، جب تک بعض یہود نے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر نہ کی، ان سے اللہ کا دین اختیار کرنے کے لیے کبھی نہ کہا۔ قرآن کریم میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام نہ لانے والے یہودیوں نے ایک قسم کی متوازی برادری قائم کر لی تھی اور وہ خود کو سب سے پہلے یہودی تصور کرتے تھے۔ ان کے پاس پہلے سے الہامی کتاب موجود تھی اور قرآن کی اصطلاح میں وہ اسلام قبول کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں صورت حال بظاہر امید افزا تھی بلکہ شروع میں ایک ایسا شخص بھی مسلمان ہو گیا جو عرب نہیں تھا۔ مسجد کی تعمیر جاری تھی کہ ایک فارسی غلام سلمان نے، جس کا مالک بنی قریظہ کا ایک یہودی تھا، رسول اللہؐ کے سامنے حاضر ہو کر اپنا قصہ سنایا۔ وہ اصفہان کے قریب پیدا ہوا تھا اور بعد میں عیسائیت اختیار کر کے شام پہنچ گیا جہاں اس نے عرب میں مبعوث ہونے والے پیغمبر کے بارے میں کئی روایات سنیں۔ اسے حجاز آتے ہوئے راستے میں گرفتار کر کے مدینہ پہنچا دیا گیا۔ حضرت سلمانؓ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک قابل احترام شخصیت بن گئے۔ وہ مسلمان ہونے والے پہلے غیر عرب مشرقی باشندے تھے جنہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھیں۔

ہجرت کے سات ماہ بعد اپریل ۶۲۳ عیسوی میں مسجد تعمیر ہو گئی۔ یہ مسجد اینٹوں سے بنائی گئی لیکن اس کی شمالی دیوار میں اس جانب، جدھر بیت المقدس کا رخ تھا، ایک مختصر خلا رکھا گیا جہاں پتھر بھی رکھے گئے۔ یہ قبلے کا نشان تھا جس طرف منہ کر کے مسلمان نماز ادا کرتے تھے۔ مسجد میں نماز کے لیے وسیع و عریض صحن موجود تھا۔ شروع میں مسلمان کسی باضابطہ بلاوے کے بغیر نماز پڑھتے لیکن یہ کوئی تسلی بخش طریق کار نہیں تھا کیونکہ اس طرح ہر شخص مختلف اوقات میں نماز ادا کرتا۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے نماز کے لیے یہود کے مینڈھے کا سینگ یا مشرقی عیسائیوں کا ناقوس استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اسی دوران ایک مہاجر نے خواب میں سبز چوغے میں ملبوس ایک شخص کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھا جس نے اسے اذان دینے کا طریقہ سکھایا۔ اذان کے الفاظ یہ تھے: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ، اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ اشہد ان محمد رسول اللہ، اشہد ان محمد رسول اللہ۔ حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح، حی علی الفلاح۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اذان کے طریقے کو پسند فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلالؓ کو موذن مقرر کر دیا۔ بلالؓ سحر کے وقت مسجد کے قریب ایک بلند مکان کی چھت پر چڑھ کر فجر کا انتظار کرتے۔ جب اذان کا وقت ہو جاتا تو وہ سیدھے کھڑے ہو جاتے اور کہتے: یا اللہ! میں تیری تعریف کرتا ہوں اور قریش کے مقابلے میں تیری مدد کا خواہاں ہوں کہ وہ تیرے دین پر سیدھے قائم ہو جائیں۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۲۱۴: The Life of Muhammad P. 280)۔

مسجد میں حضورؐ کا اپنا کوئی حجرہ نہیں تھا بلکہ مسجد کی مشرقی دیوار کے ساتھ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کے لیے دو چھوٹے چھوٹے حجرے بنا دیے گئے تھے۔ بعد میں مسجد کے ساتھ تمام ازواج مطہراتؓ کے لیے الگ الگ کمرے بنا دیے گئے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باری باری وہاں قیام فرماتے۔ مسجد تیار ہو گئی تو آنحضرتؐ نے حضرت زیدؓ کو مکہ بھیج کر اپنے گھرانے کی خواتین کو مدینہ بلا لیا۔ وہ حضرت سودہؓ اور حضورؐ کی صاحبزادیوں اُم کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ اور اپنی بیوی اُم ایمنؓ کو لے کر واپس مدینہ آ گئے۔ (حضرت زینبؓ اپنے شوہر ابوالعاص کے ساتھ، جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، مکہ ہی میں ٹھہری رہیں)۔ ان کے علاوہ ابوبکرؓ کے خاندان کے آخری ارکان ان کے صاحبزادے عبداللہؓ، ان کی بیوی اُم رومانؓ اور صاحبزادیاں اسمؓا اور عائشہؓ بھی حضرت زیدؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئیں۔

جب یہ خواتین مدینہ پہنچ گئیں تو شادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے حضرت زیدؓ کا اُم ایمنؓ کے بجائے کسی دوسری ہم عمر خاتون کے ساتھ عقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ آپؐ نے عبداللہؓ ابن جحش سے کہا کہ وہ اپنی خوبرو بہن حضرت زینبؓ کو، جو اس تجویز سے خوش نہیں تھیں، زیدؓ سے بیاہ دیں۔ چھوٹے قد، سیاہ رنگ اور چپٹی ناک والے زیدؓ کوئی پرکشش نوجوان نہیں تھے۔ دوسری طرف، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، حضرت زینبؓ کی آرزوئیں بہت بلند تھیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ کی یہی خواہش ہے تو وہ رضامند ہو گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے خاندان سے مزید قریبی تعلقات قائم کرنے کے لیے اپنی صاحبزادی اسمؓا کی شادی آنحضرتؐ کے ماموں زاد زبیر ابن العوام کے ساتھ کر دی۔

حضرت عائشہؓ کے مکہ سے مدینہ پہنچنے کے ایک ماہ بعد رسول کریمؐ کے ساتھ ان کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ان کی عمر اب بھی ۹ سال تھی۔ چنانچہ شادی پر کھانے کی دعوت کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا۔ یہ شادی اس قدر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سادگی سے ہوئی کہ خود حضرت عائشہؓ کو بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ آج ان کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کے دن بھی وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ بحرین سے نفیس سرخ کپڑا خرید کر لائے تھے جس سے حضرت عائشہؓ کا عروسی جوڑا تیار کیا گیا۔ پھر لوگ انہیں مسجد کے ساتھ ان کے چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کا انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کو بناؤ سنگھار کیے، زیورات پہنے اور لمبے بالوں کو کنگھی کیے دیکھا تو آپؐ مسکرا پڑے۔ آخر دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا اور رسول اللہؐ اور حضرت عائشہؓ دونوں نے دودھ پیا۔ شادی سے حضرت عائشہؓ کی زندگی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ طبری نے لکھا ہے کہ آپ اس قدر کم سن تھیں کہ اپنے والدین کے گھر میں ہی قیام پذیر رہیں اور بعد میں آپ کے سن بلوغت تک پہنچنے پر رخصتی عمل میں آئی۔ اس دوران حضرت عائشہؓ اپنی سہیلیوں اور گڑیوں کے ساتھ کھیلتی رہیں۔ آنحضرتؐ بعض اوقات ملاقات کے لیے ان کے گھر چلے جاتے اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ان کی کم سن سہیلیاں انہیں گھر سے باہر لے جاتیں اور حضورؐ پیچھے جا کر انہیں گھر میں واپس لے آتے۔ حضرت عائشہؓ کی وجہ سے آپؐ ان لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ واپس لا کر خوش ہوتے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی صاحبزادیوں کے ساتھ بھی، جب وہ کم سن تھیں، اسی طرح کھیلا کرتے تھے۔ اسی طرح آپؐ حضرت عائشہؓ کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز حضورؐ ہمارے گھر میں آئے تو میں گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے عائشہ! یہ کیا کھیل ہے؟'' میں نے کہا: ''یہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے ہیں''۔ اس پر آپؐ ہنس پڑے۔

(محمد ابن سعد کتاب طبقات الکبیر جلد ہشتم صفحہ ۴۴: Lings: Muhammad PP 133-134)۔

لیکن حضرت عائشہؓ امت مسلمہ میں پائی جانے والی اداسی اور دل گیری سے بخوبی آگاہ تھیں۔ مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے یثرب پہنچے تو بہت سے مہاجرین شدید وبائی بخار میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ایک دن دیکھا کہ ان کے والد اور ان کے آزاد کردہ دو غلام عامرؓ اور بلالؓ بخار کی شدت سے نڈھال ہو کر زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور بے ہوشی میں بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ حضرت بلالؓ کی یہ حالت تھی کہ جب ان کا بخار اتر جاتا تو وہ گھر کے صحن میں لیٹ جاتے اور مکہ میں اپنے گھر کو یاد کر کے بلند آواز سے یہ کہتے:

کیا ایسا نہیں ہوگا! مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کوئی رات مقام فخ میں بھی اس طرح بسر کر سکوں گا کہ میرے ارد گرد اذخر اور جلیل (نامی بوٹیاں) ہوں

اور کیا میں کسی روز مقام مجنہ کے چشموں پر بھی جا سکوں گا؟

اور کیا (کوہ) شامہ وطفیل بھی مجھے نظر آئیں گے؟

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۱۴: The Life of Muhammad P. 280)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عائشہؓ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر دوڑتی ہوئی سیدھی حضورؐ کے پاس پہنچیں۔ مہاجرین پردیس میں جس بے کسی کے عالم میں تھے، آپؐ کو اس کا پورا احساس تھا۔ آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کو تسلی دیتے ہوئے یہ دعا کی:

''یا اللہ! ہمارے لیے مدینہ کو بھی ویسا ہی محبوب بنادے جیسا کہ تو نے مکہ کو ہمارے لیے پسندیدہ بنادیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۱۴: The Life of Muhammad P 280)۔ نبی کریمؐ کو علم تھا کہ انصار اس سے بھی سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ مدینہ میں مسلمان ہونے والے سب لوگ مخلص نہیں تھے اور بعضوں نے دل سے نہیں، مصلحت کے تحت اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے نزدیک دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا رجحان ناگزیر تھا اور وہ اسلام لانے میں دوسرے لوگوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اب وہ بیٹھے یہ انتظار کر رہے تھے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ناخوش و بیزار لوگ عبداللہ بن اُبی کے گرد جمع ہو گئے۔ اگر رسول اللہؐ مدینہ میں تشریف نہ لاتے تو ابن اُبی مدینے کا بادشاہ بن جاتا۔ ابن اُبی بھی بظاہر مسلمان ہو گیا لیکن وہ اسلام کے معاملے میں پرجوش اور مخلص نہیں تھا۔ اسے امید تھی کہ گڑبڑ پیدا ہونے کی صورت میں وہ اس تحریک کو ہائی جیک کر لے گا۔ قرآن کریم کی دوسری سورت، جو قرآن کی سب سے طویل سورت ہے، حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے کے چند ماہ بعد نازل ہوئی۔ اس سورت میں واضح کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کو اس صورت حال کا مکمل ادراک تھا۔ (کافروں کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے، یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہؓ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! یقیناً یہی بیوقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔ (سورہ البقرہ آیات ۶ تا ۱۴ ..... مترجم)۔ حضورؐ نے کچھ دیر تک ابن اُبی کے معاملے میں صبر و تحمل سے کام لیا، مسجد میں اس کے ساتھ احترام سے پیش آتے رہے اور اسے نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے جواب میں ابن اُبی بھی حضرت محمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نرمی سے پیش آتا البتہ بعض اوقات اس کی جارحیت اور منافقت کھل کر سامنے آجاتی۔ ایک ناخوشگوار واقعے کے بعد ایک انصاری (سعد بن عبادہ ......مترجم) آنحضرتؐ کو ایک طرف لے گیا اور آپؐ سے التماس کی: ''یا رسول اللہؐ! اس سے نرمی فرمایئے کیونکہ واللہ! اللہ آپؐ کو ایسے وقت ہمارے پاس لایا جب ہم اس کے لیے تاج تیار کر رہے تھے، وہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس کی حکومت چھین لی''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۲۱۳:(The Life of Muhammad P. 279)۔

شروع میں مشرک عربوں کی طرح یہودی بھی نبی کریمؐ کو شک کا فائدہ دینے کو تیار تھے، خاص طور پر اس وجہ سے کہ آنحضرت کا رجحان بظاہر یہودیت کی طرف تھا۔ لیکن آخر کار وہ ابن اُبی کے ساتھ مل کر اسلام کی مخالفت کرنے لگے اور مسجد میں اکٹھے ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۶۲: The Life of Muhammad P. 246)۔ قرآن مجید میں بعض انبیا کے جو قصے بیان کیے گئے ہیں، یہود ان کا استہزا کرتے، ان کے لیے یہ کام اس لیے آسان تھا کیونکہ وہ الہامی کتابوں کے متعلق خاصا علم رکھتے تھے۔ غرض انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حقیقی نبی ماننے سے انکار کر دیا اور طعن و تشنیع کے انداز میں کہنے لگے: ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان کی خبر آیا کرتی ہے، وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کی اونٹنی کہاں ہے''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۶۱: The Life of Muhammad P. 246)۔ ان بیہودہ نکتہ چینیوں سے مسلمان اس قدر پریشان ہوتے کہ یہودیوں کے ساتھ ان کی اکثر لڑائی ہو جاتی اور بعض اوقات مسلمان انہیں جبراً مسجد سے نکال باہر کرتے۔ یہودیوں کے پاس حضورؐ کے دعوئے نبوت کو مسترد کرنے کی ٹھوس مذہبی بنیاد موجود تھی۔ انہیں ایک مسیح کے مبعوث ہونے کی توقع تھی البتہ انہیں یقین تھا کہ نبوت کا دور اب ختم ہو چکا ہے، اب کوئی یہودی یا عیسائی نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن مدینہ کے یہود کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلیم کرنے کی روایت بھی موجود تھی کیونکہ یہودیت میں ''خداترس لوگوں'' کا صومعوں میں خیر مقدم کرنے کا پرانا دستور چلا آرہا تھا۔ ایسے لوگ موسیٰ علیہ السلام کے تمام قوانین پر کاربند نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں دوست اور معاون تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان یہودیوں کو حلیف بنانے کے آرزومند تھے۔ لیکن جب یہودیوں نے یہ محسوس کیا کہ رسول اللہؐ کی مدینہ آمد کے بعد ان کی پوزیشن ڈرامائی طور پر بہت کمزور ہو گئی ہے تو انہوں نے پوری قوت کے ساتھ حضورؐ کے نبوت کے دعوے کو مسترد کر دیا۔

یہودیوں نے آنحضرتؐ کی نبوت سے انکار کیا تو آپؐ کو غالباً زندگی کی سب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ کارروائی آپؐ کی پوری دینی پوزیشن کے لیے ایک چیلنج تھی البتہ مدینہ کے کئی یہودیوں کا رویہ دوستانہ تھا اور یہ لوگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپؐ کو الہامی کتابوں کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچا کر آپؐ کو یہ بتاتے کہ آپؐ یہودیوں کے اعتراضات کا ان کی اپنی اصطلاح میں کس طرح جواب دیں۔ قرآن کریم میں یہود کے خلاف بار بار بحث کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نکتہ چینی کس قدر پریشان کن تھی تاہم نبی کریمؐ یہود کی قابل ملامت تنقید کا بروقت ابطال کر دیتے۔ یہودیوں کو خود ان کے اپنے الہامی صحیفوں میں بے دین قوم قرار دیا گیا ہے جنہوں نے خدا کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان اور میثاق کو توڑ کر بت پرستی شروع کر دی تھی اور ایک سنہری بچھڑے کو پوجنے لگے تھے۔ (جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ سورہ البقرہ آیت ۲۷.....مترجم)۔ آپؐ سے یہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں کہ آپؐ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب لائیں، موسیٰ (علیہ السلام) سے تو انہوں نے اس سے بڑی درخواست کی تھی کہ ہمیں کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دکھا دے۔ پس ان کے ظلم کے باعث ان پر کڑاکے کی بجلی آ پڑی، پھر باوجودیکہ ان کے پاس بہت دلیلیں پہنچ چکی تھیں، انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا۔ (سورہ النسا آیت ۱۵۳.....مترجم)۔ اے اہل کتاب یقیناً تمہارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آ چکا جو تمہارے سامنے کتاب اللہ کی بکثرت ایسی باتیں ظاہر کر رہا ہے جنہیں تم چھپاتے رہے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آ چکی ہے۔ سورہ المائدہ آیت ۱۵.....مترجم)۔ اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ جو کچھ ایمان والوں پر اتارا گیا ہے، اس پر دن چڑھے تو ایمان لاؤ اور شام کے وقت کافر بن جاؤ تاکہ یہ لوگ بھی پلٹ جائیں۔ (سورہ آل عمران آیت ۷۲.....مترجم)۔ ان کی تو یہی سزا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ (سورہ النسا آیت ۸۷ .....مترجم)۔ یہ اہل کتاب اپنے پیغمبروں کے بار بار انتباہ کو سننے میں ناکام رہے۔ ان لوگوں کے لیے "ویل" ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف کہتے ہیں اور اس طرح کماتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت ۷۹.....مترجم)۔ یقیناً آپؐ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے اور ایمان والوں سے سب سے زیادہ دوستی کے قریب آپؐ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں علما اور عبادت کے لیے گوشہ نشین افراد پائے جاتے ہیں اور اس وجہ سے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ (سورہ المائدہ آیت ۸۲.....مترجم)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہود کی تاریخ کا بھی علم ہو گیا اور آپؐ نے یہ دریافت کر لیا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان، جنہیں اس سے پہلے ایک ہی مذہب کے پیروکار سمجھا جاتا تھا، شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عربوں کی طرح باہر کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دونوں مذہبوں کے ماننے والے اہل کتاب نے بعض نئے اور غیر مصدقہ عناصر کو خالص آسمانی صحیفوں میں شامل کر لیا ہے۔ یہود کے ساتھ تنازع کی وجہ سے عیسائیت سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول کریمؐ کے تعلقات متاثر نہ ہوئے بلکہ قرآن حکیم میں بعض اوقات یہودیوں کے خلاف عیسائیوں کی طرفداری کی گئی ہے، خاص طور پر عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے معاملے میں یہودیوں کے دعوؤں کی تردید کی گئی ہے (اور ان کے کفر کے باعث اور مریم پر بہت بڑا بہتان باندھنے کے باعث۔ اور یوں کہنے کے باعث کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح بن مریم کو قتل کر دیا حالانکہ نہ تو انہوں نے اسے قتل کیا، نہ سولی پر چڑھایا بلکہ یہ ان کے لیے ان (عیسیٰ) کا شبیہ بنا دیا گیا تھا۔ (سورہ النسا آیات ۱۵۶، ۱۵۷..... مترجم)۔ قرآن حکیم میں عیسائیوں کے اس دعوے کو بہتان قرار دیا گیا ہے کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے۔ یہ نظریہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا کیونکہ اس سے پہلے آپؐ نے اس دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ پھر قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ سب باتیں باطل ظن اور گمان ہیں جن کے بارے میں کسی کو صحیح علم نہیں اور یہ کہ ان نظریات کی وجہ سے اہل کتاب دو متحارب کیمپوں میں بٹ چکے ہیں۔ (یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی حق پر نہیں حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں۔ (سورہ البقرہ آیت ۱۱۳..... مترجم)۔

رسول کریمؐ اب بھی یہی فرماتے تھے کہ آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب پہلے پیغمبروں پر اترنے والی الہامی کتابوں کا تسلسل ہے۔ مدینہ میں تمام یہودیوں کا رویہ جارحانہ نہیں تھا چنانچہ موجودہ مشکلات کے باوجود آپؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اہل کتاب کی مشترک باتوں پر زور دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ تمام عیسائیوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے۔ مسلمانوں کا تنازع صرف ان یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ تھا جو قرآن حکیم کے بارے میں غلط رائے رکھتے تھے یا جنہوں نے خالص دین میں ناقابل قبول اختراعیں شامل کر لی تھیں:

اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو

مگر ان کے ساتھ جو ان میں ظالم ہیں اور صاف صاف اعلان کردو کہ ہمارا تو اس کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم پر اتاری گئی

ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے، ہم سب اسی کے حکم بردار ہیں (سورہ العنکبوت آیت ۴۶)

یثرب کے تین بڑے یہودی قبیلوں کے ساتھ نزاع کے باوجود مسلمان اسی سرکاری پالیسی پر کاربند رہے۔

مدینہ میں حضورؐ کو ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی مزید حقائق کا ادراک ہوگیا۔ گناہوں کے کفارے کی تاریخ کی مدد سے آپؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ حضرت ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰؑ سے پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے اس لیے منطقی بات یہ ہے کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے پیروکاروں نے، جو بے کار مباحثوں میں الجھے ہوئے تھے، فضول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختراعوں کو ابراہیم علیہ السلام کے خالص دین میں شامل کر لیا تھا حالانکہ وہ تورات یا انجیل کے نازل ہونے سے پہلے نبی تھے:

ابراہیم نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ وہ تو یک طرفہ (خالص) مسلمان تھے، وہ مشرک بھی نہ تھے
سب لوگوں سے زیادہ ابراہیم سے نزدیک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا کہا مانا
اور یہ نبی اور جو لوگ ایمان لائے، مومنوں کا ولی اور سہارا اللہ ہی ہے (سورہ آل عمران آیات ۱۶۷، ۱۶۸)

مکہ میں حضرت موسیٰ مسلمانوں کے پسندیدہ نبی تھے لیکن مدینہ میں ابراہیم علیہ السلام نے ان کی جگہ لے لی چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں کے طعنوں اور استہزا کا دوٹوک جواب دریافت کر لیا۔ حضورؐ اور آپؐ کے پیروکاروں نے اس شخص کے خالص دین (حنیفیہ) کی روح کی طرف مراجعت کر لی جو اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کرنے والے پہلے مسلمان تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ رسول کریمؐ نے دین ابراہیمؑ کی جانب لوٹ کر بعض عربوں کی آرزوؤں کو کس قدر پذیرائی بخشی البتہ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ قرآن کریم میں مکہ کے حنیفیہ فرقے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا اور مدنی سورتوں کے نازل ہونے سے پہلے ابراہیم علیہ السلام میں بہت کم دلچسپی لی جاتی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دین کو دین حنیفیہ یا خالص دین کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

رسول اللہؐ نے اس بنیادی عقیدے کو ترک کیے بغیر یہودیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کا طریقہ وضع کر لیا کہ دین کا مطلب ہے کسی مخصوص دنیاوی طریقے سے اظہار کے بجائے خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کے آگے مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا۔ آپؐ نے حضرت ابراہیمؑ کی اہمیت کے بارے میں جو نیا انداز اختیار کر لیا، اس سے گہرے شعور اور ادراک کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہودی اور عیسائی اپنے مخصوص الہامی صحیفے قبول کرنے پر زور دیتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہونے والی قدیم اسامی وحی اور ان پچھلے پیغمبروں کے دیرینہ پیغام سے الگ تھلگ ہوتے جا رہے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کی معرفت اور روحانی مشاہدے کی تصدیق کی تھی:

اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی
اور جو چیز ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اسحاقؑ یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی
اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا
ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے
ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ (سورہ البقرہ آیت ۱۳۶)

خدا پر ایمان لانے کے لیے انسانی اظہار کے طور طریقے یقیناً بت پرستی کے مترادف تھے۔ قرآن کریم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پچھلے انبیا کے پیغام کو منسوخ نہیں کیا تھا بلکہ اس میں گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کی گئی اور یہ انہی کا تسلسل تھا۔

عظیم پیغمبروں کی فہرست میں حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے اسماعیلؑ کا تذکرہ بے حد اہم ہے۔ دوست عرب یہودیوں نے آپؐ کو حضرت اسماعیلؑ کا قصہ پہلی مرتبہ سنایا اور اس میں بعض مقامی اساطیر کا اضافہ کیا۔ حضورؐ کو بتایا گیا کہ تورات کے پہلے باب کتاب پیدائش کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے ہاں اپنی کنیز حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام اسماعیلؑ (خدا نے سن لیا ہے) رکھا گیا۔ لیکن جب حضرت سارہؓ نے ایک بیٹے حضرت اسحاقؑ کو جنم دیا تو وہ حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ سے حسد کرنے لگیں اور انہوں نے حضرت ابراہیمؑ پر زور دیا کہ وہ ان دونوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اپنے بیٹے کو کھونے پر حضرت ابراہیمؑ کو سخت صدمہ پہنچا تاہم خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ اسماعیلؑ بھی ایک عظیم قوم کے باپ بنیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ہاجرہؓ اور اپنے بیٹے کو لق و دق صحرا کے ویرانے میں چھوڑ دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی پرورش اسی صحرا میں ہوئی اور وہ ایک نامور جنگجو بن گئے۔ (کتاب پیدائش ۲۱:۸۔۲۱)۔ عرب کے یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ عربوں کے جد امجد تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہؓ اور ان کے بیٹے کو مکہ کی وادی میں چھوڑ دیا اور ان کی دیکھ بھال خدا نے کی تھی۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ نے مکہ میں اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات کی اور دونوں نے مل کر عرب میں خدا کا پہلا معبد خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کی طرح عرب بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے۔

اس قصے سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یقیناً بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ اس سے کعبۃ اللہ کو نئی اہمیت مل گئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ خدا نے عربوں کو فراموش نہیں کیا تھا بلکہ وہ ابتدائے آفرینش سے خدائی پلان کا حصہ تھے۔ قرآن مجید میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیلؑ نے خدا کے گھر کی تعمیر مکمل کرنے کے بعد خدا سے عربوں کے لیے ایک پیغمبر مبعوث کرنے کی دعا مانگی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ کی بنیادیں اور دیواریں اٹھاتے جاتے تھے اور کہتے جا رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے قبول فرما، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرماں بردار بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا اطاعت گزار رکھ اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، تُو تو بہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ان میں انہیں میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کر دے۔ یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ (سورہ البقرہ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹ ......مترجم)۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عربوں کے لیے قرآن لے کر آئے تھے۔ اب آپؐ ان کے لیے ایک منفرد دین متعارف کرا رہے تھے جس کی جڑیں آپؐ کے آباء و اجداد کے تقدس اور بزرگی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیوست تھیں۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ بیشتر یہود کی دشمنی مستقل نوعیت کی ہے تو اللہ کے نئے دین نے پرانے مذہب کی خودمختار حیثیت کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ ہجرت کے تقریباً اٹھارہ مہینوں کے بعد ماہ شعبان کے دوران ۶۲۴ عیسوی کے جنوری کے مہینے کے آخری دنوں میں رسول کریمؐ حضرت برأؓ ابن معرور مرحوم کے قبیلے کے علاقے میں تعمیر کی جانے والی مسجد میں نماز جمعہ کی امامت کر رہے تھے کہ حضورؐ پر اچانک ایک خصوصی وحی نازل ہوگئی اور آپؐ نے اپنا رخ بیت المقدس کے بجائے مکہ کی طرف پھیر لیا۔ خدا نے مسلمانوں کو ایک نیا مرکز اور نماز کے لیے ایک نیا قبلہ عطا کر دیا تھا:

ہم آپؐ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے دیکھ رہے ہیں
اب ہم آپؐ کو اس قبلہ کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپؐ خوش ہو جائیں
آپؐ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپؐ جہاں کہیں ہوں، اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں
(سورہ البقرہ آیت ۱۴۴)

قبلہ کی تبدیلی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سب سے بڑی تخلیقی مذہبی علامت تھی۔ مسلمان مکہ کی طرف منہ پھیر کر خاموشی کے ساتھ یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ کسی مسلمہ برادری کی ملکیت نہیں بلکہ انہوں نے صرف خدائے وحدہ لاشریک کی جانب رخ کر لیا ہے۔ مسلمان کعبے کی طرف منہ کر کے سجدہ ریز ہو کر خدا کے ایک دین کو متحارب فرقوں میں بانٹنے والے دو قدیم مذاہب سے مکمل طور پر علیحدگی اور معمار کعبہ کے اولیں دین کے ساتھ کامل وابستگی اور یگانگت کا اعلان کرتے:

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، آپؐ کا ان سے کوئی تعلق نہیں
بس ان کا معاملہ اللہ تعالٰی کے حوالے ہے۔ پھر ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے
آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین مستحکم ہے
جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جو اللہ کی طرف یک سو تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے
آپؐ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور مرنا
سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے
اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں
آپؐ فرما دیجیے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لیے تلاش کروں حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا
اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے، وہ اسی پر رہتا ہے اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، پھر تم سب کو اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رب کے پاس جانا ہوگا۔ پھر وہ تم کو جتلائے گا جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے

(سورہ الاعراف آیات ۱۵۹، ۱۶۱ تا ۱۶۴)

کسی بھی انسانی نظام کو خدا کی ذات پر ترجیح دینا بہت بڑا شرک ہے اور مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی مذہبی ادارے یا روایت کے بجائے رب کعبہ کو اپنی زندگیوں کا مرکز اور محور بنائیں۔

قرآن کریم میں بجا طور پر ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان اس قبلے کو بیت المقدس کے قبلے پر ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار دونوں نے خود کو کعبے کے لیے وقف کر دیا۔ حج کے دوران انصار کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پہلی ملاقات کسی حادثاتی واقعے کا نتیجہ نہیں تھی۔ اب دنیا کے دو قدیم مذاہب یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ ان کے تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ اب صحیح اور واضح سمت میں ان کا الگ قبلہ متعین ہو گیا تھا اور مسلمانوں کا ان مذاہب کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہ رہا تھا جو عربوں کے لیے سامراجی تعلقات کی بنیاد کا درجہ رکھتے تھے۔ مکہ کے لیے مسلمانوں کے جوش وخروش کو بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل تھی جس کی وجہ سے انصار اور مہاجرین امت واحد کے مضبوط رشتوں میں منسلک ہو گئے۔ اس کے علاوہ مہاجرین کو ہجرت کے باعث جس تکلیف دہ آزمائش سے گزرنا پڑا، نئے قبلے سے اس کی بھی تلافی ہو گئی۔

قبلے کی تبدیلی مسلمانوں کے لیے نئے اور قابل فخر تشخص کی علامت تھی۔ انہیں بتدریج ایک مشترک تشخص حاصل ہو رہا تھا حالانکہ ان کا تعلق تین مختلف قبیلوں سے تھا۔ حضرت بلالؓ جب فجر کی نماز کے لیے اذان دیتے تو وہ سب ایک ساتھ کھڑے ہوتے، دوپہر کو نماز کے لیے اپنا کام کاج اکٹھے چھوڑ دیتے اور شام کو ایک ساتھ نماز ادا کرتے۔ خدا کی راہ میں خیرات اور زکوٰۃ انہیں غریبوں کی طرف سے ان پر عاید ہونے والی مشترکہ ذمے داری کی یاددہانی کراتی۔ اب وہ جو کچھ بھی تھے، دن میں تین مرتبہ مکے کی طرف رخ کر کے مل کر نماز پڑھتے جس سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ لیکن مسلمانوں کو یہ نئی خودمختاری اس وقت ملی جب وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے اور حالت جنگ میں تھے۔ مدینہ کے یہودیوں نے قبلے کی تبدیلی کو فوری طور پر سرکشی اور بغاوت قرار دے دیا اور حضورؐ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ان کا عزم اب مزید پختہ ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب مدینہ کی مسلمان برادری مکہ کے طاقتور شہر کی جانب سے حملے کی توقع کر رہی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آٹھواں باب

مقدس جہاد

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک ایک جانی پہچانی شخصیت بن چکے تھے۔ کئی برسوں کی ایذا رسانی اور شکست خوردگی کے باوجود آپؐ ایک ایسے پیغمبر تھے جنہیں خود اپنے وطن میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ عیسائیت کی گود میں پرورش پانے والے لوگ اس بات کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے اور آپؐ کا احترام کر سکتے ہیں۔ لیکن ہجرت کے بعد حضورؐ کو سیاسی اور روحانی دونوں اعتبار سے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی البتہ مسیحی مغرب نے آنحضرتؐ کی حیات مقدسہ کے اس پہلو کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب آپؐ ایک روشن وتاباں اور طلسماتی سیاسی رہنما بن گئے تھے جنہوں نے نہ صرف عرب بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کا رخ موڑ دیا تھا۔ یورپ میں آپؐ کے نکتہ چینوں نے اب اس دعوے کو مسترد کر دیا ہے کہ آپؐ (نعوذ باللہ..... مترجم) ایک بہروپیے تھے جنہوں نے مذہب کو طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ چونکہ مسیحی دنیا مصلوب مسیحؑ کے خیالی پیکر کے زیر اثر ہے جنہوں نے کہا تھا کہ ان کی بادشاہت اس دنیا کی بادشاہت نہیں ہے، اس لیے ہم شکست اور ذلت و ناکامی ہی کو کسی مذہبی رہنما کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے روحانی ہیروز سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ دنیاوی نقطہ نظر سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والی کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم اس بات کو رسوا کن بلکہ فسق و فجور قرار دیتے ہیں کہ رسول اللہؐ کو امن، طاقت اور فتح کے لیے جنگ کرنا پڑی تھی۔ ہمارے ہاں اسلام کو تلوار کے دین کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس نے تشدد اور عدم برداشت کو مقدس قرار دے کر حقیقی روحانیت کو ترک کر دیا تھا۔ مسیحی یورپ میں اسلام کے متعلق یہ تاثر قرون وسطیٰ سے پایا جاتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالانکہ اس وقت عیسائی خود مشرق وسطیٰ میں مقدس صلیبی جنگیں لڑ رہے تھے۔ آج مقبول عام کتابوں اور ٹیلی وژن پروگراموں کے اکثر نام اسلام کا قہر، اسلام کی تلوار، مقدس غضب یا مقدس دہشت رکھے جاتے ہیں لیکن یہ صورت حال حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف اور حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ دنیا کا ہر مذہب اپنے منفرد انداز اور خصوصی بصیرت کا حامل ہے جو اس کے قطعی معنوں اور اقدار کا امتیازی وصف ہوتا ہے۔ عیسائیت بنیادی طور پر دکھوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کا مذہب ہے اور کم سے کم مغرب میں مصیبتوں کے زمانے میں اس کا ہمیشہ بہترین اظہار ہوا ہے۔ کلیسا کے ابتدائی دور میں حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے والی شبیہ کا تاثر اور گہرا ہو گیا اور مسیحی روحانیت پر اس کے انمٹ نقش ثبت ہو گئے۔ چنانچہ عیسائیوں نے شروع ہی سے یہ محسوس کر لیا کہ انہیں دنیا سے کنارہ کش ہونا ہو گا۔ اسی طرح سیاسی حکومت کی مخالفت یا اس سے علیحدگی شہیدوں کے دور میں خوش نصیبی کی علامت اور عیسیٰؑ کے لیے تکلیفیں اٹھانا اور ان کے لیے مرنا اعلیٰ ترین مذہبی نصب العین بن گیا۔ عیسائیوں کا یہ نظریہ کہ تکلیفیں برداشت کرنے سے انسان میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں، متاثر کن ہے اور لاکھوں غم زدہ عیسائیوں کے لیے تسلی کا باعث بھی! لیکن اس نظریے نے ایک بری ریت بھی ڈالی ہے۔ عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ ظلم اور ناانصافی کو برداشت کرنا ان کا فرض ہے، یہ خدائی نظام ہے جس میں امیر اپنے محل کے اندر اور غریب اس کے دروازے پر بیٹھتا ہے، اس دنیا میں ایذا رسانی اور تکلیفیں اٹھانے کا انعام جنت میں دیا جائے گا۔ آج بھی امریکی حکومت کے بعض طبقے قدامت پسند عیسائیوں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ وسطی اور جنوبی امریکا میں ایسی تعلیمات کی تبلیغ کریں۔ لیکن ایسے عیسائی بھی موجود ہیں جو مظلوموں اور بے کسوں کا ساتھ دینے اور ایک منصفانہ اور بہترین معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہمیں اسلامی جہاد کا، جسے مغرب کے لوگ عام طور پر مقدس جنگ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔

عیسائیت میں سیاسی سرگرمی کو مذہبی زندگی سے الگ تھلگ رکھنے کا شدید رجحان پایا جاتا ہے اور عیسائی دنیاوی کامیابی کو عموماً روحانی فتح تصور نہیں کرتے۔ ہم نے یورپ میں بتدریج ایک ایسا آئیڈیل دریافت کر لیا ہے جو کلیسا اور ریاست کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ عام طور پر ہم اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ان دو منفرد شعبوں، مذہب اور ریاست کو آپس میں گڈمڈ کر دیا ہے لیکن مسیحیت کے اس تجربے کی بنا پر ہمیں ان دوسری ثقافتی اور مذہبی روایات کے خلاف تعصب روا نہیں رکھنا چاہیے جو مختلف حالات میں پھلی پھولی ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب اپنی قوم کو وحی سے آگاہ کیا، اس وقت عرب مہذب دنیا سے باہر تھا اور اس کا سیاسی اور سماجی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ اس کے برعکس عیسائیت نے رومی سلطنت میں جنم لیا جس میں عیسائیوں کو امن اور سماجی تحفظ حاصل ہو گیا۔ یسوع مسیح اور سینٹ پال کو سماجی اور سیاسی نظام کے حوالے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ یہ نظام وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو سینٹ پال رومی حدود سے باہر تبلیغی سفر نہیں کرسکتا تھا۔ عرب میں کسی بھی شخص کو، جو کسی کے زیر حفاظت نہ ہوتا، کھلے بندوں قتل کیا جاسکتا تھا اور قاتل کو کوئی سزا بھی نہ ملتی۔ آخر چوتھی صدی کے شروع میں مسیحیت کو سلطنت کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوگئی لیکن نئی عیسائی حکومت کو ہرگز یہ احساس نہ تھا کہ اسے مکمل طور پر ایک نیا نظام معرض وجود میں لانا ہے۔ چنانچہ اس نے صرف قدیم رومی قانون اور اداروں کو عیسائیت میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت میں سیاست کو ایک الگ شعبے کا درجہ حاصل رہا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے برعکس رسول عربیؐ ایک ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے جب دنیا میں امن وسکون کے بجائے ہر طرف فتنہ، فساد برپا تھا۔ آپؐ ساتویں صدی کے خون میں نہائے ہوئے عرب میں پیدا ہوئے جہاں پرانی اقدار ناپید ہوگئی تھیں اور کسی نئے نظام یا نئی اقدار نے ان کی جگہ نہیں لی تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شروع شروع میں اس بات پر اصرار کیا کہ آپؐ کو کوئی سیاسی فریضہ نہیں سونپا گیا حالانکہ عبرانی پیغمبروں کی طرح آپؐ سماجی انصاف کے پیغام کی تبلیغ کرتے رہے تھے۔ بعد میں ایسے واقعات کی بدولت، جن کی پیش بینی ممکن نہیں تھی، حضورؐ کو ہجرت کر کے مدینہ جانے پر ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ غالباً آپؐ نے عربوں کو متحد کرنے کے نصب العین پر پہلے سے غور وخوض کرنا شروع کردیا تھا جس میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف برسرپیکار تھا۔ لیکن ہجرت کے وقت نبی کریمؐ کے پاس کوئی قطعی خاکہ اور وژن نہیں تھا اور نہ ہی آپؐ نے ایسی کوئی مربوط پالیسی وضع کی تھی جس کے ذریعے آپؐ اپنے نصب العین کو حاصل کرلیتے۔ آنحضرتؐ نے کبھی کوئی لمبے چوڑے منصوبے نہ بنائے بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آتا تو حالات کی مناسبت سے آپؐ اس سے نمٹ لیتے۔ آپؐ بتدریج ایک نامعلوم اور انجان منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر موجود نہیں تھی۔ ان حالات میں پرانے زوال پذیر نظام پر نئے نظریات اور پالیسیوں کی بنیاد استوار کرنا ناگزیر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ حضورؐ کی اولیں ترجیح رہا۔

مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جب نبی کریمؐ کو سیاسی اور سماجی نوعیت کے فیصلے کرنا پڑے تو قرآن حکیم کا انداز بھی بدلنا شروع ہوگیا اور شاعرانہ تخیل اور ازلی حقائق کی حامل سورتوں کا مزاج اب زیادہ عملی ہونے لگا جن میں نئی قانون سازی ہوتی یا موجودہ سیاسی صورت حال پر تبصرہ شامل ہوتا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا، جیسا کہ بعض مغربی نقاد سمجھتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے طاقت حاصل کرنے کے لیے اپنے حقیقی نصب العین کو ترک کردیا تھا۔ قرآن کریم پر تدبر کرتے وقت ہمیں اس کے سیاق وسباق کو پوری طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی ایک بھی ایسی سورت موجود نہیں جس کا مرکز خدا کی ذات نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیمات کا مرکز اور محور صرف خدا کی ذات ہے۔قرآن مجید ہر مرحلے پر مسلمانوں کے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج پیش کرتا ہے۔کیا وہ خدا کی کامل اطاعت کریں گے اور اس پر دل وجان سے ایمان لائیں گے یا اپنے محدود خیالات کے پیچھے بھاگتے پھریں گے؟ لیکن دنیاوی معاملات زیر بحث آنے کے باوجود بعض آیات کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقعے پر بھی اصل عربی زبان کی شان وشوکت اور لب ولہجے کو برقرار رکھا گیا ہے۔مدنی سوتوں میں جو موسیقیت اور نغمگی پائی جاتی ہے، وہ مروجہ تشبیہوں اور استعاروں کی قدرومنزلت میں اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔مثال کے طور پر جب ان میں خدا کے ساتھ اچھا سودا کرنے کا ذکر آتا ہے تو اسے خدائی نظام میں شامل کرلیا جاتا ہے۔یہاں بھی مختلف اجزا کو باہم مربوط کرنے کے عمل کو بدستور سب سے بڑے تجربے کا درجہ حاصل رہتا ہے۔مسلمان جب قرآن کریم کی کوئی مختصر آیت سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں مکمل پیغام کا تاثر ابھرآتا ہے۔قرآن میں ایسی بے شمار ضرب المثلیں، اشارے کنائے اور تلمیحات موجود ہیں جن کا ترجمہ کرنا گو ایک دشوار کام ہے لیکن وہ پیغام خداوندی کے اہم نکات کو ذہن نشین کرنے میں قاری کی معاونت کرتی ہیں۔رسول اللہؐ جیسے جیسے اہم سیاسی معاملات سے نبردآزما ہوتے رہے، آپؐ کا ذہن عربوں کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف ہوگیا۔

لیکن اپنے کیریئر کے آخر میں سیاسی کردار ادا کرنے کے باوجود سماجی پیغام آپؐ کے مذہبی وژن کا جزولاینفک رہا۔قرآن حکیم نے جب مسلمانوں کو مظاہر فطرت میں خدا کی ''نشانیاں'' دیکھنے کی ترغیب دی تو اس سے ان میں خدائی نظام کا ادراک کرنے کی جستجو پیدا ہوگئی۔مچھلیوں، پرندوں، جانوروں، پھولوں، پہاڑوں اور ہواؤں کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ خدا کے سامنے جھکنے یا نہ جھکنے کا فیصلہ کریں۔وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں خدا کی شان کا اظہار کرتی ہیں لہٰذا یہ تمام چیزیں فطری طور پر مسلمان ہیں جو خود کو خدا کے سامنے جھکا کر اعلیٰ ترین منصب تک پہنچ جاتی ہیں۔اس کائنات میں آزاد قوتِ فیصلہ کا تحفہ اور خوفناک ذمے داری صرف اور صرف انسان کو سونپی گئی ہے۔خدا نے قرآن کریم کی ایک حیرت انگیز آیت میں اشارہ کیا ہے کہ ہم نے اپنی تمام مخلوقات کو آزادی کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انکار کردیا، صرف انسان نے عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قبول کرلیا:

ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اسے اٹھالیا، وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔(سورہ الاحزاب آیت ۷۲..... مترجم)۔

لیکن خدا نے بنی نوع انسان کو ہدایت اور رہنمائی کے بغیر نہیں چھوڑا۔اس نے کرۂ ارض پر بسنے والی تمام قوموں کے لیے بے شمار پیغمبر بھیجے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے کیا چاہتا ہے؟ بہر حال انسانوں نے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام کے وقت سے خدا کے پیغام کو سننے سے انکار کردیا۔انسان اس پیغام کو صحیح طریقے سے سمجھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں یا اپنی روزمرہ زندگی پر اسے نافذ کرنے میں ناکام رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی بستیاں تباہ ہوتی رہیں کیونکہ ان کی تعمیر اس طرز پر نہیں ہوئی تھی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔ قرآن میں بار بار یہ تذکرہ ہوا ہے کہ انسان خدا کے سادہ ترین احکام کو ماننے سے کس طرح انکار کرتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے فطری دنیا کو اپنی خودغرضی اور مفادات کے لیے بگاڑنا شروع کر دیا اور اپنی ذات کو نظام کائنات میں مرکزی حیثیت دے دی۔ انسانی رویے کے لیے خدائی پلان کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے انسانوں نے فطری نظام کو اس طرح تباہ و برباد کر دیا جس طرح سمندر اپنے مقررہ حدود سے باہر نکل کر تباہی پھیلا دیتے ہیں۔ اسی طرح قریش نے بھی اپنے پیغمبر کا پیغام سننے سے انکار کر دیا اس لیے ان کا معاشرہ بھی تباہی کا شکار ہو گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہل مکہ کو آنے والی تباہی سے خبردار کیا، اس لیے نہیں کہ خدا ایسا چاہتا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ قریش فطرت کے نظام کو درہم برہم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

لیکن ابھی سب کچھ کھویا نہیں تھا، اصلاح کی گنجائش موجود تھی۔ خدا نے مدینہ کے لوگوں کو ان کی اپنی زبان عربی میں قرآن سننے کا موقع فراہم کیا تھا اور رسول کریمؐ نخلستان میں خدائی پلان کے مطابق معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف تھے۔ بعض پیغمبروں کو دوسرے نبیوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ لوگوں کی بڑی تعداد کو اللہ کی وحدانیت پر قائل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اہل کتاب کو تورات اور انجیل کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ صرف مدینہ کے باشندوں بلکہ پورے عرب کے لوگوں کو نئی امت میں شامل ہونے پر آمادہ کیا چنانچہ مسلمان حضورؐ کو تمام رسولوں میں کامیاب ترین پیغمبر قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد کو آنحضرت کی پیدائش یا پہلی وحی کے نزول کی تاریخ سے منسوب نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کا دور ہجرت کے سال سے شروع ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ سال ہے جب مسلمانوں نے انسانی تاریخ میں خدائی پلان کو عملی شکل دینے کے کام کا آغاز کیا تھا۔

مسلمانوں کی یہ ایک انتہائی خطرناک جدوجہد تھی۔ رسول اللہؐ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر ایک مہاجر کی حیثیت سے ستمبر ۶۲۲ عیسوی میں مدینہ پہنچے تھے۔ اگلے پانچ برسوں کے دوران آپؐ بدستور اخلاقی خطرے سے دوچار رہے۔ اس پورے عرصے میں مسلم اُمہ کو اپنی تباہی کا خدشہ لاحق رہا۔ مغرب میں پیغمبر اسلامؐ کو اکثر ایک جنگجو شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو متذبذب دنیا پر تلوار لہراتے ہوئے اسلام کو مسلط کرتے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اصل میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اولیں مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑ   تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک منصوبے پر بھی عمل پیرا تھے جس میں تشدد ناگزیر تھا۔ دنیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کوئی بھی سماجی اور سیاسی انقلاب خون ریزی کے بغیر رونما نہیں ہوتا اور چونکہ نبی کریمؐ ایک ایسے پر آشوب دور میں رہ رہے تھے جس میں ہر طرف انتشار اور افراتفری تھی، اس لیے اس معاشرے میں امن صرف تلوار کے ذریعے ہی قائم ہوسکتا تھا۔ مسلمان حضورؐ کے مدنی دور کو سنہری دور کے طور پر یاد کرتے ہیں لیکن یہ دور غم واندوہ، دہشت اور خون ریزی کا بھی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ہولناک تشدد کو ختم کرنے کے لیے امت مسلمہ کو انتھک جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

اب قرآن مجید نے مدینہ کے مسلمانوں پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ جہاد میں حصہ لیں۔ اس میں جنگ اور خوں ریزی ناگزیر تھی۔ لیکن لفظ ''جہد'' کا مادہ ''جہاد'' یا ''مقدس جنگ'' سے کہیں زیادہ وسیع معنوں کا حامل ہے جس میں جسمانی، اخلاقی، روحانی اور علمی جدوجہد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں مسلح جنگ کے لیے بے شمار الفاظ موجود ہیں جن میں حرب، سریہ، معرکہ اور قتال کے الفاظ شامل ہیں۔ اگر جنگ مسلمانوں کا مطمح نظر ہوتی تو قرآن حکیم ان لفظوں کو آسانی کے ساتھ استعمال کرسکتا تھا لیکن اس نے جہاد کے مبہم لیکن وسیع مفہوم رکھنے والے لفظ کا انتخاب کیا ہے۔ جہاد اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل نہیں ہے اور مغرب کے عمومی نقطہ نظر کے برعکس دین اسلام میں جہاد کو مرکزی ستون کا درجہ حاصل نہیں البتہ تمام مسلمانوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ایک منصفانہ اور مہذب معاشرے کے قیام کے لیے، جس میں غریبوں اور بے کسوں کا استحصال نہ ہو، جہاں لوگ خدا کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں اور اخلاقی، روحانی اور سیاسی تمام محاذوں پر جدوجہد جاری رکھیں۔ بعض اوقات لڑائی اور جنگ وجدل ناگزیر ہوجاتی ہے لیکن یہ پورے جہاد کا ایک مختصر حصہ ہے۔ ایک مشہور حدیث کے مطابق ایک غزوے سے واپسی پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی وجود اور معاشرے میں روزمرہ زندگی میں پائی جانے والی برائیوں کے خلاف جہاد کرنا ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔

جب مسلمانوں نے ہجرت کی تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں جنگ کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ انصار نے عقبہ میں بیعت ثانی کے موقع پر جنگ لڑنے کا عہد کیا تھا چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد اس وحی کے ذریعے مہاجرین کو بھی جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی:

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے، اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں کہ بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔ ان کا کوئی جرم نہیں تھا، اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور دیکھو اگر اللہ بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم وتشدد کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی قوم کی عبادت گاہ محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب کبھی کی ڈھائی جا چکی ہوتیں۔

قرآن کریم نے انصاف کی خاطر جنگ لڑنے کے عقیدے کی بنیاد رکھی جس کی وجہ یہ تھی کہ اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے بعض اوقات جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر مذہب پر کاربند لوگ جنگ کے لیے نہ نکلتے تو ان کی عبادت گاہوں کو تباہ کر دیا جاتا۔ اللہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں صرف اسی صورت میں نصرت عطا کرے گا جب وہ نماز ادا کریں گے، خدا کی راہ میں خرچ کریں گے، انصاف اور وقار پر مبنی قوانین نافذ کریں گے اور مساوات اور برابری کے اصولوں کی بنیاد پر استحصال سے پاک معاشرہ تشکیل دیں گے۔ (یہ وہ ہیں جنہیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے، گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھائی جاتیں جہاں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا، اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔ (سورہ الحج آیات ۴۰، ۴۱..... مترجم)۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں صرف مہاجرین کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے جنہیں قریش نے مکہ سے نکال باہر کیا تھا۔ ابھی انصار کو جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی کیونکہ ان کا مکہ والوں سے کوئی باضابطہ تنازع نہیں تھا۔ لیکن اس وحی سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ رسول اللہؐ اس ابتدائی مرحلے میں قریش کے ساتھ بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایسا کرنا تو خالص دیوانگی ہوتی۔ عرب میں غزوہ یا حملہ صدیوں سے قومی کھیل کے طور پر رائج تھا۔ دراصل مشکل دور میں گزر بسر کرنے کے لیے یہی ایک آزمودہ طریقہ تھا۔ مدینہ میں مہاجرین کے پاس روزی کمانے کے ذرائع بہت محدود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ساہوکار، تاجر اور سرمایہ دار تھے اور انہیں کھجوریں کاشت کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگر مدینہ میں زمین دستیاب ہوتی تو بھی یہ لوگ کھیتی باڑی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ گذر اوقات کے لیے انصار پر بھروسا کرتے تھے اور جب تک ان کو آمدنی کا اپنا ذریعہ نہ ملتا، وہ مسلم امہ پر بوجھ بنے رہتے۔ سب لوگ نوجوان اور ذہین تاجر عبدالرحمٰنؓ کی پیروی نہیں کر سکتے تھے جنہوں نے مدینہ پہنچتے ہی روزی کا ذریعہ تلاش کر لیا تھا۔ انہوں نے صرف بازار کا راستہ پوچھا اور تھوڑے ہی عرصے میں خرید و فروخت کے ذریعے آمدنی کا وسیلہ بنا لیا۔ مدینہ میں تجارت کے بہت کم مواقع موجود تھے اور بڑے پیمانے پر تجارت پر مکہ والوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خانہ بدوشی کے زمانے میں دولت کے حصول کے لیے دستیاب ذرائع میں غزوہ ہی ایک ناخوشگوار اور فوری ذریعہ تھا۔ حملہ آور کسی دشمن کے علاقے پر اچانک ہلہ بول دیتے اور ان کے اونٹ، مویشی اور دوسری املاک لے جاتے۔ اس کارروائی کے دوران یہ احتیاط کی جاتی کہ خون خرابے کی نوبت نہ آئے بلکہ حریف قبیلے کو کارروائی کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مکہ کے تجارتی قافلوں پر حملے کے لیے مدینہ ایک بہترین جگہ تھی کیونکہ قریش کے قافلے شام جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرتے تھے اور ان قافلوں کی دیکھ بھال پر صرف چند تاجر ہی مامور ہوتے۔ چنانچہ ۶۲۳ عیسوی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش کے کاروانوں پر حملے کے لیے مہاجرین کے دو جتھے روانہ کردیے۔ شروع میں آپؐ خود ساتھ نہ گئے بلکہ حضرت حمزہؓ یا عبیدہؓ ابن الحارث جیسے آزمودہ کار جنگجوؤں کو کمان سونپ دی۔ عرب میں کسی شخص نے ان حملوں کو اخلاق اور روایات کے منافی قرار نہ دیا بلکہ بعضوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ مسلمانوں میں اپنے طاقتور رشتے داروں پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے۔ ۶۲۳ عیسوی میں جو ابتدائی حملے کیے گئے، وہ زیادہ کامیاب نہ ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ تجارتی قافلوں کی نقل وحرکت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ فریقین کے درمیان نہ تو کوئی لڑائی ہوئی اور نہ ہی تجارتی سامان پکڑا گیا۔ لیکن اس کارروائی سے مکہ کے لوگوں میں بے چینی اور اشتعال پیدا ہوگیا اور انہوں نے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لیے ایسی احتیاطی تدبیریں اختیار کرلیں جو اس پہلے کبھی نہیں کی جاتی تھیں۔ بحیرہ احمر کے ساحلی علاقے (جو تجارتی گزرگاہ تھے) پر رہنے والے بدو قبائل مسلمانوں کی دلیری اور ہمت سے بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ ان کاروانوں پر ابتدائی حملے ناکام رہے لیکن مسلمانوں نے شاہراہ کے ساتھ واقع جنگی اہمیت کے مقامات پر آباد مختلف قبیلوں کے ساتھ معاہدے کرلیے۔ ستمبر ۶۲۳ عیسوی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش کے ایک بڑے تجارتی قافلے پر حملے کی قیادت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ قافلہ جمح قبیلے کے امیر (حضرت ابوبکرؓ کے پرانے ایذارساں) کی قیادت میں سفر کر رہا تھا اور اس میں ۲۵۰۰ اونٹ شامل تھے۔ چونکہ بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگنے کی توقع تھی اس لیے کوئی دو سو مسلمان رضاکارانہ طور پر اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ بھی یہ قافلہ بچ نکلا اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔

سردیوں کے مہینوں میں قریش نے صرف جنوب کی سمت یمن میں اپنے تجارتی قافلے بھیجے، اس لیے یہ کاروان مدینہ سے نہ گزرے۔ لیکن نبی کریمؐ نے یہ پیغام دینے کے لیے کہ آپؐ اپنا مقصد نہیں بھولے، حضرت عبداللہؓ بن جحش کی قیادت میں ۹ آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ جنوبی گزرگاہ کے ایک قافلے پر حملے کے لیے روانہ کردیا۔ یہ رجب (جنوری ۶۲۴ عیسوی) کے مقدس مہینے کے آخری دن تھے اور اس مہینے میں پورے عرب میں لڑائی پر سخت پابندی ہوتی تھی۔ رسول اللہؐ نے عبداللہؓ کو ایک تحریر دے دی اور حکم دیا کہ وہ دو دن تک چلتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہیں، پھر تحریر دیکھیں اور اس میں جو حکم دیا گیا ہے، اس کے مطابق عمل کریں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور نہ ہی ان پر دباؤ ڈالیں۔ اس مرتبہ وہ گزشتہ مہموں کے مقابلے میں مکہ کے زیادہ قریب جا رہے تھے اور یہ ایک خطرناک مہم ثابت ہو سکتی تھی۔

حضرت عبداللہؓ نے دو دن کی مسافت کے بعد حضورؐ کا خط کھولا۔ مختلف ذرائع نے اس خط کے متن کے حوالے سے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں البتہ محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس خط میں مسلمانوں کو مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ انہیں صرف تجارتی قافلوں کی نقل و حرکت کی جاسوسی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن نویں صدی کے مورخ محمد ابن عمر واقدی کے مطابق خط کے مندرجات یہ تھے: ''نخلہ کی وادی میں پہنچ کر قریش پر حملہ کر دو۔'' (Tor Andrae: Muhammad : The Man and His Faith)۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان حملہ آوروں کو رجب کے مقدس مہینے کی حرمت کی خلاف ورزی کرنا پڑتی۔ رسول اللہؐ غالباً اس معاملے میں تذبذب کا شکار تھے۔ حرمت کے یہ مہینے اس مشرکانہ نظام کا حصہ تھے جس پر غلبہ حاصل کرنے کی آپؐ جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کی خلاف ورزی کرنے کا مقصد دیوتاؤں کے طلسم کو توڑنا تھا۔ لیکن حملہ آوروں میں سے دو افراد شاید اس مہم میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے کیونکہ اگلے پڑاؤ پر ان کا اونٹ گم ہو گیا اور انہوں نے باقی سات افراد سے کہہ دیا کہ وہ انہیں چھوڑ کر مہم پر روانہ ہو جائیں۔ حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھی جب نخلہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا قافلہ ان کے قریب ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ رجب کا آخری دن تھا لیکن اگر وہ اگلے دن کا انتظار کرتے، جب لڑائی کی اجازت تھی تو یہ قافلہ مکہ کے قریب محفوظ مقام پر پہنچ جاتا۔ چنانچہ انہوں نے حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے پہلے تیر سے تین میں سے ایک تاجر ہلاک ہو گیا اور باقی دونوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ عبداللہؓ ان دونوں آدمیوں اور مالِ غنیمت کو لے کر واپس مدینہ آ گئے۔

مدینہ والوں نے جب یہ سنا کہ ان لوگوں نے مقدس مہینے کی حرمت کی خلاف ورزی کی ہے تو فاتح کی حیثیت سے ان کا استقبال کرنے کے بجائے الٹا خوف زدہ ہو گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مدینہ کے عرب باشندے رسول اللہؐ کی طرف سے دیویوں کی پرستش ختم کرنے کے اقدام سے پریشان نہیں ہوئے تھے۔ یہودیوں نے انہیں توحید پرستی کے لیے تیار کر لیا تھا اور وہ مشرکوں کے مذہب کے اس حصے کو ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے تاہم مقدس مہینوں کے بارے میں ان کے خیالات ابھی تک تبدیل نہیں ہوئے تھے اور وہ اس مذہبی قدر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس واقعے سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مالِ غنیمت لینے سے انکار کر دیا۔ ہر چند کہ یہ ایک روکھا سوکھا طرزِ عمل تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہم کسی اشتعال کے بغیر روانہ کی گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مہم سے کئی فائدے حاصل ہوئے تھے۔ نبی کریمؐ نے دین کے بنیادی عقائد پر کبھی سودے بازی نہ کی بلکہ آپؐ نے مکہ میں قریش کے ساتھ تنازعے کو طے کرنے کے لیے ایک خدا کے ساتھ بتوں کی پوجا کرنے سے انکار کر کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ آپؐ اللہ کے دین میں آہستہ آہستہ اور قدم بہ قدم اصلاحات نافذ کر رہے تھے اور جیسے جیسے حالات وقوع پذیر ہوں، آپؐ دین کو بتدریج پھیلا رہے تھے۔ شروع شروع میں آپؐ کے ذہن میں دین کے حوالے سے کوئی واضح اور تفصیلی خاکہ موجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کسی مروجہ مذہب کی مدد کے بغیر تجربہ کرو اور سیکھو کے عمل کے تحت تنہا کام کر رہے تھے۔ آپؐ مقدس مہینوں کی روایت توڑنے کو بھی تیار تھے کیونکہ آپؐ کے نزدیک دین میں اس روایت کی کوئی لازمی حیثیت نہیں تھی۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پورے عرب میں مشرکانہ روایات اور جذبوں کے حوالے سے زبردست تضادات پائے جاتے تھے۔ آنحضرتؐ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ مدینہ کے لوگ مقدس مہینوں کے بارے میں روایت شکنی پر اس قدر شدید ردعمل ظاہر کریں گے۔ جب یہ دستہ غزوہ سے واپس آیا تو انصار میں پائی جانے والی بے چینی کو دیکھ کر حضورؐ نے یہ محسوس کیا کہ انصار کے مذہبی جذبات کو غیرارادی طور پر پامال کر دیا گیا ہے۔ لیکن اب اس روش پر قائم رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی تاہم اگر لوگ مقدس مہینوں کی حرمت کے عقیدے پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے کیونکہ اس سے خدائے واحد کے دین کو کوئی گزند نہیں پہنچتی تھی۔

حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھیوں کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے حملے کی کارروائی کو پسند نہیں کیا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے حملہ کر کے غلط فیصلہ کیا تھا۔ ان میں سے بعضوں کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ ان کی اخروی نجات خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ان حالات میں حضورؐ کا فرض تھا کہ آپؐ ان لوگوں کی تسلی تشفی کرتے۔ آنحضرتؐ نے اس واقعے کو انصاف کی غرض سے جنگ کی حمایت کے نظریے کو ایک قدم آگے بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ یہ درست ہے کہ مقدس مہینوں میں لڑائی کرنا غلط تھا لیکن قریش تو اس سے بھی بدترین جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے اور عرب کی مقدس روایات کو پامال کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے قبیلوں سے خارج کیا جو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنگین جرم تھا۔ بعض اوقات خدا کے بندے پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ان برائیوں کی روک تھام کے لیے جنگ کرے:

لوگ آپؐ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت سوال کرتے ہیں، آپؐ کہہ دیجیے کہ ان میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ (سورہ البقرہ آیت ۲۱۷..... مترجم)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس آیہ مبارکہ کے نازل ہونے کے بعد صورت حال بہتر ہوگئی، یہودیوں کی جانب سے ملامت کا سلسلہ جاری رہا لیکن انصار اور چھاپہ مار دستہ دونوں پر سکون ہوگئے۔ حضورؐ نے مہاجرین میں مال غنیمت تقسیم کر کے قیدیوں کے تبادلے کے لیے قریش سے گفت وشنید شروع کردی۔ آپؐ نے مکہ کے دو قیدی تاجروں کو ان دو مسلمانوں کے عوض رہا کرنے کا اعلان کردیا جو ابھی تک مکہ میں تھے لیکن ہجرت کرنے کے آرزومند تھے۔ اسی اثنا میں یہ واقعہ ہوا کہ قریش کا قیدی تاجر حکم ابن کیسان مسلمانوں کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کرکے مدینہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ واقعہ آنحضرتؐ کے طریق کار کی بہترین مثال ہے۔ آپؐ اپنے دین کے لیے جان تک دینے کو تیار تھے لیکن دوسری طرف غیر ضروری معاملوں پر سمجھوتا کرنے پر بھی ہر وقت آمادہ رہتے۔ چونکہ مدینہ میں کوئی قدیم اخلاقی نظام موجود نہیں تھا اس لیے آپؐ مختلف واقعات کا بغور جائزہ لیتے اور خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کی روشنی میں فیصلے کرتے کہ تاریخی وحدانیت پرستی کا یہی اہم اصول ہے۔ نبی کریمؐ کو یہ توقع نہ تھی کہ اس غزوے سے احتجاج کا طوفان کھڑا ہو جائے گا تاہم اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد آپؐ کو یقین ہوگیا کہ خدا کسی اہم معاملے میں آپؐ کی رہنمائی کرنے والا ہے۔ اس غزوے کے بعد حضورؐ نے ایک ایسا اصول وضع کر لیا جسے اسلام میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کے عدم تشدد کے پیغام کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بعض حالات میں طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر ظالم اور مکروہ حکومتوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے جائیں تو برائی کی قوتیں پوری دنیا کو بدی کی دلدل میں پھنسا دیں۔ بعض اوقات تو پیغمبر بھی جنگ لڑنے اور خون ریزی کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس کی واضح مثال حضرت داؤدؑ ہیں جنہوں نے خدا کی مدد سے گولیتھ کو قتل کردیا تھا:

اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل وکرم کرنے والا ہے۔ (سورہ البقرہ آیت ۲۵۱..... مترجم)۔

بہت سے عیسائی انصاف کی خاطر جنگ کے نظریے سے یقیناً اتفاق کریں گے اور یہ اعتراف کریں گے کہ کسی ہٹلر یا چاؤ شسکو سے صرف مسلح جنگ کے ذریعے ہی نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ عدم تشدد کا پرچار کرنے والے عیسائی مذہب کے برعکس، جس میں ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال سامنے کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اسلام ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے کا درس دیتا ہے۔ ہر مسلمان سمجھتا ہے کہ کمزور اور مظلوم کی امداد کرنا اس کا دینی فریضہ ہے۔ آج جب مسلمان اپنے دشمن کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کرتے ہیں تو وہ اسی قرآنی تعلیم پر عمل کرتے ہیں۔ (میں نے اپنی کتاب Holy war: The Crusades and Their Impact on Today's world لندن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۸۸، صفحات ۲۲۳ تا ۲۸۴ میں اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے)۔

مہاجرین کو توقع تھی کہ قریش ان سے بدلہ لیں گے کیونکہ نخلہ میں جس شخص کو قتل کیا گیا تھا، وہ اس کا انتقام لینے کے پابند تھے تاہم مسلمان اب زیادہ پر اعتماد تھے۔ چند ہفتوں کے بعد ماہ رمضان کے دوران (مارچ ۶۲۴ عیسوی) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیادت میں مسلمانوں کی ایک فوج ساحلی علاقے کی طرف روانہ ہوگئی تاکہ شام سے لوٹنے والے اس قافلے کو روکا جا سکے جسے ابوسفیان واپس مکہ لے جا رہا تھا۔ یہ اس سال کا سب سے اہم تجارتی قافلہ تھا۔ مسلمانوں کا دستہ ۳۵۰ افراد پر مشتمل تھا جس میں ستر مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ یہ لوگ بحیرہ احمر کے قریب بدر کے کنوئیں پر پہنچ گئے جہاں ہر سال عرب کا بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ مسلمانوں کو توقع تھی کہ اس مقام پر قافلے سے ان کی مڈ بھیڑ ہوگی۔ بدر کا معرکہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بے حد اہم اور دوررس نتائج مرتب کرنے والا تھا لیکن اس وقت کسی شخص کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا، یہ محض ایک اور غزوہ تھا چنانچہ بہت سے راسخ العقیدہ مسلمان گھروں میں ہی ٹھہرے رہے۔ ان میں حضورؐ کے داماد حضرت عثمانؓ بن عفان بھی شامل تھے جن کی اہلیہ حضرت رقیہؓ شدید بیمار تھیں۔

بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ قریش کا یہ تجارتی قافلہ معمول کے مطابق بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ابوسفیان نہایت ذہین اور باصلاحیت شخص تھا۔ اس نے شاہراہ پر لوگوں سے پوچھ پوچھ کر مسلمانوں کی مہم کا فوراً اندازہ لگا لیا اور قافلے کا رخ دائیں جانب ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا۔ اس نے مقامی قبیلے غفار کے ایک شخص ضمضم کو امداد حاصل کرنے کے لیے مکہ جانے کی غرض سے ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار کر دیا۔ ضمضم نہایت ڈرامائی انداز میں مکہ میں داخل ہوا۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں:

ضمضم بطن وادی میں اپنا اونٹ ٹھہرائے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس نے اونٹ کی ناک کاٹ دی، کجاوا الٹ دیا اور کرتا پھاڑ لیا۔ وہ کہہ رہا تھا: اے گروہ قریش! تمہارے سامان والے اونٹ، تمہارے سامان والے اونٹ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کے ساتھی گھات میں بیٹھے ہیں۔ اپنا مال بچاؤ جو ابوسفیان کے ساتھ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم اسے پا سکو گے۔ فریاد! فریاد! (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۳۰: The Life of Muhammad P. 291)۔

یہ سن کر قریش سخت غضب ناک ہو گئے۔ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خیال ہے کہ وہ نخلہ میں چھوٹے قافلے کی طرح اس سال کے سب سے بڑے تجارتی کارواں کو بھی آسانی سے پکڑ لیں گے؟ مکہ کے تمام سرکردہ قریش جنگ کے لیے تیار ہو گئے یہاں تک کہ بوڑھا اور بھاری بھرکم امیہ بن خلف بھی ہتھیار بند ہو کر دوسرے لوگوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ ابولہب کو مکہ ہی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاہم عباس، ابوطالب کے دو بیٹوں طالب اور عقیل کے ہمراہ، جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اپنے بھتیجے کے خلاف جنگ لڑنے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے اونٹ پر سوار ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا حکیم ابن حزم بھی قریش کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ اس شام کوئی ایک ہزار افراد مکہ سے نکل کر بدر کی طرف چل پڑے۔

رسول اللہؐ نے یہ خوفناک خبر سنی تو آپؐ نے مشاورت کے لیے صحابہؓ کو جمع کر لیا۔ آپؐ امت کے فوجی سپہ سالار نہ تھے اور دوسرے سرداروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیے بغیر اس ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ مسلمان رضا کار غزوہ میں حصہ لینے کی غرض سے یہاں آئے تھے نہ کہ کوئی باقاعدہ جنگ لڑنے۔ کیا انہیں واپس چلے جانا چاہیے کیونکہ ابھی وقت تھا یا پھر وہیں ٹھہر کر قریش کے خلاف جنگ کرنی چاہیے؟ کیا مکہ سے فوج کے وہاں پہنچنے سے پہلے قافلے کو پکڑا جا سکتا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اثر انگیز اور پر جوش تقریریں کیں چنانچہ ستر مہاجرین نے یہ عہد کیا کہ حالات کچھ بھی ہوں، وہ بدر ہی میں قیام کریں گے اور اگر انہیں اپنے قریبی رشتے داروں اور سابق دوستوں کے خلاف بھی لڑنا پڑا تو لڑیں گے۔ حضورؐ نے مہاجرین کا شکریہ ادا کیا اور اپنا روئے سخن انصار کی طرف موڑ دیا۔ انصار نے عقبہ میں دوسری بیعت کے وقت یہ عہد کیا تھا کہ اگر مدینہ میں آپؐ پر حملہ ہوا تو وہ آپؐ کی حفاظت کریں گے تاہم سعدؓ بن معاذ نے انصار کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

بے شبہ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے، ہم نے آپؐ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ آپؐ نے جو چیز ہمارے سامنے پیش فرمائی ہے، وہ حق ہے۔ اس پر ہم آپؐ کو قول دے چکے اور آپؐ کی فرماں برداری اور اطاعت پر مستحکم وعدے کر چکے، اس لیے یا رسول اللہ! آپؐ جہاں چاہیں، تشریف لے چلیں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اگر آپؐ سمندر بھی ہمارے سامنے لے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپؐ کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں گے اور ہمارا ایک بھی شخص پیچھے نہیں ہٹے گا۔ ہم اس بات کو ناپسند نہیں کرتے کہ آپؐ کل ہمیں اپنے ساتھ لے کر دشمن سے مقابل ہوں۔ ہم جنگ کرنے کے لیے بڑے مضبوط اور مقابلے میں کامل ہیں۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ، صفحہ ۴۳۵: The Life of Muhammad P. 294)۔

یہ نہایت جرأت مندانہ الفاظ تھے لیکن مسلمان فطری طور پر اب بھی یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ انہیں جنگ نہیں لڑنا پڑے گی اور یہ کہ مکہ کی فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی ابوسفیان کا کارواں ان کے ہتھے چڑھ جائے گا جس کے بعد وہ باعزت طریقے سے واپس چلے جائیں گے۔ مسلمانوں نے بدر کے کنوئیں پر مکہ کے دو آدمیوں کو پکڑ لیا جو قریش کے لیے پانی لینے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قافلے کے ساتھ نہیں بلکہ فوج کے ہمراہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ خبر اس قدر دہشت انگیز تھی کہ انہوں نے دونوں قیدیوں کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ قیدی جھوٹ بول رہے ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ ان افراد کو نہ ماریں۔ چنانچہ آپؐ خود ہی ان سے سوال پوچھنے لگے۔ جب ان آدمیوں نے حضورؐ کو قریش کے ان سرداروں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نام بتائے جو آپؐ کے خلاف لشکر کشی کر کے بدر پہنچے تھے تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ مکہ نے تمہارے مقابلے کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑے ڈال دیے ہیں۔

اسی اثنا میں ابوسفیان مسلمان فوج کو جھانسہ دے کر اپنے قافلے سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب وہ رسول اللہؐ کی پہنچ سے باہر ہو گیا تو اس نے قریش کے لشکر کو یہ پیغام بھیج دیا کہ اس کا قافلہ محفوظ ہے اس لیے وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ ابوجہل اس مہم کے نام پر دولت اکٹھی کر کے مکہ میں اپنی سرداری قائم کر لے گا۔ وہ ایک آزمودہ کار اور معاملہ فہم شخص تھا اور اسے توقع تھی کہ آخر کار فریقین کے درمیان مصالحت ہو جائے گی۔ لیکن ابوجہل پسپائی پر آمادہ نہ ہوا، کہنے لگا: ''واللہ! جب تک ہم بدر نہیں پہنچیں گے، نہیں لوٹیں گے۔ ہم تین دن تک وہاں قیام کریں گے، جانور کاٹیں گے، کھانا کھلائیں گے، شراب پلائیں گے، گانے والیاں ہمارے سامنے گائیں گی، عرب میں ہماری شہرت ہو گی، ہمارے جانے اور اکٹھے ہونے کی خبر پھیلے گی، پھر ان پر ہمارا رعب داب چھا جائے گا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۳۸: The Life of Muhammad P. 296)۔ لیکن قافلے کے بچ نکلنے کے بعد قریش کے دوسرے سردار جنگ لڑنے کے آرزومند نہیں تھے۔ زہرہ اور عدی قبیلوں کے لوگ فوری طور پر واپس ہو گئے۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر ابوجہل نے رسول اللہؐ پر فوجی اور خلاقی فتح حاصل کر لی تو وہ بہت زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ طالب ابن ابی طالب بنی ہاشم کے دستے کو واپس لے گئے کیونکہ وہ اپنے ہی قبیلے کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے تھے البتہ عباس اور حکیم دونوں قریش کے لشکر کے ساتھ ٹھہرے رہے۔

قریش نے بدر کے مقام پر پڑاؤ ڈالتے ہی جمح قبیلے کے عمیر بن وہب کو رسول اللہؐ کی فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا جو ریت کے ٹیلے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کے مہیب اور پرعزم چہرے دیکھے تو ششدر رہ گیا۔ چنانچہ اس نے قریش سے کہا کہ اگرچہ ان کی تعداد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جاں نثاروں کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ ہے لیکن میں تمہیں جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ عمیر نے کہا: ''میں نے دیکھا کہ بلائیں موتوں کو اٹھائے لا رہی ہیں۔ یثرب کی اونٹنیوں پر موتیں دھری ہیں''۔ مکہ کے قریش لڑائی کو ایک کھیل سمجھ رہے تھے لیکن جب عمیر نے مسلمانوں کے لشکر پر نگاہ ڈالی تو اسے یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا کوئی شخص قریش کے آدمی کو قتل کیے بغیر قتل نہ ہو گا۔ اس نے مایوسی کے عالم میں قریش سے کہا: ''جب وہ لوگ اپنی تعداد کے برابر تمہیں ختم کر دیں گے تو پھر جینے میں کیا لطف باقی رہے گا''۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۴۱: The Life of Muhammad P.298)۔ عرب جنگوں میں غیر ضروری خطرات مول نہیں لیتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ لڑائی میں بڑے پیمانے پر آدمی مارے نہ جائیں۔ قبیلوں کے درمیان مسلسل لڑائیوں اور عرب میں خطرات سے پر زندگی نے انہیں، جہاں تک ممکن ہو سکے، زیادہ سے زیادہ افرادی قوت کو بچا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔قریش کے دوسرے لوگ اپنے قبیلوں اور خاندانوں کے ساتھ جنگ کرنے میں متذبذب تھے۔مثال کے طور پر حکیم ابن حزم پر عمیر کے ان الفاظ کا اس قدر گہرا اثر ہوا کہ اس نے فوری طور پر عتبہ ابن ربیعہ کے پاس جا کر اس سے درخواست کی کہ وہ جنگ سے بچنے کی کوشش کرے۔عتبہ نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے شخص کا محافظ تھا چنانچہ حکیم نے اس سے کہا کہ وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کا فریضہ خود انجام دے تا کہ قبیلے کی عزت محفوظ رہے۔عتبہ کو اس بات کی اہمیت کا احساس تھا لہٰذا وہ اٹھ کر فوج سے یوں مخاطب ہوا: ''اے گروہ قریش! واللہ! تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کر کے کیا حاصل کرو گے؟! اگر تم لوگوں نے انہیں مار ڈالا تو ہمیشہ ایک شخص دوسرے کی صورت دیکھنے سے اس لیے کراہت کرے گا کہ اس نے اپنے چچیرے بھائی یا خالہ زاد بھائی یا اس کے خاندان کے کسی شخص کو قتل کر ڈالا۔لہٰذا تم پلٹ چلو اور محمدؐ کو سارے عرب کے مقابل چھوڑ دو''۔(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۴۱: The Life of Muhammad p.298)۔قریش کوئی جنگجو قوم نہیں تھے، انہیں میدان جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ خوں ریزی سے بچنے کے لیے مذاکرات کو ترجیح دیتے تھے۔لیکن ابوجہل کوئی معقول بات سننے کا روادار نہیں تھا۔اس نے طنزیہ انداز میں کہا: عتبہ بڑا بزدل ہے! اسے صرف یہ خطرہ ہے کہ وہ کہیں اپنے بیٹے کو قتل نہ کر بیٹھے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مسلمانوں میں شامل تھا۔کوئی عرب بزدلی کا طعنہ برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ اس کے بعد جنگ ناگزیر ہو گئی اور کفار کے پاس اس سے گریز کا کوئی راستہ نہ بچا۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۴۴۲: The Life of Muhammad P. 298)۔

مسلمان بھی جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اب حالات کا پانسہ پلٹ جانے سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ کی فوج کو نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے آپؐ کو اس کی تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔غالباً آپؐ ابھی تک جنگ لڑنے کے معاملے میں تذبذب میں مبتلا تھے۔حضورؐ نے پانی کے چشموں کے قریب اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالا جس سے قریش پانی سے محروم ہو گئے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں اپنا رخ مشرق کی طرف کرنا پڑتا جس سے سورج کی روشنی ان کی آنکھوں میں پڑتی۔بارش ہونے سے یہ فائدہ ہوا کہ زمین سخت ہو گئی اور چلنے پھرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی البتہ قریش پر بارش کے سبب ایسی مصیبت آ گئی کہ آپؐ کے مقابلے میں انہیں چلنا پھرنا تک مشکل ہو گیا۔

عرب میں ہمیشہ کی طرح اس لڑائی کا آغاز بھی انفرادی مقابلوں سے ہوا جس میں تین نامور مسلمان حضرت حمزہ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کا مقابلہ قریش کے تین سرداروں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ سے ہوا جو نخلہ میں قتل ہونے والے شخص کا بدلہ لینے میدان میں اترے تھے۔اس لڑائی میں تینوں قریش مارے گئے جب کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کو کاری زخم لگا۔ انہیں میدان سے اٹھا کر واپس لایا گیا۔ اس کے بعد عام جنگ شروع ہوگئی۔ قریش کو اپنی عددی برتری کے باوجود یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جنگ میں انہیں ہزیمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔ وہ پرانے عرب انداز سے لاپروائی کے ساتھ شجاعت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ہر سردار اپنے آدمیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ اس طرح قریش کا کوئی مشترکہ سپہ سالار نہیں تھا۔ اس کے برعکس حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہایت منظم انداز میں مسلمانوں کی صف بندی کی اور وہ انتہائی بے جگری اور جاں نثاری سے لڑ رہے تھے۔ اس طرح آنحضرتؐ اچانک ایک اعلیٰ سپہ سالار کے طور پر سامنے آئے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کھڑا کر کے بہترین طریقے سے فوج کو آراستہ کیا جس کی وجہ سے انہوں نے دشمن پر تیروں کی بارش کر دی اور صرف آخری لمحوں میں تلوار سے دست بدست لڑائی کی۔ دوپہر تک قریش میں، جو صرف طاقت کا مظاہرہ کرنے نکلے تھے، سراسیمگی پھیل گئی اور وہ ہراساں ہو کر ادھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ ان کے پچاس سرکردہ آدمی مارے جا چکے تھے جن میں خود ابوجہل بھی شامل تھا۔

مسلمانوں میں مسرت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے قیدیوں کو پکڑ کر عرب کے دستور کے مطابق انہیں قتل کرنا شروع کر دیا لیکن نبی کریمؐ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس موقعے پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ حضورؐ نے مال غنیمت پر جھگڑا کرنے کی ممانعت کر دی اور ۱۵۰ اونٹ، ۱۰ گھوڑے اور بہت سا سامان حرب تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ پھر فاتح فوج ستر جنگی قیدیوں کے ساتھ، جن میں قبیلہ عامر کا سردار سہیل، عباس اور رسول اللہؐ کے چچازاد عقیل اور نوفل شامل تھے، واپس مدینہ روانہ ہوگئی۔ راستے میں قیدیوں کے بارے میں آپؐ پر یہ وحی نازل ہوئی:

اے نبیؐ! اپنے ہاتھ تلے کے قیدیوں سے کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں نیک نیتی دیکھے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اس سے بہتر تمہیں دے گا اور پھر گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ہی۔ (سورۃ الانفال آیت ۷۰ ...... مترجم)۔

اس غیر متوقع فتح سے ملنے والی بے پایاں خوشی کے عالم میں بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کے ساتھ مصالحت کے آرزومند تھے۔

مسلمانوں کی فوج فاتحانہ انداز میں مدینہ پہنچی تو اس کا نہایت گرمجوشی سے والہانہ استقبال کیا گیا تاہم یہودیوں کے تین بڑے قبیلے اور ابن اُبی کی پارٹی اس فتح سے بدحواس ہوگئی۔ بدر کی فتح کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ رسول اللہؐ کئی برسوں سے نفرت اور توہین آمیز سلوک برداشت کرتے چلے آرہے تھے لیکن اس شاندار فتح کے بعد عربوں کو آپؐ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ دنیا کے تین بڑے تاریخی توحید پرست مذاہب کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدس جنگوں کی تاریخ میں کسی بھی غیر متوقع فتح یا قسمت کے اچانک پلٹا کھانے کو خدائی کام تصور کیا جاتا ہے اور اس سے ان مذاہب کے پیروکاروں میں ایک نیا اعتماد اور یقین پیدا ہو جاتا ہے۔(Armstrong: Holy War)۔ عیسائی صلیبیوں کی طرح اس قسم کی صورت حال میں مسلمان بھی اس فریب نظر میں مبتلا تھے اور انہوں نے دیکھا کہ فرشتوں کے کئی غول ان کی مدد کے لیے آن پہنچے تھے۔ جنگ بدر کے بعد صورت حال کا بغور جائزہ لینے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام واقعات کو خدا نے خود ترتیب دیا تھا جس کی وجہ سے تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کو جنگ کی توقع نہ تھی، وہ لڑائی کرنے میں متذبذب تھے یہاں تک کہ انہیں قریش کی عددی برتری کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کی فتح خدائی پلان کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔(اے ایمان والو! جب تم کسی مخالف فوج سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو اور بکثرت اللہ کو یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ سورہ الانفال آیت ۴۵..... مترجم)۔ جنگ کے دوران خدا نے مسلمانوں میں عزم و یقین کو پختہ کیا۔ ایک موقعے پر رسول خداؐ نے دشمن پر مٹھی بھر کنکریاں پھینکیں جو غالباً ایک روایتی مذہبی رسم تھی۔ فتح کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو خدا کا نمائندہ قرار دیا:

سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا
اور آپؐ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی
اور تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے ان کی محنت کا خوب عوض دے
بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (سورہ الانفال آیت ۱۷)

بدر کی جنگ تک مسلمانوں کے نصب العین میں مایوس کن پیش رفت ہوئی تھی لیکن اس فتح کے بعد ان میں زبردست اعتماد پیدا ہو گیا اور یوں محسوس ہونے لگا کہ اب کوئی طاقت انہیں آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی:

اے نبیؐ! ایمان والوں کو جہاد کا شوق دلاؤ۔ اگر تم میں بیس بھی صبر کرنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب رہیں گے، اس واسطے کہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔ اچھا اب اللہ تمہارا بوجھ ہلکا کرتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں ناتوانی ہے، پس اگر تم سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(سورہ الانفال آیات ۶۵، ۶۶)۔

لیکن قرآن کریم نے صبر اور استقامت پر زور دیا ہے اور حضورؐ کے ابتدائی سوانح نگار بھی متانت، پرہیزگاری اور استقلال مزاجی کو جہاد کا طرہ امتیاز قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ کوئی مذہبی جنون یا انتہاپسندی نہیں بلکہ صبر و تحمل اور بردباری کا کڑا امتحان تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے مدبر صحابہ کرامؓ اس حقیقت سے بخوبی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگاہ تھے کہ بدر کی فتح نے انہیں خطرناک راستے پر ڈال دیا ہے جو امت مسلمہ کو تباہی سے بھی دوچار کر سکتا ہے۔ قریش کو اپنی عزت اور وقار کی خاطر، جس پر ان کی کامیابی کا دارومدار تھا، جوابی کارروائی کرنا پڑے گی۔ اگرچہ مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے لیکن یوں لگتا ہے کہ خدا اُمت کو عرب کے سب سے طاقتور قبیلے کے خلاف بھرپور جنگ کے لیے صف آرا کرنا چاہتا تھا۔

تاریخ اور جنگ میں خدا کی مداخلت کا نظریہ بظاہر غیر معمولی اور ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن وحدت پرستی کی روایت میں ایسے خدائی کام کو نہایت اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں حالات حاضرہ کو ذاتِ خداوندی کا مظہر تصور کیا جاتا ہے جس سے انسانوں پر خدائی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ کئی جنگوں کے فیصلوں، سیاسی تبدیلیوں اور کامیابیوں میں خدائی ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ تاریخ انسانی کے بعض واقعات حق و صداقت کے لمحوں میں ڈھلنے کے بعد علامتی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس طرح کے واقعات میں گہرے اثرات کا حامل ایک واقعہ وہ ہے جب فرعون اور اس کی فوج بحیرہ احمر میں ڈوب گئی تھی۔ مناجات نویسوں، پیغمبروں اور عارفوں نے اس واقعے کو تاریخ میں خدائی یورش کے نام سے تعبیر کیا ہے جسے خود نجات کا درجہ مل گیا۔ عیسائیوں نے بھی اس واقعے پر غور کیا اور وہ اسے عیسیٰ علیہ السلام کے موت سے زندگی کی طرف لوٹنے کے حوالے سے ایک روشن علامت قرار دیتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک اس واقعے کو بپتسمہ یا اصطباغ کا درجہ بھی حاصل ہے جس کے ذریعے انہیں مایوسی اور سماجی و اخلاقی قدروں کے فقدان کے بعد نئی زندگی اور امید کی کرن نظر آئی تھی۔ قرآن کریم میں بحیرہ احمر کو پار کرنے کے واقعے کو فرقان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے نجات پانا اور حق کا باطل سے الگ ہونا۔ خود قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے کیونکہ اس نے مومنوں کی زندگیوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا اور انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ تعلقات کو ڈرامائی طور پر منقطع کر لیا تھا:

یہ بالکل سچ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فیصلے کرنے والی نورانی اور پرہیزگاروں کے لیے وعظ و نصیحت والی کتاب عطا فرمائی ہے

وہ لوگ جو اپنے رب سے بن دیکھے خوف کھاتے ہیں اور قیامت (کے تصور) سے کانپتے رہتے ہیں

اور نصیحت اور برکت والا قرآن بھی ہمیں نے نازل فرمایا ہے، کیا پھر بھی تم اس کے منکر ہو۔ (سورہ الانبیا آیات ۴۸ تا ۵۰......مترجم)۔

قرآن حکیم، جو اُمت مسلمہ کو مسلسل ہدایات دے رہا تھا اور پیش آمدہ واقعات کی توضیح اور تشریح کر رہا تھا، دنیاوی معاملات میں خدا کی پراسرار موجودگی اور دلچسپی کی یاددہانی کروا رہا تھا۔

اب بدر کی جنگ بھی فرقان یعنی نجات کی علامت بن گئی۔ جس طرح خدا نے بحیرہ احمر میں مصریوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسرائیلیوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا تھا، ٹھیک اسی طرح اب مسلمانوں کی فتح کی شکل میں حق اور باطل کو واضح طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔

"آؤ اسرائیلیوں کے سامنے سے بھاگ چلیں"۔ مصری چلا کر کہنے لگے: "کیونکہ خداوند مصریوں کے خلاف اسرائیلیوں کے لیے لڑ رہا ہے"۔ "تو اپنا ہاتھ سمندر پر بڑھا" ! خداوند نے موسیٰ سے فرمایا! "تاکہ مصریوں پر اور ان کی گاڑیوں اور سواریوں پر پانی پھر آ جائے"۔ "موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر پر بڑھایا اور پو پھٹنے کے وقت سمندر اپنی اصل جگہ لوٹا اور بھاگتے ہوئے مصریوں کو آ ملا۔ اور خداوند نے مصریوں کو سمندر کے بیچ میں غرق کیا۔ اور پانی واپس آیا اور فرعون کے سب لشکر کی گاڑیوں اور سواریوں کو، جو ان کے پیچھے سمندر کے بیچ میں آئے تھے، ڈھانپ لیا اور ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ خشکی پر چلے۔ اور پانی ان کے دائیں اور بائیں دیوار کی طرح تھا۔ سو اس دن خداوند نے بنی اسرائیل کو مصریوں کے ہاتھ سے خلاصی بخشی۔ اور اسرائیل نے سمندر کے کنارے پر مصریوں کی لاشیں دیکھیں۔ اور اسرائیل نے وہ بڑی قدرت، جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی، دیکھی تو لوگ خداوند سے ڈرے اور اس پر اور اس کے خادم موسیٰ پر ایمان لائے۔ (کتاب خروج ۱۴: ۲۵-۳۱)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انجیل کے واقعات کبھی نہیں پڑھے البتہ آپؐ اس کی روح سے بخوبی آگاہ تھے کیونکہ خود آپؐ کے مذہبی وژن میں بھی وہی داخلی حیات آفرینی موجود تھی۔ معرکہ بدر کے دن اللہ نے مسلمانوں کو قریش سے محفوظ رکھا اور مسلمانوں نے قریش کے لیڈروں کی لاشوں کو میدان جنگ میں بکھرے دیکھا۔ مسلم اُمہ نے قریش کے خلاف اللہ کی عظیم کارروائی کا خود مشاہدہ کیا اور ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور بندے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم وتکریم اور بڑھ گئی۔ اس میں فرق یہ تھا کہ یہ ماضی کا کوئی تاریخی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا واقعہ تھا جسے مسلمانوں کی حیرت زدہ آنکھوں نے خود دیکھا تھا۔ یہودی ہر سال فرقان یعنی اس واقعے کی یاد میں عید منایا کرتے تھے جب قہر ربانی فرشتے کی صورت میں مصریوں پر نازل ہوا تھا البتہ رسول اللہؐ سمجھتے تھے کہ یہ یوم کفارہ کا روزہ ہے جو بحیرہ احمر پر یہودی فتح کے دن رکھا جاتا تھا جیسا کہ طبری نے لکھا ہے:

جس وقت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہودیوں کو عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ حضورؐ نے یہود سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ اس روز خدا نے فرعون کے لشکر کو بحیرہ احمر میں غرق کر دیا تھا اور موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو فرعون کے مظالم سے نجات دلائی تھی۔ اس پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہودیوں کے مقابلے میں ہمارا حق زیادہ ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے اس دن خود بھی روزہ رکھا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی روزہ رکھنے کی ہدایت کی۔

(تاریخ رسول والملوک صفحہ ۱۲۸۱: Montgomery Watt: Muhammad at Medina P. 205)۔

رسول اللہؐ اس وقت امت کی مذہبی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہے تھے اور یہودیت کا نمونہ آپؐ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے پیش نظر تھا۔لیکن جنگ بدر سے چند ہفتے پہلے آپؐ نے قبلے کا رخ تبدیل کر کے اسلام کو قدیم مذہب کی روایات سے چھٹکارا دلا دیا تھا۔ فتح کے چند دن بعد ۹ رمضان کو نبی کریمؐ نے اعلان فرمادیا کہ عاشورہ کا روزہ اب مسلمانوں پر فرض نہیں رہا اور وہ بدر کے خصوصی فرقان کے دن کی یاد میں رمضان کے مہینے میں روزے رکھا کریں گے۔

لیکن رسول کریمؐ کو یہ احساس تھا کہ اس نئی صورت حال کا ایک تاریک پہلو بھی ہے کیونکہ اُمت نے قریش کے خلاف بھرپور جنگ کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ مکہ کا دارومدار اس کی عزت اور وقار پر تھا اس لیے اگر قریش کو ایک عظیم عرب طاقت کے طور پر زندہ رہنا ہے تو اسے بدر کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ چکانا پڑے گا۔ انہیں اپنے پچاس مقتولوں کا انتقام لینا تھا۔ مسلم اُمہ کو بھی اپنی بقا کے علاوہ جہاد کے نئے مرحلے کے لیے تیاری کرنا تھی۔ لیکن یہودیوں کے برعکس، جنھوں نے بحیرہ احمر کے واقعے کے بعد خود کو ایک مقدس جنگ کے لیے تیار کر لیا تھا، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش کو نیست و نابود کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال آپؐ نے قریش پر مکمل غلبہ حاصل کرنا تھا۔ آپؐ نے قریش کے قیدیوں سے منصفانہ برتاؤ روا رکھا۔ جنگ بدر کے فوراً بعد حضورؐ نے دو قیدیوں کو قتل کروا دیا کیونکہ ہجرت سے پہلے انہوں نے نبی کریمؐ پر خوفناک الزامات عاید کیے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قسم کے تنقیدی چیلنج کو بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ باقی قیدیوں کو حفاظت کے ساتھ مدینہ لا کر انہیں ان لوگوں کے گھروں میں رکھا گیا جنھوں نے انہیں قید کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد قرآن مجید نے جنگی قیدیوں کے لیے انسانی پالیسی کا اعلان کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کسی قسم کا ناروا سلوک نہ کیا جائے، انہیں آزاد کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ فدیہ دینے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انہیں اپنی آزادی خریدنے کے لیے کمانے کا موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ قیدی بنانے والے شخص پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے وسائل سے اس کی مدد کرے۔ چنانچہ قیدیوں کو آزاد کرنا ایک نیک اور فلاحی کام قرار دیا گیا۔ (تو جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردنوں پر وار مارو۔ جب ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو اب خوب مضبوط قید و بند سے گرفتار کرو۔ (پھر اختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر تاوقتیکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ سورہ محمد آیت ۵ ..... مترجم)۔ بعد کے زمانے کی ایک حدیث مبارکہ میں قیدیوں کے ساتھ گھر کے افراد جیسا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: ''انہیں ویسا ہی کھلاؤ جیسا تم خود کھاتے ہو، ویسا ہی پہناؤ جیسا خود پہنتے ہو اور اگر تم نے ان کے ذمے کوئی مشکل کام لگایا ہے تو اسے کرنے میں خود ان کی مدد کرو''۔ (محمد ظفر اللہ خان: Islam: Its Meaning for Modern Man P. 182)۔ لیکن آج مسلمان یرغمالیوں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، وہ قرآن اور حدیث کے قوانین کے برعکس ہے جو ایک افسوس ناک بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ جدوجہد میں کسی کو یرغمال بنانا حقیقی معنوں میں کوئی اسلامی فعل نہیں۔ بیروت میں شیعہ مسلمان لوگوں کو قیدی بنا کر ان کے ساتھ جو برا سلوک کرتے ہیں اور انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دیتے، وہ اسلام کی روح کے منافی ہے بلکہ حقیقت میں ان کے اس طرز عمل سے دین اسلام کے مقدس اور بنیادی احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

جن لوگوں کو بدر میں قیدی بنایا گیا، وہ کوئی نامعلوم دشمن نہیں، مہاجرین کے قریبی رشتے دار اور سابق دوست تھے۔ نبی کریمؐ کی بیوی حضرت سودہؓ نے جب اپنے چچازاد بھائی اور بہنوئی سہیل کو ذلت آمیز طریقے سے حجرے کے ایک کونے میں اس حال میں بیٹھا ہوا دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ رسی سے کمر کے ساتھ بندھے ہوئے تھے تو وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکیں۔ پرانی قبائلی جبلتیں فوراً کھل کر سامنے آ گئیں اور اسلام کا نیا نظریہ لمحے بھر میں منہدم ہو گیا: ''اے ابو یزید''۔ وہ حقارت کے ساتھ چلا کر سہیل سے کہنے لگیں: ''تم لوگوں نے قیدی بننا قبول کر لیا، عزت کی موت مر کیوں نہ گئے''؟ حضرت سودہؓ نے جیسے ہی یہ الفاظ کہے، نبی کریمؐ حجرے میں داخل ہو گئے اور آپؐ نے فرمایا: ''اے سودہ! کیا تم اسے عز وجلال والے رب اور اسی کے رسول کی مخالفت پر ابھار رہی ہو؟'' (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۴۵۹: The Life of Muhammad P. 309)۔ لیکن عزیز واقارب کے بارے میں خود نبی کریمؐ کے جذبات بھی بہت نرم اور گہرے تھے، اس خیال سے حضورؐ کو رات بھر نیند نہ آئی کہ آپؐ کے چچا اور چچازاد بھائی، جو قیدی بنا لیے گئے تھے، خستہ حالت میں بے آرامی سے وقت گزار رہے ہیں چنانچہ آپؐ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا۔ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک رنگ لایا اور بعض قیدی اُمت کی زندگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں قبول اسلام کا سب سے ڈرامائی واقعہ عمیر ابن وہب کا ہے جنہوں نے قریش کو جنگ نہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ وہ رہا ہو کر مکہ پہنچے تو صفوان بن امیہ نے انہیں واپس مدینہ جا کر (نعوذ باللہ...... مترجم) رسول اللہؐ کو قتل کرنے پر اکسایا۔ وہ واپس مدینہ آئے، حضورؐ نے انہیں پکڑ لیا اور آخر وہ مسلمان ہو گئے۔

قیدیوں میں رسول کریمؐ کے داماد ابوالعاص بھی شامل تھے جو ابھی تک اپنے پرانے مذہب پر قائم تھے۔ ان کی بیوی حضرت زینبؓ نے، جو حضورؐ کی صاحبزادی تھیں اور مکہ میں رہ رہی تھیں، ابوالعاص کے بھائی عامر کو فدیے کی وہ رقم دے کر مدینہ بھیجا جو انہوں نے خود اکٹھی کی تھی۔ اس میں ایک ہار بھی شامل تھا جو حضرت خدیجہؓ نے رخصتی کے وقت انہیں پہنایا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ہار کو فوراً پہچان لیا اور شدت جذبات سے آپؐ کا چہرہ مبارک زرد ہو گیا۔ آپؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ ابوالعاص کو فدیہ لیے بغیر چھوڑ دیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ انہیں رہا ۔ پر بخوشی آمادہ ہو گئے۔ حضورؐ کو توقع تھی کہ ابوالعاص رہائی کے بعد اسلام قبول کر لیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے لیکن وہ مسلمان نہ ہوئے۔ اس پر نبی کریمؐ نے ان سے کہا کہ وہ حضرت زینبؓ اور ان کی چھوٹی بیٹی امامہ کو ان کے پاس مدینہ بھیج دیں۔ جدوجہد کے اس مرحلے میں یہ بات پوری طرح واضح ہو رہی تھی کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان شادی اب قابل عمل نہیں رہی تھی۔ ابوالعاص افسردگی سے رضامند ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگرچہ حضرت زینبؓ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں، اس کے باوجود اب مکہ میں ان کا رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

حضرت زینبؓ کے ساتھ دوبارہ ملنا آں حضرتؐ کے لیے باعث تسکین تھا کیونکہ بدر سے واپسی پر آپؐ کو اپنی غیر موجودگی کے دوران اپنی پیاری بیٹی حضرت رقیہؓ کے انتقال کی خبر مل چکی تھی۔ حضرت عثمانؓ کا دکھ ناقابل تلافی تھا لیکن جب حضورؐ نے اپنی دوسری بیٹی ام کلثومؓ کا نکاح ان کے ساتھ کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو وہ خوش ہو گئے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے ساتھ حضرت رقیہؓ کی قبر پر گئے تو آپؐ اپنی چادر کے کونے سے ان کے آنسو پونچھتے رہے۔ حضرت فاطمہؓ کی عمر اب بیس سال ہو چکی تھی اور یہ ان کی شادی کے لیے نہایت موزوں عمر تھی۔ ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنے لیے ان کا رشتہ مانگا لیکن رسول اللہؐ کی خواہش تھی کہ ان کی شادی اپنی نگرانی میں پروان چڑھنے والے حضرت علیؓ سے کی جائے جو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ایک بھائی کی طرح پلے بڑھے تھے۔ شروع میں حضرت علیؓ اپنی ناداری کی بنا پر متذبذب رہے۔ انہیں اپنے والد ابوطالب سے وراثت میں کچھ نہیں ملا تھا تاہم آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ کی ہمت بندھائی اور معرکہ بدر کے بعد چند ہفتوں میں دونوں کی شادی ہو گئی۔

تقریباً اسی وقت آپؐ نے ایک اور شادی کرنے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ کی بیٹی حفصہؓ حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر خلیس بن حذافہ سہمی نے حبشہ سے مکہ واپسی پر حضرت حفصہؓ کے ساتھ شادی کی تھی لیکن جنگ بدر کے بعد وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہے۔ حضرت حفصہؓ کی عمر اب اٹھارہ سال تھی۔ وہ خوبصورت اور کمال مہذب، شائستہ اور سلیقہ مند تھیں اور باپ کی طرح لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے والد کی مانند تنک مزاج بھی تھیں جس سے ان کی دل کشی متاثر ہوتی۔ سوگ کی میعاد پوری ہونے پر حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کو حفصہؓ کے ساتھ شادی کی پیش کش کر دی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ حضرت ام کلثومؓ کو حضرت عثمانؓ کے ساتھ بیاہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بعد میں انہوں نے ابوبکرؓ کو پیش کش کی لیکن وہ اس بے ہنگم پیشکش پر خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ جب اپنے ان دو قریبی ساتھیوں کے بظاہر روکھے رویے کی شکایت کرنے کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گئے تو انہیں یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ رسول اللہؐ خود ان کا داماد بننا چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عمرؓ کو فوراً یہ بتا کر عارضی ناچاقی کو دور کر دیا کہ وہ حضورؐ کے حفصہؓ کے ساتھ شادی کرنے کے ارادے سے آگاہ تھے۔ چنانچہ ۶۲۵ عیسوی میں یہ شادی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دو انتہائی قریبی ساتھیوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آں حضرتؐ کا سیاسی اتحاد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب آپؐ دونوں دوستوں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے داماد تھے۔

حضرت عائشہؓ نے نہایت خوشدلی سے حضرت حفصہؓ کا خیر مقدم کیا۔ وہ حضورؐ کی بعد کی ازواج مطہراتؓ سے حسد کرتی تھیں لیکن ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان موجود گہرے تعلقات کی بنا پر ان دونوں میں دوستی بڑھتی گئی۔ چونکہ حضرت عائشہؓ ابھی چھوٹی تھیں اس لیے حضرت حفصہؓ ان ابتدائی برسوں میں ان کی رہنما بن گئیں۔ بعد میں حضرت سودہؓ کے ساتھ بھی ان کے تعلقات قائم ہو گئے لیکن شروع میں وہ اس معمر خاتون کو دق کرتیں۔ ایک روز ان دونوں نے حضرت سودہؓ سے مذاق کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک جھوٹے پیغمبر دجال کا ظہور ہو گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت سودہؓ اس قدر دہشت زدہ ہوئیں کہ وہ اس خوفناک مخلوق سے ڈر کر باورچی خانے میں چھپ گئیں۔ اس پر یہ دونوں ازواج مطہراتؓ قہقہے لگاتی ہوئی فوراً حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچ گئیں اور آپؐ کو یہ قصہ سنایا۔ چنانچہ حضورؐ بے چاری سودہؓ کو بچانے کے لیے جلدی سے ان کے پاس گئے اور مکڑی کے جالے میں اٹی ہوئی حضرت سودہؓ کو باہر لے آئے۔ حضرت سودہؓ کو جب اس مذاق کا علم ہوا اور یہ پتا چلا کہ دجال کا ظہور نہیں ہوا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بہ ہر حال وہ ان دو چھوٹی ''بہنوں'' سے، جس نام سے حضورؐ کی یہ ازواج مطہراتؓ موسوم تھیں، ناراض نہ ہوئیں۔

لیکن ان نوعمر ازواجؓ کے لیے زندگی ہمیشہ خوش کن نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ ابھی کم عمر ہی تھیں کہ ایک دن حضورؐ نے انہیں ایک جنگی قیدی کی نگرانی کرنے کے لیے کہا۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی توجہ ہٹ گئی اور وہ قیدی فرار ہو گیا۔ رسول اللہؐ جب واپس آئے اور آپؐ کو اس واقعے کا علم ہوا تو آپؐ کو سخت غصہ آیا: ''اللہ تمہارا ہاتھ کاٹ دے'' آں حضرتؐ نے قیدی کا پیچھا کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کو غصے سے کہا۔ بعد میں آپؐ قیدی کو دوبارہ پکڑ کر گھر لے آئے تو آپؐ نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ افسردگی سے اپنے ہاتھوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا کسی جن نے تم پر قبضہ کر لیا ہے''؟ آں حضرتؐ نے عائشہؓ سے پوچھا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ وہ حیران ہیں کہ اللہ ان کا کون سا ہاتھ کاٹے گا؟۔ یہ سن کر حضورؐ شرمائے اور آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فوری طور پر معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دعا کریں گے کہ انہوں نے جس کسی کے لیے بھی کبھی بددعا کی ہو، اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کرے۔

معرکہ بدر کے بعد نبی کریمؐ کی پوزیشن بہتر ہو گئی لیکن آپؐ کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے سب انصار خوش نہیں تھے۔ فتح کی خوشی اور فخر وانبساط کے باوجود بہت سے سمجھ بوجھ والے مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ اگلی مرتبہ قریش کو شکست دینا اس قدر آسان نہیں ہو گا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کا اگلا سال بڑی بے چینی میں گزرا۔ مسلمان یہ سن کر فطری طور پر پریشان ہو گئے کہ قریش نے رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کے لیے بدو قبیلوں سے امداد طلب کر لی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ابن ابی اور مخالف پارٹی نے ان خدشوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہ دلیل دی کہ اسلام نے مدینے کو تباہ کن صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نخلستان حضورؐ کی مدینہ آمد سے پہلے ہی تباہی کے دھانے پر پہنچ چکا تھا لیکن اب پورا عرب رسول اللہؐ کے خلاف ہو گیا تھا۔ ان کے یہ تمام اندیشے قابل فہم تھے۔ ابن ابی نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ وحی کے احکام پر عمل کرنے کو تیار ہے لیکن وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی نہیں کرے گا کیونکہ انہوں نے مدینے کو ایک خوفناک جنگ میں دھکیل دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ قرآن کریم میں اشارہ کیا گیا ہے، جب وحی نے حضورؐ کے فیصلوں کی توثیق کرتے ہوئے جہاد کو لازم قرار دے دیا تو مخالفین کو چپ لگ گئی اور بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ موت سے خوف زدہ ہیں۔ (اور جو لوگ ایمان لائے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی صاف مطلب والی سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپؐ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے، وہ آپؐ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے اس شخص کی نظر ہوتی ہے جس پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ سورہ محمد: آیت ۲۰ ..... مترجم)۔

ابن ابی، جسے یہودی قبائل کی حمایت حاصل تھی، مدینہ میں نبی کریمؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اہل مکہ کو اپنا فطری اتحادی سمجھتا تھا۔ بدر کی فتح کے فوراً بعد یہودی قبیلے بنی نضیر کا شاعر کعب بن اشرف سیدھا مکہ چلا گیا جہاں اس نے اشتعال انگیز شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ اس نے اپنے کلام میں قریش پر زور دیا کہ وہ رسول اللہؐ کے خلاف صف آرا ہو کر آپؐ سے اپنے مقتولین کا بدلہ لیں:

کاش جس وقت وہ قتل کیے گئے، زمین نے
اپنے لوگوں کو دھنسا لیا ہوتا اور پارہ پارہ ہو گئی ہوتی
جس نے اس خبر کی اشاعت کی ہے کاش! وہی نیزے کا نشانہ ہو گیا ہوتا
یا اندھا ہو کر زندہ رہتا، پھڑ پھڑ اتا رہتا اور اسے کچھ سنائی نہ دیتا

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۴۳: The Life of Muhamamd , P. 361)

کعب کے شعروں سے قریش پر واضح ہو گیا کہ مدینہ کے تمام لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حمایت نہیں کرتے۔ یہود کے قبیلے نہایت خوف زدہ تھے۔ ان کے پاس خاصی فوج اور شاندار حربی طاقت موجود تھی اور اہل مکہ کے حملے کی صورت میں وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے چھٹکارا پانے کے لیے قریش کے اتحادی بن سکتے تھے۔ اس زمانے میں شاعری کو عرب کی سیاسی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور کعب کے شعروں نے قریش کی آتش انتقام کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا جس میں وہ بدر کی ذلت آمیز شکست کے بعد پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غزوۂ بدر کے بعد ابوسفیان کا شمار مکہ کے اہم ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ قریش کے بیشتر لیڈر بدر میں قتل ہو چکے تھے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا شدید مخالف چچا ابولہب بھی بدر کے فوراً بعد انتقال کر گیا۔ چنانچہ اب ابوسفیان رسول کریمؐ کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرنے لگا۔ اس موقع پر قریش کی مجلس شوریٰ کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شام سے بحفاظت آنے والے تجارتی کارواں کی تمام آمدنی اہل مدینہ کے خلاف جنگ کے لیے وقف کر دی جائے گی۔ معرکہ بدر کے کوئی دس ہفتے بعد ابوسفیان مدینہ والوں کو مستقبل میں پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے دو سو سوار لے کر نکلا۔ وہ نہر کے اوپر والے حصے میں مدینے کے قریب ایک پہاڑ کے پاس جا اترا جس کا نام شیب تھا۔ پھر وہ راتوں رات نکل کر اندھیرے ہی میں یہودی قبیلے بنی نضیر کے پاس گیا جہاں قبیلے کے سردار سلام بن مشکم نے ابوسفیان کی میزبانی کی اور کھلایا پلایا۔ اس نے ابوسفیان کے ساتھ صورت حال پر تبادلہ خیال کیا اور محمد ابن اسحاق کے مطابق اسے مسلمانوں کے رازوں کی خبر دی۔ اگلے روز ابوسفیان اور اس کے آدمیوں نے بعض کھیت تباہ کر دیے، کھجوروں کے کچھ درختوں کو آگ لگا دی (یہ فعل عرب اصولوں کے منافی تھا جسے جنگ کا نقطہ آغاز تصور کیا جاتا تھا) اور کھیتوں میں کام کرنے والے دو انصار کو قتل کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جیسے ہی خبر ملی، آپؐ نے ایک دستے کی قیادت کرتے ہوئے قریش کا تعاقب شروع کر دیا لیکن ابوسفیان اور اس کے ساتھی بچ کر نکل گئے اور گھبراہٹ میں بوجھ کم کرنے کے لیے اپنا کچھ سامان رسد کھیتوں میں پھینک دیا۔

یہودی قبائل اب سلامتی کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ اگر مکہ کی فوج مدینے کے جنوب میں آتی تو یہ علاقہ یہودیوں کے دو انتہائی طاقتور قبیلوں کی ملکیت تھا۔ یہاں یہود کی افواج آسانی کے ساتھ ان قریش کے ساتھ مل جاتیں جنہیں یہودی اپنا حلیف سمجھتے تھے۔ اگر قریش شمال کی طرف سے مدینہ پر حملہ کرتے، جو ان کے لیے بہترین راستہ تھا تو اس صورت میں یہودی پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں پوری طرح محاصرے میں لے سکتے تھے۔ رسول کریمؐ نے محسوس کیا کہ اس مخالفت کو روکنا بہت ضروری ہے۔ یہودیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کرنے والوں نے آپؐ کو بتایا کہ یہودیوں کے تین میں سے سب سے چھوٹا قبیلہ بنی قینقاع کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ انتہائی جارحانہ ہے۔ ہجرت سے پہلے اس قبیلے کے یہودی ابن ابی کے حلیف تھے۔ جنگ بدر کے بعد انہوں نے مخالف پارٹی کو تقویت پہنچانے اور پیغمبر اسلامؐ کو مدینہ سے نکال باہر کرنے کے لیے رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدہ توڑ کر پرانے حلیفوں سے ناتا بحال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا علاقہ شہر کے مرکز سے بہت قریب تھا۔ یہودیوں کے دوسرے دو قبیلوں کے برعکس یہ لوگ کاشتکار نہیں، دستکار اور کاریگر تھے۔ معرکہ بدر اور کعب کے مکہ جانے کے تھوڑی دیر بعد حضورؐ ان کے علاقے میں تشریف لے گئے اور آپؐ نے ان پر زور دیا کہ وہ مشترک مذہبی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کی بنا پر آپ ؐ کو پیغمبر تسلیم کرلیں۔ بنی قینقاع کے یہود نے آں حضرت ؐ کی گفتگو کو خاموشی سے سنا اور جواب دیا کہ ان کا امت میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ''اے محمدؐ! تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم کی طرح ہیں۔ تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تم نے ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا جنہیں جنگ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اس لیے ان پر قابو پالیا۔ واللہ! اگر ہم سے جنگ کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ہم خاص قسم کے لوگ ہیں اور آپ ؐ کو ہم سا کوئی نہیں ملا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۴۵: The Life of Muhammad, P. 363)۔ اس دھمکی کے بعد حضورؐ وہاں سے واپس آ گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔

کچھ دنوں کے بعد قینقاع کے بازار میں ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک یہودی سنار نے ایک مسلمان خاتون کے ساتھ دھوکا کیا جو خریداری کے لیے وہاں آئی تھی۔ اس نے چپکے سے اس کی قمیض کو اس طریقے سے پچھلے حصے کے بالائی کپڑوں کے ساتھ باندھ دیا کہ جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کی پیٹھ ننگی ہوگئی۔ مسلمانوں اور بنی قینقاع کے یہودیوں کے درمیان نفرت کے جذبات اس قدر بھڑک اٹھے تھے کہ جب ایک انصاری غضبناک ہوکر یہودی سنار پر جھپٹا تو وہاں فساد ہوگیا جس میں ایک یہودی اور ایک مسلمان قتل ہوگیا۔ چونکہ یہودیوں اور مسلمانوں کا ایک ایک آدمی مارا گیا تھا اس لیے تنازع طے کرنے اور امن بحال کرنے کی غرض سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سرکاری حیثیت میں ایک منصف کے طور پر وہاں بلایا گیا۔ لیکن یہودیوں نے آپ ؐ کو ثالث ماننے سے انکار کردیا۔ وہ اپنے قلعے میں بند ہوگئے اور انہوں نے اپنے عرب حلیفوں سے امداد کی درخواست کردی۔ بنی قینقاع کے پاس سات سو جنگجو موجود تھے اور اگر پرانے عرب حلیف بھی اپنے لشکر لے کر ان کی امداد کو آ جاتے تو رسول اللہؐ انہیں شکست دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ابن ابی قینقاع کی مدد کرنے کے لیے بے قرار تھا چنانچہ اس نے اپنے دوسرے حلیف حضرت عبیدہؓ ابن صامت سے مشورہ کیا لیکن عبیدہؓ ایک پکے مسلمان تھے اور انہوں نے اس جانب اشارہ کیا کہ جب تمام یہودیوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے تھے تو اس وقت یہودیوں سے ہونے والے سب اتحاد منسوخ ہو گئے تھے۔ ابن ابی کو پتا چل گیا کہ وہ یہودیوں کی مدد کرنے کے معاملے میں بے بس ہے کیونکہ باقی عرب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پرزور حامی تھے۔ بنی قینقاع کو امید تھی کہ حضورؐ اور مہاجرین کے خلاف بغاوت ہوجائے گی لیکن ان کی توقع کے برعکس مدینہ کے تمام عرب قبیلوں نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ یہودی دو ہفتوں تک ابن ابی کی امداد کا انتظار کرتے رہے لیکن آخرکار غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔

اس کے فوراً بعد ابن ابی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور کہا کہ میرے دوستوں سے نیک سلوک کیجئے۔ آپؐ نے اس کی جانب سے روئے مبارک پھیر لیا تو اس نے رسول اللہؐ کے گریبان میں ہاتھ ڈال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا۔ اس پر حضورؐ کو غصہ آ گیا اور آپؐ کا چہرہ مبارک سفید ہو گیا۔ اس کے باوجود ابن ابی برابر اصرار کرتا رہا۔ وہ اپنے ان حلیفوں کو کس طرح بے یارو مددگار چھوڑ سکتا تھا جو ماضی میں کئی مرتبہ اس کی امداد کر چکے تھے؟ وہ جانتا تھا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب روایات کے مطابق یہودیوں کے پورے قبیلے کو قتل کر دیتے تو وہ حق پر ہوتے۔ لیکن آں حضرتؐ نے قینقاع کے یہود کی اس شرط پر جان بخشی کر دی کہ وہ فوری طور پر نخلستان کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ ابن ابی سے کہا گیا کہ وہ انہیں مدینے سے باہر لے جائے۔ بنی قینقاع کے یہودیوں کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ ابن ابی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تو وہ مدینہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہودیوں نے ایک جوا کھیلا تھا جس میں وہ اس لیے ہار گئے تھے کیونکہ انہوں نے رسول اللہؐ کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ ابھی تک یہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ پرانا نظام اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے سابق اتحادی اس نظام کو بحال کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے بظاہر کوئی احتجاج کیے بغیر نخلستان کو چھوڑ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ جانیں بچا کر جا رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے وقتوں میں جنگ کے دوران کئی قبیلوں کو نخلستان سے نکال دیا گیا تھا۔ اہل مدینہ اس قسم کی سزا سے بخوبی آگاہ تھے اور بنی قینقاع کو بھی اندازہ تھا کہ انہیں وہاں سے جانا ہی پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے وادی القرہ میں ایک اور یہودی قبیلے کے ہاں پناہ لے لی اور آخر شام کی سرحد پر بس گئے۔

اہل مغرب کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ مدینے کے یہودیوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے برتاؤ کا ادراک کر سکیں کیونکہ اس سے خود ہماری ماضی کی بہت سی شرمناک کرتوتوں کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ لیکن مدینہ کے تین بڑے یہودی قبیلوں کے ساتھ رسول اللہؐ کی جدوجہد اس نسلی اور مذہبی منافرت سے بالکل مختلف تھی جس کی بدولت مسیحی یورپ میں مخالفین کو منظم انداز میں قتل کرنے کا رجحان کوئی ایک ہزار برس تک برقرار رہا ہے۔ عیسائیوں کی دہشت گردی کا آخری مظاہرہ ہٹلر کی طرف سے یہودیوں کے خلاف سیکولر صلیبی جنگ کے اعلان کی صورت میں ہوا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہودیوں سے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا، نہ ہی آپؐ کی یہ خواہش تھی کہ یہود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، آپؐ نازی جرمنی کی طرح مدینہ سے یہودیوں کا صفایا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بنی قینقاع کے یہودیوں کے ساتھ آپؐ کا تنازع خالصتاً سیاسی تھا اور اس کا مدینہ میں آباد یہودیوں کے ان چھوٹے قبیلوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ طے پائے جانے والے معاہدوں کی پاسداری کرتے ہوئے امن سے مسلمانوں کے شانہ بشانہ رہتے تھے۔

امت مسلمہ کے لیے یہ ایک نہایت خطرناک وقت تھا۔ مسلمان جانتے تھے کہ اہل مکہ ان پر ایک بڑا حملہ کرنے والے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی صفوں کے اندر کسی دشمن کی موجودگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بنی قینقاع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا مدینے سے اخراج ابن ابی اور بنونضیر جیسے دوسرے مخالف گروپوں کے لیے ایک وارننگ تھی۔ اس کارروائی سے یہ ظاہر ہوگیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسے انسان نہیں تھے کہ ان سے ٹکر لی جائے۔ چند ماہ بعد جب شاعر کعب واپس مدینہ آ کر بغاوت اور سرکشی کی آگ بھڑکانے کے لیے زیادہ اشتعال انگیز اور توہین آمیز شاعری کرنے لگا تو رسول اللہؐ کو اسے قتل کرانا پڑا۔ حضورؐ جارحیت پسند شاعروں کو ہمیشہ خطرناک تصور کرتے تھے کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان شاعروں کا کلام جادوئی اثر رکھتا تھا۔ عرب میں شاعر کو ہلاکت خیز ہتھیار کی حیثیت حاصل تھی اور آں حضرتؐ کسی شاعر کو مدینہ میں اشتعال پھیلانے یا بدوی قبائل کو اہل مدینہ کے خلاف ابوسفیان کے اتحاد میں شامل ہونے کی ترغیب دینے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ بنی قینقاع کی شکست سے بنی نضیر کے حوصلے پست ہو گئے اور جب کعب کو قتل کر دیا گیا تو وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور شکایت کی کہ آپؐ نے یہودیوں کے ایک بڑے سردار کو قتل کرا دیا ہے۔ حضورؐ جانتے تھے کہ آپؐ کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ بھی کعب کی طرح نہایت جارحانہ ہے اور وہ وقتی طور پر خاموش ہیں۔ رسول اللہؐ نے ان یہودیوں کو بتایا کہ آپؐ باغیانہ خیالات یا رائے کو تو برداشت کر سکتے ہیں، بغاوت کو نہیں۔ حضورؐ نے بنی نضیر کی سلامتی اور خاموشی کو یقینی بنانے کے لیے ایک خصوصی معاہدے کی پیشکش کی جسے انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ اس طرح جب اہل مکہ کا حملہ متوقع تھا، آں حضرتؐ نے مدینہ میں داخلی مخالفت پر کامیابی کے ساتھ قابو پا لیا۔

نبی کریمؐ نے اس بحران کو جس ماہرانہ انداز سے حل کیا، اس سے مدینہ میں آپؐ کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہوگیا لیکن ابھی تک آپؐ کو متفقہ طور پر امت کا سردار تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عبیدہؓ ابن صامت کی امداد اور حمایت کے بغیر آپؐ کے لیے بنی قینقاع اور ابن ابی کے مشترکہ خطرے سے نمٹنا بہت مشکل تھا۔ بنی قینقاع نے مدینہ چھوڑتے وقت جو مال و اسباب چھوڑا، نبی کریمؐ کو اس میں سے پانچواں حصہ (خمس) دیا گیا۔ عربوں میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ وہ اس طرح کے مال میں سے اپنے سردار کو ایک چوتھائی حصہ دیتے تھے جو اس رقم کو تحائف دینے، غریبوں کی دیکھ بھال اور مہمان نوازی پر خرچ کرتا تھا۔ حضورؐ کو دیا جانے والا خمس اگرچہ دوسرے سرداروں کے مقابلے میں قدرے کم تھا لیکن اس سے بہ ہر حال یہ ظاہر ہوگیا کہ آپؐ کی قیادت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بے چینی کے ساتھ قریش کے متوقع حملے کا انتظار کر رہے تھے کہ اس دوران آپؐ کی مدینہ میں بدر کی فتح سے حاصل ہونے والی اعلیٰ پوزیشن مزید مستحکم ہوگئی۔ حضورؐ جب بھی یہ سنتے کہ فلاں بدوی قبیلہ اہل مکہ کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مدینہ کے علاقے پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے، آپؐ حملے کی پیش بندی کے لیے فوراً نکل پڑتے اور جیسے ہی مسلمان دستے اس قبیلے کی سرکوبی کے لیے وہاں پہنچتے، وہ تتر بتر ہو جاتا۔ موسم گرما کے آخر میں آپؐ نے قریش کو ایک اور ذلت سے دوچار کر دیا۔ غزوہ بدر کے واقعے کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریش کے تجارتی قافلے شام جانے کے لیے بحیرہ احمر کا راستہ استعمال نہیں کرتے تھے چنانچہ صفوان بن امیہ (صفوان بن حرب......مترجم) نے عراق جانے کے لیے مدینہ کے مشرق میں واقع شاہراہ نجد کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک دشوار راستہ تھا اور وہاں پانی کے ذخیرے بھی دور افتادہ مقامات پر تھے۔ لیکن صفوان نے تقریباً ایک لاکھ درہم مالیت کی چاندی لے جانے والے قافلے کے ہمراہ پانی سے لدے مزید اونٹوں کا اضافہ کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو قریش کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کر دیا۔ حضرت زیدؓ اور ان کے ساتھیوں نے تجارتی قافلے کو اس وقت القردہ کے چشمے پر جا لیا جب قریش وہاں آرام کر رہے تھے۔ معرکہ بدر کے بعد کفار کے دلوں پر مسلمان سپاہیوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی چنانچہ قریش نے جب انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر فرار ہو گئے اور پورے قافلے کا تجارتی سامان بھی وہیں چھوڑ دیا۔

قریش نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے زور شور کے ساتھ تیاریاں جاری رکھیں لیکن وہ سردیاں گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ۱۱ مارچ ۶۲۵ عیسوی کو تین ہزار آدمیوں کی فوج تین ہزار اونٹوں اور دو سو گھوڑوں کے ہمراہ مدینہ پر چڑھائی کے لیے نکل پڑی۔ راستے میں احابیش، طائف کے ثقیف اور عبد منات کے بدو اتحادی قبیلے بھی قریش کے ساتھ مل گئے۔ ۲۱ مارچ کو قریش کی فوج مدینے کے باہر پہنچ گئی اور اس نے نخلستان کے شمال مغرب میں اور پہاڑ کے سامنے میدان میں خیمے لگا لیے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اہل مدینہ کو قریش کی فوج کی روانگی کی خبر صرف ایک ہفتہ پہلے ملی۔ کھیتوں سے فصل اٹھانے کے لیے وقت میسر نہیں تھا البتہ وہ قریبی بستیوں میں رہنے والے لوگوں کو اونٹوں، مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے ساتھ شہر میں لے آئے۔ قریش کی فوج جیسے ہی مدینہ کے باہر پہنچی، شہر کے سرداروں نے جنگی کابینہ کا اجلاس بلا لیا۔ سب سے زیادہ تجربہ کار افراد نے حد درجہ محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ سب لوگ شہر کے اندر رہیں اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ سے باہر جانے سے انکار کر دیں۔ عرب میں محاصرہ جاری رکھنا بہت مشکل ہے۔ ماضی میں جب بھی اس قسم کی صورت حال میں یہ تدبیر اختیار کی گئی، دشمن لڑائی کیے بغیر واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔

لیکن نئی نسل کے بعض نوجوان جنگ لڑنے پر آمادہ تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جنگ بدر میں آں حضرتؐ نے صرف ۳۵۰ مسلمانوں سے دشمن کی ایک بڑی فوج کو شکست دے دی تھی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ یقیناً اب بھی آپؐ کی مدد کرے گا۔ کئی کاشتکار بھی ان نوجوانوں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ شہر کے باہر قریش ان کے کھیتوں کی فصلیں لے جائیں۔ یہ پر جوش اور جذباتی نوجوان اس قدر آمادہ پیکار تھے کہ آخر ان کی تجویز منظور کر لی گئی اور جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ (ان نوجوانوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! ہمیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باہر نکل کر دشمنوں سے جنگ کرنے کا موقع عنایت فرمائیں تاکہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم میں کسی قسم کی بزدلی یا کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔ مترجم)۔

لیکن بعد میں حضرت سعدؓ ابن معاذ جیسے تجربہ کار لوگوں نے جب ان نوجوانوں کو بتایا کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنا تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے تو ان عقاب صفت نوجوانوں کا جوش وخروش ماند پڑ گیا اور انہوں نے نبی کریمؐ کو بتایا کہ وہ مدینہ کے اندر رہنے کو تیار ہیں لیکن رسول اللہؐ جنگ کرنے کے فیصلے پر سختی سے قائم رہے: ''نبی کے لیے کسی طرح جائز نہیں'' حضورؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا'' کہ ایک مرتبہ زرہ پہن لینے کے بعد بغیر جنگ کیے اسے اتار دے۔'' (محمد ابن عمر الواقدی: کتاب المغازی صفحہ ۲۱۴: Martin LIngs: Muhammad : His Life Based on the Earliest Sources: P. 176)۔ اس موقعے پر کسی قسم کے تذبذب یا کمزوری کا مظاہرہ تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا چنانچہ ۶ شوال کو رسول اللہؐ قریش کے تین گنا لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے پسندیدہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک ہزار صحابہؓ کی جمعیت کے ہمراہ مدینہ سے بیس میل دور واقع احد پہاڑ کی جانب روانہ ہوگئے۔ یہودیوں نے جنگ کرنے سے انکار کردیا کیونکہ یہ ان کا سبت (یہودیوں کا ہفتہ وار آرام اور پرستش کا دن ...... مترجم) تھا۔ لیکن مسلمان خوب جانتے تھے کہ یہود اہل مکہ کی کامیابی کے لیے دعائیں کررہے ہیں۔ مسلمانوں کے لشکر نے رات کو مدینے اور کوہ احد کے درمیان خیمے لگائے اور صبح کو ابن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس مدینہ چلا گیا۔ اس نے آں حضرتؐ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کی زحمت بھی نہ کی بلکہ بعض انصار کو بتایا کہ وہ اس خلاف عقل اور خودکش مہم سے الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے۔ ابن ابی کہنے لگا: ''رسول اللہؐ نے نادانوں اور ناسمجھ لوگوں کی بات مان لی اور میری بات نہ مانی۔ لوگو! میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس جگہ اپنے آپ کو موت کا لقمہ کیوں بنایا جائے؟'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۵۵۹: The Life of Muhammad P. 372)۔ یہ ایک قابل فہم لیکن بے توقیر فیصلہ تھا البتہ ابن ابی ایک گہری چال چل رہا تھا۔ ۶۱۷ عیسوی میں وہ جنگ بعاث سے اس لیے واپس آ گیا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس جنگ میں مکمل فتح ممکن نہیں تھی۔ اس فیصلے کی وجہ سے اسے فائدہ ہوا اور اسے مدینے کے بادشاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب اگر احد میں آں حضرتؐ کو شکست ہوتی ہے، جس کے واضح آثار نظر آرہے تھے تو اس صورت میں ابن ابی تباہی اور ہلاکت سے بچ نکلتا اور اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیتا۔

اگلی صبح مسلمان نہایت بے سروسامانی کے عالم میں دشمن کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ ابوسفیان کفار کے لشکر کی پہلی قطار کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے دائیں طرف قبیلہ مخزوم کا خالد بن ولید اور بائیں جانب ابوجہل کا بیٹا عکرمہ تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ابوسفیان نے آگے بڑھ کر اوس اور خزرج سے کہا کہ وہ رسول اللہؐ کو چھوڑ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر گھروں کو واپس چلے جائیں، اہل مکہ کا ان کے ساتھ کوئی تنازع نہیں ہے۔ لیکن انصار نے بیک زبان بلند آواز سے کہا کہ وہ اپنے پیغمبر کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بعد مدینہ کا ابوعمرو آگے بڑھا۔ اس کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا اور وہ نبی کریمؐ کی مدینہ آمد کے بعد بھاگ کر مکہ جا بسا تھا۔ ابوعمرو اپنے قبیلے والوں سے اس طرح مخاطب ہوا: ''اے گروہ اوس! میں ابوعمرو ہوں۔'' جواب میں قوم نے کہا: ''او بدکار! ہم تجھے پہچانتے ہیں۔ خدا تجھے آنکھوں سے محروم کر دے۔'' یہ سن کر ابوعمرو کو صدمہ ہوا۔ اس نے مکہ میں یہ ڈینگ ماری تھی کہ اگر اس نے اپنے قبیلے کو ایک مرتبہ کہہ دیا تو اس کے قبیلے والے قریش کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ قوم نے اسے ٹھکرا دیا ہے تو بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا: ''جب سے میں نے اپنی قوم کو چھوڑا ہے، ان پر پھٹکار پڑ گئی ہے۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۶۲:The Life of Muhammad P. 374)۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ مکہ والوں کے لشکر کے پیچھے ابوسفیان کی بیوی ہند قریش کی بعض دوسری عالی نسب عورتوں کے ساتھ دف بجا بجا کر اور ترانے گا گا کر مردوں کو ابھارنے لگی:

اگر آگے بڑھ کر مقابلہ کرو گے تو ہم تمہیں اپنے سینوں سے لگا لیں گی
اور تمہارے لیے اچھے تکیے اور فرش لگا کر تمہارا استقبال کریں گی
اگر تم پیٹھ دکھا کر بھاگو گے تو اپنے پاس بھی نہ آنے دیں گی اور اس طرح چھوڑ دیں گی
جیسے کوئی محبت نہ کرنے والا چھوڑ دیتا ہے

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۵۶۲:The Life of Muhammad P. 374)۔

ہند رسول اللہؐ سے ہمیشہ نفرت کرتی تھی لیکن بدر کے معرکے میں اس کے باپ عتبہ بن ربیعہ اور دو بیٹوں کو قتل کر دیا گیا تو اس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے کی قسم کھالی جنہوں نے انفرادی مقابلے میں اس کے باپ عتبہ کو مار گرایا تھا۔ اب دونوں طرف سے جنگ شروع ہوگئی۔ اس معرکے کے بارے میں تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے لیکن اکثر راوی اس سلسلے میں ابہام کا شکار ہیں۔ بہرحال شروع میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بدر کی طرح فوج کی صف بندی کی اور ایک مرحلے پر یوں لگتا تھا کہ وہ دشمن کو مار بھگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد مسلمان تیر اندازوں نے احکام کی خلاف ورزی کی اور اپنی صفوں سے باہر نکل آئے۔ خالد نے عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور اپنے دستے کو مہارت کے ساتھ آگے بڑھاتا گیا جس کے بعد مسلمان سراسیمگی کی حالت میں تتر بتر ہونا شروع ہوگئے۔ رسول کریمؐ نے انہیں روکنے کی کوشش کی کہ اس دوران آپؐ دشمنوں کے پتھر برسانے کے باعث زخمی ہو کر گر پڑے۔ آپؐ کا سامنے والا دانت ٹوٹ گیا اور چہرہ زخمی ہو گیا۔ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصل میں حضورؐ صرف بے ہوش ہوئے تھے۔ آپؐ کو اٹھا کر پہاڑ کی ایک گھاٹی میں لے جایا گیا جس کے بعد آپؐ سنبھل گئے۔ لیکن قریش نے آں حضرتؐ کی شہادت کی خبر کی تصدیق کرنا گوارا نہ کیا، انہوں نے جیسے ہی یہ سنا کہ رسول اللہؐ کو شہید کر دیا گیا ہے، لڑائی روک دی اور اپنی فتح کو یقینی نہ بنا سکے۔ اس سے مسلمانوں کو دوبارہ سنبھلنے کا موقع مل گیا اور وہ منظم انداز سے پسپا ہو گئے۔ اس لڑائی میں مکہ کے ۲۲ افراد ہلاک اور ۶۵ مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن قریش کے لیے یہ کوئی بڑی فتح نہیں تھی۔ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شہید کرنے اور امت مسلمہ کا صفایا کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شہید ہونے والوں میں صرف تین مہاجرین حضرت حمزہؓ، عبداللہؓ بن جحش اور حضرت مصعبؓ شامل تھے۔ باقی تمام شہدا انصار تھے جن کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے قریش زیادہ بے تاب نہیں تھے۔ لڑائی کے بعد قریش اپنے اتحادی بدوی قبائل سے الگ ہو گئے اور انہوں نے لاشوں کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ قریش میں سے ایک شخص نے حضرت حمزہؓ کا پیٹ پھاڑ ڈالا، کلیجہ نکالا اور اسے ہند کے پاس لے گیا جس نے کلیجہ چبا کر اپنی قسم پوری کر لی۔ پھر اس نے حضرت حمزہؓ کا ناک، کان اور دوسرے اعضا کاٹ کر ان کے ہار اور پازیب بنا لیے اور قریش کی دوسری عورتوں سے کہا کہ وہ بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ یہی سلوک کریں۔ یہ عورتیں یہ ہار، بندے اور پازیب پہنے میدان جنگ سے رخصت ہوئیں تو کئی بدوؤں اور ان کے اپنے آدمیوں نے یہ محسوس کیا کہ قریشی عورتوں کی اس حرکت سے ان کا نصب العین آلودہ ہو گیا ہے۔

میدان جنگ سے فوج کی واپسی سے پہلے ابوسفیان نے یہ مایوس کن خبر سنی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ کے ساتھ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ''اگلے سال میدان بدر میں ہماری تمہاری پھر جنگ ہو گی۔'' ابوسفیان نے آخری دھمکی دیتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس پر ایک صحابیؓ نے رسول اللہؐ کی طرف سے بلند آواز میں کہا: ''ہاں ہم اس کے لیے تیار ہیں، میدان بدر آئندہ سال کی جنگ کے لیے مقرر ہے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۳۸۶:۵۸۳ (The Life of Muhammad P. 386:583)۔

بھاری جانی نقصان کے باوجود مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ تین دن تک مشرکین مکہ کا تعاقب کرتے رہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رات کے وقت مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر کے انہیں منتشر ہونے اور آگ کے الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا تاکہ دشمن کو نظر آئے کہ ایک بہت بڑی فوج وہاں خیمہ زن ہے۔ یہ جنگی چال ان قریش کے لیے سدِ راہ ثابت ہوئی جو واپس مکہ جا کر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتے تھے۔

لیکن یہ حکمت عملی مسلمانوں کی تسکین کا سامان نہ کر سکی۔ غزوہ احد کے بعد بہت سے مسلمان افسردہ اور دل گیر ہو گئے۔ اگر غزوہ بدر فتح و نصرت کی علامت تھا تو کیا احد کی شکست اس بات کا اشارہ تھی کہ خدا نے حضرت محمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تنہا چھوڑ دیا ہے؟ قرآن کریم نے اس بدگمانی کا تیسری سورت میں جواب دیتے ہوئے کہا یہ خیال غلط ہے کہ تباہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی، اس کے ذمے دار خود مسلمان ہیں۔ اس پوری مہم کے دوران وہ جھگڑالو، حکم سے سرتابی کرنے والے اور غیر منظم رہے تھے۔ لیکن غزوہ احد کے اندر ایک سبق بھی تھا۔ اس سے سچے مسلمانوں اور ان بزدلوں کے درمیان خط امتیاز کھنچ گیا جو عبداللہ ابن ابی کے ساتھ میدان جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔

توقع کے مطابق ابن ابی اور یہودی بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔ ابن ابی اور اس کے حامی برملا یہ کہتے پھرتے تھے کہ اگر ابن ابی کی پالیسی پر عمل کیا جاتا تو مسلمانوں کو جانی نقصان اٹھانا نہ پڑتا۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (نعوذ باللہ ..... مترجم) ایک جاہ طلب شخص ہیں، انہیں پیغمبرانہ سند حاصل نہیں، کیا کسی نے کبھی کسی نبی کو شکست کھاتے دیکھا ہے؟ حضرت عمرؓ ان عیب گوؤں کو قتل کرنا چاہتے تھے لیکن رسول اللہؐ نے ان کے غیظ وغضب کو ٹھنڈا کر دیا۔ آپؐ نے اعلان کر دیا کہ قریش امت مسلمہ کی پھر کبھی تذلیل نہیں کر سکیں گے اور ایک دن آئے گا کہ وہ کعبے کی دوبارہ پرستش کرنے لگیں گے۔ بہ ہر حال حضورؐ کے خاموش اعتماد کے باوجود جنگ احد کی وجہ سے آپؐ کی عظمت اور سطوت کو نقصان پہنچا اور ابن ابی کے ساتھ اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ ابن ابی اب تک خفیہ طور پر مخالفت کرتا رہا تھا لیکن اب وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ معرکہ احد کے بعد آنے والے جمعے کے دن ابن ابی کو مسجد میں سرعام زبردست شرمندگی اٹھانا پڑی۔ ابن ابی جمعہ کے اجتماع میں تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو دو انصاری اس پر جھپٹ پڑے اور اسے بتایا کہ احد میں غداری کے بعد اسے اپنا منہ بند رکھنا چاہیے۔ اس پر ابن ابی غضبناک ہو کر مسجد سے نکل گیا اور حضورؐ سے دعائے مغفرت کرانے سے بھی انکار کر دیا۔ قرآن حکیم نے جنگ احد کے بعد اس کی جماعت کو ایک نیا نام دے دیا اور ابن ابی اور اس کے پیروکاروں کو منافقین کے نام سے موسوم کیا جانے لگا جس کا عام طور پر مطلب ہے ریاکار اور مکرباز۔ لیکن ڈبلیو منٹگم ، ہے کہ ان لوگوں کے لیے رینگنے والے یا چوہے کے الفاظ زیادہ موزوں ہیں کیونکہ احد کے مقام پر وہ ... زدہ چوہوں کی طرح رینگ کر اپنے بلوں میں گھس گئے تھے۔(The Life of Muhammad. P. 184)

اس کے علاوہ کئی دوسرے عملی مسائل ایسے تھے جنہیں حل کرنا بے حد ضروری تھا۔ احد میں جو ۶۵ مسلمان شہید ہوئے تھے، ان کی بیواؤں اور خاندانوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا۔ غزوہ احد کے بعد حضورؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی گئی:

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور پاک اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو، اور اپنے مالوں

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ان کے مال ملا کر نہ کھاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں سے بھی، جو تمہیں اچھی لگیں، تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ (ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھک جانے سے بچ جاؤ۔ (سورہ النسا: آیات ۲، ۳)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مغربی نکتہ چیں کثیر الازدواجی سے چشم پوشی کو خالصتاً مردوں کی جنگجویانہ ذہنیت قرار دیتے ہیں۔ ''حرم'' جیسی مقبول فلموں میں ایک مسلم شیخ کی ازدواجی زندگی کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور اس میں محض مغربی تخیل پرستی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس تناظر میں کثیر الازدواجی کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کا مقصد مردوں کی جنسی زندگی کو بہتر بنانا نہیں تھا بلکہ اسے صرف ایک سماجی قانون کا درجہ حاصل تھا۔ رسول اللہ ؐ کو ابتدائے نبوت سے ہی یتیموں کا مسئلہ درپیش رہا اور غزوہ احد کے بعد اس مسئلے کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس معرکے میں جو مسلمان شہید ہوئے، ان کے پسماندگان میں نہ صرف بیوائیں بلکہ بیٹیاں، بہنیں اور دوسرے رشتے دار شامل تھے جنہیں نئے محافظوں اور سرپرستوں کی ضرورت تھی۔ یہ ضروری تھا کہ نئے گارڈین ان یتیموں کی جائیداد کا انتظام و انصرام کرنے کے معاملے میں محتاط طرز عمل اختیار کرتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے بعض لوگ ان عورتوں کی جائیداد ہتھیانے کے لیے ان کی شادی ہی نہ کرتے۔ اس زمانے میں زیر نگہداشت عورتوں کی جائیداد کو اپنی املاک میں ضم کر لینا مردوں کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

عرب میں مردوں کی تعداد غالباً کم تھی جس کے نتیجے میں بہت سی عورتیں کنواری رہ جاتیں اور ان کا عام طور پر بری طرح استحصال کیا جاتا۔ قرآن مجید کو اس مسئلے پر گہری تشویش تھی چنانچہ اسے حل کرنے کے لیے کثیر الازدواجی کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح یتیم ہونے والی تمام لڑکیاں بیاہی گئیں۔ لیکن قرآن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مرد صرف اسی صورت میں ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان عورتوں کی جائیداد کی بہتر نگہداشت کرنے کا وعدہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یتیم لڑکی کو منقولہ جائیداد نہ سمجھا جائے۔

قرآن کریم میں طلاق دینے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں، جب عورتیں باپ کے گھر میں رہتی تھیں، ایک عورت یا اس کا مرد قرابت دار اس کے رشتے کو ختم کر سکتا تھا۔ قرآن پاک میں مرد کو عورت کی طرف سے طلاق کی درخواست مسترد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے البتہ اس میں عورت کے حق میں بھی ایک شق رکھی گئی ہے۔ عرب میں مرد کی جانب سے دلہن کو مہر یا جہیز دینے کا دستور تھا جسے لڑکی کے رشتے دار عموماً اپنے پاس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھ لیتے تھے۔لیکن اسلام میں یہ جہیز دلہن کو براہ راست دینے کا حکم دیا گیا ہے۔آج تک مسلمان خواتین کو مہر کی رقم اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا حق حاصل ہے۔وہ چاہے تو اس رقم کو خیرات کر دے،اس سے سومنگ پول بنائے یا کاروبار کرے البتہ طلاق کی صورت میں مرد کو عورت سے مہر کی رقم کا تقاضا کرنے کی اجازت نہیں۔اس طرح عورت کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے۔

مغرب کے نقاد خواتین کے ساتھ سلوک کے ضمن میں قرآن کریم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے عورتوں سے منصفانہ سلوک نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ خواتین کی آزادی اور ان کے حقوق کی پاسداری حضورؐ کو دل سے عزیز تھی۔یہ شکایت بھی کی جاتی ہے کہ قرآن میں دہرے معیار کا پرچار کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر وراثت کے شرعی قوانین کی رو سے عورت کو بھائیوں کے مقابلے میں (جنہیں نئے خاندان کا آغاز کرنے کے لیے مہر ادا کرنا پڑتا ہے) وراثت سے نصف حصہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ قانون کے مطابق عورتوں کو گواہی دینے کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن مرد کے مقابلے میں اس کی گواہی کو نصف تسلیم کیا گیا ہے۔بیسویں صدی کے تناظر میں، جب ہم ابھی تک خواتین کو مساوی حقوق دلانے کی مہم چلا رہے ہیں،عورتوں سے متعلق قرآنی قوانین بظاہر ناکافی دکھائی دیتے ہیں لیکن ساتویں صدی کے عرب میں یہ انقلابی اقدامات تھے۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ظہور اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں، جب لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیا جاتا تھا اور عورتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا،اس زمانے میں خواتین کی زندگی کس قدر کٹھن اور دشوار گزار ہوگی؟اس معاشرے میں عورتوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا،انہیں گھٹیا مخلوق سمجھا جاتا تھا اور انہیں کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا۔اس قسم کی وحشی اور غیر مہذب دنیا میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خواتین کے لیے جو کچھ حاصل کیا،وہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔اس وقت یہ نظریہ نہایت حیرت انگیز تھا کہ ایک عورت گواہی دے سکتی ہے یا اسے وراثت میں حصہ مل سکتا ہے۔ہمیں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ مسیحی یورپ میں خواتین کو اس قسم کے حقوق حاصل کرنے کے لیے انیسویں صدی تک انتظار کرنا پڑا،اس کے باوجود قانون کا جھکاؤ بدستور مردوں ہی کی طرف رہا ہے۔

ہمیں کثیر الازدواجی کے اسلامی قانون کا اس پس منظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ساتویں صدی کے عرب میں، جب مرد اپنی مرضی سے جتنی چاہے، بیویاں رکھ سکتا تھا،صرف چار بیویاں رکھنے کا قانون انہیں مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس قانون کو جبر و تعدی کے لائسنس کا درجہ حاصل نہیں تھا۔اس کے علاوہ قرآن چار شادیوں کی صرف اس صورت میں اجازت دیتا ہے کہ مرد تمام بیویوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک کرے۔یہ ایک مشکل شرط ہے۔قرآنی احکام کے مطابق شوہر کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی ہر بیوی کو برابر وقت دے،سب بیویوں کے ساتھ مالی اور قانونی لحاظ سے یکساں سلوک کرے،کسی بیوی کو دوسری بیوی پر معمولی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجیح بھی نہ دے اور احترام اور محبت کے معاملے میں تمام بیویوں سے مساوی برتاؤ کرے۔ پورے عالم اسلام میں بڑے پیمانے پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ان قرآنی شرائط کو پورا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مرد اس قسم کی غیر جانبداری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی بھی شخص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی شخص کو ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھنی چاہییں۔ جن ملکوں میں کثیر الازدواجی کی ممانعت ہے، وہاں کے حکام نے یہ طرز عمل سیکولر بنیاد پر اختیار نہیں کیا بلکہ مذہبی بنیاد پر یہ پابندی عاید کی ہے۔

قرآن کریم نے غزوہ احد میں شکست کے بعد مسلمانوں کو پرتعیش حرم قائم کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ قرآن نے نہ صرف بیویوں کی تعداد کو محدود کرنے کا حکم دیا بلکہ ان سے یہ بھی کہا کہ وہ مستقبل پر غیر متزلزل یقین رکھیں۔ قرآن مجید میں دختر کشی کی بار بار ممانعت کی گی ہے۔ یہ شرائط اس کے بنیادی احکام میں شامل ہو گئیں جن کا ماننا اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے لازم ہے۔ برتھ کنٹرول کے وحشیانہ رواج کے برعکس قرآن حکیم میں مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ خدا پر یقین رکھیں اور ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں بوڑھوں، شیرخوار بچوں اور یتیموں جیسے کمزور طبقوں کو تمام انسانی حقوق دیے جائیں اور ان کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے۔ (آپ کہہ دیجیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن (یعنی جن کی مخالفت) کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرما دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل نہ کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں، ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں، خواہ پوشیدہ، اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے، اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ۔ ان کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورہ الانعام: آیت ۱۵۱......مترجم)۔ انجیل کے ایک خوبصورت ترین اقتباس میں حضرت عیسیٰؑ اپنے پیروکاروں کو ہوا میں اڑنے والے پرندوں اور زمین پر کھلنے والے نرگس کے پھولوں کی نگہداشت کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ مستقبل کی فکر نہ کریں، خدا ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ (Mathew: 6: 26 ......مترجم)۔ اسی طرح قرآن مجید میں بھی مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ فطرت کی ''نشانیوں'' پر غور و فکر کریں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، کریم النفسی اور ربوبیت پر کامل یقین رکھیں، انہیں زمانہ جاہلیت کی سنگدلانہ اور استحصالی روش کو ترک کر کے خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے اور اس اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اللہ ان کی تمام ضروریات کو پورا کرے گا۔ مسلمانوں کو حاجت مند عورتوں کے ساتھ شادی کرنی چاہیے اور اس یقین سے سرشار ہو کر بڑے خاندان رکھنے چاہییں کہ اللہ ان کے زندہ رہنے کے اسباب مہیا کرنے والا ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح کے ہوں، ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک بخت غلام لونڈیوں کا بھی۔ اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔ (سورہ النور: آیت ۳۲)۔

یہ ایمان کا معاملہ تھا اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ جرأت مندی کا مظاہرہ کیا جائے۔ حضورؐ نے خود اپنے عمل کے ذریعے امت مسلمہ کی بے سہارا خواتین کے بارے میں اپنی تشویش کے سلسلے میں روشن مثال پیش کی اور غزوہ بدر کے بعد بدر میں شہید ہونے صحابی عبیدہؓ ابن الحارث کی بیوہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ سے چوتھی شادی کر کے انہیں رہنے کے لیے ایک الگ مکان دیا۔ وہ بدوی قبیلے بنو عامر کے سردار کی بیٹی تھیں چنانچہ اس شادی سے اس قبیلے کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم ہو گیا۔ ان کے لیے مسجد نبوی کے ساتھ ایک حجرہ تعمیر کیا گیا اور وہ اپنی ''بہنوں'' حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے ساتھ رہنے لگیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو تسلی دے رہے تھے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں پر امید رہیں اور اگر انہیں یقین ہے کہ وہ مساوات قائم رکھ سکتے ہیں تو نئی ذمے داریاں ضرور اٹھائیں۔ دوسری طرف ابوسفیان امت مسلمہ کو تباہ کرنے کے لیے ایک بڑا اتحاد بنانے میں مصروف تھا۔ اسی دوران رسول اللہؐ معمول کے مطابق مکمل احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے تھے۔ آپؐ کو احساس تھا کہ مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق میں رہنے والے بدو قبائل کو قریش کے اتحاد میں شمولیت سے باز رکھنے کے لیے ان کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان بدوؤں کو متاثر کرنے کے لیے کئی چھاپہ مار مہمیں ان علاقوں کی طرف بھیجیں۔ لیکن ۶۲۵ عیسوی کے موسم گرما میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے ظاہر ہو گیا کہ مدینہ کس قدر گہرے خطرات میں گھر چکا ہے۔

نجد کے دو بدو قبیلوں نے آں حضرتؐ سے درخواست کی کہ کچھ آدمیوں کو ان کے ساتھ روانہ کیا جائے تاکہ وہ ان لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا کریں، قرآن پڑھائیں اور شریعت اسلامیہ کی تعلیم دیں۔ ان کے بعض لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ انہیں قرآن کی تلاوت کا طریقہ سکھایا جائے چنانچہ حضورؐ نے اپنے چھ قابل ترین اشخاص کو اس مشن پر روانہ کر دیا۔ سفر کے دوران انہوں نے مکہ کے نواح میں رجیع کے چشمے پر آرام کیا۔ اس دوران ہذیل قبیلے کے ایک سردار نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا جس میں تین مسلمان شہید ہو گئے اور باقی تین کو قیدی بنا لیا گیا۔ ایک مسلمان قیدی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اس پر پتھروں کی بارش کر دی گئی اور وہ بھی شہید ہو گیا۔ دوسرے دو قیدیوں کو قریش کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لیے مکہ لے جایا گیا۔ صفوان ابن امیہ نے بدر میں مارے جانے والے اپنے باپ اور قبیلہ جمح کے بوڑھے سردار کا بدلہ لینے کے لیے ایک مسلمان قیدی کو خرید لیا اور بعد میں حرم سے باہر لے جا کر اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقریباً اسی وقت بدوی قبیلے بنو عامر کے سردار اور حضورؐ کے نئے سسر ابو برا نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ آپؐ اپنے رفقا میں سے کچھ لوگوں کو اہل نجد کے پاس بھیج دیں اور وہ انہیں آپ کا پیغام پہنچا کر اسلام کی دعوت دیں تو مجھے امید ہے کہ نجد کے لوگ آپؐ کے پیغام پر ضرور لبیک کہیں گے۔ اس پر حضورؐ نے چالیس مسلمانوں کو روانہ کر دیا جنہیں بنو عامر کے علاقے کے قریب معونہ کے چشمے پر شہید کر دیا گیا۔ یہ کارروائی ابو برا کے مخالفین کی ترغیب پر ہمسایہ قبیلے بنو سلیم کے لوگوں نے کی۔ ان میں سے دو مسلمان قریبی چراگاہ میں اونٹ چرا رہے تھے۔ انہیں اپنے ساتھیوں کی قطعاً کوئی خبر نہ تھی مگر انہوں نے دیکھا کہ ان کی جماعت کے سروں پر گدھ اڑ رہے ہیں۔ وہ فوراً اپنے ساتھیوں کی طرف لپکے تو دیکھا کہ مسلمان خون میں آلودہ پڑے ہیں اور جن لوگوں نے انہیں قتل کیا تھا، وہ وہیں کھڑے ہیں۔ زندہ بچنے والے ایک صحابیؓ کو قیدی بنا لیا گیا اور دوسرا بھاگ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ بنی عامر کے دو اشخاص ایک درخت کے نیچے آرام سے سو رہے ہیں۔ اس صحابیؓ نے یہ سمجھ کر کہ اس کے ساتھیوں کو بنی عامر کے لوگوں نے قتل کیا ہے، تلوار سونتی اور ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ مدینہ پہنچ گیا اور رسول اللہؐ کو پورا ماجرا سنا دیا۔ اسے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ اس نے بنی عامر کے دو افراد کو قتل کر کے غلط کام کیا ہے اور یہ کہ مسلم امہ کو ان کا خون بہا ادا کرنا ہو گا۔ آں حضرتؐ کو یقین تھا کہ بنی عامر کے افراد کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ درست تھا کہ صحابہ کرامؓ کے قتل عام کے پیچھے بنی عامر کے بعض لوگوں کا ہاتھ تھا لیکن فنی نقطہ نظر سے یہ کام بنو سلیم کا تھا۔ حضورؐ کو توقع تھی کہ ابو برا کو، جو اس واقعے سے بے حد خوفزدہ تھے، خون بہا دے دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان کا پورا قبیلہ اسلام قبول کر لے گا۔ شاعروں نے دو عامریوں کے قتل پر مرثیے لکھے اور ابو برا کے ساتھ رسول اللہؐ کے حسن سلوک کی بنا پر آپؐ کے کئی پرانے دشمن امت مسلمہ کے بارے میں زیادہ ہمدردی سے سوچنے لگے یہاں تک کہ بنی سلیم کے جن لوگوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا، شہادت کے وقت صحابہؓ کے پختہ ایمان اور جرأت مندی کے مظاہرے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ خود ایمان لے آئے۔

رسول اللہؐ نے دو عامریوں کی دیت ادا کرنے کے لیے مدینہ میں رقم اکٹھی کرنا شروع کر دی۔ اس سلسلے میں آپؐ نے ابو برا کے حلیف یہودی قبیلے بنو نضیر کے ساتھ بھی رابطہ کیا اور دیت کا معاملہ شوریٰ میں پیش کیا۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی اس موقعے پر آپؐ کے ہمراہ تھے۔ یہودی تعاون کے لیے بظاہر آمادہ تھے اور انہوں نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ باہر کھڑے ہوں، ہم اس معاملے پر مشورہ کر لیتے ہیں۔ اس پر آں حضرتؐ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے گھر تشریف لے آئے۔ بعد میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بتایا کہ انہیں جبرائیل نے آگاہ کر دیا تھا کہ یہودی آپؐ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآنی آیات کا نزول ضروری نہیں تھا۔ بنونضیر کے بعض یہودی مسلمانوں سے اپنے شاعر کعب بن اشرف کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو علم ہو گیا تھا کہ یہودی ایک مکان کی چھت سے پتھر گرا کر حضورؐ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔

رسول اللہؐ نے ایک انصاری کو اپنی طرف سے یہود کے پاس بھیج کر انہیں الٹی میٹم دے دیا۔ محمد ابن مسلمہؓ نے، جن کا تعلق ہجرت سے پہلے بنونضیر کے حلیف قبیلے اوس سے تھا، یہودیوں کو واضح طور پر بتا دیا: ''خدا کے پیغمبرؐ نے مجھے آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے اور فرمایا ہے: میرے قتل کی سازش کر کے تم نے وہ معاہدہ توڑ دیا ہے جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا'' اس غداری کے بعد یہودی مدینے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہود اس بات پر حیران تھے کہ قبیلہ اوس کا ایک شخص انہیں اس قسم کا پیغام پہنچا سکتا ہے۔ پچھلے سال بنوقینقاع کی طرح وہ اس حقیقت کو اب بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ پرانا نظام ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ ابن مسلمہؓ نے یہودیوں کو صاف صاف بتا دیا: ''اب دل بدل چکے ہیں اور اسلام نے تمام پرانے اتحادوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔'' (Maxime Rodinson: Mohammad: P. 192)۔

یہودیوں نے مصالحت کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش کی لیکن ابن ابی نے حضورؐ سے (نعوذ باللہ...... مترجم) چھٹکارا پانے کے ایک اور موقعے کو غنیمت سمجھا۔ اس نے یہودیوں کو بتایا کہ اگر وہ مسلم امہ کے ساتھ قطع تعلق کر لیں تو وہ اپنی فوج کو لے کر ان سے آ ملے گا۔ چنانچہ بنی قینقاع کی طرح بنونضیر کے یہودی بھی اپنے قلعے میں بند ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے لیکن وہ ابن ابی اور اس کی جماعت کا انتظار کرتے رہے کہ وہ آ کر انہیں رہائی دلائیں۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ابن ابی نے رسول اللہؐ کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے میں اب بھی غلطی کی اور یہ سمجھا کہ غزوہ احد کے بعد حضورؐ پہلے سے بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ دو ہفتوں کے انتظار کے بعد، جب بنونضیر کو معلوم ہو گیا کہ وہ زیادہ عرصے تک قلعے میں نہیں رہ سکتے، آں حضرتؐ نے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹنے کا حکم دے دیا۔ یہودی اسے جنگ کی علامت سمجھ کر خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اب یہودی حضورؐ سے اپنی جانوں کی بھیک مانگنے لگے۔ آپؐ نے صرف اس شرط پر ان کی جان بخشی کی کہ وہ نخلستان سے فوری طور پر چلے جائیں اور وہی چیزیں اپنے ساتھ لے جائیں جو ان کے اونٹ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن بنونضیر اپنی تمام املاک اپنے ساتھ لے گئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے دروازوں کی چوکھٹوں تک کو توڑ دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے کام نہ آ سکیں۔ یہودی بڑے طمطراق کے ساتھ نخلستان سے روانہ ہوئے جیسے انہوں نے کوئی علاقہ فتح کر لیا ہو۔ ان کی عورتوں نے زرق برق لباس اور زیورات پہن رکھے تھے اور وہ طبل اور ڈھول بجاتی اور گاتی ہوئی مدینے سے نکلیں۔ بالآخر وہ شام جانے والی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شمالی شاہراہ پر چل پڑے۔ ان میں سے بعض یہودی خیبر کی بستی میں رک گئے جہاں سے وہ شمالی قبیلوں کی حمایت سے مسلمانوں کے خلاف اتحاد بنانے کی غرض سے ابوسفیان کی امداد کرتے رہے۔

غزوہ احد کے بعد ایک سال میں حضورؐ نے احد میں اپنے وقار کو پہنچنے والی ٹھیس کی تلافی کر لی اور بنی نضیر کے واقعے سے ابن ابی کو ایک اور شکست سے دو چار ہونا پڑا۔ رسول اللہؐ نے ابتدائی مرحلوں میں پیش بندی کے طور پر حملے جاری رکھے اور اپریل ۶۲۶ عیسوی میں آپؐ کو ایک فیصلہ کن اخلاقی فتح حاصل ہوگئی۔ ابوسفیان نے احد کے میدان جنگ سے واپس جاتے ہوئے مسلمانوں کو چیلنج کیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر بدر میں صف آرا ہوگا چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپریل ۶۲۶ عیسوی میں سالانہ میلے کے دوران پندرہ سو مسلمانوں پر مشتمل دستہ لے کر بدر کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے اور ایک ہفتے تک وہاں ٹھہرے رہے لیکن ابوسفیان بدر پر نہ پہنچا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ آں حضرتؐ وقت پر بدر آ جائیں گے۔ وہ محض دکھاوے کے لیے فوج لے کر مکہ سے روانہ ہوا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی کہ مسلمان مدینے سے روانہ نہیں ہوئے، وہ اپنی فوج کو واپس لے آئے گا۔ اس سال شدید قحط پڑا تھا اور سفر کے دوران اونٹوں کے لیے گھاس کا ایک تنکا بھی دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ ابوسفیان دو دن کے بعد ہی اپنی فوج کے ہمراہ مکہ لوٹ گیا۔ بدر میں وعدے کے مطابق مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے پر اہل مکہ نے اس کی سخت سرزنش کی۔ بدوؤں نے خاص طور پر مسلمانوں کی بہت تعریف کی کہ وہ بڑے بہادر ہیں اور مکہ کی پہلے سے بھی بڑی فوج کا دوبارہ مقابلہ کرنے کے لیے بدر کے مقام پر تیار کھڑے ہیں۔ اب مدینہ میں حضورؐ کی پوزیشن نہ صرف بہتر ہو رہی تھی بلکہ باقی عرب میں بھی ہوا کا رخ آپؐ کے حق میں تبدیل ہو رہا تھا۔

ہر چند کہ مسلمان یہ جانتے تھے کہ بدر میں دوبارہ ذلت اٹھانے کے بعد قریش مسلمانوں پر ایک نیا حملہ کرنے کے لیے زیادہ زور شور کے ساتھ تیاریاں کریں گے لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اب بھی یہ امید تھی کہ قریش کے ساتھ پرامن سمجھوتا طے پا جائے گا۔ جنوری ۶۲۶ عیسوی میں آپؐ کی نئی زوجہ حضرت زینبؓ کا انتقال ہوگیا۔ وہ صرف آٹھ ماہ تک آپؐ کی رفاقت میں رہیں۔ اس کے چند ماہ بعد حضورؐ نے اپنے پھوپھی زاد ابوسلمہ کی بیوہ حضرت ہندؓ بنت المغیرہ کو شادی کی پیشکش کی۔ ام سلمہؓ کے نام سے مشہور یہ خاتون مکہ کے طاقتور قبیلے مخزوم کے ایک سرکردہ سردار کی بہن تھیں اور اس طرح ایک مفید تعلق کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ ان کی عمر ۲۹ برس تھی لیکن وہ ابھی خوبصورت تھیں۔ وہ ایک ذہین خاتون تھیں جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اچھی رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ آں حضرتؐ انہیں اکثر اہم مہموں میں ساتھ لے جاتے اور کم از کم ایک موقع پر انہوں نے حضورؐ کو سودمند مشورہ بھی دیا۔ لیکن شروع میں وہ آپؐ کے ساتھ شادی کرنے میں متذبذب تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے مطابق اب وہ نوجوان نہیں رہی تھیں اور ان کی طبیعت میں رشک اور حسد بھی پایا جاتا تھا۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ حرم میں زندگی گزار سکیں گی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسکراتے ہوئے انہیں جواب دیا کہ وہ ان سے بھی زیادہ عمر کے ہیں اور یہ کہ خدا انہیں حسد سے محفوظ رکھے گا۔

حرم کی رقابت کے بارے میں ام سلمہؓ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ ان کے ساتھ حضورؐ کی شادی سے ازواج مطہراتؓ کے درمیان اختلافات پیدا ہونے لگے جو امت مسلمہ کی مختلف جماعتوں میں سیاسی قوت کے حصول کے لیے مسابقت کے آئینہ دار تھے۔ قبیلہ مخزوم سے تعلق رکھنے والی حضرت ام سلمہؓ مہاجرین کے امیر طبقے جب کہ حضورؐ کے دو انتہائی قریبی ساتھیوں کی بیٹیاں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ عام طبقے کی نمائندگی کرتی تھیں۔ جب بھی کوئی نئی بیوی حرم میں داخل ہوتی تو وہ ان دو حریف گروپوں میں سے کسی ایک گروپ میں شامل ہو جاتی۔ حضرت ام سلمہؓ حمایت حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ تیسری مختصر پارٹی یعنی اہل بیت کی طرف دیکھتیں جو نبیؐ کریم کے انتہائی قریبی اہل خاندان پر مشتمل تھے۔ ان کی سب سے زیادہ امیدیں حضرت فاطمہؓ سے وابستہ تھیں جو بے حد شرمیلی اور قدرے ڈرپوک تھیں۔ ازواج مطہراتؓ کے درمیان یہ گروہ بندی امت مسلمہ میں فیصلہ کن تقسیم کا سبب بنی اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ ان اختلافات نے مسلمانوں کو آج تک تقسیم کر رکھا ہے۔ اہل بیت، جو چاہتے تھے کہ عالم اسلام کی قیادت حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے ہاتھ میں رہے، شیعہ بن گئے۔ حضرت ام سلمہؓ کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ایک نئی بیوی نے حضورؐ کے حرم میں داخل ہو کر اس گروپ کو مستحکم کیا اور امرا کی پارٹی کے لیے تقویت کا باعث بنیں۔ آں حضرتؐ کی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ بنت جحش کو حضرت زیدؓ نے طلاق دے کر خود ان کی شادی حضورؐ سے کرا دی۔ اس واقعے پر بعض لوگوں نے حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسلام کے ناقدین اس معاملے کی بنا پر پیغمبر اسلامؐ کو بے جا نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہیں۔

والٹیئر Voltaire اور پرائڈکس Prideaux جیسے لوگوں نے اس واقعے کو رسالت مآبؐ کے ناقابل تسکین جنسی میلان اور آسمانی وحی کو ذاتی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنانے سے تعبیر کیا ہے۔ مسلمانوں کے برعکس ان نکتہ چینوں نے اس واقعے کو رنگ آمیزی کر کے غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک سہ پہر کو آں حضرتؐ زیدؓ کے گھر تشریف لے گئے لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ ان کی بیوی حضرت زینبؓ نے دروازہ کھولا اور چونکہ انہیں کسی مہمان کی توقع نہیں تھی، اس لیے وہ مختصر لباس میں ملبوس تھیں۔ حضرت زینبؓ کی عمر اب چالیس سال کے قریب تھی، اس کے باوجود وہ بے حد خوبصورت تھیں۔ اس موقعے پر حضورؐ ان کے حسن کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ آپؐ واپس جانے کے لیے تیزی سے مڑے اور آپؐ کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو انسانوں کے دلوں کو پلٹ دیتا ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(محمد ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر جلد ہشتم، صفحات ۷۱، ۷۲، ۷۴: Lings: Muhammad P. 213)۔

حضرت زینبؓ زیدؓ کے ساتھ شادی کرنا نہیں چاہتی تھیں اور اب انہوں نے رسول اللہؐ کی طرف سے کہے گئے توصیفی الفاظ کو اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ حضرت زیدؓ کو پرزور طریقے سے بار بار یہ بتانے لگیں کہ حضورؐ انہیں دیکھ کر مسحور ہو گئے تھے۔ اس طرح زندگی دشوار ہو گئی۔ حضرت زیدؓ نے آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ اگر حضورؐ زینبؓ کے ساتھ خود شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ انہیں طلاق دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رسول اللہؐ نے انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ وہ خدا سے ڈریں اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھیں تاہم اب شادی برقرار رہنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ حضرت زینبؓ کی ہر وقت کی ملامت اور نکتہ چینی سے تنگ آ کر حضرت زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی اور آخر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مجوزہ شادی پر تنقید کی گئی اور بعضوں نے کہا کہ یہ شادی اس لیے غیر قانونی ہے کیونکہ حضرت زینبؓ کا بیاہ حضورؐ کے متبنٰی بیٹے کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ یہ نکاح یقیناً حرام نہیں۔ (اور دیکھو) کسی مومن مرد عورت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔ (یاد کرو) جب کہ تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تو نے بھی کہ تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے خوف کھاتا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تو اس سے ڈرے، پس جب کہ زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی، ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح تنگی نہ رہے جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کر لیں، اللہ کا یہ (حکم) تو ہو کر ہی رہنے والا تھا۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کے لیے مقرر کی ہیں ان میں نبیؐ پر کوئی حرج نہیں، (یہی) اللہ کا دستور ان میں بھی رہا جو پہلے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں۔ یہ سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ (لوگو) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (بخوبی) جاننے والا ہے۔ (سورہ الاحزاب، آیات ۳۶ تا ۴۰.....مترجم)۔ حضرت زیدؓ نبی کریمؐ کے لے پالک بیٹے تھے اور ان کے درمیان غیر حقیقی اور مصنوعی رشتہ تھا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کر کے حضورؐ نے کسی دستور اور قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ جب یہ وحی نازل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئی تو آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس تھے۔ چنانچہ انہوں نے قدرے ترش روئی کے ساتھ حضورؐ سے کہا: ''بے شک آپؐ کے خدا نے بڑی تیزی سے آپؐ کی خواہش پوری کر دی ہے۔'' مغربی ملکوں کے لوگ عام طور پر اس خیال کی تائید کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ آں حضرتؐ کے ہم عصروں نے اس واقعے کی عملی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محبت کے گہرے جذبات سے معمور شخصیت کے مالک ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو بعض اضافی مراعات دے رکھی ہیں، اس لیے وہ آپؐ پر نکتہ چینی کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ آج دنیا بھر کے مسلمان اس الزام کی پرزور تردید کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ہوس پرستی کے زیر اثر حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ۳۹ سالہ خاتون، جو پوری زندگی غذائی قلت کا شکار اور عرب کے تپتے ہوئے سورج کی تمازت میں جھلستی رہی، کسی شخص کے جذبات میں کس قدر تلاطم برپا کر سکتی ہے اور پھر وہ بھی اپنے ماموں زاد کے دل میں، جو بچپن سے اسے جانتے تھے۔ حضرت زینبؓ سمیت جحش خاندان کے ساتھ شروع سے آپؐ کے قریبی تعلقات تھے۔ مسلمانوں کا استدلال یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کو حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی تو امت مسلمہ کی دوسری بے سہارا عورتوں کی طرح آں حضرتؐ کو حضرت زینبؓ کے بارے میں بھی تشویش ہوگئی تھی۔ اگر آپؐ حضرت زینبؓ کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے تو برسوں پہلے ان کے ساتھ شادی کر سکتے تھے۔ اس واقعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ لے پالک بیٹے کے ساتھ تعلق خونی رشتے جیسا نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے شادی کی راہ میں رکاوٹ ہونا چاہیے۔

حضرت زینبؓ سے شادی کے فوراً بعد وحی کے ذریعے پردے کی آیات نازل ہوئیں اور خدا نے حکم دیا کہ حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کو باقی امت سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ مسلمان علمائے کرام نے حجاب یا پردے کے نفاذ کی مختلف انداز میں تشریح کی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے ازواج مطہراتؓ پر پردے کی پابندی عاید کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے آں حضرتؐ سے اصرار کیا کہ ازواج مطہراتؓ کو چادر استعمال کرنی چاہیے۔ کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات اس کا سبب بنے تھے جب منافقین نے اس وقت آپؐ کی بیویوں کی توہین کی جب وہ رفع حاجت کے لیے باہر گئی تھیں۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جیسے جیسے زیادہ اہمیت اختیار کرتے گئے، آپؐ مہذب ملکوں کے طور طریقوں سے زیادہ باخبر ہوگئے چنانچہ آپؐ نے ازواج مطہراتؓ کے وقار میں اضافہ کرنے کے لیے اونچے طبقوں کی خواتین کو علیحدہ رکھنے کی ایرانی اور بازنطینی روایات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا البتہ یہ سب لوگ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں جنسی اخلاقیات کے معاملے میں عموماً لاپروائی برتی جاتی تھی۔ اس زمانے کے لوگ بے ہودہ گوئی، فحش کلامی اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کے عادی اور بہت زیادہ باتونی تھے۔ ایک روایتی معاشرے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنسی اسکینڈل لوگوں کے جذبات بھڑکانے کا سبب بن سکتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے تھے کہ ابن ابی اور اس کے حامی آپؐ کے خاندان کو بے توقیر کر کے امت مسلمہ کے نصب العین کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت زینبؓ کی شادی کی دعوت میں بعض مہمان دیر تک ٹھہرے رہے جو حضورؐ کے لیے تکلیف دہ بات تھی۔ یہ واقعہ ایک وحی کے نزول کا سبب بنا جس نے رسول کریمؐ کے خاندان اور باقی امت کے درمیان کچھ فاصلہ قائم کر دیا:

اے ایمان والو! جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے، تم نبیؐ کے گھروں میں نہ جایا کرو کھانے کے لیے ایسے وقت میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرتے رہو بلکہ جب بلایا جائے، جاؤ اور جب کچھ کھا چکو، نکل کھڑے ہو، وہیں باتوں میں مشغول نہ ہو جایا کرو۔ نبیؐ کو تمہاری ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے تو وہ لحاظ کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ (بیان) حق میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جب تم نبیؐ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو، تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے۔ نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم رسول اللہؐ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپؐ کے بعد کسی وقت بھی آپؐ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ (یاد رکھو) اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا (گناہ) ہے۔ (سورہ الاحزاب، آیت ۵۳)۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مسجد نبوی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کوئی ذاتی کمرہ نہیں تھا بلکہ آپؐ اپنی بیویوں کے حجروں میں قیام کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے مدینہ میں آپؐ کو اہمیت حاصل ہوتی گئی، آپ کا گھر عام لوگوں کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا اور زیادہ سے زیادہ لوگ ذاتی یا دینی مسائل پر صلاح مشورے یا کسی تنازعے میں آپؐ سے ثالث بننے کی درخواست کرنے کی غرض سے آپؐ کے پاس آنے لگے۔ بعض لوگ آپؐ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ازواج مطہراتؓ کو ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے۔ مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ ایک نوجوان کے ساتھ اکثر بے تکلف گفتگو کرتیں۔ وہ لوگوں کو اس وقت یاد آیا جب ایک ایسا اسکینڈل کھڑا ہوا جو مسلم امہ کی وحدت کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ دراصل حجاب یا پردہ عورتوں کے خلاف کوئی جابرانہ اقدام نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد ایسی بدنامی کی افواہوں کا سدباب کرنا تھا جسے حضورؐ کے دشمن آپؐ کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔

یہاں ہمیں حجاب کے سوال اور پردے کے دستور پر غور کے لیے توقف کرنا چاہیے۔ مغرب میں پردے کو عام طور پر مردوں کے ظلم سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم کا یہ فیصلہ محض بلند رتبے کی علامت تھا جس کا اطلاق صرف ازواج مطہراتؓ پر ہوتا تھا۔ مسلمان مردوں کی طرح مسلمان عورتوں کو بھی مناسب لباس پہننے کا حکم دیا گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے البتہ عورتوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ نظروں سے چھپنے کے لیے پردہ کریں یا گھر کے کسی علیحدہ حصے میں مردوں سے الگ تھلگ رہیں۔ یہ بعد کی باتیں اور بندشیں ہیں اور اسلامی مملکت میں یہ دستور آں حضرتؐ کی وفات کے بعد تیسری یا چوتھی نسل میں عام ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیائے اسلام میں عورتوں کے پردہ کرنے اور انہیں علیحدہ رکھنے کا رواج فارس اور بازنطین سے درآیا تھا جہاں عورتوں کے ساتھ مدت سے یہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حجاب یا پردے کا مقصد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی ازواج مطہراتؓ کا رتبہ کم کرنا نہیں تھا بلکہ یہ ان کی اعلیٰ حیثیت اور مرتبے کی علامت تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ازواج مطہراتؓ بہت اثر و رسوخ کی حامل بن گئی تھیں، مذہبی معاملات میں ان کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی اور صحابہ کرامؓ آں حضرتؐ کی سنت یا رائے معلوم کرنے کے لیے اکثر ان کے ساتھ رابطہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو سیاسی لحاظ سے زبردست اہمیت حاصل تھی اور انہوں نے ۶۵۶ عیسوی میں چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ کی قیادت کی۔ ایسا لگتا ہے کہ بعد میں دوسری مسلمان خواتین ازواج مطہراتؓ کے بلند مرتبے سے حسد کرنے لگیں اور انہوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ انہیں بھی پردے کے لیے چادر اوڑھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اس وقت اسلامی معاشرہ مساوات اور ترقی کے یکساں حقوق کے اصولوں کی بنیاد پر استوار تھا اور یہ بات غیر مناسب معلوم ہوتی تھی کہ ازواج مطہراتؓ کو عام مسلمان عورتوں کے مقابلے میں خاص نوع کی تعظیم اور امتیاز دیا جائے۔ چنانچہ شروع شروع میں حجاب اوڑھنے والی خواتین نے پردے کو طاقت اور اثر و رسوخ کی علامت سمجھا نہ کہ مردوں کے استحصال کی علامت! عیسائی صلیبیوں کی بیویوں نے مسلمان خواتین کا اس حوالے سے احترام ہوتے دیکھا تو انہوں نے بھی اس امید میں نقاب پہننا شروع کر دیا کہ ان کے مرد بھی ان کے ساتھ بہتر سلوک کریں گے۔ کسی بھی دوسری ثقافت کی علامات اور رسوم کو سمجھنا ہمیشہ سے مشکل رہا ہے۔ یورپ میں ہم نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہم نے اپنی سابق نوآبادیوں اور زیر حفاظت ملکوں کی روایتی ثقافتوں کی اکثر غلط تشریح کی ہے اور انہیں نقصان پہنچایا ہے۔ آج کی مسلمان عورتیں، بلکہ مغرب میں پرورش پا کر جوان ہونے والی مسلم خواتین اپنی ثقافت پر نسوانی حقوق کے علمبردار مغربی نقادوں کے حملے پر شدید ردعمل ظاہر کرتی ہیں۔ دنیا کے بیشتر مذاہب پر مردانہ چھاپ لگی ہوئی ہے اور جنس کے حوالے سے ان میں خاصا تعصب پایا جاتا ہے لیکن اس ضمن میں اسلام کو دوسرے مذاہب سے زیادہ قصوروار ٹھہرانا غلطی ہوگی۔ قرون وسطیٰ میں صورت حال بالکل الٹ تھی۔ اس زمانے کے مسلمان عورتوں کے ساتھ مغربی عیسائیوں کے برے سلوک اور برتاؤ پر خوف زدہ ہو جاتے اور عیسائی اسکالرز اسلام پر یہ الزام لگاتے کہ اس نے غلاموں اور عورتوں جیسے کمزور طبقوں کو بہت زیادہ حقوق اور اختیارات دے رکھے ہیں۔ آج اگر بعض مسلم خواتین نے روایتی لباس دوبارہ پہننا شروع کر دیا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی متشدد مذہب نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منظم انداز میں ذہنی طور پر ان کی کایا پلٹ دی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے آباء واجداد کی ثقافتی اساس کی طرف واپسی ان کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مغرب کے اس استعماری رویے کو مسترد کر دیا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اقدار اور روایات کو خود مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر سمجھتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی ازواج مطہراتؓ کے لیے حجاب کا حکم نازل ہونے کے تھوڑی دیر بعد جنوری ۶۲۷ عیسوی میں ایک تکلیف دہ واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہو گیا کہ آپؐ کے خاندان پر کیچڑ اچھالنے سے حضورؐ کی پوزیشن کو کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آپؐ نے بنوخزاعہ کے ایک قبیلے بنوالمصطلق کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی جو مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آں حضرتؐ نے اس قبیلے کے ایک چشمے مریسیع پر، جو مدینہ کے شمال مغرب میں بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع تھا، دشمن پر اچانک حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں وہ فرار ہو گئے۔ اس غزوے میں دو ہزار اونٹ، پانچ ہزار بھیڑ بکریاں اور قبیلے کے سردار کی بیٹی جویریہ بنت حارث سمیت دو سو عورتیں غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ اس مہم میں رسول اللہؐ حضرت عائشہؓ کو ساتھ لے گئے تھے اور جب انہوں نے جویریہ کو، جو بے حد حسین اور ملیح تھیں، دیکھا تو مبہوت ہو گئیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''خدا کی قسم! میں نے انہیں دیکھا تو یہ سمجھ گئی کہ جو حسن و جمال میں نے ان میں دیکھا ہے، رسول اللہؐ بھی دیکھیں گے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۷۲۹: Lings: Muhammad P. 493)۔ چنانچہ حضورؐ نے انہیں شادی کی پیشکش کی اور وہ اسلام لے آئیں۔ اس شادی کے نتیجے میں ایک دشمن قبیلہ مسلمانوں کا اتحادی بن گیا۔

مسلمان مزید دو دن تک مریسیع کے مقام پر ٹھہرے رہے۔ اس غزوے میں منافقین نے معمول سے زیادہ تعداد میں شرکت کی کیونکہ انہیں اس سے زیادہ مال غنیمت ملنے کی توقع تھی۔ لیکن اس موقعے پر اچانک ایک ایسا معمولی واقعہ پیش آیا جس سے پوری امت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کے گھوڑوں کو پانی پلانے پر مامور دو مقامی قبائلی کسی بات پر جھگڑ پڑے اور ہر ایک نے اپنے روایتی حلیف قبیلے کو مدد کے لیے پکارا۔ ایک نے قریش اور دوسرے نے خزرج کو آواز دی۔ مہاجرین اور انصار نے اس قبائلی چیلنج پر فوری طور پر ردعمل ظاہر کیا اور چند ہی منٹوں میں ایک دوسرے کے دست بگریباں ہو گئے۔ یہ ان میں پرانی وفاداریوں کی پاسداری کا ایک اور مظاہرہ تھا اور اگر مسلمان ہوش مندی سے کام نہ لیتے تو نیا اسلامی نظریہ تہ و بالا ہو جاتا۔ حضرت عمرؓ اور آں حضرتؐ کے بعض دوسرے قریبی صحابہؓ نے فوری مداخلت کی اور معاملے کو رفع دفع کرا دیا۔ لیکن ابن ابی سخت غضبناک ہو کر کہنے لگا: ''اچھا! کیا ان لوگوں نے یہ (حوصلہ) کیا ہے۔ انہوں نے ہمارے اندر منافرت پیدا کر دی اور ہمارے ہی شہروں میں ہم پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثریت اور طاقت حاصل کرنا چاہی۔ خدا کی قسم! ہم ان قلاش قریشیوں کو اپنے برابر شمار کر کے اس کے سوا کیا کریں گے کہ پہلے لوگوں کی کہی ہوئی اس مثال کے مصداق بن جائیں کہ اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ تمہیں کھا جائے۔ خدا کی قسم! ہم جب واپس مدینہ پہنچ جائیں گے تو ان میں جو زیادہ طاقت اور غلبے والے ہیں، وہ اپنے سے کمزور کو یقینی طور پر نکال کر رہیں گے۔'' (محمد ابن اسحاق : سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۴۹۱:۲۶ Muhammad P 491)۔ ایک انصاری نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابن ابی کی اس دھمکی سے آگاہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فوراً تلوار نکال لی۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''عمر! یہ کیوں کر ہو سکتا ہے، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں، یہ مناسب نہیں۔'' اس کے بعد حضورؐ نے فوراً کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو شدید گرمی میں سفر کرنا تھا حالانکہ اس سے پہلے آپؐ نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ مدینہ واپسی کے لیے سفر کے دوران ۶۳ ویں سورہ المنافقون نازل ہوئی لیکن آں حضرتؐ نے واپس مدینہ پہنچنے تک صحابہؓ کو اس وحی کے متعلق کچھ نہ بتایا۔

ایک پڑاؤ کے دوران حضرت عائشہؓ کو رفع حاجت کے لیے جانا پڑا اور جب وہ واپس آئیں تو قافلہ روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے گلے کا ظفار کا ایک ہار گر گیا ہے اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔ پھر جب وہ اونٹ کے کجاوے میں واپس آئیں اور گلے میں ہار ٹٹولنے لگیں تو وہ غائب تھا۔ اس وقت لوگ روانہ ہونے لگے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر ہار تلاش کیا تو وہ مل گیا۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں: ''وہ لوگ جو میرا کجاوا باندھنے اور رکھنے کے لیے متعین تھے، کجاوا پہلے سے ہی کس چکے تھے، یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں حسب معمول ہودج میں موجود ہوں، اسے اونٹ پر رکھ کر باندھ دیا اور ذرا شک نہ کیا کو میں اس میں موجود نہیں۔ انہوں نے اونٹ کا سر پکڑا اور چل دیے۔ اب جو میں واپس لشکر گاہ میں آئی تو یہاں نہ کوئی بلانے والا تھا، نہ کوئی جواب دینے والا، سب لوگ جا چکے تھے۔ میں اپنی چادر میں لپٹی اور اس جگہ لیٹ گئی۔ خدا کی قسم! میں لیٹی ہوئی تھی کہ صفوان ابن معطل سلمی کا میرے پاس سے گزر ہوا۔ وہ آگے بڑھے اور میرے پاس آ کر رک گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں ہوں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر مجھ سے پوچھا: آپ کس وجہ سے پیچھے رہ گئیں، خدا آپ پر رحم فرمائے۔ مگر میں نے ان سے کوئی بات نہ کی۔ پھر انہوں نے اپنا اونٹ مجھ سے قریب کر کے کہا: اس پر بیٹھ جاؤ اور خود پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے لشکر کو جلد پکڑنے کی کوشش کی لیکن ہم ان لوگوں کو نہ پکڑ سکے اور نہ ہی کسی نے مجھے تلاش کیا۔ اب صبح ہو گئی تھی اور لوگ پہنچ کر ٹھہر چکے تھے۔ اس کے بعد صفوان مجھے لے کر پہنچے۔ پھر جو اہل افک نے کیا، وہ معلوم ہے، لشکر میں کھلبلی مچ گئی اور خدا کی قسم! مجھے کچھ معلوم نہ ہوا کہ معاملہ کیا ہے؟''

منافقین نے اس قصے کو فوراً اچھالنا شروع کر دیا۔ ان کا مقصد ان مہاجرین کے خلاف در پردہ قبائلی تعصب کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھڑکا نا تھا جن کی وجہ سے ان پر یہ تمام جنگیں مسلط ہوئی تھیں۔ شاعر حسان بن ثابت نے، جو ہجرت سے اب تک حضورؐ کی فتوحات پر وفاداری کے ساتھ جشن مناتے رہے تھے، پرانی دیویوں سے روگردانی کا نوحہ کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ وہ مدینہ میں مہاجرین کے سمندر میں گھر گئے ہیں۔ بعض مہاجرین بھی حضرت عائشہؓ کی بے گناہی کے بارے میں شک کرنے لگے۔ ان میں ان کے عم زاد حضرت مسطحؓ اور حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ بنت جحش بھی شامل تھیں جو اپنی بہن کی وجہ سے حضرت عائشہؓ سے حسد کرتی تھیں کیونکہ حضرت عائشہؓ رسول کریمؐ کی چہیتی بیوی تھیں تاہم خود حضرت زینبؓ نے پرجوش طریقے سے حضرت عائشہؓ کی حمایت کی۔

جب یہ قافلہ واپس مدینے پہنچا تو حضرت عائشہؓ علیل ہو گئیں اور انہیں بتدریج اس افواہ کا علم ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کھنچے کھنچے رہنے لگے ہیں اور آپؐ کا رویہ سرد مہری پر مبنی ہے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ وہ اپنے والدین کے گھر چلی جائیں جہاں ان کی مناسب دیکھ بھال ہوگی۔ آں حضرتؐ اس صورت حال سے سخت پریشان ہو گئے۔ آپؐ کو وحی کے نزول میں تعطل پیدا ہونے پر بھی گہری تشویش تھی۔ اس مرتبہ حضورؐ نے معمول کے مطابق مدد کے لیے اپنے قریبی صحابہؓ سے رجوع نہ کیا۔ آپؐ حضرت ابوبکرؓ سے ان کی صاحبزادی کے بارے میں مشورہ نہیں کر سکتے تھے، نہ ہی آپؐ نے حضرت عمرؓ سے ان کی رائے معلوم کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضرت عمرؓ عورتوں کے بارے میں بہت سخت گیر تھے۔ ان کے بجائے آں حضرتؐ نے نوجوان نسل سے رابطہ کیا۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کی رائے دریافت کی تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کی بہت تعریف کی اور کلمۂ خیر کہا۔ حضورؐ نے گھر کی نوکرانی حضرت بریرہؓ کو بلا کر ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ میں عائشہؓ پر کسی قسم کا عیب نہیں لگاؤں گی البتہ یہ چیز ضرور ہے کہ میں اپنا آٹا گوندھا کرتی تھی۔ اگر کبھی عائشہؓ سے کہہ جاتی کہ دیکھتی رہنا تو وہ آٹے سے غافل ہو کر سو جاتیں، بکری آتی اور آٹا کھا جاتی۔'' لیکن حضرت علیؓ کا رد یہ جارحانہ اور تنگ مزاجی پر مبنی تھا۔ ''یا رسول اللہ! عورتیں بے شمار ہیں۔'' حضرت علیؓ کہنے لگے: ''آپؐ ایک کی جگہ کسی دوسری عورت کو لا سکتے ہیں۔'' چنانچہ حضرت عائشہؓ نے انہیں کبھی معاف نہ کیا۔

ابن ابی، جو اس صورت حال سے بہت خوش تھا، اس قصے کو ہوا دے کر نبی کریمؐ کو ایذا پہنچاتا رہا چنانچہ آں حضرتؐ کو مدینے کے سرداروں کا ایک اجلاس بلانا پڑا تاکہ اپنے خاندان کو نقصان پہنچانے کے ذمے دار شخص کے خلاف تادیبی اقدامات کیے جائیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے اور امداد حاصل کی جائے۔ حضورؐ جانتے تھے کہ اگر آپؐ نے ان کی اجازت کے بغیر ابن ابی کے خلاف کوئی کارروائی کی تو قبیلہ خزرج کے بعض مسلمانوں کو اس سے تکلیف ہوگی۔ اس اجلاس سے ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کا نیا اتحاد کس قدر کمزور تھا۔ اس مسئلے سے اوس اور خزرج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے درمیان اختلافات کی گہری خلیج کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ قبیلہ اوس کے بعض سرداروں نے، جنہیں معلوم تھا کہ حضرت عائشہؓ کے بیشتر دشمنوں کا تعلق خزرج قبیلے سے ہے، اس بات پر زور دیا کہ اس اسکینڈل کے ذمے دار تمام لوگوں کے سر قلم کر دیے جائیں۔ یہ سن کر ایک خزرج (سعدؓ ابن عبادہ......مترجم) فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ تم منافق ہو اور ان کی طرف سے لڑ رہے ہو۔ اب دونوں جانب سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ ان دونوں قبیلوں میں فتنے کی آگ بھڑک اٹھتی مگر رسول اللہؐ سامنے آ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب امت مسلمہ کو متحد رکھنے کے لیے اس بحران کو حل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

آخر کار نبی کریمؐ نے حضرت عائشہؓ سے خود باز پرس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ تندرست مگر غمگین تھیں۔ وہ دو دن سے مسلسل روتی جا رہی تھیں لیکن والدین نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ حضرت عائشہؓ کی والدہ ام رومانؓ نے ان سے صرف یہی کہا کہ جو بھی عورت خوبصورت ہو اور اس کا شوہر اس سے محبت بھی کرتا ہو تو اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسی صورت حال میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟ آخر انہوں نے حضرت عائشہؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مسجد میں اپنے حجرے میں واپس چلی جائیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ کے والدین ان کے پاس تھے اور وہ تینوں زار و قطار رو رہے تھے۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے جب آں حضرتؐ کو دیکھا تو ان کے آنسو خشک ہو گئے۔ حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر وہ کسی برائی میں پڑی ہیں، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں تو انہیں اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ چودہ سالہ عائشہؓ نے اپنے شوہر اور والدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت باوقار انداز میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! جس چیز کا آپؐ نے ذکر کیا ہے، اس کے بارے میں میں تو کبھی اللہ سے توبہ نہیں کروں گی۔ خدا کی قسم! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر میں لوگوں کی کہی بات کا اقرار کروں گی اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو میں ایسی بات کہوں گی جو بالکل بے وجود ہے اور اگر میں ان کی بات کا انکار کروں گی تو آپ لوگ مانیں گے نہیں۔ پھر میں نے قرآن کی ایک آیت کے حوالے سے حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کیا لیکن یاد نہ آیا، لہٰذا میں نے کہا: میں تو وہی کہوں گی جو ابو یوسفؑ (حضرت یوسفؑ کے والد) نے کہا تھا: صبر جمیل کے سوا کیا ہو سکتا ہے اور جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو، اس پر اللہ ہی کی مدد طلب کی جا سکتی ہے۔'' آخری لفظ کہہ کر حضرت عائشہؓ خاموشی کے ساتھ بستر پر لیٹ گئیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عائشہؓ کی باتوں سے یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے کیونکہ جب انہوں نے گفتگو ختم کی تو آپؐ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس میں وحی نازل ہوتی تھی۔ آپؐ بے ہوش ہو گئے اور اگرچہ اس روز شدید سردی تھی، اس کے باوجود آپؐ پسینے سے شرابور ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ کے سر کے نیچے چمڑے کا ایک تکیہ رکھ دیا اور آپؐ پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ وہ اور ام رومانؓ سراسیمگی کے عالم میں خدائی احکام کا انتظار کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگے تاہم حضرت عائشہؓ، جو شدید خطرے میں تھیں، بالکل نہ گھبرائیں اور پرسکون رہیں۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ خدا ان کے ساتھ ہرگز ناانصافی نہیں کرے گا۔ آخر حضورؐ کی وہ کیفیت ختم ہوگئی۔ آپؐ بیٹھ گئے اور فرمایا: ''عائشہ! خوشخبری سن لو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت نازل کردی ہے۔'' یہ سنتے ہی والدین نے خوش ہوکر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اٹھو اور آ کر حضورؐ کا شکریہ ادا کرو۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے صرف یہ جواب دیا: ''میں نہ تو آپؐ کے پاس آؤں گی اور نہ آپ کا شکریہ ادا کروں گی، نہ ہی میں تم دونوں کی شکرگزار ہوں گی جنھوں نے جھوٹی تہمت کو سنا اور اس کی تردید نہ کی۔ میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۴۹۵: احادیث احمد بن حنبل جلد ششم ۶۰، ۱۹۷: محمد ابن البخاری جلد سوم ۱۰۸، ۲۹۶: Nabia Abbot: Aisha, The Beloved of Muhammad شکاگو ۱۹۴۲)۔ اس گلے شکوے کو قبول کرتے ہوئے حضورؐ باہر کو نکل گئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ آپؐ نے وہ آیات پڑھ کر سنائیں جن میں حضرت عائشہؓ کو بری الذمہ قرار دیا گیا اور بہتان لگانے والوں کی مذمت کی گئی تھی۔ (جو لوگ یہ بہت بڑا بہتان باندھ لائے ہیں، یہ بھی تم میں سے ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، یہ تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہاں ان میں سے ہر ایک شخص پر اتنا گناہ ہے جو اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو انجام دیا ہے، اس کے لیے عذاب بھی بہت بڑا ہے۔ سورہ النور: آیت ۱۱...... مترجم)۔

حضرت عائشہؓ ایک پراعتماد اور احساس تفاخر سے سرشار خاتون تھیں اور اس واقعے کے بعد وہ حضورؐ کی نظروں میں دوبارہ اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ انہوں نے جس وقار کے ساتھ اس صورت حال پر قابو پایا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے خواتین میں کس قدر اعتماد پیدا کردیا تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کی تمام ازواج مطہراتؓ آپؐ سے خائف نہیں تھیں بلکہ وہ آپ کا ساتھ دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتیں اور آں حضرتؐ بھی ان کی بات کو نہایت توجہ سے سنتے البتہ ازواج مطہراتؓ کو حضورؐ سے شکایت رہتی کہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے ساتھ زیادہ لطف و کرم سے پیش آتے ہیں۔ آپؐ ہمیشہ غیر جانبدار رہنے کی پوری کوشش کرتے اور باری باری سب کے پاس جاتے، جب آپؐ کسی مہم پر روانہ ہوتے تو ازواج مطہراتؓ میں قرعہ ڈال کر یہ طے کیا جاتا کہ ان میں سے کون حضورؐ کی ہم سفر ہوگی۔ لیکن رسول اللہؐ بہرحال ایک انسان تھے اور آپؐ کی حقیقی ترجیح پوری امت پر واضح تھی۔ جو مسلمان آپؐ کو تحائف بھیجنا چاہتے، وہ عموماً اس دن بھیجتے جس دن آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس ہوتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے آپؐ خوش ہوں گے۔ دوسری ازواج مطہراتؓ اسے اپنی توہین سمجھتیں چنانچہ ایک دن ام سلمہؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ مسلمانوں کو یہ بتا سکیں کہ وہ تحائف کو تمام حجروں میں بھیجا کریں۔ لیکن آں حضرتؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے کہا کہ وہ حضرت عائشہؓ کے حوالے سے ان پر نکتہ چینی نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریں۔ حضورؐ نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ موجودہ ازواج مطہراتؓ میں عائشہؓ آپؐ کی واحد بیوی ہیں جن کے پاس ہوتے ہوئے آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کو اس امید میں ساتھ لے کر گئیں کہ وہ اس معاملے میں ان کی زیادہ کامیاب مددگار ثابت ہوں گی۔ ''پیاری بیٹی!'' حضورؐ نے آہستہ سے فرمایا: ''کیا تم اس سے محبت نہیں کرتیں جس سے میں محبت کرتا ہوں؟'' یہ سن کر حضرت فاطمہؓ خاموش ہوگئیں۔ آخر میں حضرت زینبؓ احتجاج کے لیے آئیں اور غصے میں حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہوئیں۔ آں حضرتؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ وہ اپنا دفاع خود کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس قدر فصاحت اور بلاغت کے ساتھ جواب دیا کہ حضرت زینبؓ نے چپ سادھ لی۔ اس پر رسول اللہؐ بہت محظوظ ہوئے اور آپؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ اپنے باپ ابوبکرؓ کی سچی اور کھری بیٹی ہیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ بھی انسانی جذبات سے عاری نہیں تھیں۔ ایک دن انہوں نے حضرت خدیجہؓ کو حسد سے ''پوپلے منہ والی بوڑھی خاتون'' کہہ دیا جس پر حضورؐ کو سخت غصہ آ گیا۔ حضرت خدیجہؓ آپؐ کو سب سے عزیز تھیں جنہوں نے اس وقت آپ کی امداد کی تھی جب باقی دنیا نے آپؐ کو مسترد کر دیا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے خلاف بہتان طرازی بند ہونے کے چند ماہ بعد مارچ ۶۲۷ عیسوی میں اہل مکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ دس ہزار کی فوج لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل مدینہ اور بدوی قبیلوں سے صرف تین ہزار افراد اکٹھے کر سکے چنانچہ احد کی طرح، جب آپؐ کو مدینہ سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس مرتبہ مسلمانوں نے خود کو مدینہ کے اندر محصور کر لیا۔ مدینے کا دفاع کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ شہر تین اطراف سے پہاڑوں اور آتش فشاں چٹانوں میں گھرا ہوا تھا اور دشوار گزار شاہراہوں سے نخلستان کی جانب جانے والے راستے بند کرنا نسبتاً آسان تھا البتہ شمال کی طرف سے مدینہ سب سے زیادہ غیر محفوظ تھا۔ رسول اللہؐ نے اس موقعے پر ایسی عسکری حکمت عملی اختیار کی جو آپؐ کے ہم عصروں کے نزدیک ایک غیر معمولی بات تھی۔ قریش اور ان کے اتحادیوں کو میدان جنگ میں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور وہ بڑے طمطراق سے شمال کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو جنگ کی تیاریوں کے لیے خاصا وقت مل گیا۔ انہوں نے قرب و جوار سے اپنی فصلیں اٹھا لیں تاکہ دشمن کی فوج کو پہلے کی طرح مویشیوں کے لیے چارہ نہ مل سکے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے نخلستان کے شمالی حصے کے اردگرد ایک بہت بڑی خندق کھودنا شروع کر دی۔ روایات کے مطابق یہ منصوبہ فارس سے آنے والے نومسلم غلام حضرت سلمانؓ نے پیش کیا تھا جو حال ہی میں آزاد ہوئے تھے۔ خندق کو مسلسل کھودنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ درمیان میں کئی قلعے بھی واقع تھے جو اہل مدینہ کے لیے دفاع کا باعث بنے تاہم اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بروقت مکمل کرنے کے لیے سخت مشقت اور مستقل مزاجی درکار تھی۔ خندق کھودنے کی غرض سے ہر خاندان اور ہر قبیلے کے لیے علاقہ مخصوص کر دیا گیا۔ رسول کریمؐ نے مسلمانوں کو اجر و ثواب کی ترغیب دینے کے لیے بہ نفسِ نفیس خندق کی کھدائی میں حصہ لیا۔ خندق کھودتے وقت حضورؐ وہی رجز پڑھتے جو ہجرت کے بعد مسجد نبویؐ کی تعمیر کے وقت پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے حوصلے نہایت بلند تھے اور بعض صحابہ کرامؓ کا کہنا ہے کہ خندق کی کھدائی کے دوران آپؐ بے حد حسین دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت آپ صحابہؓ کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور یہ نیا رجز پڑھتے:

اے خدایا! وہ لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ ہم کبھی نہیں چل سکتے

وہ نہ تو صدقہ دیتے ہیں، نہ نماز پڑھتے ہیں

ان کے مقابلے میں ہمارے قدم مضبوط فرما

ان دشمنوں نے ہم پر ظلم کیا اور ہمیں تیری پرستش سے روکا

لیکن ہم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا

۳۱ مارچ ۶۲۷ عیسوی کو قریش اپنی فوج لے کر مدینہ کے باہر پہنچ گئے۔ انہوں نے خندق کو دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ خندق سے باہر نکلنے والی مٹی سے ایک بہت بڑی دیوار بن گئی جو سلع پہاڑ کے دامن میں لشکر اسلامی کے لیے ایک مضبوط ڈھال بن گئی تھی۔ اس سے قریش کے مقابلے میں مسلمانوں کو برتری حاصل ہو گئی جہاں سے انہوں نے دشمن پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اہل مکہ کی فوج خندق کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی تو مسلمانوں کی طرف سے تیروں کی بارش نے انہیں یہ وارننگ دے دی کہ وہ ان کی زد میں ہیں۔ چنانچہ کفار تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی یہ حرکت تفنن اور استہزا کا باعث تھی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر کھودی جانے والی خندق نے قریش کی اس بڑی فوجی مہم کو موثر طور پر ناکام بنا دیا تھا اور قریش کے لیڈروں کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس صورت حال سے کیسے نمٹیں؟ اس معرکے میں بھی ابوسفیان اور ابوجہل کا بیٹا عکرمہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پرانے کٹر دشمنوں قریش کے لشکر کی قیادت کر رہے تھے جب کہ گھڑسوار دستوں کی کمان خالد بن ولید اور عمرو بن العاص (عمرو بن عبد بن ابوقیس ...... مترجم) کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن قریش کو جن گھڑسوار دستوں پر بڑا ناز تھا، خندق کی وجہ سے وہ مکمل طور پر ناکارہ ہو گئے کیونکہ گھوڑے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دو موقعوں پر جب گھوڑے خندق پار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سواروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ پیدل فوج کو بھی خندق کے اس پار بھیجنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ اس سے قریش کو بھاری جانی نقصان اٹھانے کا خدشہ تھا۔ ان کے پاس کوئی سیڑھی یا جنگی اوزار بھی نہیں تھے۔ بہ ہر حال قریش کو چونکہ دستی مشقت سے نفرت تھی اس لیے وہ خندق کھودنے کو نہایت بدذوقی تصور کرتے تھے۔ خندق کھودنا عربوں کے روایتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حربی طریقوں سے بھی بہت مختلف تھا۔عکرمہ جیسے لوگ وقفے وقفے کے ساتھ خندق پار کرنے کی کوشش کرتے لیکن مسلمانوں کی جوابی کارروائی سے ناامید ہو کر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جاتے:

ہتھیاروں سے لیس قریش کے بعض نوجوان گھوڑوں پر بیٹھ کر نکلے اور بنوکنانہ کے منازل سے گزرے تو ان سے کہا: بنوکنانہ! جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آج کون مرد میدان ہے؟ پھر یہ اپنے تیز رو گھوڑوں پر آگے بڑھے اور خندق پر آ کر رکے۔ جب انہوں نے خندق دیکھی تو بولے: خدا کی قسم! یہ تو وہ تدبیر و ترکیب ہے جو عربوں نے کبھی اختیار نہیں کی تھی۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۶۷۷: Muhammad P. 454)۔

شہر میں داخل ہونے کے لیے اب قریش نے مزید عیارانہ حربے استعمال کرتے ہوئے نخلستان کے جنوب میں آباد یہودی قبیلے بنوقریظہ کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔سال کے شروع میں یہودیوں کے جلاوطن قبیلے بنونضیر کا سردار حیّی ابن اخطب، جو اب خیبر میں رہ رہا تھا، مکہ میں ابوسفیان کے پاس گیا اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ میں قریش کی مدد کرے گا۔اس نے ابوسفیان اور مکہ کے کئی دوسرے سرداروں کے ہمراہ خانہ کعبہ کے اندر جا کر خدا کو گواہ بناتے ہوئے یہ عہد و پیمان باندھا کہ وہ قریش کے ساتھ مل کر امت مسلمہ کو تباہ کرنے کے لیے ہر ممکن امداد فراہم کرے گا۔اب ابوسفیان نے سوچا کہ اسے یہودیوں کے پاس جا کر دین اسلام کے بارے میں ان کی رائے دریافت کرنی چاہیے: ''اے یہود! تم پہلے اہل کتاب ہو اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہمارے تنازعے کے متعلق بھی جانتے ہو۔کیا ہمارا مذہب سب سے اچھا ہے یا اس کا؟'' ابوسفیان نے حیّی سے پوچھا۔حیّی نے جواب میں کہا کہ قریش کا مذہب یقیناً بہترین ہے۔ مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ حیّی نے بت پرستی کی حمایت کی ہے تو انہیں سخت تشویش ہوئی۔(کیا آپؐ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے؟ جو بت کا اور باطل معبود کا اعتقاد رکھتے ہیں اور کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں۔(سورہ النسا: آیت ۵۱......مترجم)۔خیبر کے یہودیوں نے ایک بڑی فوج کو مدینہ روانہ کر دیا اور مدینے کے شمال میں کئی عرب قبیلوں کو اس وعدے پر اپنے ساتھ ملا لیا کہ وہ انہیں کھجور کی نصف فصل دیں گے۔چنانچہ اسد، غطفان اور سلیم قبیلوں نے اپنے دستوں کو ابوسفیان کی مدد کے لیے بھیج دیا۔اب حیّی نے قریش کو عقب سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔اس کی دوسری تجویز یہ تھی کہ بنونضیر اور بنوغطفان کے دو ہزار جنگجو مدینہ میں گھس کر قلعوں میں محصور مسلمان عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیں۔ یہودی اس منصوبے پر عمل کرنے میں متذبذب تھے۔وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رسول اللہؐ کی مخالفت کرنے والے بنوقینقاع اور بنونضیر کے یہودیوں کا کیا حشر ہوا تھا۔بعض یہودی تو یہ سوچنے لگے کہ آں حضرتؐ وہی پیغمبر تو نہیں جن کا وہ طویل ۔ سے انتظار کر رہے تھے۔لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قریش ایک بہت بڑا لشکر لے کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینہ آ گئے ہیں جس نے پورے افق کو ڈھانپ رکھا ہے تو بنو قریظہ کا سردار قریش کی امداد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کو بنی قریظہ کی غداری کا سب سے پہلے علم ہوا۔ انہوں نے حضورؐ کو فوری طور پر اس کی اطلاع دے دی جس سے آپؐ پریشان ہو گئے۔ اس امکانی صورت حال پر آپؐ کو ہمیشہ سے تشویش لاحق تھی۔ آپؐ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی فوج چاروں طرف سے ہونے والے حملے کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت سعدؓ ابن معاذ کو، جو ہجرت سے پہلے بنو قریظہ کے سب سے بڑے حلیف تھے، کعب کی عہد شکنی کی تفتیش کے لیے ان کے علاقے میں بھیج دیا۔ حضرت سعدؓ نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر یہودیوں کی غداری اور بدعہدی کی تصدیق کر دی۔ یہودیوں نے کہا: ''کون رسول اللہؐ؟ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۶۷۵: Muhammad P. 453)۔ یہودیوں نے ایک مرحلے پر نخلستان کے جنوب مشرق میں اس قلعے پر حملہ کر دیا جس میں مسلمان عورتیں اور بچے محصور تھے تاہم اس حملے کو پسپا کر دیا گیا۔ اس موقعے پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنو قریظہ پر اپنا سفارتی حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں قریش پر یہود کا اعتماد ختم ہو گیا۔ لیکن تین ہفتوں تک بے یقینی کی کیفیت طاری رہی اور یہودیوں کے آئندہ طرز عمل کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ مسلمانوں کی فوج تھک گئی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ منافقین بھی افواہوں کے ذریعے ان میں بددلی پھیلا رہے ہیں۔ منافقین انصار کو اکسا رہے تھے کہ وہ آپؐ کو اپنے قبیلے سے نکال دیں۔ بعضوں نے تو مدینہ سے فرار ہو کر ابو سفیان سے ملنے کی بھی کوشش کی۔ قرآن کریم میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اس وقت مسلمان مایوسی کا شکار ہو چکے تھے اور بعض مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اسلام سے دست بردار ہونے کے قریب پہنچ گئے:

جب کہ (دشمن) تمہارے اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہیں مومن آزمائے گئے اور پوری طرح وہ جھنجھوڑ دیے گئے۔ (سورہ الاحزاب: آیات ۱۰، ۱۱)۔

لیکن آخر میں مسلمانوں کو خوف کی اس سیاہ رات سے نجات مل گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا البتہ ایسا لگتا ہے کہ مکہ والوں پر بنو قریظہ کے یہودیوں کا اعتماد ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ یہود اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے قریش میں سے بعض لوگوں کو یرغمال بنانے پر اصرار کرنے لگے۔ یہودی یہ سوچنے لگے کہ اگر اہل مکہ بھاگ گئے اور یہود کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو کیا ہو گا؟ قریش بھی مسلسل حالت جنگ میں رہنے سے اکتا گئے تھے۔ عرب میں محاصرہ برقرار رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی اور ان کے آدمی اور گھوڑے بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے۔ قریش کوئی ماہر اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجربہ کار سپاہی نہ تھے لہٰذا اچانک افتاد سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یوں لگتا ہے کہ جب موسم اچانک تبدیل ہوا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ قرآن حکیم میں بھی درجہ حرارت میں کمی، تیز ہواؤں کے چلنے اور بارش برسنے کو اللہ تعالیٰ کی امداد سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ابوسفیان نے اس فیصلے کا اعلان کر دیا:

اے گروہ قریش! دیکھو تمہارے پاس قیام کی کوئی جگہ نہیں۔ گھوڑے اور اونٹ مر چکے ہیں، بنو قریظہ نے وعدہ خلافی کی ہے اور ان کا جو پیغام ہمارے پاس پہنچا ہے، ہم اسے بہت ناپسند کرتے ہیں۔ اور تم دیکھ رہے ہو، ہم شدید ہواؤں سے دوچار ہیں، نہ ہماری ہانڈیاں قائم رہی ہیں، نہ ہماری آگ ٹھہرتی ہے، نہ ہمارے خیمے برقرار ہیں اس لیے سب کوچ کر چلو، میں بھی کوچ کر رہا ہوں۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۴۳۸: Muhammad P. 460)۔

یہ کہہ کر وہ اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور چل پڑا۔ اسے جلدی میں یہ احساس بھی نہ ہوا کہ اس کا اونٹ لنگڑا رہا ہے۔ اس کے قبیلے کے لوگ اور بدو بھی بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑے کیونکہ وہ بھی کئی دنوں سے بے آرامی کا شکار تھے۔ اتحادی فوجیں ذلت آمیز طریقے سے پسپا ہوئیں تو خالد بن ولید نے ابوسفیان سے کہا: ''ہر سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص اب یہ جان گیا ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جھوٹے نہیں ہیں۔'' (واقدی: کتاب المغازی، صفحات ۴۸۸ تا ۴۹۰: Lings: Muhammad P. 227)۔ اگلی صبح مسلمانوں نے ٹیلے کے اوپر سے دیکھا تو میدان مکمل طور پر خالی تھا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنو قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے جنہوں نے امت مسلمہ کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا؟ حضورؐ نے مسلمانوں کو آرام نہ کرنے دیا بلکہ اگلی صبح جبرائیل امینؑ کے ایما پر انہیں قریظہ گاؤں میں طلب کر لیا۔ یہ ایک مہیب اور وحشت ناک قصہ ہے اور آج ہم میں سے بیشتر لوگ اسے بھیانک واقعہ قرار دیں گے۔ حیی ابن اخطب قریش اور ان کے حلیفوں کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد اپنے وعدے کے مطابق بنو قریظہ کے ساتھ مل گیا۔ یہودیوں نے جب یہ سنا کہ رسول اللہؐ ان کے علاقے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں تو انہوں نے خود کو اپنے قلعے میں بند کر لیا۔ اس پر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا جو پچیس دن تک جاری رہا۔ یہودی جانتے تھے کہ عہد شکنی اور غداری کے مرتکب حلیف کی حیثیت سے انہیں مسلمانوں سے رحم کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ حیی اور کعب نے یہود سے کہا کہ وہ ناگزیر صورت حال کو تسلیم کر لیں۔ انہوں نے یہودیوں کے سامنے تین امکانی شرائط رکھیں: وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر لیں (آپؐ کی غیر معمولی فتح آپؐ کے سچے پیغمبر ہونے کی دلیل تھی) یا وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے مسلمانوں کی فوج پر حملہ کر دیں کیونکہ اس صورت میں اگر وہ مارے گئے تو انہیں زیر کفالت لوگوں کی کوئی فکر نہیں ہو گی اور اگر انہوں نے مسلمانوں پر فتح پائی تو انہیں آسانی کے ساتھ نئی بیویاں مل جائیں گی۔ تیسری شرط یہ تھی کہ وہ یہودیوں کے یوم سبت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو مسلمانوں پر حملہ کردیں کیونکہ اس روز مسلمانوں کو حملے کی توقع نہیں ہوگی۔

یہودیوں نے تینوں تجویزیں مسترد کردیں اور رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ بنی نضیر کی طرح انہیں بھی نخلستان سے چلے جانے کی اجازت دی جائے۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں کی یہ درخواست مسترد کردی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ بنونضیر مدینہ سے چلے جانے کے بعد مسلم امہ کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے اس مرتبہ یہود کے فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔آپؐ نے بنوقریظہ کو اپنے ایک سابق حلیف قبیلہ عوف کے سردار حضرت ابولبابہؓ ابن عبدالمنذر کے ساتھ مشورہ کرنے کی اجازت دے دی۔اس قصے کے اس حصے پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہودیوں نے ابولبابہؓ سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عزائم کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہود کو بتادیا کہ انہیں سزائے موت دینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔بعد میں وہ یہ راز فاش کرنے پر اس قدر پشیمان ہوئے کہ انہوں نے خود کو پندرہ روز تک مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ دیا جس کے بعد توبہ قبول ہونے پر حضورؐ نے انہیں رہا کردیا۔حضرت ابولبابہؓ نے گو یہودیوں کو ان کے مستقبل کے بارے میں فیصلے سے آگاہ کردیا تھا، اس کے باوجود رسول اللہؐ نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔کہا جاتا ہے کہ ابولبابہؓ غالباً بنوقریظہ کے ساتھ پرانے عہدوپیمان کو نبھانا چاہتے تھے۔اگلی صبح بنوقریظہ حضورؐ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر رضامند ہوگئے۔انہوں نے مسلمانوں کی فوج کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے البتہ ان کا خیال تھا کہ ان کا سابق حلیف قبیلہ اوس ان کی مدد کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبیلہ اوس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہودیوں کے لیے رحم کی اپیل کی لیکن اس سے پہلے واقعے میں کیا حضورؐ نے خزرج قبیلے کے ابن ابی کی درخواست پر بنی قینقاع کے یہودیوں کو چھوڑ نہیں دیا تھا؟ آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا کہ آیا وہ اپنے کسی سرکردہ شخص کا فیصلہ قبول کرلیں گے؟ اس پر یہودیوں نے رضامندی ظاہر کردی۔محاصرے کے دوران حضرت سعدؓ ابن معاذ کو مہلک زخم لگا تھا لیکن انہیں ایک گدھے پر بٹھا کر بنوقریظہ کے پاس پہنچادیا گیا۔ان کے ہم مرتبہ سرداروں نے حضرت سعدؓ پر زور دیا کہ وہ اپنے سابق حلیفوں کی جانیں بخش دیں لیکن سعدؓ نے یہ محسوس کرلیا کہ اس اقدام سے مستقبل میں سنگین نتائج برآمد ہوں گے اور مدینہ ایک مرتبہ پھر خلفشار کا شکار ہوجائے گا۔کیا ایک پرانی وفاداری کو امت مسلمہ کے اجتماعی مفاد پر ترجیح دینی چاہیے؟ حضرت سعدؓ نے فیصلہ سنایا کہ بنوقریظہ کے کل سات سو افراد کو قتل کیا جائے، ان کے اموال بانٹے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا جائے۔یہ فیصلہ سن کر حضورؐ نے بلند آواز سے فرمایا: ''تم نے بنوقریظہ کے بارے میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ سنادیا ہے جو آسمانوں سے آیا ہے۔'' (یعنی جو احکام تورات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق ہے)۔(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۶۸۹: Muhammad P. 464)۔

اگلے روز آں حضرتؐ نے ایک اور خندق کھودنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ یہ خندق مدینہ کے سوق (بازار) میں کھودی گئی۔ بعض یہودیوں کو مسلمانوں کی درخواست پر چھوڑ دیا گیا لیکن باقیوں کو گروہوں کی صورت میں باندھ کر ان کے سر قلم کر دیے گئے۔ بعد میں ان کی لاشیں خندق میں پھینک دی گئیں۔ صرف ایک یہودی عورت کو قصاص میں قتل کیا گیا جس نے محاصرے کے دوران چکی کا پاٹ پھینک کر ایک مسلمان کو شہید کر دیا تھا۔ حضرت عائشہؓ اس عورت کے قتل کی تفصیلات اس طرح بیان کرتی ہیں:

یہ عورت میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور کھلے دل سے ہنس رہی تھی۔ ادھر رسول اللہؐ اس کے آدمیوں کو بازار میں قتل کرا رہے تھے۔ اتنے میں پکارنے والے نے اس کا نام پکارا: ''اے فلانی۔'' اس نے جواب دیا: ''خدا کی قسم میں موجود ہوں۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''میں نے اس سے کہا، تیرا برا ہو تجھے کیا ہو گیا؟'' وہ عورت کہنے لگی: ''میں قتل کی جاؤں گی۔'' میں نے پوچھا: ''کیوں؟'' بولی ایک معاملے کی بنا پر جو میں نے کیا تھا۔ پس اسے لے جا کر اس کی گردن اڑا دی گئی۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: ''خدا کی قسم: اس میں جو تعجب انگیز چیز تھی، میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ قتل کی جانے والی ہے تاہم اس میں اتنی بشاشت تھی کہ خود ہنس رہی تھی۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۶۸۹: Muhammad P. 464)۔

ہمارے لیے غالباً یہ ناممکن ہے کہ اس واقعے کو نازیوں کے مظالم سے علیحدہ کر کے سمجھ سکیں۔ یہ قصہ بہت سے لوگوں کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روگردانی کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن میکسم روڈنسن Maxime Rodinson اور ڈبلیو منٹگمری واٹ W Montgomery Watt جیسے مغربی اسکالرز کا استدلال یہ ہے کہ اس واقعے کو بیسویں صدی کے معیاروں پر نہیں پرکھنا چاہیے۔ جس معاشرے میں یہ واقعہ رونما ہوا، وہ ایک قدیم معاشرہ تھا، یہودیوں کے معاشرے سے بھی کہیں زیادہ قدیم جس میں چھ سو برس پہلے حضرت عیسیٰؑ رحم اور محبت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اس مرحلے میں عربوں میں آفاقی فطری قانون کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ جب تک قدیم دنیا کی عظیم سلطنت میں رائج قوانین کا ادراک نہ ہوتا، اس وقت تک اس قسم کے معاشرے کی تشکیل بہت مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں مدینے کی حالت داؤدؑ بادشاہ کے بیت المقدس کی سی تھی جو خدا کے دشمنوں کا طاقتور قاتل تھا اور جس نے دو سو فلستیوں کا قتل عام کیا اور انہیں آختہ کر کے لاشوں کو لیران کے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ سے منسوب بہت سے حمدیہ گیتوں (زبور) کی تکمیل ان کی وفات کے صدیوں بعد ۵۵۰ قبل مسیح میں ہوئی تھی جن میں اسرائیلیوں کے ہولناک مظالم کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں ایک عرب سردار سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ بنو قریظہ جیسے غداروں اور باغیوں سے رحم کا سلوک کرے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محاصرے کے دوران امت مسلمہ تباہ ہونے سے بمشکل بچی تھی اس لیے اس وقت مسلمان فطری طور پر بہت جذباتی تھے۔ بنوقریظہ نے مدینے کو تقریباً برباد کر دیا تھا۔ اگر رسول اللہ ان یہودیوں کو چھوڑ دیتے تو وہ فوراً خیبر جا کر دوسرے اسلام دشمن یہودیوں کے ساتھ مل جاتے اور مدینے پر ایک اور حملے کی تیاریاں کرنے لگتے۔ ممکن تھا کہ اگلی مرتبہ قسمت مسلمانوں کا ساتھ نہ دیتی جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمانوں کو اپنی بقا کی خونریز جدوجہد غیر معینہ عرصے کے لیے جاری رکھنا پڑتی اور مزید قتل و غارت گری ہوتی۔ یہودیوں کو فوری سزائیں دینے سے ان کے دلوں پر دہشت طاری ہوگئی۔ یہود کے قتل عام سے کسی کو صدمہ نہ ہوا اور یوں لگتا ہے کہ خود بنوقریظہ نے بھی اس فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ مدینہ کے یہودیوں کی گردنیں اڑانے کا واقعہ خیبر کے یہودیوں کے لیے ایک ہولناک پیغام تھا۔ عرب قبیلوں نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنوقریظہ کے دوستوں اور حلیفوں سے خوف زدہ نہیں کہ وہ ان کے قتل کا بدلہ لیں گے۔ یہ ایک غیر معمولی طاقت کی علامت تھی جو محاصرے کے بعد آں حضرتؐ کو حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح آپؐ عرب کے نہایت طاقتور گروپ کے لیڈر بن گئے۔

بنوقریظہ کے قتل عام سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں پائے جانے والے مایوس کن حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک المناک واقعہ تھا لیکن اس دور میں اس کارروائی کو اتنا بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا جس قدر آج تصور کیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کسی ایسے زمانے میں ایک عالمی سلطنت کے اندر مصروف عمل نہیں تھے جس میں بین الاقوامی امن کا دور دورہ ہو، نہ ہی اس وقت کوئی مسلمہ مذہبی روایات موجود تھیں۔ آپؐ کے پاس وہ دس احکام الٰہی بھی موجود نہیں تھے جن میں کہا گیا تھا: ''تم قتل نہیں کرو گے''۔ لیکن حضرت موسیٰ نے یہ حکم پہنچانے کے فوراً بعد خود کیا کیا؟ انہوں نے اسرائیلیوں کو حکم دیا کہ وہ کنعان کی پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیں۔ حضورؐ کے پاس صرف پرانا قبائلی نظام اخلاق موجود تھا جس کے مطابق اپنی جماعت کو بچانے کے لیے ایسی مہم جوئی کی اجازت تھی۔ یہ مسئلہ اس حقیقت سے مزید گھمبیر شکل اختیار کر گیا کیونکہ فتح کے بعد آپؐ عرب میں اس جماعت کے سب سے طاقتور سردار بن گئے تھے جسے محض ایک روایتی قبیلے کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ حضورؐ نے پرانی قبائلیت سے ماوراءالاعلیٰ اقدار پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز ابھی کیا تھا اور آپؐ سماجی ترقی کے دو تشکیلی مراحل کے درمیان دو مخالف فوجوں کی متنازع زمین پر کھڑے تھے۔

یہاں اس اہم نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس افسوسناک آغاز نے یہودیوں کے بارے میں مسلمانوں کے رویے پر مستقل طور پر گہرا رنگ نہیں چھوڑا تھا۔ ایک بار جب مسلمانوں نے اپنی عالمی سلطنت قائم کر کے اپنے مقدس قانون کی بنیاد رکھ لی اور زیادہ جدید انسانی ضابطہ اخلاق تشکیل دے دیا تو انہوں نے رواداری اور برداشت کا ایک ایسا نظام وضع کر لیا جو طویل عرصے سے مشرق وسطیٰ کے مہذب علاقوں میں رائج چلا آ رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس خطہ ارض میں مختلف مذہبی گروہ عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہ رہے تھے۔ یہودیوں سے دشمنی کی برائی مغربی عیسائیت کی پیداوار ہے نہ کہ اسلام کی۔ اور اگر مدینے کا یہ ہولناک واقعہ ہمارے لیے تشویش اور اشتعال کا باعث ہے تو ہمیں اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ خود رسول اللہؐ کے زمانے میں یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ ۶۲۷ عیسوی کے بعد مدینہ میں بدستور موجود رہے، انہیں امن وسکون کے ساتھ رہنے کی اجازت تھی اور ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ کا دوسرا حصہ، جس کا تعلق یہودیوں کی آبادکاری سے تھا، اس تاریخ کے بعد طے پایا تھا۔ اسلامی سلطنت میں عیسائیوں کی طرح یہودیوں کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور ہماری موجودہ صدی میں اسرائیل کی ریاست کے قیام تک وہ امن وآشتی کے ساتھ رہتے رہے ہیں۔ اسلامی عہد میں یہودیوں کو وہ مصیبتیں نہیں اٹھانا پڑی تھیں جن کا سامنا انہیں عیسائیت کے دور میں کرنا پڑا تھا۔ مشرق وسطیٰ میں یہودیوں سے دشمنی کی یورپی داستانیں عیسائی مشنریوں نے پچھلی صدی میں پھیلائیں جس کی بنا پر لوگ ان سے نفرت کرنے لگے۔ لیکن حالیہ برسوں میں کئی مسلمان قرآن کریم کی بعض ایسی آیتوں کا تذکرہ کرنے لگے ہیں جن میں مدینہ کے باغی یہودی قبیلوں کا حوالہ دیا گیا ہے البتہ یہ لوگ ان بے شمار قرآنی آیات پر غور نہیں کرتے جن میں یہود اور ان کے عظیم پیغمبروں کے بارے میں مثبت خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اچھے تعلقات کی بارہ سو سالہ تاریخ میں یہ ایک بالکل نیا رجحان ہے۔ (Bernard Lewis: Semities and Anti-Semities)۔

قرآن حکیم یہ سکھاتا ہے کہ جنگ ہمیشہ قابل نفرت ہے اور مسلمانوں کو اس میں کبھی پہل نہیں کرنی چاہیے، منصفانہ جنگ صرف وہی ہے جو اپنے دفاع کے لیے لڑی جائے البتہ اگر مسلمان جنگ شروع کر دیں تو انہیں پوری قوت اور جذبے کے ساتھ لڑنا چاہیے تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو، جنگ ختم ہو جائے۔ (انہیں مارو جہاں بھی پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور (سنو) فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک یہ خود تم سے نہ لڑیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں مارو، کافروں کا بدلہ یہی ہے۔ (سورہ البقرہ، آیت ۱۹۱ ..... مترجم)۔ اگر دشمن صلح کی تجویز پیش کرے یا امن کا ارادہ ظاہر کرے تو اس صورت میں قرآن نے مسلمانوں کو فوری طور پر جنگ بند کرنے کا حکم دیا ہے البتہ صلح کی شرائط غیر اخلاقی یا اہانت آمیز نہیں ہونی چاہییں۔ (تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت اور قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں خوب جان رہا ہے۔ جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔ اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسا رکھ، یقیناً وہ بہت سننے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاننے والا ہے۔ (سورہ الانفال، آیات ۶۰، ۶۱.....مترجم)۔لیکن قرآن مجید میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ مسلح تصادم کو فوراً روک دینا اور دشمن کا مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرنا مسلمانوں کا مقدس فریضہ ہے۔ ہر قسم کے تاخیری حربے اور فیصلہ نہ کر پانے کی کیفیت سے، جو لڑائی کو غیر معینہ عرصے کے لیے طوالت دے، گریز کرنا چاہیے۔

جنگ کا مقصد جس قدر جلد ممکن ہو، امن اور ہم آہنگی کو بحال کرنا ہے۔مئی ۶۲۷ عیسوی میں مدینہ کے بازار میں جو ہولناک واقعہ رونما ہوا، بلاشبہ اس سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے لیکن اس کارروائی کی حمایت میں یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ خالص سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک صحیح فیصلہ تھا۔اس نوعیت کا یہ آخری سفاکانہ اقدام تھا لیکن اسے جہاد کے بدترین مرحلے کے اختتام کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔غزوہ خندق میں نبی کریمؐ نے کسی ایک شخص کے خلاف متحد ہونے والی عربوں کی سب سے بڑی فوج کو شکست دے دی تھی۔اس کے علاوہ آپؐ نے یہودیوں کے تین طاقتور قبیلوں کو کچل کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ مستقبل میں مسلم امہ کے خلاف کوئی غداری، کوئی سازش برداشت نہیں کی جائے گی۔حضورؐ نے یہ بھی دکھا دیا کہ اب آپؐ عرب کے سب سے طاقتور سردار ہیں جنہوں نے ایک ایسے خونیں تنازعے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے جو کئی برسوں تک جاری رہ سکتا تھا۔

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے اور لفظ ''اسلام'' کا مصدر اور ماخذ یہی ہے۔بنو قریظہ کے قتل کے بعد جہاد کی پالیسی میں واضح تبدیلی آ گئی۔اب رسول اللہؐ اپنی جان بچانے کے لیے جنگ نہیں کر رہے تھے۔چنانچہ حضورؐ نے عرب میں امن وصلح کے لیے کوششیں تیز کر دیں اور اگلے برس امن وسلامتی کی ایک ایسی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوئے جس کی وجہ سے آپؐ کو اپنے انتہائی قریبی اور حد درجہ وفادار ساتھیوں کی امداد اور حمایت کھو دینے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواں باب

مقدس امن

غزوہ خندق میں مدینہ کے محاصرے کے دوران نبی کریمؐ کو قریش پر فقید المثال فتح حاصل ہوئی۔ پانچ سال پہلے آپؐ ایک تھکے ماندے اور سفر سے نڈھال مہاجر کی حیثیت سے نخلستان میں تشریف لائے تھے۔ اس وقت مکہ کے باشندوں نے آپؐ کو قتل کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ آپؐ کا تعاقب کیا تھا۔ اب حضورؐ نے بادِ مخالف کا رخ موڑ کر پورے عرب پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ مکہ کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب چکا ہے۔ قریش رسول اللہؐ اور امت مسلمہ کو ختم کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے تھے اور وہ اپنا کھویا ہوا وقار اور پہلی سی شان و شوکت بحال نہیں کر سکتے تھے جس پر ان کے اقتدار اور طرز زندگی کا دار و مدار تھا۔ مکہ اب ایک تباہ حال شہر تھا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہی وہ شخص تھے جن کے نام کا پوری دنیا میں ڈنکا بجنے والا تھا۔ اس بات کا اعتراف قریش کی طرف سے مدینہ کا محاصرہ اٹھاتے ہوئے خالد بن ولید جیسی شخصیت نے بھی کیا تھا۔ پرانا قبائلی نظام، حلم کا نظریہ اور قریش کا جارحانہ سرمایہ دارانہ سسٹم اب اسلام کی خلاقی اور سیاسی طاقت کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جہاد کا خونیں مرحلہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ رسول عربیؐ قریش کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے بجائے ان کے دل جیت کر انہیں اپنے ساتھ ملانے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ مدینہ کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد آپؐ نے مصالحت کے عمل کا آغاز کر دیا کیونکہ یہ ایک ناگزیر قدم تھا تاہم آپؐ نے کمزوری اور قوت فیصلہ کے فقدان کا کوئی علامتی مظاہرہ نہ کیا۔

اس مرحلے پر آں حضرتؐ کی حکمت عملی میں ایک بار پھر تبدیلی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ غزوہ بدر میں فتح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد آپ نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ عرب اتحاد اب ناممکن نہیں رہا۔قریش کی شکست اور بنی قریظہ کو عبرتناک سزا کے بعد بہت سے بدوی قبائل قریش کا ساتھ چھوڑ کر مدینہ میں امت مسلمہ کے اتحاد میں شمولیت اختیار کرنے لگے۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب مکہ سے بھی آگے کا سوچ رہے تھے۔آپ مکہ کو اس لیے فتح کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس شہر کو آپ کے مذہبی وژن میں مرکزی مقام حاصل تھا۔لیکن حضورؐ نے مدینہ کے شمالی علاقے کو اسلام کے فروغ کے لیے موزوں سمجھا اور اسے اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپؐ پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپؐ شمالی قبیلوں اور غالباً شام اور عراق کے ان عربوں کو قرآن کریم کی تعلیمات سے روشناس کرانا چاہتے تھے جو بازنطینی سیاست اور مذہبی نظام میں ضم ہو چکے تھے۔ایک روایت کے مطابق، جو ابتدائی ذرائع نے بیان نہیں کی، تقریباً اسی زمانے میں حضورؐ نے بازنطین اور فارس کے بادشاہوں، حبشہ کے نجاشی اور مصر کے مقوقس کو مکتوبات اور قیمتی تحائف بھیجے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔یہ ایک غیر مستند روایت ہے کیونکہ اس بارے میں کوئی شواہد نہیں ملتے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسلام کو آفاقی مذہب سمجھتے تھے جس سے اہل کتاب پر نازل ہونے والی وحی منسوخ ہو گئی تھی۔جس طرح حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کے لیے یہودی مذہب تھا، اسی طرح آل اسماعیلؑ کے لیے دین اسلام نازل ہوا تھا۔رسول اللہؐ کی رحلت کے تقریباً ایک سو سال بعد تک مسلمان اسلام کو بدستور عربوں کا دین سمجھتے رہے البتہ ہمسایہ حکمرانوں کے پاس سفیر بھیجنے کی روایت میں کچھ صداقت بھی ہو سکتی ہے۔سفیروں کے ذریعے مکتوبات بھیجنے کے واقعے سے ایک نئے اعتماد اور حضورؐ کی وسعت فکری کا اظہار ہوتا ہے۔اب آپؐ محض ایک مظلوم طبقے کے لیڈر اور مدینہ کے دوسرے سرداروں کی طرح ایک سردار نہیں، عرب کے انتہائی طاقتور رسید بن گئے تھے۔ممکن ہے کہ اپنی جدوجہد کے آخری مرحلے میں آپؐ مکہ کی طرف سے بیرونی امداد کی درخواست کی پیش بندی کر رہے ہوں۔ہمیں آپؐ کے جو مکتوبات دستیاب ہوئے ہیں، ان میں حضورؐ نے ان حکمرانوں سے صرف یہ کہا ہے کہ وہ آپؐ کو پیغمبر تسلیم کرلیں۔اب رسول اللہؐ کو یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام عربوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔اسی وقت، جیسا کہ آپؐ نے نجاشی اور مقوقس کے نام خط بھیجے، حضورؐ نے شمالی عرب کے دو قبیلوں غسان اور حنیفہ کو بھی، جن کی بڑی تعداد عیسائی تھی، مکتوبات روانہ کیے۔آپؐ کو یہ توقع نہیں تھی کہ یہ لوگ عیسائیت ترک کر دیں گے۔حضورؐ کی صرف یہ خواہش تھی کہ مدینہ کے باقی یہودی قبیلوں کی شرائط کے مطابق یہ لوگ بھی امت میں داخل ہو جائیں۔

۶۲۸-۷ عیسوی میں نبی کریمؐ نے خود اپنا اتحاد تشکیل دینا شروع کر دیا۔چنانچہ آپؐ نے مختلف قبائل کو یہ دعوت دی کہ جس طرح احابیش قریش کے حلیف ہیں، اسی طرح وہ بھی آپؐ کے اتحادی بن جائیں۔بدوی قبیلوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں سے بعض لوگوں نے انفرادی طور پر اسلام قبول کر لیا تھا اور بعضوں نے تو ہجرت کر کے مدینہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ اس سال حضورؐ جو اتحاد قائم کر رہے تھے، وہ خالص سیاسی نوعیت کے تھے، اس کے باوجود آں حضرتؐ کو یہ توقع تھی کہ یہ اتحاد بعد میں مذہبی وفاداری میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس وقت حالات کا تقاضا تھا کہ آپؐ طاقت اور قوتِ فیصلہ کا بھرپور مظاہرہ جاری رکھتے۔ اسی سال کے دوران حضورؐ نے قریش کے اتحادی قبیلوں کے خلاف، جن میں اسد اور ثعلبہ کے قبائل شامل تھے، کئی مہمیں روانہ کیں۔ یہ قبیلے شدید قحط کی وجہ سے خلاف معمول مدینہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان غزووں کا مقصد ان قبیلوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ وہ مدینے سے دور رہیں۔ نبی کریمؐ نے قبیلہ سعد کے خلاف بھی ایک مہم روانہ کی جو خیبر کے یہودیوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے پر غور کر رہا تھا۔ خانہ بدوشوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ امت مسلمہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی خطرناک اور امت کا استحکام اور قوت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے دین کے وقار میں اضافے کا ذریعہ ہے۔

اس سال رسول اللہ کا مکے پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا البتہ آپؐ تجارت پر مکہ کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے قریش کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دین اسلام قبول کرنے والے مزید لوگ ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے لگے تو شہر کی آبادی بڑھ گئی چنانچہ مسلم امہ کے لیے شام کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر کے وہاں سے سامان کو نخلستان میں درآمد کرنا ضروری ہو گیا۔ ان حالات میں حضورؐ نے شام کی تجارت کا رخ مدینہ کی طرف موڑنے اور اسلام کی تبلیغ کے لیے شمال کی جانب کئی مہمیں روانہ کیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبدالرحمٰنؓ ایک کارواں کو شام جانے والی شاہراہ پر واقع دومتہ الجندل لے گئے جہاں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ معرکہ بدر کے بعد جب قریش کے لیے بحیرہ احمر کا راستہ بند کر دیا گیا تھا، مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی پر مدینہ بتدریج اثر انداز ہو رہا تھا۔ اسی سال کے دوران جب مدینہ کا محاصرہ ختم ہوا، رسول اللہؐ نے قریش کی تجارتی ناکہ بندی اور مسلمانوں کے لیے تجارتی مواقع حاصل کرنے کی غرض سے سخت اقدامات کیے۔ حضرت زیدؓ کو شام کے ساتھ تجارت کے لیے روانہ کیا گیا لیکن ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا گیا تاہم وہ اپنے کارواں کو واپس مدینہ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حضرت زیدؓ کو قریش کے تجارتی قافلے پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا جو شام سے واپس مکہ جا رہا تھا۔ اس قافلے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے داماد ابوالعاص بھی شامل تھے جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ فرار ہونے کے بعد رات کو چھپ کر اپنی سابق بیوی حضرت زینبؓ کے پاس پہنچ گئے۔ اگلی صبح مسجد میں نماز فجر کے بعد حضرت زینبؓ نے ابوالعاص کو پناہ دینے کا اعلان کر دیا۔ حضورؐ نے، جن کو اس واقعے کا علم نہیں تھا، اپنی صاحبزادی کی طرف سے ابوالعاص کو پناہ دینے کے حق کی حمایت کی البتہ آپؐ نے حضرت زینبؓ کو ہدایت کی کہ وہ اس کے ساتھ خلوت میں نہ جائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت زینبؓ نے آں حضرتؐ کو بتایا کہ ابوالعاص کو اپنا سامان تجارت کھودینے کا بہت رنج ہے کیونکہ یہ سامان انہوں نے مکہ کے ان لوگوں سے لیا تھا جنہوں نے ان پر اعتماد کیا تھا۔ رسول اللہؐ نے فوری طور پر قافلے پر حملہ کرنے والے مسلمانوں سے کہا کہ وہ یہ سامان ابوالعاص کو واپس کر دیں۔ چنانچہ ان مسلمانوں نے حضورؐ کے اس حکم کی فوری تعمیل کرتے ہوئے ان کا اسباب واپس کر دیا یہاں تک کہ کچھ پرانے مشکیزے، بوتلیں اور لکڑی کے بیکار ٹکڑے بھی انہیں لوٹا دیے۔ یہ کارروائی بارآور ثابت ہوئی۔ ابوالعاص مکہ چلے گئے اور لوگوں کو ان کا سامان تجارت واپس کرنے کے بعد مدینہ چلے آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں انہوں نے حضرت زینبؓ سے دوبارہ رجوع کر لیا۔ اس سے پہلے انہوں نے مشرکانہ عقیدے کی خاطر اپنی بیوی اور بیٹی سے جدائی برداشت کر لی تھی لیکن اب مکہ والوں کی قسمت خراب تھی اور انہیں ناگزیر صورت حال کو قبول کرنا پڑا۔ مکہ کے بعض اور لوگوں نے بھی اسی انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا اور رسول اللہؐ اس صورت حال سے یقیناً آگاہ ہوں گے۔ مشرکین مکہ اپنے پرانے دیوتاؤں کی حمایت میں مدینہ کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے اور احد کے معرکے میں ان کا نعرۂ جنگ یہ تھا: ''یا عزیٰ! یا ہبل!'' لیکن قریش مکہ نے دیکھا کہ ان کے دیوتا حضورؐ کے اللہ کے دین کے سامنے بالکل بے بس تھے۔ اس کے باوجود صفوان، عکرمہ اور بنی عامر کے سردار سہیل جیسے مشرکین حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابوالعاصؓ جیسے نومسلموں اور خود اپنے مخبروں سے (اب حضورؐ کے پاس جاسوسی کا انتہائی ترقی یافتہ نظام موجود تھا) لوگوں کے انداز فکر میں تبدیلی سے آگاہی حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ جاننا اب بھی بہت مشکل تھا کہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ آں حضرتؐ مکہ کے مقدس شہر کو فتح کرنے کے لیے لشکرکشی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ کے پاس معمول کے مطابق کوئی طے شدہ پلان موجود نہیں تھا البتہ یہ بات یقینی ہے کہ آپؐ لاشعوری سطح پر اس مسئلے کے حل کے لیے ضرور غور وفکر کرتے ہوں گے۔ چنانچہ مارچ ۶۲۸ عیسوی میں حج کے مہینے کے دوران آپؐ کو قریش سے مصالحت اور فتح مکہ کے مسئلے کا حل خواب کی صورت میں سامنے آیا۔ حضورؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ حج کے لیے بال منڈوائے، حاجیوں کے روایتی لباس میں ملبوس خانہ کعبہ میں کھڑے ہیں اور اس کی چابی آپؐ کے ہاتھ میں ہے۔ اس خواب میں آپؐ کو گویا فتح کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس کا اظہار خدا کے لفظوں میں قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا:

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو خواب سچا دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے (چین کے ساتھ) نڈر ہو کر، وہ ان امور کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ (سورہ الفتح آیت ۲۷)۔

اگلی صبح حضورؐ نے یہ اعلان فرمادیا کہ آپؐ حج کے لے خانہ کعبہ جارہے ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس غیر معمولی اعلان سے مسلمانوں میں خوف، حیرت اور مسرت و شادمانی کا جو احساس پیدا ہوا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے واضح کر دیا کہ یہ کوئی عسکری مہم نہیں ہے، مسلمان حاجیوں کا روایتی لباس پہنیں گے اور کوئی ہتھیار ساتھ نہیں رکھیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ چنانچہ امت کے اتحادی بدوی قبائل نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تاہم ایک ہزار کے قریب مہاجرین اور انصار آں حضرتؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے یہاں تک کہ ابن ابی بھی اپنے چند ساتھیوں سمیت ساتھ ہولیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پچھلے سال تمام تر مشکلات کے باوجود مسلمانوں کی فتح اور بنی قریظہ کے عبرتناک انجام سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیوی حضرت ام سلمہؓ اور دوسری بیعت عقبہ پر موجود دو خواتین کو بھی حج کے لیے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔

عازمین حج نے تیزی کے ساتھ تیاریاں شروع کر دیں اور ستر اونٹ بھی اپنے ہمراہ لے لیے جنہیں قدیم رسم کے مطابق خانہ کعبہ کے قریب قربان کیا جاتا تھا۔ نبی کریمؐ نے حاجیوں کا مخصوص روایتی لباس زیب تن کیا جو دو ان سلی چادروں پر مشتمل تھا۔ آپؐ نے ان میں سے ایک چادر کو تہبند کے طور پر باندھ لیا اور دوسری کو کندھے کے گرد لپیٹ لیا۔ حج کے لیے مکہ جانے والے عازمین آج بھی یہی لباس پہنتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ استدلال پیش کیا کہ قریش مسلمان عازمین پر یقیناً حملہ کریں گے اس لیے مسلمانوں کو پوری طرح مسلح ہو کر مکہ جانا چاہیے تاکہ حملے کی صورت میں وہ اپنا دفاع کر سکیں۔ لیکن رسول اللہؐ پورے استقلال کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہے: ''میں ہتھیار لے کر نہیں جاؤں گا۔'' آپؐ نے مضبوط لہجے میں فرمایا: ''میں صرف حج کرنے کی غرض سے مکہ جا رہا ہوں۔'' (محمد ابن عمر الواقدی: کتاب المغازی صفحہ ۵۸۷ نیز مارٹن لنگز Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources P. 247)۔ آں حضرتؐ نہایت پر اعتماد تھے اور آپؐ کو اپنے خواب کی تعبیر پر مکمل بھروسا تھا کہ آپؐ کسی خوف و خطر کے بغیر بیت اللہ میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے، آپؐ پر ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟ حضورؐ کو یقین تھا کہ اس مرتبہ آپؐ لڑائی کے لیے نہیں جا رہے چنانچہ ہر مسلمان نے صرف ایک چھوٹی تلوار ساتھ لے لی جو شکار کے لیے آخر وقت تک استعمال میں آتی تھی۔

ابتدائی اقدام کے طور پر رسول کریمؐ نے روایتی طور پر ایک اونٹ کی قربانی دینے کا اعلان کیا، اسے خوبصورتی کے ساتھ سجایا، اس کی گردن میں ہار ڈالے اور مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ پھر آپؐ نے حج کے کلمات بلند آواز سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادا کیے اور کہا: ''لبیک! اللھم لبیک'' جس کا مطلب ہے ''اے اللہ! میں حاضر ہوں''۔ بعض صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی پیروی کی اور کئی دوسرے صحابہؓ نے اس عمل کو آئندہ کے لیے موخر کر دیا کیونکہ حج کے دوران شکار پر پابندی تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ آپؐ نے قریش کو نہایت مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ مکہ کے محافظ کی حیثیت سے ایک ہزار عرب عازمین کو مناسک حج سے روکنا ان کے لیے بدنامی کا باعث بن جاتا کیونکہ تمام عرب پوری آزادی کے ساتھ کعبے کا طواف کر سکتے اور حدود حرم میں داخل ہو سکتے تھے۔ اگر حضورؐ اس طرح مکہ میں داخل ہو جاتے تو اس سے آپؐ کے ہاتھوں قریش کی تذلیل ہوتی اور آپؐ کو عظیم الشان اخلاقی فتح حاصل ہو جاتی۔ سہیل، عکرمہ، صفوان اور ان کے ساتھیوں نے حضورؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا تہیہ کر رکھا تھا حالانکہ یہ کارروائی ان کے اتحادی خانہ بدوش قبائل کے لیے صدمے کا باعث ہو سکتی تھی۔ لیکن صفوان نہایت پراسرار طور پر خاموش رہا۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین شخص تھا اور اس نے غالباً یہ محسوس کر لیا تھا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ روایتی طریقوں سے نہیں نمٹا جا سکتا۔

یوں لگتا ہے کہ قریش کی مجلس میں وہ واحد شخص تھا جس کی یہ سوچ تھی۔ خالد ابن ولید کو دو سو سواروں کے دستے کے ساتھ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بھیجا گیا اور جب مسلمان مکہ سے کوئی ۲۵ میل دور شمال جنوب میں عسفان کے کنوئیں پر پہنچے تو ان کے مخبر نے آکر یہ خبر دی کہ خالد ان سے صرف آٹھ میل دور پہنچ چکا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہایت پراعتماد لہجے میں فرمایا: ''قریش کا برا ہو! انہیں تو جنگ کھا گئی ہے۔ اگر وہ اس معاملے کو مجھ پر اور عربوں پر چھوڑ دیں تو ان کا کیا بگڑتا؟ اگر عرب مجھے ہلاک کر دیں گے تو قریش کا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے عربوں پر غالب کر دے گا تو وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اگر وہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے تو جب تک ان میں قوت ہوگی، جنگ کریں گے۔ پھر قریش کس خیال میں ہیں! خدا کی قسم! میں اس مقصد کے لیے برابر جہاد کرتا رہوں گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے تاآنکہ وہ ذات پاک اسے غالب کر دے یا میری موت آجائے۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۱۷: The Life of Muhammad P. 500)۔ اس کے بعد نبی کریمؐ نے فرمایا: ''کون ہے جو مجھے یہ راستہ چھوڑ کر، جس پر قریش ہیں، کسی دوسرے راستے سے لے چلے'' تاکہ آپؐ مکہ کے قریب پہنچ سکیں جہاں ہر قسم کی لڑائی اور تشدد کی ممانعت ہے۔ چنانچہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص آپؐ کو سنگلاخ راستے سے تنگ گھاٹیوں کے اندر ہوتا ہوا لے گیا جہاں خالد کا پہنچنا دشوار تھا۔ جب حضورؐ مسلمانوں کے ہمراہ نرم زمین میں وادی کے موڑ پر پہنچے تو رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ کو اس مہم کی مذہبی نوعیت سے آگاہ کیا۔ اب وہ حدود حرم میں داخل ہونے والے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لہٰذا آں حضرتؐ نے عازمین سے کہا کہ وہ خدا کے حضور توبہ و استغفار کریں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف کر!'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۷۴۱)۔ پھر آپؐ نے عازمین کو حکم دیا کہ وہ حرم کے کنارے حدیبیہ کے مقام کی طرف چلیں اور اپنے اونٹوں کے پاؤں سے ریت اڑائیں تاکہ خالد اور اس کے آدمیوں کو معلوم ہو کہ اب وہ خطرے سے باہر پہنچ چکے ہیں۔

رسول اللہؐ کو خواب سے یہ تاثر ملا تھا کہ قریش عازمین کو شہر میں داخلے کی اجازت دے دیں گے تاہم خالد کی مسلح فوج سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نہتے مسلمانوں کو کعبے میں داخل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں اور انہیں قتل کرنے کے درپے ہیں چنانچہ حضورؐ نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے فوری اقدامات کیے۔ جب آپؐ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو حضورؐ کی اونٹنی قصویٰ اچانک گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ صحابہؓ نے اس کے گرد کھڑے ہو کر معمول کے مطابق چلاتے ہوئے ''ھل ھل'' کہنا شروع کر دیا لیکن قصویٰ ٹس سے مس نہ ہوئی اور لوگ اس کی ضد اور سرکشی کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے تاہم آں حضرتؐ نے فرمایا: ''یہ ضدی نہیں، یہ اس کی عادت نہیں لیکن اسے اس پاک ہستی نے روک دیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ آج قریش کسی بھی چیز کی طرف مجھے دعوت دیں جو صلہ رحمی اور قرابت داری پر مبنی ہو تو میں وہ چیز انہیں دیے بغیر نہ رہوں گا۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۷۴۱)۔ جنگ نہیں صلح، اس نہم کا طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ وہ اونٹوں سے نیچے اتر آئیں۔ جب لوگوں نے کہا کہ اس وادی میں پانی نہیں تو حضورؐ نے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اپنے ایک صحابیؓ کو دیا۔ یہ صحابیؓ تیر لے کر ایک کنوئیں میں اتر گئے اور وہ تیر خشک کنوئیں کے وسط میں گاڑ دیا۔ پھر کنوئیں سے کثیر پانی ابل پڑا۔

اونٹ پانی پی کر لیٹ گئے اور صحابہ کرامؓ، جو اس صورت حال سے مایوس تھے کہ انہیں کوئی دلیرانہ کارنامہ انجام دینے کے لیے نہیں کہا گیا، اونٹوں کے پاس بیٹھ گئے۔ صحابہؓ کے اس ''دھرنے'' کو دیکھ کر خانہ بدوش قبائل پر بہت اثر ہوا۔ اس وقت سب آنکھیں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ خبریں ایک سے دوسرے قبیلے تک تیزی سے پہنچنا شروع ہو گئیں اور جب بدویوں نے یہ سنا کہ قریش پرامن عرب عازمین کے ایک دستے پر حملہ کرنے والے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی ہے جو تمام عربوں کا مقدس حق ہے تو ان خانہ بدوشوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ رسول اللہؐ نے حرم کعبہ کے جوار میں حاجیوں کا لباس پہن کر نہایت صبر کے ساتھ بیٹھ کر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان اس معاملے میں خانہ کعبہ کے محافظوں کے بجائے عرب روایت پر کاربند ہیں۔ حدیبیہ میں مسلمانوں کی آمد کے فوراً بعد قبیلہ خزاعہ کا ایک وفد اپنے سردار بدیل ابن ورقا کی قیادت میں وہاں پہنچ گیا۔ بدیل مکہ جاتا رہتا تھا اور اس نے مسلمانوں کے آنے کی خبر وہیں سنی۔ بدیل نے جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضورؐ سے دریافت کیا کہ آپؐ کس مقصد کے لیے آئے ہیں تو آں حضرتؐ نے فرمایا کہ مسلمان جنگ کی غرض سے نہیں، محض زیارت و اکرام بیت اللہ کے لیے آئے ہیں تاہم اگر ضروری ہوا تو مختصر ہتھیار رکھنے کے باوجود حج بیت اللہ کے حق کے لیے جنگ سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا لیکن وہ قریش کو کچھ مہلت دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے لائحہ عمل پر سوچ بچار کر لیں۔ ہدیل کو یہ جان کر سخت دھچکا لگا کہ پر امن مسلمان عازمین کو اس طریقے سے خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے چنانچہ اس نے حدیبیہ میں قیام کے دوران مسلمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں اور معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔

ہدیل فوراً مکہ پہنچا اور اس نے غضب ناک ہو کر قریش کی اس پالیسی پر سخت اعتراض کیا جس کے مطابق عربوں کی نہایت مقدس روایت کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔ لیکن عکرمہ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پیغام سننے سے انکار کر دیا البتہ صفوان نے ہدیل کی باتوں کو غور سے سنا۔ جب ہدیل نے حضورؐ کے پر امن عزائم پر زور دیا تو بعض قریش کو یقین نہ آیا اور وہ کہنے لگے: "ممکن ہے کہ آپؐ قتال کی غرض سے نہ آنے ہوں لیکن خدا کی قسم! پھر بھی انہیں بیت اللہ میں بزور داخل نہیں ہونے دیا جائے گا اور عربوں کو چاہیے کہ ہم سے اس سلسلے میں بات بھی نہ کریں۔" (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۷۴۳: The Life of Muhammad P. 501)۔ قریش نے حضورؐ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے بجائے یہ عہد کیا کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور خانہ کعبہ کے درمیان کھڑے ہو کر اپنا آخری آدمی قتل ہونے تک جنگ جاری رکھیں گے۔ بہر حال مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ابن ابی کو پیغام بھیجا اور اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے کی دعوت دی کیونکہ وہ ابن ابی کو اہل مکہ کا دوست سمجھتے تھے۔ لیکن ابن ابی نے ان کے جواب میں جو پیغام بھیجا، اسے سن کر قریش کو سخت حیرت ہوئی۔ ابن ابی نے کہا کہ وہ رسول کریمؐ سے پہلے خانہ کعبہ کا طواف کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ابن ابی کے ماضی کے رویے اور مستقبل میں حضورؐ کی دوبارہ مخالفت سے قطع نظر اس نے حدیبیہ میں ایک اچھا مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔

قریش کے دوسرے لوگوں نے، جن میں صفوان اور سہیل شامل تھے، سوچا کہ انہیں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مذاکرات کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ طائف کے عروہ بن مسعود نے، جو قریش کا اتحادی اور ان دنوں مکہ میں موجود تھا، اس سلسلے میں قاصد کے فرائض انجام دینے کی پیش کش کر دی۔ عروہ نے دلیل دی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معقول درخواست کو رد کر دینا نقصان دہ ثابت ہوگا کیونکہ آپؐ نے سرِ عام یہ اعلان کیا ہے کہ آپؐ قریش کو مراعات دینے کو تیار ہیں۔ اہل مکہ نے عروہ کی پیش کش قبول کر لی لیکن انہوں نے عروہ سے پہلے اپنے بدوی حلیف اور قبیلہ بنی حارث کے سردار حلیس ابن علقمہ کو رسول اللہؐ کے پاس بھیجا جو اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت تمام حبشیوں کا سردار تھا۔ وہ ایک پکا بت پرست تھا اور حضورؐ نے جیسے ہی اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ''یہ شخص عبادت گزار قوم میں سے ہے اس لیے اس کے سامنے قربانی کے اونٹوں کو لے جاؤ تاکہ وہ انہیں دیکھ لے۔'' حلیس نے جب ۷۰ اونٹوں کو اپنی طرف آتے دیکھا جن کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے تھے، جو قربانی کے جانور کی علامت تھی تو وہ فوراً قریش کی طرف واپس ہوگیا اور چونکہ قربانی کے اونٹ دیکھ کر اس کے دل میں عظمت قائم ہوگئی تھی، اس لیے وہ رسول اللہؐ کے پاس بھی نہ پہنچا۔ غرض اس نے یہ سارا حال جا کر قریش کو سنا دیا۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ واقعی حج کرنا چاہتے ہیں اس لیے انہیں بیت اللہ میں داخل ہونے کا حق حاصل ہے۔ لیکن صفوان اور اس کے ساتھی یہ ناخوشگوار خبر سن کر غضبناک ہوگئے اور انہوں نے حلیس سے کہا: ''تو تو بالکل دہقانی ہے، تجھے کچھ نہیں معلوم''۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی چنانچہ حلیس کو بڑا غصہ آیا اور اس نے نہایت باوقار انداز میں کھڑے ہو کر کہا:

اے گروہ قریش! خدا کی قسم! اس بات پر ہم تم ایک دوسرے کے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہمارا تمہارا معاہدہ ہوا تھا کہ جو شخص بیت اللہ کی زیارت اور اس کے اکرام کے لیے آیا ہو، اسے روکا جاسکتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں حلیس کی جان ہے! یا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس مقصد کے لیے آئے ہیں، انہیں پورا کرنے دو یا میں تمام حبشیوں کو لے کر ایک ساتھ الگ ہوتا ہوں۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۷۴۳: The Life of Muhammad. P. 501)

قریش نے جلدی سے حلیس سے معافی مانگ لی اور اس سے کہا کہ وہ ذرا رک جائے، ہم لوگ اپنے لیے کوئی ایسی بات طے کرلیں جس پر ہم سب رضامند ہو جائیں۔

اس کے بعد قریش نے عروہ بن مسعود کو حدیبیہ بھیج دیا۔ عروہ رسول کریمؐ کے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قریش سر سے پاؤں تک ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنی عورتوں اور بچوں کے ہمراہ نکل آئے ہیں۔ کیا تم گوناگوں قسم کے ان لوگوں کو مقابلے کے لیے لے کر آئے ہو جن میں سے کئی قبیلے ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف شدید جنگیں لڑتے رہے ہیں۔ خدا کی قسم! کل لڑائی کا رخ بدلا تو یہ تمہیں چھوڑ جائیں گے۔'' حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر طیش میں آ گئے اور کہا: ''تم لات کے پستانوں کو چوسو۔'' اس پر عروہ بولا: ''اگر مجھ پر تمہارا احسان نہ ہوتا تو میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا۔'' عروہ نے نبی کریمؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے عربوں کی بے تکلفی کی پرانی روایت کے مطابق آپؐ کی ڈاڑھی مبارک اپنے ہاتھ میں پکڑ لی لیکن ایک اور صحابیؓ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے کر دیا۔ عروہ مسلمانوں کی اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ والہانہ عقیدت کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا اور جیسا کہ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے: ''عروہ نے دیکھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وضو کرتے ہیں تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحابہ کرامؓ آپؐ کے وضو کا پانی لینے میں سبقت کرتے ہیں، آپؐ لعاب دہن پھینکتے ہیں تو اس پر بھی لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں، آپ کا کوئی بال گرتا ہے تو اسے بھی رکھ لیتے ہیں۔'' عروہ نے تجارت کے سلسلے میں کئی ملکوں کا سفر کیا تھا چنانچہ یہ منظر دیکھ کر وہ قریش کے پاس آ کر کہنے لگا: ''اے گروہ قریش! میں کسریٰ سے اس کے ملک میں جا کر ملا۔ میں نے قیصر سے اس کے ملک میں ملاقات کی اور نجاشی سے اس کے ملک میں جا کر ملا مگر خدا کی قسم! میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا جو اپنی قوم میں اتنا معزز ہو جتنے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہؓ میں معزز ہیں۔ میں نے ایسی قوم دیکھی جو کبھی کسی قیمت پر بھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یوں نہیں چھوڑ سکتی۔ اب جو تم اپنی رائے قائم کرو۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۷۴۵: The Life of Muhammad. P. 503)۔

نبی کریمؐ نے خود اپنے ایلچی کو مکہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے آپؐ نے یہ سوچ کر ایک انصاری کو مکہ بھیجا کہ اس سے زیادہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا تاہم قریش نے اس انصاری کے اونٹ کے پاؤں کی نس کاٹ کر اسے ناکارہ بنا دیا اور اگر حلیس کا دستہ اس کی مدد کو نہ پہنچتا تو اسے قتل کر دیا جاتا۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ وہ مکہ جائیں لیکن عمرؓ نے کہا: ''یارسول اللہؐ! مجھے اپنے متعلق قریش سے ڈر ہے۔ مکہ میں بنو عدی کعب کا کوئی آدمی بھی نہیں جو میری حمایت کر سکے۔ قریش سے مجھے جو عداوت ہے اور ان کے معاملے میں میری جو سختی ہے، اسے وہ جانتے ہیں۔'' چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ ابن عفان کو مکہ بھیجنے کی تجویز دی۔ مکہ میں حضرت عثمانؓ کے بہت سے اشراف کے ساتھ تعلقات تھے اس لیے قریش نے ان کی باتوں کو توجہ سے سنا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ قریش نے انہیں بتایا کہ اگر وہ چاہیں تو خانہ کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے بھی ابن ابی کی طرح رسول اللہؐ سے پہلے بیت اللہ کا طواف کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد قریش نے حضرت عثمانؓ کو یرغمال بنا کر مسلمانوں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا: ''اب ہم اس جگہ سے اس وقت تک نہ ہٹیں گے جب تک اس قوم سے جنگ نہ کر لیں۔'' یہ سنگین بحران کا وقت تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ پوری مہم، جو ایک امید افزا خیال کی بنا پر شروع ہوئی تھی، ایک خطرناک انجام پر منتج ہوگی۔ روایت ہے کہ اس موقع پر حضورؐ پر وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی جو وحی کے نزول کے وقت ہوتی تھی۔ اس نازک وقت میں آپؐ یقیناً گہرے روحانی وجدان کی مدد سے اس مسئلے کا حل تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس کے بعد آں حضرتؐ نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ وفاداری اور اطاعت شعاری کا خصوصی عہد کریں۔ رسول اللہؐ نے لوگوں کو بیعت کرنے کی دعوت دی، یہی بیعت رضوان ہے جو ایک درخت کے نیچے لی گئی تھی۔ اس بیعت کے الفاظ کے بارے میں متضاد روایات پائی جاتی ہیں۔ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اس بیعت میں یہ عہد کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ وہ آخر دم تک قریش کے ساتھ جنگ جاری رکھیں گے۔ لیکن یہ نقطہ نظر چند لوگوں کا ہے۔ بیشتر روایات میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اس بیعت میں صرف یہ عہد کیا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھاگیں گے نہیں تاہم واقدی کا کہنا ہے کہ اس موقعے پر ہر مسلمان نے حضورؐ کا دست مبارک تھام کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس بحران میں ہر بات میں آں حضرتؐ کی کامل اطاعت کرے گا۔

(W. Montogomery Watt: Muhammad at Medina P. 50)

ابن ابی اور دوسرے منافقین نے بھی اس موقعے پر حلف اٹھایا جو عازمین میں شامل تھے۔

اس معاملے میں واقدی کا نقطہ نظر زیادہ وزنی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب استغراق اور وجدان کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر مستقبل کے لیے جو لائحہ عمل طے کیا، اس وقت آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اس فیصلے کے نتیجے میں نہ صرف عدم برداشت بلکہ آپؐ کے پیروکاروں میں بغاوت کے اثرات ظاہر ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔ حضورؐ نے قریش کے خلاف صف آرا ہونے کا جو فیصلہ کیا، وہ سابق پالیسی کے بالکل برعکس تھا۔ آپؐ نے ابھی تک کوئی واضح حکمت عملی اختیار نہیں کی تھی بلکہ آپؐ حدیبیہ میں پیش آنے والے واقعات کا منطقی جائزہ لے رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپؐ صحابہ کرامؓ کی قیادت کرتے ہوئے مکہ جانے کے لیے مدینے سے روانہ ہوئے تھے، اس وقت آپؐ کو یہ توقع نہیں تھی کہ صورت حال اس قدر سنگین ہو جائے گی۔ بیعت رضوان کے فوراً بعد یہ خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے۔ اسی دوران رسول اللہؐ نے سہیل کو دو ساتھیوں کے ہمراہ اپنی طرف آتے دیکھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اس سفارت کا مطلب یہ ہے کہ قریش نے بات چیت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آپ کافی دیر تک سہیل کے ساتھ بیٹھے رہے اور طویل بحث مباحثے کے بعد فریقین کے درمیان ایسی شرطیں طے ہوگئیں جن سے صحابہ کرامؓ میں سخت مایوسی اور بددلی پھیل گئی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وعدہ کیا کہ آپؐ اس موقع پر خانہ کعبہ کا طواف کیے بغیر واپس مدینہ چلے جائیں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی عرب یہ نہ کہہ سکے کہ آپؐ قریش کی پروا کیے بغیر بزور مکہ میں داخل ہوئے ہیں۔ لیکن اگلے سال اسی وقت مسلمان بیت اللہ کا طواف کرنے کی غرض سے مکہ جائیں گے اور قریش تین دن کے لیے شہر کو خالی کر دیں گے تاکہ مسلمان پرامن طریقے سے طواف کعبہ اور عمرہ کر سکیں۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ ان دس برسوں میں لوگ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے اور ایک دوسرے سے ہاتھ روکے رکھیں گے۔ شرط یہ ہے کہ جو آدمی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے گا، وہ اسے قریش کے پاس لوٹا دیں گے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیوں میں سے جو آدمی قریش کے پاس جائے گا، قریش اسے حضورؐ کے پاس واپس نہ کریں گے نیز یہ کہ دلوں کی عداوتیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلوں میں رہیں گی، انہیں ظاہر نہ کیا جائے گا، بدعہدی اور خیانت نہیں کی جائے گی اور یہ کہ جو پسند کرے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عقد وعہد میں داخل ہو، وہ اس میں داخل ہو جائے اور جو پسند کرے کہ قریش کے عقد وعہد میں داخل ہو، وہ ان کے عقد وعہد میں داخل ہو جائے۔ اس صلح نامے کی رو سے بدوی قبائل سابق عہد وپیمان سے سبکدوش ہو کر مکہ یا مدینہ دونوں میں سے کسی کا حلیف بن سکتے تھے۔ قرآن کریم میں واضح کیا گیا ہے کہ مسلمان قیام امن کی خاطر دشمن کی تجویز کردہ شرطوں کو قبول کر لیں گے۔ لیکن اس صلح نامے کی شرطیں مسلمانوں کے لیے اہانت آمیز تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ رسول اللہؐ خانہ کعبہ کا طواف کیے بغیر واپس مدینہ جانے کی شرط کو مان کر اس مہم سے حاصل ہونے والے فائدے سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ مکہ سے امن کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان اب قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے نہیں کر سکیں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ مہاجرین اپنی گذر اوقات کیسے کریں گے اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس اقتصادی ناکہ بندی سے آخر کیوں دست بردار ہو رہے ہیں جو مکہ کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ جاری تھی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول اللہؐ کسی نومسلم کو قریش کے حوالے کرنے پر کیوں رضامند ہوئے ہیں حالانکہ صلح نامے کی رو سے قریش حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کسی ساتھی کو آپؐ کے پاس واپس کرنے کے پابند نہیں تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ حضورؐ نے اس جہاد کو ختم کر دیا ہے جس میں بے شمار مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا اور بدترین خطرات مول لیے تھے۔ اب یہ سب قربانیاں بظاہر رائیگاں جا رہی تھیں اور قریش مکہ ان کے فوائد سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔ جیسا کہ محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے: ''صحابہ کرامؓ کو پوری امید تھی کہ آں حضرتؐ کے خواب کے مطابق وہ مکہ پر فتح حاصل کر لیں گے لیکن جب انہوں نے امن کے لیے مذاکرات اور صلح نامے کی شرطوں کو دیکھا تو ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۸۷: The Life of Muhammad P. 505)۔

صلح حدیبیہ کے ردعمل میں بدترین بغاوت ہوگئی۔ معاہدے کی شرطیں سن کر حضرت عمرؓ جوش میں آ گئے۔ وہ تیزی کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا: ''کیا ہم مسلمان اور وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر ہمارے دین کے معاملے میں ہمیں یہ ذلت کیوں دی جا رہی ہے؟'' معاہدے سے حضرت ابوبکرؓ بھی سخت پریشان ہوئے تاہم انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا: ''عمر! رسول اللہؐ کا دامن تھامو! میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔'' بعد میں حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اگر اس موقعے پر ایک سو آدمی بھی میرا ساتھ دیتے تو میں امت سے منحرف ہو جاتا۔ لیکن حدیبیہ میں حضورؐ کی نگاہیں وہ کچھ دیکھ رہی تھیں جو کسی اور کو نظر نہیں آتا تھا۔ گو کہ صلح حدیبیہ کے مطابق آپؐ حج بیت اللہ نہ کر سکے لیکن اس خیال نے مہمیز کا کام دیا اور اس نے آپؐ کو امن کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ یہ ایک نیا اور اچھوتا تجربہ تھا اور کسی دوسرے شخص بلکہ آپؐ کے ان انتہائی قریبی صحابہ کرامؓ کو بھی اس کا ادراک نہیں تھا جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیرت اور خاموشی کے ساتھ اس اچانک تبدیلی پر غور کر رہے تھے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وجدان کی اتھاہ گہرائیوں میں اس تاریکی سے نکلنے کا راستہ بخوبی معلوم تھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ جب تک خانہ کعبہ تک رسائی نہیں ہوتی، خانہ بدوش قبائل آپ کا ساتھ دینے میں متذبذب رہیں گے۔ حضورؐ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ آپؐ کے مسلمانوں کو عرب کے انتہائی مقدس مقام کعبۃ اللہ کے ساتھ اتنی ہی عقیدت ہے جس قدر بدوؤں کو! قریش مکہ کے ساتھ امن معاہدہ کر کے آپؐ نے خانہ کعبہ تک دسترس حاصل کر لی تھی جو پروپیگنڈے کی جنگ میں ایک موثر ہتھیار تھا۔ آپؐ نے قریش سے یہ اہم حقیقت منوالی تھی کہ مکہ اور مدینہ اب برابری کی سطح پر آ گئے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار معاہدے کی اس شق سے ہوتا تھا جس کے مطابق خانہ بدوش قبائل کو قریش کے ساتھ پرانا اتحاد ختم کر کے امت مسلمہ کا حلیف بننے کی اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ معاہدہ ہوتے ہی قبیلہ بنوخزاعہ نے، جس میں شادی کی وجہ سے آپؐ کا تعلق موجود تھا، اس نئی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے بڑھ کر کہا کہ ہم لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عقد وعہد میں ہیں۔ (جنوری ۶۲۷ عیسوی میں بنی مصطلق پر حملے کے بعد حضورؐ نے اس قبیلے کے سردار حارث ابن ابوضرار کی بیٹی حضرت جویریہؓ کو رشتہ ازواج میں منسلک کرالیا تھا)۔ مدینہ میں قریش کو شکست دینے کے بعد ان پر دباؤ بڑھانا اور انہیں فوجی اعتبار سے تباہ کرنا واضح لائحہ عمل ہو سکتا تھا لیکن آں حضرتؐ نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ معاشی ناکہ بندی ختم کرنے کے بعد حضورؐ کو توقع تھی کہ آپؐ پرامن طریقے سے قریش کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عربوں کے لیے سیاسی اور مذہبی مسئلے کے حل کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ ایسا کوئی غیر متوقع اور روایتی قدم نہ اٹھاتے کیونکہ اس طرح حالات کو جوں کا توں رکھنے کا ناخوشگوار عمل جاری رہتا۔

رسول کریمؐ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے جب سہیل کے ساتھ بیٹھے تو آپؐ جانتے تھے کہ آپؐ نے مسلمانوں کی وفاداری اور اطاعت گزاری کو آخری حد تک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ کیا وہ بیعت رضوان پر کاربند رہیں گے یا بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے؟ مسلمانوں نے جب معاہدے کے اصل الفاظ سنے تو صورت حال مزید گھمبیر ہوگئی۔ حضورؐ نے صلح نامہ لکھنے کے لیے حضرت علیؓ کو بلایا اور جب انہوں نے مسلمانوں کی روایت کے مطابق تحریر کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا تو سہیل نے فوراً اس پر اعتراض کیا۔ قریش کو اس قسم کے مقدس القابات سے ہمیشہ نفرت تھی چنانچہ سہیل نے کہا: ''میں نہیں جانتا بلکہ لکھو باسمک اللھم (اے اللہ تیرے نام سے)'' حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوری طور پر رضامند ہو گئے اور جب آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ یہی الفاظ لکھ دیں تو اس سے مسلمانوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بدترین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت حال پیش آنے والی تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے بعد یہ لکھوایا: "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سہیل بن عمرو سے صلح کی۔" سہیل نے ان الفاظ پر پھر اعتراض کیا، کہنے لگا: "اگر میں اس بات کا اقرار کرتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ سے جنگ کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیے۔" حضرت علیؓ "اللہ کے رسول" کے الفاظ پہلے لکھ چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان لفظوں کو عبارت سے نہیں کاٹ سکتے چنانچہ آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ چرمی کاغذ پر لکھے گئے ان الفاظ کی نشان دہی کر دیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے ان لفظوں کو خود اپنے دست مبارک سے کاٹ کر یہ الفاظ لکھوا دیے: "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد ابن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی۔"

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۷۷ The Life of Muhammad. P. 504)۔

رسول اللہؐ اور سہیل یہ معاہدہ لکھ ہی رہے تھے کہ ابو جندلؓ بن سہیل بن عمرو پابہ زنجیر قیدی کی چال چلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے جس سے صورت حال انتہائی تشویشناک ہوگئی۔ ابو جندلؓ مسلمان ہو گئے تھے اور سہیل نے انہیں اپنے مکان میں قید کر رکھا تھا تاکہ وہ حضورؐ کے ساتھ نہ آملیں تاہم ابو جندلؓ فرار ہو کر اس حال میں حدیبیہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر سہیل نے کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کے منہ پر طمانچہ مار دیا اور ان کا گلا پکڑ لیا۔ پھر اس نے حضورؐ سے کہا: "محمد! معاملہ میرے اور تمہارے درمیان طے ہو چکا ہے، اس سے پہلے کہ یہ (ابو جندلؓ) تمہارے پاس آئے۔" مسلمان حیرت زدہ آنکھوں سے ابو جندلؓ کو دیکھنے لگے۔ یہ بات یقینی تھی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابو جندلؓ کو دھوکا دینے والے نہیں تھے اور نہ ہی انہیں باپ کے حوالے کرنے والے تھے کہ وہ ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کریں۔ لیکن حضورؐ معاہدے پر سختی سے قائم رہے اور آپؐ نے ابو جندلؓ کو باپ کی رضامندی کے بغیر ہجرت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جب سہیل نے ابو جندلؓ کو واپس مکہ لے جانے کے لیے کھینچا تانی شروع کی تو ابو جندلؓ نے بلند آواز میں چیختے ہوئے کہا: "اے مسلمانو! کیا میں مشرکوں کی طرف واپس جا سکتا ہوں جو میرے دین کو برباد کر دیں گے۔؟" جیسا کہ محمد ابن اسحاق نے کلاسیکی انداز میں بیان کیا ہے: "اس واقعے سے مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا تاہم حضورؐ نے جب یہ فرمایا تو صحابہ کرامؓ کی قدرے تسکین ہوئی: "ابو جندل! صبر سے کام لو اور ثواب کا خیال رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور ان کمزور مسلمانوں کے لیے، جو تمہارے ساتھ ہیں، کشادگی کا راستہ پیدا کر دے گا۔ ہم نے اپنے اور اس قوم کے درمیان صلح کا معاہدہ کر لیا ہے اور اس پر ہم نے بھی اور انہوں نے بھی اللہ سے عہد کر لیا ہے۔ ہم یہ عہد کسی طرح بھی توڑنے کے لیے تیار نہیں۔"

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۴۷۸ The Life of Muhammad. P. 505)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عمرؓ کے لیے یہ آخری تنکا تھا جس کے بعد ان کی ہمت اور برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے فوراً کھڑے ہوکر اس شخصیت کو چیلنج کرنے کی جسارت کردی جس کی وہ پچھلے بارہ برسوں سے کامل اطاعت کررہے تھے: ''کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا مسلمان حق پر اور مشرک گمراہ نہیں؟ پھر ہمارے دین کے معاملے میں ہمیں کس بنا پر ذلت دی جارہی ہے؟ مسلمانوں کو یہ اہانت آمیز صلح کیوں کرنا پڑی ہے۔؟ کیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چند روز قبل مدینہ سے روانگی کے وقت مسلمانوں سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر کعبے میں خدا کی عبادت کریں گے؟'' حضورؐ نے اعتراف کیا کہ آپؐ نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''لیکن کیا میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اسی سال خانہ کعبہ میں عبادت کریں گے؟'' اس پر حضرت عمرؓ کو تسلیم کرنا پڑا کہ حضورؐ نے مسلمانوں سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر رسول کریمؐ نے فرمایا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کسی طرح نہیں کرسکتا اور وہ مجھے کسی طرح ضائع نہیں کرے گا۔'' (Lings: Muhammad P. 254)۔ حضرت عمرؓ نے، اس کے باوجود کہ ان کی مکمل تسلی نہیں ہوئی تھی، علیؓ، ابوبکرؓ، عبدالرحمٰنؓ، عبداللہؓ بن سہیل (ابوجندل کے بھائی) اور محمدؓ ابن مسلمہ کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کردیے۔

لیکن مدینہ سے آنے والے عازمین اب بھی بغاوت پر آمادہ تھے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ صلح نامے پر دستخط کرنے کے بعد رسول اللہؐ نے بلند آواز سے فرمایا کہ خانہ کعبہ میں داخل نہ ہونے کے باوجود آپؐ حدیبیہ میں ہی مناسک حج ادا کریں گے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو سر کے بال منڈوانے اور قربانی کے لیے لائے جانے والے ستر اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ ہر طرف کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تمام دل گرفتہ صحابہؓ آں حضرتؐ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حضورؐ مایوس ہوکر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ آپؐ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر اس نازک لمحے میں آپؐ عازمین کی امداد اور حمایت سے محروم ہوگئے تو ہر چیز کھو جائے گی۔ اب آپؐ کو کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا جو سرخ چمڑے کے خیمے سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے حالات کا پوری طرح جائزہ لے لیا تھا چنانچہ انہوں نے رسول اللہؐ کو مشورہ دیا کہ آپؐ ایک مرتبہ پھر ان لوگوں کے پاس جائیں اور جب تک سب لوگ اپنے اپنے اونٹوں کی قربانی نہیں دے دیتے، اس وقت تک کسی سے گفتگو نہ کریں۔ یہ بالکل درست فیصلہ تھا۔ اس کے بعد آں حضرتؐ اپنے خیمے سے باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھے بغیر اس اونٹ کے پاس پہنچے جو قربانی کے لیے مخصوص تھا۔ یہ ایک مقدس رسم تھی جس سے تمام عرب واقف تھے۔ لیکن یہ قدیم رسم کی خلاف ورزی اور ایک آزادانہ اقدام تھا کیونکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ سے باہر قربانی دے کر پرانی روایت کو توڑ رہے تھے۔ اس قربانی نے خاموش ہجوم کو مایوسی اور غم کی تاریکیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے باہر نکالنے میں موثر کردار ادا کیا، اس سے مسلمانوں کی دل جوئی ہوئی اور ماحول میں پائی جانے والی کشیدگی ختم ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد تمام صحابہؓ اپنے اپنے اونٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ ان سب لوگوں نے عربوں کی قدیم رسم کے مطابق بلند آواز سے بسم اللہ اور اللہ اکبر کہتے ہوئے اونٹوں کی قربانی دی۔ حضورؐ نے جب ایک انصاری کو اپنے پاس بلا کر سر کے بال منڈوانے کا حکم دیا تو تمام صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کے لیے دوسروں پر سبقت لے جانے کی غرض سے ایک دوسرے پر گر پڑے۔ ان میں اس قدر جوش وخروش پایا جاتا تھا کہ حضرت ام سلمہؓ بعد میں اس واقعے کو یاد کر کے فرمایا کرتی تھیں: ''مجھے ڈر محسوس ہوا کہ وہ اسی جوش وخروش میں مہلک زخم نہ لگوا بیٹھیں۔'' ایک روایت کے مطابق جیسے ہی مسلمانوں نے حدیبیہ کا میدان چھوڑا، ایک ہوا اچانک پہاڑ سے آئی اور سیاہ بالوں کو اڑا کر مکہ لے گئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانی کو قبول کر لیا ہے۔

مسلمان واپس مدینہ روانہ ہوئے تو ماحول میں قدرے تلخی موجود تھی اور حضورؐ کو یہ احساس تھا کہ اس نئے معاہدے کی پاسداری کی خاطر آپؐ کو ایک نئی مہم کا آغاز کرنا پڑے گا کہ صلح کا معاہدہ خطرے میں نہ پڑے۔ اس معاہدے کے بارے میں بھی آپؐ کے ذہن میں کئی تحفظات موجود تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کو یقینی توقع تھی کہ آپؐ اس مشکل معاہدے پر دستخط کیے بغیر مکہ میں داخل ہو جائیں گے۔ واپسی کے سفر کے دوران آپؐ لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر آئندہ کے لائحہ عمل پر غور وخوض کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ ڈر تھا کہ ان کے باغیانہ رویے اور سرکشی کی وجہ سے نبی کریمؐ کے ساتھ ان کی دوستی کو مستقل نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کی عاقبت نااندیشی کے باعث ان کی سرزنش کے لیے خدا کی طرف سے وحی بھی نازل ہو سکتی ہے۔ جب حضورؐ نے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ بدترین اندیشوں میں گھر گئے۔ اچانک ایک ایلچی نے حضرت عمرؓ کے پاس آ کر کہا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں بلایا ہے۔ اس سے ان کا دل ڈوب گیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ آں حضرتؐ کا چہرہ مبارک خوشی سے دمک رہا ہے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ ان کے کندھوں سے اتر گیا ہے۔ ''مجھ پر خدا کی طرف سے ایک سورت نازل ہوئی ہے''۔ حضورؐ نے اعلان کیا: ''اور یہ سورت مجھے اس سورج کے نیچے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔'' (Lings: Muhammad. P. 255)۔ قرآن کریم کی ۴۸ویں سورت الفتح میں حدیبیہ میں پیش آنے والے تمام واقعات کی مکمل اہمیت اور حق کے لیے جنگ کے فلسفے کی واضح تشریح کی گئی ہے۔ مغرب کے نکتہ چیں جہاد کے حوالے سے اسلام کو ایک جارح مذہب قرار دے کر اس پر تنقید کرتے ہیں تو انہیں رسول عربیؐ کی امن کی ان اخلاقیات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جو آپؐ پر اس وقت نازل ہوئیں جب آپؐ جنگ سے تباہ حال عرب پر امن کے اسلامی فلسفے کو عملاً نافذ کر رہے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پچھلے ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے برعکس پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت میں کئی حوالوں سے متنوع، متضاد اور گوناگوں اوصاف نمایاں نظر آتے ہیں لیکن آپؐ کا پیغام، جس کا عیسائیوں کو صحیح ادراک نہیں، عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی تعلیمات کو زیادہ عملی شکل میں نافذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن کا اس زمانے کی مخصوص سیاسی اور سماجی صورت حال سے گہرا تعلق تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم حضرت عیسیٰؑ کے سیاسی رویے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ عیسیٰؑ کو رومیوں نے ایک بغاوت کے الزام میں مصلوب کیا تھا۔ انجیل مقدس کے بعض عالم یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں نے ایک گرجا گھر میں ساہوکاروں کے خلاف بغاوت کی اور تین دن اس گرجے پر قابض رہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام صلح اور امن کے پیغام کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال کر دینے کا فلسفہ پیش کیا، زبان تک سے اپنا دفاع کرنے سے انکار کیا اور تلوار کے زور پر حکمرانی کرنے والوں کی مذمت کرتے رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بظاہر شکست اور تذلیل سے ان کے حواری حواس باختہ ہو گئے اور ان میں سے بیشتر لوگ مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ حدیبیہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غیر متوقع صورت حال میں منفرد طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا دوسرا گال قریش کے سامنے کر دیا اور بظاہر ذلت برداشت کر لی جس کے نتیجے میں آپؐ کے بے حد قریبی ساتھی ناراض ہو گئے، آپؐ نے ان کی بغاوت کا خطرہ مول لے لیا تاہم جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد سینٹ پال جیسے مصنفوں نے صلیب پر چڑھائے جانے کے واقعے کی اہمیت پر روشنی ڈالی، ٹھیک اسی طرح سورہ الفتح میں مسلمانوں کو بظاہر شکست کے عمیق مطالب اور منشا سے آگاہ کیا گیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بظاہر دکھائی دینے والی شکست حقیقت میں آپؐ کی شکست نہیں تھی:

بے شک (اے نبیؐ) ہم نے آپؐ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے
تا کہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے ہوئے
سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور تجھ پر اپنا احسان پورا کرے
اور تجھے سیدھی راہ چلائے
اور آپؐ کو ایک زبردست مدد دے (سورہ الفتح، آیات ۱ تا ۳)

بدر میں اللہ تعالیٰ کی ذات جنگ کے دوران جلوہ افروز تھی اور خدا کی موجودگی مسلمانوں کے لیے فتح و نصرت اور نجات کا باعث تھی، اسی طرح حدیبیہ میں بھی جب مسلمانوں کو بظاہر ہزیمت اٹھانا پڑی، اس وقت بھی ذات خداوندی کی تائید و حمایت حضورؐ کے شامل حال تھی چنانچہ اس نے امن اور صلح کے جوہر سکینہ کو آپؐ پر نازل کیا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور اطمینان ڈال دیا
تا کہ اپنے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں
اور آسمانوں اور زمین کے کل لشکر اللہ ہی کے ہیں
اور اللہ تعالیٰ دانا اور باحکمت ہے (سورہ الفتح آیت ۴)

اس سے پہلے خدا نے اس وقت بھی رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ پر سکینہ نازل کیا تھا جب وہ اپنے قرابتداروں سے کامل مایوسی کے بعد مکہ کے قریب تین دن تک ایک غار میں چھپے رہے تھے اور قریش آپؐ کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں پہلے بھی سکینہ کا لفظ آ چکا ہے جو عبرانی زبان کے لفظ شکینہ کے ہم معنی لگتا ہے اور جس کا مطلب دنیا میں اللہ تعالیٰ کی موجودگی ہے۔ چنانچہ بدر اور حدیبیہ کے دونوں واقعات نجات کی علامت اور اس حقیقت کا پرتو ہیں کہ خدا کی ذات ان تاریخی واقعات کے دوران پراسرار طور پر موجود تھی۔ جس طرح خدا جنگ میں مسلمانوں کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا، اسی طرح وہ امن کوششوں کے دوران بھی پوری طرح فعال اور سرگرم تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے حدیبیہ میں بھی مسلمانوں کی شکست کو فتح مبین میں تبدیل کر دیا۔

سورہ الفتح میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ جب نہتے مسلمان خانہ کعبہ کے طواف کی غرض سے ایک خطرناک مہم پر مکہ روانہ ہوئے تھے تو ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت موجود تھی۔ دوسری طرف خانہ بدوش قبائل نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا جو حضورؐ کے لیے غیر متوقع بات تھی۔ (دیہاتیوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ اب تجھ سے کہیں گے کہ ہم اپنے مال اور بال بچوں میں لگے رہے ہیں پس آپؐ ہمارے لیے مغفرت طلب کیجیے۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ آپؐ جواب دیجئے کہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا بھی اختیار کون رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو یا تمہیں کوئی نفع دینا چاہے تو، بلکہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے اللہ خوب باخبر ہے۔ (سورہ الفتح آیت ۱۱......مترجم)۔

صحابہ کرامؓ نے اپنے جذبہ ایمانی کا دوسری مرتبہ اس وقت اظہار کیا جب انہوں نے ببول کے درخت کے نیچے بیعت رضوان کے دوران حضورؐ سے عہد و پیمان باندھا تھا۔ قریش اگر ان پر حملہ آور ہوتے تو ان کا صفایا کر سکتے تھے لیکن صحابہؓ نے اہانت آمیز مایوسی کے گہرے سائے کے باوجود آخر دم تک نبی کریمؐ کا ساتھ دینے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ حدیبیہ میں بالآخر صلح کا جو معاہدہ ہوا، وہ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھا اور مسلمانوں کو اس کے ظاہری مطالب سے ہٹ کر اس کے حقیقی معنیٰ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی:

اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت ساری غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے
پس یہ تو تمہیں جلد ہی عطا فرما دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاکہ مومنوں کے لیے یہ ایک نشانی ہو جائے اور (تاکہ) وہ تمہیں سیدھی راہ چلائے (سورہ الفتح آیت ۲۰ ..... مترجم)

بدر میں فتح ایک فرقان تھی جس نے میدان جنگ میں حق کو باطل سے الگ کر دیا تھا، اسی طرح حدیبیہ میں فتح نے اہل ایمان اور کفار کے درمیان حد فاصل کھینچ دی تھی:

جب کہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت کو جگہ دی اور
حمیت بھی جاہلیت کی، سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر
اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقوے کی بات پر جمائے رکھا
اور وہ اس کے اہل اور زیادہ مستحق تھے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (سورہ الفتح آیت ۲۶)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ایسی ناگزیر صورت حال سے دوچار تھے جس میں سیاسی اعتبار سے تخلیقی عمل کی ضرورت تھی۔ آپؐ کو گہرے وجدان کی بدولت عرب میں رونما ہونے والی حرکی تبدیلیوں کا مکمل ادراک تھا اور حالات نے جو رخ اختیار کیا، اس سے آپؐ کی داخلی بصیرت کی تائید ہو گئی تھی۔ اب جب کہ حضورؐ نے امت مسلمہ کو تباہی کے خطرے سے بچا لیا تھا، جہاد امن کی ان کوششوں میں تبدیل ہو گیا جو صبر و تحمل اور ہنرمندی کی متقاضی تھیں۔ چنانچہ بدر اور حدیبیہ ایک ہی سکے کے دو رخ اور قرآنی حکمت کے اہم جزو ہیں۔ اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے بعض اوقات جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اور جب جنگ ہو رہی ہو تو مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ پورے استقلال اور قوت کے ساتھ لڑیں اور کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہ کریں تاکہ جارحیت کا فوری طور پر سدباب ہو سکے اور مزید خون خرابے اور لڑائی کا سلسلہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ لیکن ایک دور امن کا بھی ہوتا ہے اور اگرچہ اس میں بظاہر نقصان اٹھانا پڑتا ہے لیکن آخر کار اس سے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اسلام مکمل انتہا پسندی اور تشدد کا پرچار کرتا ہے اور اس میں بلاوجہ مذہبی جنون اور تعصب کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم میں جنگ اور امن دونوں کے لیے ایک جامع نظریہ پیش کیا گیا ہے جسے قبول کرنا بیشتر عیسائیوں کے لیے بہت مشکل ہے۔

لیکن حدیبیہ کا تقاضا تھا کہ مسلمان جذبہ ایمان سے سرشار ہوں جیسا کہ قرآن میں اس کی مکمل صراحت کی گئی ہے۔ اگر نبی کریمؐ کا مذہبی وژن اعلیٰ اور برتر نہ ہوتا تو آپ صحابہ کرامؓ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ مسلمانوں کی اکثریت اگر فوری طور پر سیاسی فتح حاصل کرنے کی آرزومند ہوتی تو وہ حضورؐ پر مکمل اعتماد کا اظہار نہ کرتی۔ سورہ الفتح کے آخر میں مسلم برادری کی ایسی صاف و شفاف اور پرسکون منظر کشی کی گئی ہے جس میں مسلمان ایک ایسے دینی جذبے سے سرشار اور اعلیٰ اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں جو اسلام سے پہلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہودیت اور دین عیسوی کی الہامی کتابوں تورات اور انجیل میں بیان کی گئی تھیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں، تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ مثل اس کھیتی کے جس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ (سورۃ الفتح، آیت ۲۹)۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس تقوے اور پرہیز گاری کا انداز جارحانہ ہے اور اس کا مطمح نظر کافروں اور مشرکوں کو بھڑکانا اور انہیں غصہ دلانا ہے۔ لیکن دنیا کے تینوں توحید پرست ادیان میں مذہبی احکامات کے حوالے سے روگردانی کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی دوسرے کو کوئی رعایت دی جاسکتی ہے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ وہ امن قائم کرنے کے لیے نہیں، تلوار کے لیے آئے ہیں۔ (Mathew, 10: 34-36)۔ اس ضمن میں انجیل میں بعض جگہوں پر حضرت عیسیٰؑ کا جو سراپا بیان کیا گیا ہے، وہ اس رحمدل انسان سے بالکل مختلف ہے جو ہمارے ذہنوں میں ان کے بارے میں موجود ہے۔

مسلم امہ کی نشوونما اور دوسری اہل کتاب قوموں کے درمیان مقام پانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اپنی جانب راغب کرتے۔ اس معاملے میں رسول کریمؐ کی صلح کی نئی حکمت عملی فوری طور پر مفید اور کارگر ثابت ہوئی کیونکہ صلح نامے کی بدولت پرسکون ماحول میسر آیا جس سے مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان بحث ومباحثے اور تبادلہ خیالات کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ محمد ابن اسحاق نے حدیبیہ کی عظیم فتح کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام کو اتنی بڑی فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جہاں بھی لوگ ایک دوسرے سے دوچار ہوتے تھے، جنگ ہو کر رہتی تھی لیکن جب یہ مصالحت ہوئی، جنگ روک دی گئی، لوگ ایک دوسرے سے مامون ہو گئے اور میل ملاپ کرنے لگے۔ باہم گفت وشنید اور تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام کے بارے میں بات کرتا اور اس کی سمجھ میں کوئی چیز آجاتی تو وہ اسلام میں داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی جو تعداد تھی، اس کے برابر یا اس سے بھی زیادہ لوگ ان دو برسوں (۶۲۸ سے ۶۳۰ عیسوی) میں داخل اسلام ہوئے۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۷۵۱: The Life of Muhammad P. 507)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدیبیہ میں یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کی جڑیں عربوں کی حد درجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدس روایات میں پیوست ہیں۔ اس کے علاوہ عرب میں حضورؐ کو جس تیزی کے ساتھ اعلیٰ مقام حاصل ہوا، اس سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ آپ کا دین اثر کر گیا ہے۔ عرب لوگ مذہب کے معاملے میں جنونی نہیں تھے تاہم صحرا کی سخت کوش زندگی نے انہیں بے حد عملیت پسند بنا دیا تھا۔ جب انہوں نے امت مسلمہ کی عملی کامیابی کا مشاہدہ کیا تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ یہی وہ ممکنہ تبدیلی ہے جس کو لوگ طویل عرصے سے تلاش کر رہے تھے۔

لیکن معاہدہ حدیبیہ کی رو سے حضورؐ اس بات کے پابند تھے کہ جو شخص اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کرے، اسے مکہ والوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ اب آپؐ نے خود کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دینے کے لیے تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ مثال کے طور پر معاہدے میں مسلمان ہونے والی خواتین کی واپسی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تھا چنانچہ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد جب حضرت عثمانؓ کی سوتیلی بہن (حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ..... مترجم) ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں تو آں حضرتؐ نے انہیں واپس مکہ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے کے بعد خواتین کو مدینہ ہجرت کی اجازت مل گئی البتہ اگر وہ اپنے سرپرست کی مرضی کے خلاف ہجرت کرتیں تو رسول اللہؐ ان کا جہیز قریش کو واپس کر دیتے۔ تقریباً اسی وقت ایک پرعزم نومسلم مرد ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا۔ ابوبصیرؓ ابن اسید، جو قبیلہ بنی زہرہ کے حلیف تھے، اپنے سرپرستوں اور محافظوں کو جل دے کر مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ قریش نے ابوبصیرؓ کو واپس لانے کے لیے اپنے ایک ایلچی کو ایک غلام کے ہمراہ مدینہ بھیج دیا۔ حضورؐ نے نہایت تاسف کے ساتھ ابوبصیرؓ کو بتایا کہ آپؐ کے پاس انہیں واپس مکہ بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن حضرت ابوبصیرؓ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ جب یہ تینوں افراد مکہ جاتے ہوئے مدینہ کے جنوب میں کوئی آٹھ میل دور ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابوبصیرؓ نے ایلچی کی تلوار پکڑ لی اور اسے قتل کر دیا۔ آزاد غلام تیزی سے بھاگتا ہوا واپس مدینہ پہنچ کر رسول اللہؐ کے قدموں میں گر پڑا اور آپؐ کو یہ خوفناک خبر سنا دی۔ ابھی یہ مولی حضورؐ کے پاس تھا کہ ابوبصیرؓ بھی وہاں پہنچ گئے اور کہا: "یا رسول اللہؐ! آپ کی ذمے داری پوری ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپؐ کی طرف سے واجب تھا، ادا کر دیا۔ میں اپنے دین کے متعلق فتنے میں پڑنے سے بچ گیا ہوں۔" چونکہ حضرت ابوبصیرؓ ہجرت نہیں کر سکے تھے اس لیے فنی لحاظ سے وہ مسلمان نہیں تھے چنانچہ رسول اللہؐ پر اس ایلچی کے خون کی ذمے داری عاید نہیں ہوتی تھی۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر بھی ابوبصیرؓ کو مسلم امہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ حضورؐ نے ابوبصیرؓ کو اس مولی کے حوالے کرنے کی کوشش کی جو دو سو میل تک ابوبصیرؓ کے ساتھ تنہا سفر کرنے کے خیال سے لرزاں و ترساں تھا۔ چنانچہ اس مولی نے آں حضرتؐ سے معذرت کر لی اور تیزی کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کے بعد آں حضرتؐ نے ابوبصیرؓ کو بتایا کہ اگرچہ وہ مدینہ میں قیام نہیں کر سکتے لیکن انہیں یہ اجازت ہے کہ وہ جہاں جانا چاہیں، جا سکتے ہیں۔ جب ابوبصیرؓ چلے گئے تو رسول اللہؐ نے مبہم انداز میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا: ''کیا شعلہ صفت شخص ہے! اگر اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے تو جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی۔''
(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ ﷺ صفحہ ۷۵۲ The Life of Muhammad, P. 507)۔

حضرت ابوبصیرؓ نبی کریمؐ کا عندیہ سمجھ گئے اور بحیرہ احمر پر العیص کے مقام پر چلے گئے۔ العیص قریش کے اس تجارتی راستے پر، جس سے ہوکر وہ شام جاتے تھے، سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے اور صلح حدیبیہ کے بعد قریش اس راستے کو دوبارہ استعمال کر سکتے تھے۔ اس واقعے کی خبر حضورؐ کے مبہم الفاظ کے ساتھ مکہ پہنچ گئی اور ابوجندلؓ ابن سہیل جیسے لوگوں نے، جو ہجرت کے لیے بے چین تھے، اسے نہایت اشتیاق کے ساتھ سنا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ان مسلمانوں کے محافظ اور نگران سست پڑ گئے تھے چنانچہ ستر کے قریب نوجوان مسلمان مکہ سے فرار ہوکر مدینہ میں رسول اللہؐ کے پاس جانے کے بجائے ابوبصیرؓ کے پاس العیص پہنچ گئے۔ حدیبیہ کے معاہدے میں ایسے کسی اقدام کی ممانعت نہیں کی گئی تھی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نوجوان امت مسلمہ کا رکن نہیں تھا۔ ان لوگوں نے راستے میں ناکے کھڑے کر کے قریش کی تجارتی شاہراہ کے ذریعے شام جانے والے ہر قافلے پر حملے شروع کر دیے۔ ان نوجوانوں کے ضمن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کوئی ذمے داری عاید نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی آپؐ پر معاہدہ توڑنے کا الزام لگایا جا سکتا تھا تاہم قریش پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ پرانی تجارتی ناکہ بندی جزوی طور پر پھر بحال ہوگئی ہے۔ شکست کے بعد قریش کا وقار اس قدر گر گیا تھا کہ اگر وہ ان نوجوان مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی فوج روانہ کرتے تو علاقے میں رہنے والے خانہ بدوش اس فوج کی کوئی امداد نہ کرتے۔ آخر قریش کو حضورؐ سے یہ درخواست کرنا پڑی کہ آپؐ ان نوجوانوں کو امت میں شامل کر کے انہیں اس خطرے سے نجات دلائیں۔ نبی کریمؐ نے ان مسلمانوں کو بخوشی مدینہ بلانے کے لیے انہیں پیغام بھیج دیا لیکن یہ پیغام بڑی دیر سے پہنچا اور حضرت ابوبصیرؓ اس سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

آں حضرتؐ اس معاہدے کی شقوں سے فنی بنیادوں پر فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ عرب میں یہ عام دستور تھا اور ہم دیکھیں گے کہ قریش نے بھی ایک سال کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جدوجہد میں اسی قسم کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ عرب کے ایک ماہر سیاست دان کی حیثیت سے حضورؐ قبائلی نظام کے قوانین کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے البتہ ایک ماڈرن مغربی باشندے کے لیے ممکن ہے کہ یہ چیز ناقابل قبول ہو کیونکہ آج مغرب کے لوگوں کی نظر میں قبائلی ضابطہ اخلاق ظلم اور جبر پر مبنی تھا چنانچہ وہ حضورؐ کی طرف سے اس ضابطے پر کاربند رہنے کو پسند نہیں کرتے۔ ہم طویل عرصے تک قبائلی یا گروہی اخلاقی ضابطوں کا مشاہدہ کر چکے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم زمانوں میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے یہ نظام بہت موثر ثابت ہوا تھا۔ عرب میں صدیوں سے یہ نظام کامیابی کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چل رہا تھا لیکن اب اس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح اس نظام سے گہری وابستگی رکھتے اور اس کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانے میں سیاست اور سماجی تحفظ کا یہ واحد نظام تھا جس کا آپؐ تصور کر سکتے تھے۔ اس عبوری دور میں کوئی انقلابی تبدیلی لانا ممکن نہیں تھا۔ حضرت ابو بصیرؓ کے معاملے میں حضورؐ نے امت مسلمہ کو، جو شکست و ریخت کا شکار ہونے والے سسٹم میں اصلاح کرنے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جدو جہد کر رہی تھی، مستحکم کرنے کے لیے قبائلی قانون کے ایک عمدہ نکتے کو اپنے حق میں استعمال کیا تھا۔

قرآن کریم کی معاشرتی قانون سازی میں بھی حضورؐ نے قبائلی نظام کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا تھا۔ قرآن نے بدلہ لینے کے عمل کو ایک اعلیٰ صفت اور سماجی اور مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ظالم سے انتقام لیں، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ (عقلمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے۔ سورہ البقرہ آیت ۱۷۹...... مترجم)۔ کوہ زیتون کے واعظ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تعلیمات کو سن کر پرورش پانے والوں کے لیے اس صورت حال کو قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نفرت کرتے اور اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن حکیم جیسی مقدس کتاب میں ایسی سخت سزا کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انتقام کو خلاف قانون قرار دے کر عفو و درگزر کے پیغام کی تبلیغ کیوں نہیں کی تھی؟ لیکن ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جس طرح حدیبیہ کے بعد آں حضرتؐ ایک ریاست کے سربراہ بن گئے تھے، اس طرح حضرت عیسیٰؑ کسی ملک کے حکمران نہیں تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو امن و امان برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ یہ مذہبی ادارے کا فریضہ تھا جس پر حضرت عیسیٰؑ دشنام طرازی کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں یہ فرض روم کے سرکاری عہدیدار انجام دیتے تھے۔ اگر عیسیٰؑ سماجی قوانین وضع کرنے کے ذمے دار ہوتے تو انہیں بھی یقیناً اسی قسم کے سخت قوانین نافذ کرنا پڑتے کیونکہ بہت سے قدیم معاشروں میں ایسی سخت سزائیں لاگو کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی جنہیں آج ہم وحشت ناک تصور کرتے ہیں۔ خود برطانیہ میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک چور کے ہاتھ کاٹنے پر ہی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ معمولی جرائم کے مرتکب افراد کو یا تو قتل کر دیا جاتا یا انہیں غلام بنا کر برطانوی نوآبادیوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے کہ کچھ اسلامی ملکوں میں اب بھی پرانی سزائیں دی جاتی ہیں لیکن اس معاملے میں قرآن اور اسلامی روایات کو وحشیانہ قرار دے کر انہیں داغدار کرنا یقیناً ناانصافی ہے۔ اس جانب اشارہ کیا جاتا ہے کہ مستقبل کے مسلمان حکمران بڑے معاشروں میں ان قرآنی احکام کو موثر طور پر نافذ کرنے کی اجازت دینے کے متحمل نہیں ہو سکیں گے اور سماجی تحفظ کے اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنانے کے لیے انہیں نئے قوانین وضع کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑیں گے۔(Marshal G. S. Hodgson: The Venture of Islam. vol i, P. 339)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امت کو ایک برتر قبیلے کے طور پر دیکھتے تھے اور معاشرتی نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے آپؐ پرانے قوانین پر بدستور کاربند رہے۔ مدینہ یا عرب میں کوئی پولیس فورس موجود نہیں تھی اور ایک نامعلوم زمانے سے صرف وہی لواحقین مجرم کو سزا دینے کے ذمے دار سمجھے جاتے تھے جو ممکنہ تشدد کی روک تھام کے لیے تعذیبی نظام وضع کر سکتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس سسٹم کو برقرار رکھا اور رشتے داروں اور عزیز واقارب کو حکم دیا کہ وہ مقتول کا بدلہ لینے کے ضمن میں اپنا فرض پورا کریں۔ (اور کسی جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے، ہرگز ناحق قتل نہ کرنا اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے، ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے پس اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۳.....مترجم)۔

اسلام میں قصاص یا بدلہ لینے کے نظام کو سخت پابندی سے منسلک کر دیا گیا ہے اور ایک آنکھ کے بدلے میں صرف ایک آنکھ اور ایک دانت کے عوض صرف ایک دانت کا بدلہ لیا جا سکتا ہے ورنہ زیادتی کی صورت میں سزا پانے والا شخص مظلوم قرار پائے گا اور مدد کا مستحق بھی۔ اس کا وارث اسے ''نصر'' دے گا اور اس طرح جارحیت کا ایک نیا سلسلہ چل پڑے گا اور ایک نہ رکنے والے خون خرابے کا آغاز ہو جائے گا۔ اصل میں قرآن کریم میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ قصاص کے دوران مجرم کو اصل سے بھی کم سزا دینے پر اکتفا کیا جائے اور یہ ایک مستحسن عمل ہے۔ قرآن مجید میں ان قوانین اور ضابطوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے عبرانی پیغمبروں کو تورات کے ذریعے بھیجے تھے اور جن کی بعد میں آنے والے علما اور یہودی ربی توثیق کرتے رہے ہیں۔ قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فرماتا ہے:

اور ہم نے یہودیوں کے ذمے تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ
جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ
اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان
اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے
پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے
اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں، وہی لوگ ظالم ہیں (سورہ المائدہ آیت ۴۵)

حضرت عیسیٰؑ نے تورات کے ان لفظوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے پیروکاروں سے یہ کہا کہ وہ اپنے دشمنوں کو پیار کریں۔ وہ ایک تیز فہم شخص تھے اور ان کے اس قول متناقض میں ایک گہری مگر پیچیدہ مذہبی بصیرت مضمر تھی جس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریح کرنا آسان نہیں۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عیسیٰ کی حد تک آگے نہیں گئے۔ جب حضورؐ نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ایک دوسرے کو معاف کر دیا کریں اور انتقام لینے سے گریز کریں تو غالباً آپؐ مسلمانوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک اور جان لینے کے بجائے دیت قبول کرلیں۔ عفو و درگزر کا یہ تصور، خواہ کتنے ہی محدود پیرائے میں کیوں نہ ہو، عرب میں بالکل نیا تھا جس سے پرانے نظام میں اخلاقی پیش رفت کی عکاسی ہوتی ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ عیسائیت محبت کا مذہب جب کہ اسلام سماجی انصاف کا دین ہے۔ مسیحیت کے پیروکار ہمسائے سے محبت کرنے کو سچے دین کا امتحان سمجھتے ہیں لیکن قرآن حکیم میں حقیقی دینی روح کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ اگرچہ زیادہ خوش کن نہیں لیکن اس میں سراپا عمل کی تلقین کی گئی ہے:

ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے ہی میں نہیں
بلکہ حقیقتاً اچھا شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر،
کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت رکھنے کے باوجود
قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے
غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے
جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تنگ دستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے
یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں (سورۃ البقرہ آیت ۱۷۷)

اسلامی معاشرے کی بنیاد مساوات کے اصول پر رکھی گئی جس میں ہر شخص پر یکساں فرائض عاید ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں طبقہ امرا، مبلغوں اور راہبوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو ختم کرنے کے لیے خدا کی راہ میں صدقہ و خیرات دینے کی تاکید کی گئی تھی اور کسی غلام کو آزاد کرنا ایک مستحسن اقدام قرار دیا گیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر غلامی کو ختم نہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے لیکن یہ ایک غلط فیصلہ ہے۔ عہد نامہ جدید کے مصنفوں نے بھی اس مسئلے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے مساوات اور بھائی چارے کے اصول رائج کر کے جزیرہ نما عرب میں حملوں اور تشدد پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ غلامی میں بھی بڑی حد تک کمی کر دی تھی۔ اسلامی معاشرے میں ہر فرد کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کو اساسی اصول قرار دیا گیا اور انصاف اور برابری کے لیے قوانین نافذ کیے گئے۔ قرآن کے احکام اور بعد میں شرعی قوانین کے نفاذ سے مسلمانوں کو استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ یہ بھی سچ ہے کہ مساوات کی روح مشرق وسطیٰ کے معاشرے میں بہت پہلے سے کارفرما تھی اور اسلام نے اس جذبے کو مزید فروغ دیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد ایک اہم بدوی قبیلے کا سردار جبلہ مسلمان ہوگیا۔ ایک دن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امت مسلمہ کے ایک عام فرد نے اسے تھپڑ مار دیا۔ اسلامی اصولوں کی رو سے جبلہ کو دوسرا گال آگے کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اسے پوری توقع تھی کہ اس کی بلند حیثیت اور مرتبے کی وجہ سے اس مسلمان کو سخت سزا دی جائے گی۔ لیکن اسے صرف یہ بتایا گیا کہ وہ حملہ آور مسلمان سے بدلہ لینے کے لیے اس کے منہ پر تھپڑ مار سکتا ہے۔ یہ سن کر جبلہ اس قدر طیش میں آیا کہ وہ اسلام کو ترک کر کے دوبارہ عیسائی بن گیا۔

اسلام نے مساوات اور سماجی انصاف کے اصول رائج کر کے مسلمانوں میں اخوت کے جذبے کو عملاً فروغ دیا اور تمام اہل اسلام کو سماجی اور سیاسی اعتبار سے ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہجرت کے فوراً بعد مسلمانوں میں مواخات یعنی بھائی چارہ قائم کرنے کا دستور نافذ کیا جس کی رو سے ہر مہاجر کو کسی ایک انصاری کے ساتھ رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا گیا۔ آپؐ نے تمام مہاجرین اور انصار سے کہا کہ وہ بھائی بن جائیں۔ گویا ایک طرح سے یہ تینوں قبائلی گروپوں کو ایک متحد برادری میں ڈھالنے کی ایک کوشش اور خونی رشتوں سے ماورا ایک نئی مذہبی برادری کو عالم وجود میں لانے کا عملی مظاہرہ تھا۔ دنیا کے تینوں توحید پرست الہامی مذاہب میں امت کا تصور ایک اعلیٰ اور مقدس مقام کا حامل رہا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت دونوں مذہبوں میں اس تصور کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے کہ جہاں دو یا تین افراد اکٹھے ہوں وہاں خدا ان کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ سینٹ پال نے عیسائی برادری کو حضرت عیسیٰ کے جسم سے تشبیہ دی ہے اور ہم دیکھیں گے کہ امت مسلمہ کو مسلمانوں کے عقیدے میں ہمیشہ ایک مقدس اہمیت حاصل رہی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی آزادی کا نظریہ متعارف کرا رہے تھے اور آپؐ کی یہ کوششیں بارآور ثابت ہو رہی تھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں مقتول کے لواحقین کو صرف مجرم سے بدلہ لینے کا حکم دیا گیا نہ کہ پرانے سسٹم کے تحت ذمے دار قبیلے کے دوسرے افراد سے۔ (Watt: Muhammad in Medina P. 268)۔ لیکن امت مسلمہ میں برادری کے تصور کو فیصلہ کن اہمیت حاصل رہی اور تمام مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ اسلام کی جڑوں میں دور تک سرایت کر گیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے نظام کی بنیاد عربوں کے انسان دوستی کے پرانے قبائلی نظام ''مروہ'' پر رکھی تھی جو مشترکہ بہبود، تعاون اور غریبوں اور بے کسوں کی امداد پر مبنی تھا۔ حضورؐ نے اس میں یہ تنوع پیدا کیا کہ کسی ایک قبیلے کے بجائے پوری امت مسلمہ کے تمام مسلمانوں کو اس نظام میں شامل کر لیا۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ میں یہ احساس اجاگر کیا کہ مسلمان، خواہ ان کا تعلق اوس، خزرج یا قریش سے ہے، اب بھائی بھائی ہیں۔ اس طرح آں حضرتؐ نے مستقبل میں ایک منفرد اسلامی نظام سیاست کے لیے مضبوط بنیادیں استوار کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مغرب کی قومی ریاست کے اس نظریے کو موزوں نہیں سمجھتے جس سے امت انتشار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا شکار ہو کر جارح قبیلوں یا الگ الگ گروپوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

(William Fidelity Lancaster: The Gulf Crisis and Arab Disenchantment)

واقعہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے خود اپنے طرز عمل سے بھائی چارے کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ آپؐ کی ذات دشمنوں کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بنتی جا رہی تھی لیکن خود امت کے اندر آپؐ سے حد درجہ عقیدت اور محبت کی جاتی تھی جو چاروں طرف سے مسلسل خطرات میں گھرنے کے باوجود ایک مطمئن اور مسرور برادری تھی۔ رسول اللہؐ نے اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان حفظِ مراتب کی کوئی رسمی خلیج حائل نہ ہونے دی۔ آپؐ کو شاہانہ القابات اور تعریف و تحسین کے حامل خطابات سے نفرت تھی۔ حضورؐ اپنے صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں بے تکلفی سے زمین پر بیٹھ جاتے اور اکثر اوقات سب سے غریب مسلمانوں کی جماعت کے درمیان بیٹھنے کو ترجیح دیتے۔ بچے خاص طور پر آپؐ کی طرف کھنچے چلے آتے۔ آپؐ ہمیشہ بچوں کو اٹھائے اور انہیں پیار کرتے نظر آتے۔ آپؐ جب بھی کسی مہم سے واپس آتے تو امت کے بچے نخلستان سے باہر نکل کر آپؐ کا والہانہ استقبال کرتے اور فاتحانہ انداز سے جلوس کی قیادت کرتے۔ اگر حضورؐ جمعہ کی نماز کے دوران مسجد میں کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز کو لمبا کرنے کی نیت کے باوجود اسے جلد ختم کر دیتے۔ آپؐ سے اس بچے کی ماں کی بے قراری اور پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔

آج ہمیں قرآن مجید کے قوانین ظالمانہ دکھائی دیتے ہیں لیکن خود حضورؐ کی ذات اقدس بے حد مہربان، شفیق اور نرم برتاؤ کرنے والی تھی۔ ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ کسی غریب مسلمان سے معمولی خطا سرزد ہوئی تو آپؐ نے اسے سزا سنائی اور فرمایا کہ وہ اس لغزش کے کفارے کے لیے خیرات کرے۔ اس صحابیؓ نے عرض کیا کہ اس کے پاس خیرات کرنے کے لیے نہ تو کھانے پینے کی کوئی چیز ہے اور نہ ہی کوئی اور سامان۔ عین اسی وقت کھجوروں کا ایک بڑا ٹوکرا تحفے کے طور پر مسجد میں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ''آگے بڑھو!'' آں حضرتؐ نے اس مسلمان سے فرمایا اور اسے حکم دیا کہ وہ ان کھجوروں کو غریبوں میں تقسیم کر دے۔ اس پر غریب مسلمان کہنے لگا کہ وہ مدینہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو اس سے غریب ہو۔ رسول اللہؐ نے تبسم فرمایا اور اسے بتایا کہ ان کھجوروں کو کھانا ہی اس کی طرف سے کفارہ ہے۔

محبت اور اخوت کا فروغ شروع ہی سے اسلام کے پیغام کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں ہمیں اسلام کے قوانین انتہائی سخت دکھائی دیتے ہیں لیکن مسلمانوں میں تزکیہ نفس کے عمل کا آغاز ابتدائے اسلام سے ہی ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ ایک دن حضورؐ نے ایک آزاد کردہ غلام کو سخت مشقت کا کام کرتے دیکھا تو آپؐ چپکے سے اس کے پاس گئے اور بچوں کی طرح پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیے۔ اس غلام نے جواب میں کہا کہ یہ صرف نبی کریمؐ کی ذات گرامی ہو سکتی ہے جنہوں نے اس کا بوجھ ہلکا کرنے اور اس دن کو خوشگوار بنانے کے لیے اس کے ساتھ ایسا شفقت آمیز برتاؤ کیا ہے۔

ہم مغرب میں رہنے والے لوگ کئی صدیوں سے پیغمبر اسلامؐ کو ایک سنگدل انسان، ایک ظالم جنگجو اور بے رحم سیاست دان کی حیثیت سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپؐ بے حد رحم دل اور اعلیٰ اخلاق کی حامل مہربان شخصیت کے مالک تھے۔ آپؐ کو جانوروں سے محبت تھی اور اگر آپؐ کسی بلی کو اپنی چادر پر سوئے دیکھتے تو آپؐ اس کے آرام میں خلل ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ کسی بھی معاشرے کا ایک امتحان یہ ہے کہ جانوروں کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے؟ دنیا کے تمام مذاہب فطری دنیا سے محبت اور شفقت کا درس دیتے ہیں۔ حضورؐ نے بھی صحابہ کرامؓ کو یہی سبق دیا۔ عرب جاہلیت کے زمانے میں جانوروں کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کرتے تھے۔ وہ کھانے کے لیے زندہ جانوروں سے گوشت کاٹ لیا کرتے اور اونٹوں کے گلے میں تکلیف دہ کڑے ڈال دیا کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے جانوروں کو سنگدلی سے داغنے یا منظم طریقے سے ان کی لڑائیاں کرانے سے منع کیا۔ ایک حدیث کے مطابق آں حضرتؐ نے صحابہؓ کو یہ قصہ سنایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو پیاسے کتے کو پانی پلانے پر جنت میں بھیج دیا اور ایک عورت کو اپنی بلی کو بھوکا رکھنے کی پاداش میں دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ ان احادیث مبارکہ کو محفوظ رکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں ان اقدار کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اور یہ کہ ملت اسلامیہ نے ایک زیادہ انسان دوست قوم کی حیثیت سے ترقی کی منازل کس طرح طے کیں؟

اب یہودیوں کو بھی انسانیت نواز عرب معاشرے کی تکمیلی کوششوں میں شامل کر لیا گیا۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے حبشہ میں مقیم مسلمانوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اسلامی امت اور معاشرے کے قیام میں ہاتھ بٹانے کے لیے مدینہ چلے آئیں۔ پھر آپؐ نے اپنی توجہ شمال کے علاقوں کی طرف دوبارہ مبذول کی۔ یہودیوں کی بستی خیبر نے، جس نے مدینہ کے محاصرے کے دوران نہایت خطرناک کردار ادا کیا تھا، بنی قریظہ کی جلاوطنی کے انجام سے کوئی سبق نہ سیکھا اور وہ شمالی قبیلوں کو شورش پر اکسانے لگے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ خیبر سے ملت اسلامیہ کی سلامتی کو دوبارہ کوئی خطرہ درپیش نہ ہو چنانچہ حدیبیہ سے واپسی کے فوراً بعد آپؐ چھ سو مسلمانوں کو لے کر خیبر روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ چونکہ مال غنیمت ملنے کے امکانات بہت روشن تھے، اس لیے خانہ بدوش قبیلوں نے بھی اس مہم میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی لیکن حضورؐ نے انکار کر دیا۔ آپؐ مسلمانوں کو، جو حدیبیہ کے واقعے سے دل گرفتہ اور مایوس ہو گئے تھے، شکست خوردگی کا احساس زائل کر کے انہیں دوبارہ فعال بنانا اور اس کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن خیبر کو فتح کرنا ایک دشوار اور انتہائی مشکل کام تھا اور اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناقابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا۔ مدینہ کی طرح خیبر بھی آتش فشاں پتھروں سے ڈھکے ہوئے میدانی علاقوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے کھجور کے کھیتوں اور باغوں کی حفاظت کے لیے سات بڑے قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ قریش نے جب یہ سنا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس خطرناک مہم پر روانہ ہو گئے ہیں تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ آپؐ اتنی مختصر فوج کے ساتھ تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

لیکن اس مرتبہ بھی دشمن کی صفوں میں وہ شدید انتشار اور نفاق آں حضرتؐ کا سب سے بڑا اتحادی ثابت ہوا جو عربوں میں قبائلی نظام کے انحطاط کا باعث تھا۔ مسلم امہ کے برعکس خیبر اندرونی اختلافات کی وجہ سے کئی حصوں میں منقسم تھا۔ اس بستی میں آباد ہر یہودی قبیلہ خود مختار تھا چنانچہ ان کے لیے مشترکہ دشمن کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہودیوں نے اپنے حلیف قبیلے بنو غطفان کو پیغام بھیجا لیکن وہ ان کی مدد کو نہ پہنچے۔ یہودیوں میں سے بعضوں نے کہا کہ انہیں ایک پراسرار غیبی آواز سنائی دی ہے جس میں انہیں اپنے علاقوں میں واپس چلے جانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ آں حضرتؐ نے ان یہودیوں کو جنگ سے الگ تھلگ رہنے کے عوض ان سے مدینہ کی کھجوروں کی فصل کا معقول حصہ دینے کا وعدہ کیا ہو۔ مسلمان رات کو خیبر پہنچے اور صبح کو جب بستی کے مزدور بیلچے اور ٹوکریاں اٹھائے کام کے لیے نکلے تو انہوں نے رسول اللہؐ اور اسلامی سپاہ کو دیکھ کر کہا: ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھ لشکر!'' پھر یہ لوگ پیٹھ پھیر کر واپس خیبر کی طرف بھاگ گئے۔ ''اللہ اکبر!'' حضورؐ نے فرمایا: ''خیبر برباد ہو گیا!''

خیبر کا محاصرہ کوئی ایک ماہ تک جاری رہا۔ مسلمانوں نے منظم انداز میں باری باری ہر قلعے کا محاصرہ کیا، تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے اسے فتح کیا اور پھر مال غنیمت اور قیدیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ آخر جب یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی فتح ممکن نہیں تو انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر امن کے لیے درخواست کر دی۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے قرآنی احکام کے تحت ان شرطوں پر صلح کر لی جو اہل خیبر کے لیے ذلت آمیز نہیں تھیں۔ یہ اسی نوعیت کا معاہدہ تھا جو آباد علاقوں کے عرب عام طور پر خانہ بدوش قبیلوں کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھجوروں کی نصف فصل کے عوض خیبر کے یہودیوں کو فوجی تحفظ فراہم کیا اور وہ مدینہ کی رعیت بن گئے۔ اس طرح یہود پرانے بد و محافظوں کی حفاظت سے نکل کر رسول اللہؐ کی پناہ میں آ گئے۔ جب خیبر کے شمال مغرب میں واقع زرخیز نخلستان فدک کے یہودیوں نے اس معاہدے کے متعلق سنا تو انہوں نے بھی مسلمانوں کے ممکنہ حملے کی پیش بندی کے طور پر انہی شرطوں پر حضورؐ کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے حضورؐ نے اپنے دشمن حیی ابن اخطب کی سترہ سالہ خوبصورت بیٹی حضرت صفیہؓ کے ساتھ شادی کر لی جو لڑائی کے دوران بیوہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اہل مدینہ نے یہودیوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکست دے دی ہے۔ حضرت صفیہؓ بہ رضا و رغبت اسلام قبول کر چکی تھیں۔ آں حضرتؐ سے ان کا نکاح خیبر سے مدینہ واپسی کا نصف سفر طے ہونے کے بعد ہوا۔

جب مسلمان واپس مدینہ آئے تو حبشہ سے مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے۔ رسول اللہؐ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ کو گلے سے لگا لیا جنہیں تیرہ برس قبل آپؐ نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب ان کی عمر ۲۷ سال تھی۔ حضورؐ نے ان کا ماتھا چوم لیا اور فرمایا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ انہیں کس بات سے زیادہ خوشی ہوئی ہے، فتح خیبر سے یا جعفرؓ کے ساتھ ملاقات سے! ابھی آپؐ کو ایک اور بیوی کا بھی خیر مقدم کرنا تھا۔ اسی سال کے شروع میں آں حضرتؐ کو یہ خبر ملی تھی کہ آپؐ کے پھوپھی زاد اور برادر نسبتی عبیداللہ ابن جحش کا حبشہ میں انتقال ہو گیا ہے۔ وہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے توحید پرست تھے لیکن حبشہ میں انہوں نے مرتد ہو کر عیسائیت اختیار کر لی جس سے حبشہ میں موجود مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ رسول کریمؐ نے ان کی بیوہ حضرت رملہؓ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا جن کی کنیت ام حبیبہ تھی۔ عدت کی میعاد پوری ہونے پر نجاشی کے دربار میں حضورؐ کی غیر حاضری میں نکاح پڑھا گیا۔ یہ کوئی محبت کی شادی نہ تھی بلکہ ایک سیاسی فیصلہ تھا کیونکہ حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان کے لیے مسجد نبوی کے قریب ایک حجرہ تیار کیا گیا اور مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد وہ سیدھی اس حجرے میں چلی گئیں جب کہ حضرت صفیہؓ اپنے حجرے کی تیاری تک ایک قریبی مکان میں ٹھہری رہیں۔

حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے ساتھ حضرت صفیہؓ کی شادی کا پتا چلا تو وہ افسردہ ہو گئیں۔ انہیں حضرت ام حبیبہؓ سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن صفیہؓ بے حد خوبصورت تھیں۔ آں حضرتؐ نے جب حضرت عائشہؓ سے حضرت صفیہؓ کے بارے میں رائے معلوم کی تو انہوں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ہنگامے کا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگیں: ''ایک یہودن بھی دوسری جیسی ہی ہے''۔ ''ایسا مت کہو'' حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب دیا: ''کیونکہ وہ مسلمان ہو کر خدا کی کامل اطاعت کا عہد کر چکی ہیں''۔ حضرت صفیہؓ کو شروع میں حرم میں مشکل وقت گزارنا پڑا کیونکہ دوسری امہات المومنینؓ انہیں اپنے باپ حیی کے حوالے سے طنز کا نشانہ بناتی تھیں۔ ایک دن وہ روتی ہوئی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ''آپ ان سے کہیں کہ ہارونؑ میرے باپ اور موسیٰؑ میرے چچا تھے۔'' (محمد ابن سعد، کتاب الطبقات الکبیر جلد ہفتم صفحہ ۱۴۷: Lings: Muhammad P. 275)۔ لیکن بعد میں حضرت عائشہؓ اور وہ اچھی دوست بن گئیں اور حضورؐ کی تین نو عمر بیویوں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ کی دوسری ازواج سے الگ تثلیث بن گئی۔

اس سال کا بقیہ حصہ معمول کی چھاپہ مار کارروائیوں میں گزر گیا جن میں سے بعض حملے شمالی علاقوں کے نئے یہودی اتحادیوں کی درخواست پر کیے گئے۔ مارچ ۶۲۹ عیسوی میں ذی الحج کے مقدس مہینے میں نبی کریمؐ معاہدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیبیہ کے مطابق عازمین حج کے ایک مختصر قافلے کی قیادت کرتے ہوئے مکہ روانہ ہوگئے۔ اس مرتبہ ۲۶۰۰ صحابہ کرامؓ حضور کے ہمراہ تھے۔ آپؐ جب حرم کے حدود میں داخل ہوئے تو قریش وعدے کے مطابق اپنا گھر بار چھوڑ کر شہر سے باہر چلے گئے تاکہ مسلمان کسی مداخلت کے بغیر حج کے مناسک ادا کرسکیں۔ قریش کے سرداروں نے ابوالقبیس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس غیر معمولی منظر کو خوف اور دہشت کے عالم میں دیکھا۔ صحابہ کرامؓ کے بڑے مجمعے نے، جو احرام کی سفید چادروں میں ملبوس تھے، قصویٰ پر سوار نبی کریمؐ کی قیادت میں شہر میں آہستہ سے داخل ہونا شروع کر دیا اور مکہ کی وادی ''لبیک اللّٰھم لبیک'' کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ بیت اللہ میں پہنچ کر حضورؐ اونٹنی سے نیچے اتر آئے اور حجر اسود کو بوسہ دیا۔ پھر تمام صحابہؓ رسول کریمؐ کی قیادت میں کعبے کا طواف کرنے لگے۔ اس طرح آپؐ نے عمرے کے تمام مناسک ادا کیے جن میں کوہ عرفات اور منیٰ میں قیام شامل نہیں تھا۔ بعد میں آں حضرتؐ اور صحابہؓ نے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ کر سات چکر لگائے۔

اپنے پرانے سنگدل شہر کی طرف دوبارہ مراجعت رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کے لیے یقیناً ایک انوکھا تجربہ تھا۔ قریش بھی ہیبت اور خوف سے حبشہ کے سیاہ فام بلالؓ کو، جو کبھی محض ایک غلام تھے، خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر دن میں تین مرتبہ نماز کے لیے اذان دیتے ہوئے دیکھتے۔ حضورؐ کے چچا عباس ملاقات کے لیے شہر میں آئے اور آپؐ کو یہ پیش کش کی آپ ان کی خواہر نسبتی میمونہؓ بنت حارث سے، جو حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں، شادی کر لیں۔ (فاضل مصنفہ نے یہاں حضرت میمونہؓ بنت حارث کو غلطی سے حضورؐ کے چچا عباس ابن عبدالمطلب کی بہن لکھ دیا ہے حالانکہ وہ حضرت عباسؓ کی بیوی حضرت ام الفضلؓ کی بہن تھیں...... مترجم)۔ آں حضرتؐ نے شادی کی اس تجویز کو قبول کر لیا۔ غالباً آپؐ نے چچا کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینے کے لیے شادی پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اس موقعے پر آپؐ نے قریش کو شادی کی دعوت میں شرکت کے لیے بھی کہا۔ قریش کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا چنانچہ سہیل نے ابوالقبیس پہاڑ سے نیچے اتر کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بتایا کہ تین دن کی میعاد پوری ہو چکی ہے اس لیے آپؐ کو شہر سے فوراً چلے جانا چاہیے۔ اس بظاہر گستاخی اور بداخلاقی پر ایک انصاری حضرت سعدؓ بن عبادہ، جو اس وقت حضورؐ کے پاس تھے، طیش میں آ گئے لیکن آپؐ نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا: ''اے سعد! ان لوگوں سے، جو چل کر ہمارے پاس آئے ہیں، سخت کلامی نہ کرو'' (Lings: Muhammad P. 282)۔ اس کے بعد قریش یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ رات آنے سے پہلے صحابہؓ اس قدر نظم وضبط کے ساتھ شہر سے واپس مدینہ روانہ ہوگئے کہ اہل مکہ کو، جو اپنی نااتفاقی اور انتشار کے باعث زوال کا شکار ہوئے تھے، اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

اس واقعے کے بعد قریش کے بعض نوجوانوں نے نوشتہ دیوار کو پڑھ لیا کیونکہ یہ رسول کریمؐ کی زبردست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاقی فتح تھی۔ پورے عرب میں بھی اس واقعے کا شہرہ ہوا اور لوگوں میں اشتیاق کے ساتھ بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس لمحے کے بعد مکہ شہر کی تقدیر پر بدبختی کی مہر ثبت ہو گئی۔ خانہ بدوش قبائل جوق در جوق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حلیف بن گئے اور مکہ کے بہت سے نوجوان ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں دو نوجوان خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ معرکہ بدر کے بعد عمرو ابن العاص اور خالد ابن الولید کو مکہ میں اہم جنگجو کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی لیکن اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ مکہ میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ چنانچہ خالد بن ولید نے کہا: ''راستہ پوری طرح صاف ہو گیا ہے۔ یہ شخص یقیناً اللہ کا پیغمبر ہے اور اللہ کی قسم! میں مسلمان ہونے جا رہا ہوں۔'' (محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہ صفحہ ۲۱۷ The Life of Muhammad P. 485)۔ یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیر معمولی کامیابی کے پیچھے خدائی امداد و نصرت کارفرما تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خالد اور عمرو نے اکٹھے ہجرت کی اور مدینہ میں ان کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ خالد کو ڈر تھا کہ ان کے ماضی کا ریکارڈ ان کے خلاف مصیبت کھڑی کر دے گا۔ وہ بدر کے معرکے اور غزوہ خندق میں قریش کے لشکروں کی قیادت کر چکے تھے اور ان کے ہاتھوں بہت سے مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ اب انہیں انتقامی کارروائی کا خوف تھا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں تسلی دی کہ اسلام تمام سابق اعمال کو دھو دیتا ہے اور اب انہیں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔ ملت اسلامیہ کا یہ ایک اہم اصول تھا جس کی روشنی میں نہ صرف ایک نئی روحانی زندگی شروع ہو جاتی بلکہ اسلام صرف اسی اصول کی پاسداری کے ذریعے عرب میں امن و امان قائم کر سکتا تھا۔

رسول کریمؐ کے لیے یہ فتح کا سال تھا لیکن اسی سال کے دوران آپؐ کو کئی صدمے بھی اٹھانا پڑے۔ عمرے کے فوراً بعد حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ وفات پا گئیں اور بعد میں شام کی سرحد پر ایک غزوے میں آپؐ کے خاندان کے دو افراد شہید ہو گئے۔ زندگی کے آخری برسوں میں آں حضرتؐ نے اپنی توجہ شمال کی طرف مرکوز کر دی۔ ہمیں اس کی وجوہ کا صحیح علم نہیں لیکن عرب کے باہر کی سیاسی صورت حال اب ڈرامائی طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ فارس اور روم کی سلطنتیں کئی عشروں سے تھکا دینے والی جنگ لڑ رہی تھیں۔ حضورؐ کے ابتدائی کیریئر کے دوران فارس کی سلطنت کا اقتدار عروج پر تھا، اس نے شام پر حملہ اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس سے قریش میں گہری تشویش پائی جاتی تھی اور وہ اپنی غیر وابستہ حیثیت کے بارے میں شش و پنج میں مبتلا تھے۔ لیکن حال ہی میں رونما ہونے والے واقعات کی بدولت حالات رومیوں کے حق میں پلٹا کھا چکے تھے اور غزوہ احد کے سال ۶۲۵ عیسوی میں ہرقل نے اہل فارس کو پیچھے دھکیل کر ان کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ اگر رسول اللہ شمال میں عیسائی سلطنت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ عرب ریاست قائم کر دیتے تو آپؐ بازنطینیوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساسانیوں دونوں کو چیلنج کر سکتے تھے۔ چنانچہ زندگی کے آخری برسوں میں آپؐ سرحد پر اپنی موجودگی کا احساس دلانے اور یہودی قبائل کی طرح شمال کے عیسائی قبیلوں کو امت میں شامل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔
بہ ہر حال حضورؐ نے حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کو تین ہزار صحابہؓ پر مشتمل لشکر کے ہمراہ شام کی سرحد پر بھیج دیا۔ اس مہم پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس لشکر کشی کے بارے میں معلومات کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلامی سپاہ مدینہ سے روانہ ہوئی تو اسے معلوم ہو گیا کہ ہرقل ایک لاکھ فوج لے کر ان کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے لیکن مسلمانوں نے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ بحیرہ احمر کے قریب موتہ کے گاؤں میں، جو اب اردن میں ہے، ہرقل کی فوج نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے علاوہ دس اور مسلمان شہید ہو گئے۔ آخر حضرت خالدؓ بن ولید نے، جو اس مہم میں موجود تھے، لشکر کو واپس لے آنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زیدؓ اور جعفرؓ کی شہادت کی خبر سنی تو سیدھے ان کے گھر گئے۔ حضرت جعفرؓ کی بیوی حضرت اسماءؓ بعد میں اس واقعے کو یاد کر کے بتایا کرتی تھیں کہ وہ روٹیاں پکا رہی تھیں کہ حضورؐ ان کے گھر میں آئے۔ میں آپؐ کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ رسول کریمؐ نے حضرت جعفرؓ کے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا، جھک کر انہیں پیار کیا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپؐ سے یہ خبر سن کر حضرت اسماءؓ عربوں کی روایت کی مطابق رونے اور چیخنے لگیں اور عورتیں ان کے پاس جمع ہو گئیں۔ جب حضورؐ اپنے اہل خانہ کی طرف چلے گئے تو آپؐ نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ حضرت جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنے میں غفلت نہ کریں۔ چنانچہ اگلے چند دنوں تک آپؐ کے گھر سے کھانا آتا رہا۔ جب آپؐ واپس مسجد میں آنے کے لیے ایک گلی سے گزر رہے تھے تو حضرت زیدؓ کی ننھی بیٹی اپنے گھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور آپؐ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ حضورؐ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور وہاں کھڑے ہو کر زار و قطار روتے رہے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نسبتاً کم جانی نقصان پہنچنے کے باوجود حضرت خالدؓ اسلامی لشکر کو کیوں واپس مدینہ لے آئے تھے۔ جب یہ مسلمان واپس آئے تو انہیں اہل مدینہ کے طنز وحقارت کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ حضورؐ نے انہیں اپنی مضبوط حفاظت میں لے لیا۔ لیکن کوئی ایک ماہ گزرنے کے بعد حضرت عمروؓ ابن العاص نے ایک اور مہم کے دوران شمالی علاقوں کے قبیلوں پر حملہ کر کے مسلمانوں کی عزت اور وقار کو بحال کر دیا۔ اس مہم کے نتیجے میں دشمن سرحدی علاقوں سے فرار ہو گئے۔

لیکن اس سال ایک واقعے سے رسول اللہؐ کو ذاتی طور پر فرحت وانبساط حاصل ہوئی۔ مصر کے مقوقس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے گھنگر یالے بالوں والی ایک خوبصورت مصری کنیز آپؐ کی خدمت میں بھیجی۔ اس قبطی عیسائی لڑکی کا نام مریم تھا۔ حضورؐ روزانہ ان کے پاس جاتے اور دن کا زیادہ وقت حضرت مریمؓ کے پاس گزارنے لگے جو غالباً حرم کے حاسدانہ ماحول سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی۔ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا اور کسی شخص کو اس پر حیرت نہ ہوئی۔ بنی اسرائیل خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے جب مستقل رہائش رکھنے کے اسی قسم کے مرحلے سے گزر رہے تھے تو تورات میں انہیں بھی لونڈیاں رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ خود حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہؓ کو بطور کنیز ہی اپنایا ہوا تھا جن کے بطن سے عربوں کے جدامجد اسماعیلؑ پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک سال کے بعد جب حضرت مریمؓ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو حضورؐ نے اسی مناسبت سے ان کا نام ابراہیمؑ رکھا۔

ازواج مطہراتؓ نے جب معمولی حیثیت کی عورت کو حضورؐ کے بیٹے کو گود میں اٹھائے دیکھا تو انہیں قدرتی طور پر بہت حسد محسوس ہوا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے اس صورت حال کے خلاف باقاعدہ احتجاج کیا اور حرم میں بغاوت کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ اس عجیب وغریب واقعے کو، جس کی وجہ سے ایک بہت بڑا خانگی بحران اور توقع سے بڑھ کر پیچیدگی پیدا ہوگئی، سمجھنا بہت مشکل ہے۔ یہ قصہ خواتین کے بارے میں جارحانہ نظریات رکھنے والے حضرت عمرؓ سے منسوب ہے جن کا کہنا تھا کہ عورتوں کو دیکھنا چاہیے، ان کی باتیں نہیں سنی چاہییں۔ ان کا خیال تھا کہ مہاجرین کی بیویاں مدینہ کی عورتوں سے بری عادتیں سیکھ رہی ہیں لیکن ازواج مطہراتؓ کے ساتھ آں حضرتؐ کا رویہ نہایت نرم اور مشفقانہ تھا۔ ایک دن حضرت عمرؓ کو پتا چلا کہ حضورؐ کے حرم سے ایک عجیب قسم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو سراسر ناجائز تھا۔ ازواج مطہراتؓ مطالبہ کر رہی تھیں کہ انہیں حال ہی میں حاصل ہونے والے مال غنیمت سے امت کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رسول کریمؐ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب انہوں نے حاضری کے لیے اندر آنے کی اجازت مانگی تو حرم میں خاموشی چھا گئی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو عمرؓ کی آواز سنتے ہی تمام ازواجؓ خوف زدہ ہو کر پردے میں چلی گئیں۔ حضرت عمرؓ نے غضبناک ہو کر ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اگر وہ پیغمبر خداؐ کا بھی اسی طرح احترام کرتیں تو یہ زیادہ بہتر تھا۔ وہ پردے کے پیچھے دبکی ہوئی خواتین سے چیختے ہوئے کہنے لگے: ''اے اپنے آپ کی دشمنو! تم مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول خداؐ سے نہیں ڈرتیں''۔ ''بالکل!'' ان میں سے ایک خاتون نے جواب میں کہا: ''کیونکہ آپ رسول اللہؐ کے مقابلے میں زیادہ تندخو اور سخت مزاج ہیں''۔ (محمد ابن اسماعیل البخاری، Lings: Muhammad, P 275)۔

حضرت عمرؓ کو پہلے ہی اپنی بیٹی حفصہؓ کے رویے پر تشویش تھی چنانچہ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے کہا کہ وہ اپنے حسد پر قابو پائیں اور اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ وہ حضرت عائشہؓ جیسی پرکشش نہیں ہیں۔ لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت حفصہؓ نے حضرت مریمؓ کے خلاف اس قدر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ حضورؐ نے تنگ آ کر یہ وعدہ کرلیا کہ آپؐ مریمؓ سے پھر نہیں ملیں گے۔ لیکن اس سے بھی صورت حال بہتر نہ ہوئی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اکسانے پر دوسری ازواج مطہراتؓ نے بھی حضرت مریمؓ پر طعن وتشنیع شروع کر دی اور بحث وتکرار اور دشمنی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر گھریلو ماحول اس قدر خراب ہو گیا کہ حضورؐ نے ایک ماہ تک تمام ازواج مطہراتؓ سے قطع تعلق کرلیا۔

لیکن حرم کے ان تمام قصوں سے باقی امت میں موجود کسی مسئلے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کو ایک نئی خوشحالی نصیب ہوئی تھی اور حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ خیبر سے پہلے انہوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھجوریں بھی نہیں کھائی تھیں۔ لیکن نئی دولت نے کئی مسئلے بھی کھڑے کر دیے۔ بعض کاشتکار مسلمان اس مالی آسودگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے جب کہ کئی دوسرے لوگوں نے مختلف غزوات سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت سے زیادہ حصہ وصول پانے کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔ یوں لگتا ہے کہ خود آں حضرتؐ کے اپنے اہل خاندان نے ان تحائف کا مطالبہ شروع کر دیا تھا جو غریبوں میں تقسیم ہونے چاہییں تھے۔ رسول اللہؐ تمام لوگوں، خاص طور پر حرم میں اس خوشحالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اخلاقی کمزوریوں کے اثرات کے بارے میں بے حد فکر مند تھے۔

ازواج مطہراتؓ سے حضورؐ کی علیحدگی کے متعلق حضرت عمرؓ کے بیان سے بھی اس مسئلے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جب مسلمانوں نے حرم سے آپؐ کی علیحدگی کی خبر سنی تو وہ بہت پریشان ہو گئے۔ اس معاملے پر کوئی شخص اظہار خیال نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مسلمانوں کا ایک دل گرفتہ ہجوم مسجد کے باہر جمع ہو کر حجرے کی چھت پر بنائے گئے اس چھوٹے سے کمرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں رسول اللہؐ تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ اس واقعے کو یاد کر کے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص یہ خبر لے کر دوڑتا ہوا ان کے گھر پہنچ گیا اور اس نے دروازے کو اس قدر زور سے پیٹنا شروع کر دیا کہ میں سمجھا، شمالی قبیلوں نے مدینے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ لیکن یہ خبر محاصرے سے بھی بدتر تھی۔ یہ شخص کہنے لگا: ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمام ازواج مطہراتؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے''۔

یہ محض گھریلو بحران نہیں تھا۔ حضورؐ کی شادیوں کو سیاسی اتحادوں کی حیثیت حاصل تھی جس کے لیے بڑی احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ اگر آپؐ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو طلاق دے دیتے تو اس سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے تعلقات کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اب چند خواتین کے جھگڑے کی وجہ سے ہر چیز خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے کہ ازواج مطہراتؓ کا یہ احتجاج مدینے کے داخلی تنازعات کا شاخسانہ ہو جو حضورؐ کے حرم پر بھی اثر انداز ہوا ہو لیکن ہم ایسے کسی داخلی خلفشار کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ حضرت عمرؓ رسول اللہؐ سے ملاقات کے لیے فوراً مسجد کی طرف دوڑ پڑے تاکہ دیکھیں کہ وہ اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن آں حضرتؐ نے ان کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر انہیں ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عمرؓ نے جب نبی کریمؐ کے چھوٹے سے کمرے پر نظر دوڑائی تو وہاں صرف تین کچی کھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ حضورؐ ایک کھردری چٹائی پر، جس پر کمبل تک نہیں تھا اور جس پر لیٹنے سے آپؐ کے رخسار مبارک پر نشان پڑ گئے تھے، افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ ازواج مطہراتؓ کو طلاق نہیں دے رہے تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ انہوں نے مدینہ ہجرت کرنے والی اپنی بیویوں کے حوالے سے بعض مشکلات کا قصہ سنایا تو ماحول میں کشیدگی بتدریج ختم ہوگئی اور حضورؐ مسکرا پڑے۔ حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ مدینہ کے مرد اپنی بیویوں کو قابو میں رکھنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ آخر جب رسول خداؐ کا حزن وملال ختم ہو گیا تو حضرت عمرؓ زمین پر آپؐ کے ساتھ بیٹھ کر کہنے لگے کہ قیصر وکسریٰ تو عیش وعشرت کر رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو چند گھریلو نعمتیں کیوں نہیں دیں؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ان کی خوشیاں صرف اس دنیا تک محدود ہیں۔

آج ہمارے لیے اس قصے کو سمجھنا مشکل ہے کیونکہ اس کہانی میں ذاتی حرص وہوس کے کئی عناصر موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جنسی حسد کے مقابلے میں مادہ پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان غالب آ گیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ماہ تک ازواج مطہراتؓ سے الگ تھلگ رہے جس کے بعد ان سے کہا گیا کہ وہ دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرلیں: یا تو وہ حضورؐ کی شرائط کو تسلیم کر کے اسلام کی سادہ زندگی بسر کریں یا انہیں باہمی رضامندی سے طلاق دے دی جائے گی۔ یہاں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اس انتخاب سے متعلق قرآنی آیات میں حضرت مریمؑ یا خواتین کے حسد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا بلکہ ان میں زندگی کی آسائشوں اور مادی دنیا سے بے جا رغبت کا حوالہ دیا گیا ہے:

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم زندگانی دنیا اور زینت دنیا چاہتی ہو
تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا دوں اور تمہیں اچھائی کے ساتھ رخصت کردوں
اور اگر تمہاری مراد اللہ اور اس کا رسولؐ اور آخرت کا گھر ہے
تو (یقین مانو کہ) تم میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے
بہت زبردست اجر رکھ چھوڑے ہیں (سورہ الاحزاب آیات ۲۸، ۲۹)

ان آیات کے نازل ہونے کے بعد ازواج مطہراتؓ نے ان شرطوں کو قبول کرلیا اور اس وقت سے امت مسلمہ میں ان کی اہمیت اور وقار میں اضافہ ہوگیا۔ قرآن کریم نے انہیں ''امہات المومنین'' کا لقب دیا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد دوبارہ شادی نہ کریں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپؐ کسی اور مرد سے ان کی شادی سے حسد کرتے تھے بلکہ اس قسم کی شادیوں سے خاندانی سلطنتیں قائم ہونے اور ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں ملت اسلامیہ میں انتشار اور فساد برپا ہونے کا خطرہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی ان آیات کے نازل ہونے کے بعد امت کے مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلق کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ واضح انداز میں بیان کر دیا گیا ہے اور عدل و انصاف اور مساوات کے اصولوں پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے مسلمان مردوں اور عورتوں کے حقوق اور فرائض کا واضح تعین کر دیا گیا ہے:

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں

فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں

صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں

خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں

اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں، بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والیاں

ان (سب) کے لیے اللہ تعالیٰ نے (وسیع) مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے (سورہ الاحزاب آیت ۳۵)

بعد میں مسلمانوں نے اگرچہ بعض اوقات قرآن کریم کے مساوات کے اس وژن سے انحراف کیا لیکن اسلام پر عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کا الزام لگانے والے عورتوں کے حقوق کے مغربی علمبرداروں کو یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ خواتین کے ساتھ خود عیسائیت کا رویہ بھی حد درجہ منفی رہا ہے۔ گو کہ عہد نامہ جدید میں عورتوں کے لیے مثبت پیغام دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجیل میں صنف نازک کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں دی گئی۔ (میں نے اپنی کتاب The Gospel According to woman میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے)۔ عیسائیت میں عورتوں سے نفرت اور امتیازی سلوک کی بڑی نشانی خواتین کی نفسانی اور جنسی خواہشات کو نظر انداز کرنے کا رجحان ہے اور یہ رجحان دنیا کے کسی مذہب کی تعلیمات میں نہیں پایا جاتا۔ یہودیت اور اسلام دونوں مذاہب میں اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام پر عورتوں کے ساتھ نامناسب سلوک اور ان سے تعصب برتنے کا الزام لگانا یقیناً بہت بڑی ناانصافی ہے۔ آج اگر مسلم خواتین ہماری پیش کردہ بعض آزادیوں کو مسترد کر رہی ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر، ضدی اور ہٹ دھرم ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات کے حوالے سے مغرب کے نظریات الجھاؤ اور پراگندگی کا شکار ہیں۔ ہم مساوات اور آزادی کی تبلیغ تو کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اشتہارات، برہنہ تصویروں کی مدد سے عریانی پھیلانے اور مقبول عام تفریحات کے ذریعے اس انداز سے عورتوں کا استحصال اور بے توقیری کرتے ہیں جسے مسلمان توہین آمیز اور حقارت انگیز تصور کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ازواج مطہراتؓ کے حرم میں روزمرہ زندگی کے معمولات کے مقابلے میں ان کے درمیان کشیدگی اور گروہ بندی کے بارے میں زیادہ تفصیلات جانتے ہیں لیکن یہ تصور کرنا غلط ہوگا کہ ان کے درمیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محبت یا مسرت وشادمانی کا فقدان تھا۔ رسول کریمؐ نے جب یہ قرآنی آیات حضرت عائشہؓ کو سنائیں تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ وہ فیصلہ کرنے سے پہلے پوری احتیاط کے ساتھ غور وخوض کر لیں۔ حضورؐ نے انہیں اپنے والدین کی رائے معلوم کرنے کا بھی مشورہ دیا۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے آں حضرتؐ کی اس تجویز کو بالائے طاق رکھ دیا بلکہ انہوں نے اس معاملے پر زیادہ سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا انتخاب کر لیا۔ وہ بہت حاسد خاتون تھیں اور بعض اوقات اس غرض سے حضورؐ کی جاسوسی کرتی تھیں کہ آپؐ دوسری ازواج مطہراتؓ سے ملاقات تو نہیں کر رہے؟ حضرت مریمؓ کا امید سے ہونا بھی ان کے لیے کم باعث آزار نہ تھا۔ تمام ازواج مطہراتؓ کی سابق شوہروں سے اولادیں تھیں لیکن حضرت عائشہؓ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔

ایک رقت انگیز قصے کے مطابق حضرت عائشہؓ نے رسول کریمؐ سے درخواست کی کہ دوسری ازواجؓ کی طرح آپؐ انہیں بھی کوئی کنیت دیں۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے انہیں ام عبداللہ کی کنیت دی کیونکہ حضرت عائشہؓ کو اپنے کمسن بھتیجے عبداللہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عائشہؓ کی زندگی بہت ناخوشگوار تھی۔ رسول اللہؐ نہایت شفیق شوہر تھے۔ وہ حضرت عائشہؓ پر ان کے باپ سے بھی زیادہ مہربانی فرماتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کی پٹائی کر دیتے تھے۔ آں حضرتؐ ازواج مطہراتؓ کو کفایت شعاری اور قناعت سے گزارا کرنے کی نصیحت کرتے البتہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضورؐ گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور اپنے تمام کام خود کر لیتے تھے۔ آپؐ اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگا لیتے، جوتے مرمت کر لیتے اور بکریوں کی دیکھ بھال کرتے۔ آپؐ مسلمانوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتے تھے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان روایات پر ایک ایسے زمانے میں عمل کیا گیا جب دنیا کے بیشتر مذاہب کے پیروکار یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک عظیم پیغمبر گھر کے کام کاج بھی کر سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ خواتین سے حسن سلوک کے بارے میں حضورؐ کی تعلیمات پر کاربند رہے البتہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے کئی مسلمان اپنا طرز عمل تبدیل نہ کر سکے۔

کوئی بھی دوسری خاتون حضرت خدیجہؓ کی جگہ نہ لے سکتی تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضورؐ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ مثال کے طور پر ایک دن آں حضرتؐ نے انہیں دوڑ کے مقابلے کی دعوت دی اور جب آپؐ دوڑ جیت گئے تو آپؐ نے فاتحانہ انداز میں بلند آواز سے کہا کہ اب حساب برابر ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے مکہ میں جب حضرت عائشہؓ ایک چھوٹی لڑکی تھیں، ایک مرتبہ حضورؐ سے آگے نکل گئی تھیں اور آپؐ انہیں پکڑ نہیں سکے تھے۔ لیکن گھر میں بے تکلفی کے کئی اور واقعات بھی رونما ہوتے۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہؐ کے سر پر آپؐ کے پسندیدہ خوشبودار تیل کی مالش کرتیں اور دونوں ایک ہی برتن میں پانی پیتے۔ آپؐ بیمار ہوتے تو حضرت عائشہؓ بڑی محبت سے آپؐ کی تیمارداری کرتیں۔ ایک دن جب دونوں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ اپنے چپل کی مرمت کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مصروف تھے تو حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ کسی خیال کے زیر اثر آپ کا چہرہ دمکنے لگا ہے۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے آپ کا چہرہ دیکھا اور اس چمک دمک اور خوشی کے تاثر پر آپؐ کی تعریف وتحسین کی۔ آں حضرتؐ نے اٹھ کر ان کی پیشانی چوم لی اور کہا: ''اے عائشہ! اللہ تمہیں اجر دے، میں تمہیں اتنی خوشی نہیں دے پاتا جتنی خوشی تم سے مجھے ملتی ہے''۔

• حضرت عائشہؓ کی شخصیت کا ایک سنجیدہ پہلو بھی تھا۔ وہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب بھی کسی ضرورت کے تحت مدینہ سے باہر جانا پڑتا تو آپ مسلمانوں کو یہ تاکید فرماتے کہ اگر انہیں آپؐ کی غیر حاضری کے دوران کوئی دینی مسئلہ پیش آئے تو وہ حضرت عائشہؓ سے صلاح مشورہ کریں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد پیغمبر اسلامؐ کی سیرت مبارکہ اور دینی اعمال کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی رائے کو سند کا درجہ حاصل تھا جو خاص طور پر اس تناظر میں ایک حیرت انگیز بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے خلفا خواتین کی عزت واحترام کے معاملے میں حضورؐ کے طرز عمل کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے منسوب احادیث کی تعداد ۲۲۱۰ ہے البتہ بخاری اور مسلم نے، جنہوں نے نویں صدی عیسوی میں احادیث کے ضخیم مجموعے مرتب کیے، ان میں سے بیشتر احادیث کو حذف کر دیا ہے۔ انہوں نے صرف ۱۷۴ احادیث کو تسلیم کیا جو حضرت عائشہؓ نے رسول کریمؐ سے براہ راست سنی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو ابتدائی اسلامی سلطنت کے پر آشوب دور کی سیاست میں بھی زبردست اہمیت حاصل رہی اور انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں ان کے خلاف بغاوت کی قیادت کی۔ جیسا کہ مغرب میں قیاس کیا جاتا ہے، اسلام نے عورتوں کو مغلوب اور پامال نہیں کیا بلکہ اس نے خواتین کو اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا ایسا موقع فراہم کیا جس کا جاہلیت کے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس سال کے آخر میں قریش مکہ نے حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ دیا اور اس طرح وہ دوبارہ غیر محفوظ ہو گئے۔ قبیلہ بنو بکر مدتوں سے قریش کا حلیف تھا تاہم کئی عشروں سے قبیلہ خزاعہ کے ساتھ ان کی شدید دشمنی چلی آ رہی تھی جو رسول کریمؐ کے اتحاد میں شامل ہو گئے تھے۔ نومبر ۶۲۹ عیسوی میں بنو بکر نے بنو خزاعہ پر ان کے علاقے میں شب خون مار دیا اور لگتا ہے کہ بعض قریش نے اس حملے میں ان کی امداد بھی کی تھی۔ انہوں نے بنو بکر کو ہتھیار مہیا کیے اور کہا جاتا ہے کہ صفوان نے لڑائی میں حصہ بھی لیا تھا۔ بنو خزاعہ نے فوری طور پر جوابی کارروائی کی بلکہ دونوں قبیلوں کے درمیان حدود حرم میں لڑائی بھی ہوئی۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے امداد کی اپیل کی اور حضورؐ نے انہیں امداد دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

اس واقعے کے فوراً بعد قریش نے یہ محسوس کر لیا کہ انہوں نے آں حضرتؐ کو مکہ پر حملہ کرنے کا بہانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فراہم کر دیا ہے۔ صفوان اور عکرمہ جنگ لڑنے اور فتنہ انگیزی پر آمادہ تھے لیکن سہیل نے، جس کی ماں کا تعلق بنوخزاعہ سے تھا، بنوبکر کے اس اقدام کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہؐ کے پاس اپنے مخبر تھے چنانچہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بتا دیا کہ ابوسفیان عنقریب مدینہ آنے والا ہے۔ غزوہ خندق میں شکست کھانے کے بعد ابوسفیان نے غالباً یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ، جو کچھ عرصہ قبل حضرت ام حبیبہؓ سے شادی کے باعث ابوسفیان کے داماد بن گئے تھے، لڑائی جاری رکھنا بے سود ہے۔ معاہدہ امن کی خلاف ورزی کے فوراً بعد ابوسفیان نے مدینہ پہنچ کر حضورؐ سے امن کی درخواست کر دی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ دو سال پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مدینہ میں ابوسفیان کی امن کوششوں کے بارے میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کے پاس گئے تاکہ وہ حضورؐ پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔ لیکن حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے والد کو حضورؐ کے بستر پر بیٹھنے بھی نہ دیا۔ یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی زندگی میں اس قسم کے تقدس اور احترام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق ابوسفیان نے بعد میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے مشورہ کیا۔ لیکن یہ روایت اس لیے مشکوک نظر آتی ہے کیونکہ اس میں پہلے چار خلفا کا نام ترتیب سے لیا گیا ہے۔ بہرحال ابوسفیان نے اس مرحلے پر ایک نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت وہ اسلام کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم نہیں کر سکتا تھا تاہم اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فتح ناگزیر ہے اور قریش کو جس قدر جلد ممکن ہو، بہتر شرائط حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اور سہیل اہل مکہ کو بنوبکر کے تنازعے سے اسی طرح چھٹکارا دلانا چاہتے تھے جس طرح ایک سال پہلے حضورؐ نے ابوبصیرؓ کا معاملہ طے کیا تھا۔ لیکن قریش اب اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ سنگین نتائج سے نہیں بچ سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ابوسفیان کو مشورہ دیا کہ وہ رسول اللہؐ سے یہ پوچھیں کہ اگر کوئی مکی حضورؐ کے سامنے ہتھیار ڈالنا چاہے اور پناہ لینے کے لیے ان کے گھر آ جائے تو کیا آپؐ اسے جان کی امان دیں گے؟ اس طرح مکہ شہر پر مسلمانوں کے حملے کی صورت میں ان کی عزت رہ جاتی اور جانیں بچ جاتیں کیونکہ ان حالات میں اہل مکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے براہ راست ہتھیار ڈالنے کے بجائے اپنے ہی ایک آدمی کی پناہ میں آ جاتے۔

ابوسفیان اس تجویز پر غور کرنے پر رضامند ہو گیا اور واپس مکہ چلا گیا جہاں اس نے قریش کے دوسرے لوگوں کو ناگزیر صورت حال کو قبول کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی۔ ابوسفیان کی مکہ روانگی کے بعد رسول کریمؐ نے بھی ایک نئی مہم کے لیے تیاریوں کا آغاز کر دیا اور امت مسلمہ اور اس کے اتحادیوں کو فوج میں شامل ہونے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دعوت دی۔ اس مہم کی منزل کو حفاظتی نقطہ نظر سے خفیہ رکھا گیا تاہم فطری طور پر اس بارے میں بہت زیادہ تجسس پھیل گیا اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ دس رمضان المبارک، جنوری ۶۳۰ عیسوی کو حضورؐ اب تک کی سب سے بڑی فوج کو لے کر مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مسلم امہ کے تقریباً تمام مردوں نے اس مہم میں رضا کارانہ طور پر حصہ لیا۔ راستے میں اتحادی خانہ بدوش قبائل بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے جس سے فوج کی تعداد دس ہزار ہو گئی لیکن ابھی تک کسی کو منزل کے متعلق یقین سے کچھ علم نہیں تھا۔ یہ لوگ یقیناً مکہ جا رہے تھے البتہ ان کی منزل بعض جنوبی قبائل یا طائف کا شہر بھی ہو سکتی تھی جس کا اسلام کے بارے میں رویہ ابھی تک جارحانہ تھا۔ جب جنوبی قبیلے ہوازن نے یہ سنا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فوج ان کی جانب بڑھ رہی ہے تو انہوں نے لات کے شہر اور مشرکین کے گڑھ طائف میں اپنی فوجیں جمع کر لیں۔ ادھر مکہ میں قریش کی حالت قدرتی طور پر بہت خراب تھی۔ حضرت عباسؓ نے قریش مکہ کو اس افتاد سے بچانے اور اس تباہی کی پیش بندی کے لیے اقدامات کی کوشش کی: ''اے گروہ قریش! افسوس! اس سے پہلے کہ قریش خود رسول اللہؐ سے آ کر ملیں اور ان سے حصول امن کی درخواست کریں، اگر وہ جنگ کر کے بزور طاقت مکہ میں داخل ہو گئے تو قریش کی ہمیشہ کے لیے موت ہو جائے گی۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ صفحہ ۸۱۲: The Life of Muhammad P. 546)۔ وہ رات کو حضورؐ سے ملنے کے لیے چل پڑے۔ راستے میں ابوسفیان اور بنو خزاعہ کے سردار ہدیل بن ورقا سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی رسول اللہؐ کی لشکر گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ تینوں افراد نے رات وہیں گزاری۔ صبح کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اسلام قبول کرنے کو تیار ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ''میں مسلمان ہونے کے لیے کلمہ طیبہ کے پہلے حصے (خدا کے سوا کوئی معبود نہیں) پر ایمان لانے کو تیار ہوں۔ مجھے یہ قطعی یقین ہو گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو مجھے ان حالات میں کوئی نفع تو پہنچاتا تاہم کلمہ طیبہ کے دوسرے حصے یعنی حضورؐ کی نبوت پر ایمان لانے کے سلسلے میں میرے دل میں اب بھی کھٹکا ہے''۔ ابوسفیان نے نماز فجر کے دوران مسلم سپاہ کو قبلہ رخ قطاروں میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ جب اس نے مختلف قبائل کو مکہ شہر کی طرف بڑھتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اب قریش کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ابوسفیان تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے مکہ گئے اور بلند آواز سے یہ اعلان کیا: ''اے گروہ قریش! یہ رہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہارے سروں پر آ گئے ہیں۔ تم ان کا سامنا نہیں کر سکتے اس لیے جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ امن پائے گا، وہ مامون ہوگا''۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ غصے سے ابوسفیان کے پاس کھڑی ہو گئی، اس نے ابوسفیان کی مونچھیں پکڑ لیں اور چلاتے ہوئے لوگوں سے کہنے لگی: ''اس موٹے چربیلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخص کو، جو مشک کی طرح پھولا ہوا ہے، مار ڈالو! قوم اس کے باعث تباہ ہو گئی۔ دیکھو تمہیں یہ چیزیں دھوکے میں نہ ڈالیں"۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۸۱۵: The Life of Muhammad. P. 548)۔ لیکن ابوسفیان نے قریش سے کہا کہ وہ ہند کی باتیں نہ سنیں کیونکہ اس قسم کی دھمکیوں اور سرکشی کا وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ ابوسفیان نے مسلمانوں کی فوج دیکھ لی تھی جس کا مقابلہ کرنے کی قریش میں سکت نہیں تھی۔ چنانچہ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر لیے جو رسول اللہؐ کی اطاعت قبول کرنے کی علامت تھی۔

لیکن اہل مکہ میں سے چند لوگ جنگ کرنے پر آمادہ تھے۔ عکرمہ، صفوان اور سہیل نے ایک مختصر لشکر کے ہمراہ کوہ ابوقبیس پر جا کر حضرت خالدؓ بن ولید کے دستے پر، جب وہ مکہ شہر میں داخل ہو رہا تھا، حملہ کر دیا۔ یہ حملہ فوراً ناکام بنا دیا گیا جس کے بعد عکرمہ اور صفوان مکہ سے بھاگ گئے جب کہ سہیل نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ مسلمانوں کی باقی فوج کسی جھڑپ کے بغیر شہر میں داخل ہو گئی۔ خانہ کعبہ کے قریب رسول اللہؐ کے لیے خیمہ نصب کر دیا گیا اور حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ، جو آپؐ کے ہمراہ تھیں، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں۔ حضورؐ اور آپؐ کے اہل خانہ جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت علیؓ کی بہن ام ہانیؓ، جن کی ایک مشرک کے ساتھ شادی ہوئی تھی اور جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی، حضرت خالدؓ کے خلاف لڑائی میں حصہ لینے والے اپنے دو رشتے داروں کی جان بخشی کی درخواست لے کر آں حضرتؐ کی خدمت میں پہنچ گئیں۔ اگرچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ ان دونوں افراد کو قانونی سزا دینا چاہتے تھے لیکن حضورؐ نے حضرت ام ہانیؓ سے فرمایا: "جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی، جسے تم نے امن دیا، اسے ہم نے امن دیا۔ علی انہیں قتل نہ کریں"۔ آپؐ خونیں انتقام لینے کے ہرگز خواہاں نہیں تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے مکہ کے کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا اور نہ ہی ان لوگوں پر اس سلسلے میں کوئی دباؤ ڈالا گیا۔ حضورؐ جبر و اکراہ کے ذریعے دین پھیلانا نہیں چاہتے تھے بلکہ آپؐ کا مطمح نظر صلح و آشتی اور امن تھا۔

نبی کریمؐ قریش کی ایذا رسانی کے لیے نہیں، اس مذہب کو ختم کرنے کے لیے مکہ گئے تھے جس کی وجہ سے قریش ناکام ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تک آرام کرنے کے بعد آں حضرتؐ نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ پھر آپؐ نے اپنی اونٹنی قصویٰ پر بیٹھ کر سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ طواف کے دوران حضورؐ "اللہ اکبر" کہتے جاتے، دس ہزار صحابہ کرامؓ بھی آپؐ کے ساتھ نعرہ تکبیر لگانے لگے جس سے پورا شہر گونج اٹھا اور یہ اسلام کی کامل فتح کا بھرپور مظاہرہ تھا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے خانہ کعبہ کے اردگرد، چھتوں اور بالکونیوں سے ۳۶۰ بتوں کو گرا دیا۔ آپؐ قریش کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے ایک ایک بت کو گراتے جا رہے تھے:

حق آ گیا اور باطل چلا گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے شک باطل جانے اور زائل ہونے والا ہی تھا (سورہ بنی اسرائیل: آیت ۸۱)

خانہ کعبہ کے اندر دیواروں کو مشرکین کے معبودوں کی تصویروں اور مورتیوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں مٹانے کا حکم دے دیا۔ ان میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی شبیہیں بھی تھیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے انہیں نہ چھیڑنے کا حکم دیا تھا۔ آخر اسلام نے عبادت کے دوران ہر قسم کی شبیہ کے استعمال کی ممانعت کر دی کیونکہ اس سے عبادت میں یکسوئی ختم ہوتی ہے اور انسان خدا سے ہٹ کر انسان کی تخلیق کردہ مقدس علامتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

مکہ کے کچھ لوگ گھروں سے نکل کر خانہ کعبہ کی طرف آئے اور حضورؐ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ رسول خداؐ نے اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں خدا کے دین اور نئے نظام کو قبول کرنے کی دعوت دی اور ان سے کہا کہ وہ امت مسلمہ میں شامل ہو جائیں اور جاہلیت کے تفاخر اور ان مشرکانہ برائیوں کو ختم کر دیں جو بنی نوع انسان میں انتشار اور ناانصافی کا باعث ہیں۔ آخر میں آپؐ نے قرآن حکیم کی ایک آیت کی تلاوت کی جس کے متعلق بعد میں مسلمانوں نے یہ تشریح کی کہ اس آیہ مبارکہ میں نسل پرستی کی اس لعنت کی مذمت کی گئی ہے جس سے مسلمان بڑی حد تک آزاد ہیں:

اے گروہ قریش! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباء واجداد پر غرور کو زائل کر دیا، سب انسان آدم سے پیدا ہوئے اور آدم مٹی سے

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد اور عورت سے پیدا کیا
اور ہم نے تمہارے گروہ اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو
بے شک تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے پرہیزگار ہے
یقیناً اللہ خبیر وعلیم ہے (سورہ الحجرات آیت ۱۳)

(محمد ابن اسحاق، سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۸۲۵: The Life of Muhammad, P. 553)۔

آخر میں حضورؐ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ صرف دس افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان میں عکرمہ بھی شامل تھا۔ (صفوان کو کسی وجہ سے شامل نہ کیا گیا)۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے تھے یا جنہوں نے آں حضرتؐ کے اہل خانہ کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ لیکن جن لوگوں نے رسول اللہؐ سے معافی کی درخواست کی، انہیں معاف کر دیا گیا۔

یہ ایک دانشمندانہ حکمت عملی تھی۔ مثال کے طور پر نبی کریمؐ جانتے تھے کہ صفوان اب بھگوڑا ہے چنانچہ آپؐ نے صحابہؓ سے کہا کہ صفوان کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے: ''اگر صفوان تمہیں ملے تو اسے دیکھ کر تیوری نہ چڑھانا''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضورؐ نے حکم دیا: ''اسے آزادی کے ساتھ ہمارے پاس آنے دو کیونکہ مجھے اپنی زندگی کی قسم! وہ ایک ذہین اور باوقار شخص ہے اور اسلام کی صداقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا''۔ (Lings: Muhammad P. 304)۔ خانہ کعبہ میں خطاب کے بعد آں حضرتؐ کوہ صفا پر چلے گئے جہاں آپؐ نے مکہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ آپؐ کی اطاعت گزاری کا عہد کریں اور آپؐ کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیں۔ پھر قریش میں سے ہر شخص فرداً فرداً اس حال میں حضورؐ کے پاس آتا گیا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ایک عورت نقاب اوڑھے رسول اللہؐ کے سامنے آئی اور جب وہ بولی تو آپؐ نے اسے پہچان لیا۔ یہ ابوسفیان کی بیوی ہند تھی جس نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو مسخ کر کے ان کا کلیجہ چبانے کی کوشش کی تھی۔ ''تم ہند بنت عتبہ ہو؟'' حضورؐ نے پوچھا۔ ''ہاں!'' اس نے گستاخی سے جواب دیا: ''جو کچھ میں نے ماضی میں کیا، اس پر مجھے معاف کر دیں، خدا آپؐ کو معاف کرے گا۔'' رسول کریمؐ نے سوال و جواب کے ذریعے تبلیغ جاری رکھی اور ہند سے یہ عہد لیا کہ وہ بدکاری یا چوری کا ارتکاب نہیں کرے گی اور اپنے بچوں کو قتل نہیں کرے گی۔ ہند نے جواب دیا: ''میں نے اپنے بچوں کو پالا پوسا اور جب وہ جوان ہوئے تو آپؐ نے بدر میں انہیں قتل کر دیا اس لیے آپ ان کے بارے میں بہتر جانتے ہیں''۔ (ابوجعفر الطبری: تاریخ رسول والملوک صفحہ ۱۶۴۲: The Life of Muhammad. P. 553)۔ ہند نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہنے لگی: ''اے اللہ کے رسولؐ! اب میں مسلمان ہوں اس لیے آپؐ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے''۔ اس پر آں حضرتؐ مسکرا پڑے اور آپؐ نے فرمایا: ''بلاشبہ تم آزاد ہو''۔ (محمد ظفر اللہ خان: Islam : Its Meaning for Modern Muslim P. 60)۔ ہند نے بعد میں دیکھا کہ ابوسفیان کے تعاون کے صلے میں اس کے شوہر اور بیٹوں کو امت میں اہم عہدے دیے گئے۔ آخر کار اسی نسل نے اموی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

صفوان اور عکرمہ کے رشتے داروں نے حضورؐ سے ان دونوں کی امان کے لیے درخواست کی اور آپؐ نے انہیں اس شرط پر امان دینے کا وعدہ کر لیا کہ وہ دونوں آپؐ کی قیادت کو تسلیم کر لیں تو شہر میں آزادانہ داخل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا اور عکرمہ نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ اس کے جواب میں آں حضرتؐ نے اس کا نہایت شفقت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور کہا کہ کوئی شخص اس کے باپ ابوجہل کے بارے میں بدگوئی نہ کرے۔ صفوان اور سہیل دونوں نے آپؐ کی اطاعت قبول کر لی لیکن مسلمان نہ ہوئے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے کچھ آدمیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا جن میں حضرت عثمانؓ ابن عفان کا رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بھی شامل تھا۔ سلمان رشدی نے اپنے ناول The Satanic Verses میں عبداللہ کے بارے میں قصہ طرازی کے ذریعے اس کے کردار کو لافانی بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ حضورؐ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(نعوذ باللہ...... مترجم) ایک بے رحم، ظالم اور منتقم مزاج شخص تھے۔ رشدی نے اصل قصے کو غلط انداز میں پیش کیا ہے جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ نے ۶۲۲ عیسوی میں مدینہ ہجرت کی لیکن بعد میں اسلام کو چھوڑ کر مشرک و مرتد ہو گیا اور واپس چلا گیا۔ اسے کاتب وحی مقرر کیا گیا اور اس نے مذاق یا امتحان کے طور پر قرآن حکیم کی ایک آیت میں معمولی تبدیلی کر دی تھی۔ حضورؐ نے جب اس کو وحی کے یہ الفاظ علیم السمیع لکھوائے (اللہ جاننے والا اور سننے والا ہے) تو عبداللہ نے ان الفاظ کے بجائے علیم الحکیم (اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے) لکھ دیا۔ بعد میں وہ مرتد ہو کر واپس مکہ چلا گیا جہاں قریش نے اس کہانی میں زیب داستاں کے لیے کئی روایات شامل کر کے اسے خوب اچھالا۔ قرآن کریم نے آں حضرتؐ پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وحی کے مقدس الفاظ میں اپنی مرضی سے کوئی ردوبدل کیا گیا تو اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ خدا کے پیغام کو پوری طرح محفوظ کرنے میں بے حد محتاط تھے۔ عبداللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا ہے تو وہ بھاگ کر حضرت عثمانؓ کی پناہ میں آ گیا جہاں وہ فتح مکہ کی سرگرمیاں ماند پڑنے تک ان کی امان میں رہا۔ پھر حضرت عثمانؓ اسے لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی جان بخشی کے لیے درخواست کی۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ کو امان دینے سے پہلے رسول اللہؐ خاصی دیر تک خاموش رہے، پھر فرمایا: ''اچھا!'' ان کے جانے کے بعد آں حضرتؐ نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا: ''میں اس لیے خاموش ہو گیا کہ تم میں سے کوئی اٹھ کر تلوار سے اس کی گردن اڑا دے گا''۔ ایک انصاری بولے: ''یارسول اللہ! کیا آپ کا روئے سخن میری طرف تھا''۔ آپؐ نے فرمایا: ''دیکھو، نبی اشارے سے قتل نہیں کرتا''۔ جان بخشی کے بعد عبداللہ نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد اسلامی سلطنت میں اسے ایک اعلیٰ منصب دے دیا گیا۔

فتح مکہ آخری فتح تھی جب کہ بدر اور حدیبیہ کی فتوحات کو ابتدائی حیثیت حاصل تھی۔ اصل میں لفظ فتح کے لغوی معنی کھولنا کے ہیں جسے بعد میں سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی کیونکہ اس فتح نے اسلام کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ کو فتح کر کے نبوت کے دعوے کو درست ثابت کر دیا۔ لیکن یہ فتح کسی خوں ریزی کے بغیر حاصل ہو گئی اور حضورؐ کی پرامن پالیسی کامیاب ثابت ہوئی۔ ایک سال کے اندر اندر مکہ میں کفر و شرک کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور عکرمہ اور سہیل جیسے سخت دشمن بھی اسلام کے سچے اور مخلص پیروکار بن گئے۔

آں حضرتؐ اس فتح سے زیادہ دیر تک استفادہ نہ کر سکے کیونکہ آپؐ نے سنا کہ قبیلہ ہوازن کی فوج طائف میں جمع ہو گئی ہے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے عزیٰ کے بت کو تباہ کرنے کے لیے حضرت خالدؓ کو نخلہ بھیجا تھا۔ بعد میں آپؐ نے ایک دستے کو حضرت علیؓ کی قیادت میں ہدیل روانہ کیا تاکہ وہ وہاں موجود منات کے معبد کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قلع قمع کر دیں۔ قبیلہ بنو ثقیف اور اس کے اتحادیوں نے لات کو بچانے کے لیے بیس ہزار آدمیوں کے لشکر کو وہاں بھیجا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی جس میں سب کچھ ختم ہو سکتا تھا تاہم نومسلم قریش حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ طائف اور ہوازن ان کے پرانے دشمن تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ کے فاتح کی حیثیت سے راتوں رات شہر کی محبوب ترین شخصیت بن گئے۔ دونوں فوجیں فتح مکہ کے پندرہ دن بعد جنوری ۶۳۰ عیسوی کے آخر میں حنین کی وادی میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ لڑائی کے دوران مسلمان تقریباً شکست سے دوچار ہو چکے تھے لیکن آخری لمحوں میں مسلمانوں نے دشمن پر ایک نیا حملہ کر دیا جس سے کفار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بہت سے مشرکین پہاڑوں میں چھپ گئے اور بعضوں نے طائف کے فصیل دار شہر میں پناہ لے لی۔ آں حضرتؐ نے شہر کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپؐ کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اس وقت شہر کو فتح کرنا ممکن نہیں چنانچہ آپؐ وہاں سے واپس چلے آئے۔

غزوہ حنین کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے سوال پر تنازع کھڑا ہو گیا اور امت دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ حضورؐ نے ابوسفیان، صفوان اور سہیل جیسے سابق دشمنوں کے دل جیتنے کے لیے انہیں مال غنیمت میں زیادہ حصہ دے دیا۔ اس سے صفوان اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ ایسی روح کسی پیغمبر کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی''۔ صفوان پکار اٹھے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں''۔ (Lings: Muhamamd P. 311)۔ سہیل بھی مسلمان ہو گئے۔ وہ شروع سے ایک مذہبی شخص تھے چنانچہ نومسلموں میں ان کا دینی جوش و خروش سب سے بڑھ گیا۔ اس بظاہر جانب داری سے حضورؐ کے دیرینہ ساتھیوں کی حوصلہ شکنی ہوئی جو ایک فطری بات تھی۔ انصار نے خاص طور پر یہ محسوس کیا کہ چونکہ آں حضرتؐ قریش کے ساتھ دوبارہ مل گئے ہیں، اس لیے اب آپؐ انہیں چھوڑ کر یہ بھول جائیں گے کہ اوس اور خزرج نے آپؐ کو اس وقت پناہ دی تھی جب آپؐ ایک بے یار و مددگار مہاجر کی حیثیت سے مدینہ آئے تھے۔ اس موقعے پر رسول اللہؐ نے ایک نہایت رقت انگیز تقریر کر کے صورت حال کو خراب ہونے سے بچا لیا۔ حضورؐ نے ان تمام باتوں کا اعتراف کیا جو اہل مدینہ نے آپؐ کے لیے کی تھیں۔ آپؐ نے انصار سے یہ وعدہ بھی کیا کہ آپؐ زندگی کے آخری لمحوں تک مدینہ ہی میں قیام کریں گے۔ جب حضورؐ نے آخر میں دعا کی تو انصار کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں:

اے گروہ انصار! تم دنیا کی حقیر شے کے لیے غمگین اور رنجیدہ ہو گئے۔ اس سے میں نے کچھ لوگوں کی دلداری کرنا چاہی تاکہ وہ اسلام لے آئیں جب کہ تمہیں میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کر دیا۔ اے گروہ انصار! کیا تم اس بات سے خوش نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے کجاووں میں اللہ کے رسولؐ کو لوٹا کر لے جاؤ! پھر قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا اور اگر لوگ ایک گھاٹی میں اور انصار دوسری گھاٹی میں چلتے تو میں انصار کی گھاٹی میں چلتا۔ اے خدا انصار پر، ان کی اولاد پر اور ان کی اولاد کی اولاد پر اپنا رحم فرما! (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۸۸۶: The Life of Muhammad P. 596)۔

اس سے انصار مطمئن ہو گئے۔ مال غنیمت کی تقسیم اور ہوازن کی اطاعت گزاری کے بعد رسول اللہؐ نے مسلمان فوج کے ساتھ عمرہ ادا کیا اور پھر مدینہ لوٹ آئے۔

عرب میں پرانے قبائلی نظام کا انحصار مختلف گروپوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھنے پر تھا۔ بدلہ لینے کے ضابطے میں اس بات کو یقینی بنایا گیا تھا کہ اگر ایک قبیلے کے کسی فرد کو قتل کر دیا جاتا تو قتل کے ذمے دار قبیلے کو بھی اتنا ہی نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ آپؐ نے اس نظام کو کنٹرول کر کے عرب میں قیام امن کی راہ ہموار کر دی۔ اب خانہ بدوش قبائل کے پاس دو ہی راستے تھے: یا تو وہ حضورؐ کے اتحادی اور حلیف بن جاتے یا مسلسل بڑھتی ہوئی مسلم قوت کے ساتھ اپنا طرز عمل بہتر بنا لیتے۔ اگلے دو برسوں میں یکے بعد دیگرے کئی قبیلوں نے حضورؐ کی خدمت میں اپنے وفد مدینہ بھیجے۔ ان سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ اپنے بتوں کو نابود کر دیں گے، ضرورت پڑنے پر فوجی دستے مہیا کریں گے، امت مسلمہ اور اس کے اتحادی قبیلوں پر حملے نہیں کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ بہت سے بدو قبائل نے اسلام قبول کر لیا لیکن کئی قبیلے دل سے پرانے مذہب پر قائم رہے۔ آں حضرتؐ اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے، اس کے باوجود آپؐ نے دین اسلام کو جبراً نافذ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آپؐ کو توقع تھی کہ سیاسی اطاعت گزاری کے نتیجے میں لوگ آخر کار مخلص مسلمان بن جائیں گے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی دوسرے کی امداد کے بغیر دنیا کو اسلام کا پیغام امن پہنچا دیا۔

لیکن جنگ اور جنگی مہمیں عربوں کے طرز زندگی کا اہم حصہ تھیں اور جارحیت کی عادت ان کی فطرت میں شامل تھی۔ رسول کریمؐ نے محسوس کیا کہ داخلی امن برقرار رکھنے کے لیے بیرونی استحکام بھی ناگزیر ہے۔ جوں جوں مزید قبیلے ملت اسلامیہ میں شامل ہوتے گئے یا اس کے اتحادی بنتے گئے، وہ مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ ہوتے گئے۔ اس طرح حضورؐ نے مسلمانوں کی قوت کو مجتمع کر کے ان شمالی قبیلوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جو اسلام کے لیے مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مسیحی یورپ بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار تھا جب کلیسا نوابوں اور جاگیرداروں کو ایک دوسرے پر حملے کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے خدائی امن کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ آخر ۱۰۹۵ عیسوی میں پوپ اربن ثانی نے راہبوں کی مجلس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسائیوں پر زور دیا کہ وہ ارض مقدس میں اپنے مشترک دشمن کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اس طرح صلیبیوں نے ''کافر'' مسلمانوں کے خلاف جو پہلی صلیبی جنگ لڑی، اسے مغرب میں خدائی امن اور مشرق وسطیٰ میں خدا کے نام پر جنگ کا نام دیا گیا۔

اکتوبر ۶۳۰ عیسوی میں حضورؐ نے ایک نئی مہم کا اعلان کیا اور سابق معمول کے برعکس اس مرتبہ مسلمانوں پر واضح کر دیا گیا کہ وہ بازنطینی سرحد پر جا رہے ہیں تاکہ طویل سفر کے لیے مناسب تیاریاں کر لیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ رسول اللہؐ اس مہم پر، جو عام فہم و ادراک سے باہر تھی، کیوں اصرار کر رہے تھے؟ یہ گرمیوں کا موسم تھا، کھجور کی فصل اٹھانے کے لیے تیار تھی اور مسلمان بازنطینی فوج سے خوف زدہ تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ آپؐ شام اور فلسطین پر حملے کی پیشگی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اصل میں آپؐ موتہ کی شکست کا انتقام لینا یا عرب کے شمالی علاقوں میں اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ بیشتر مسلمانوں نے اس مہم کے لیے تیاریوں کا آغاز کر دیا لیکن بعضوں نے حیلے بہانے تراشنا شروع کر دیے اور کئی ایک نے تو آپؐ کے ساتھ جانے سے بھی انکار کر دیا۔ توقع کے مطابق منافقین تذبذب کا شکار تھے جب کہ نئے خانہ بدوش اتحادی قبیلوں نے مہم پر جانے سے معذرت کر لی۔ کئی مسلمان بھی گھروں میں رہ کر کھجور کی فصل سے دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس غزوہ پر اعتراض کرنے والوں میں بعض اہم صحابہؓ بھی شامل تھے یہاں تک کہ حضرت علیؓ بھی مدینہ میں رکے رہے تاہم کئی دوسرے ذریعوں کا دعویٰ ہے کہ انہیں حضورؐ نے اپنی غیر حاضری کے دوران اہل خاندان کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ آخر کوئی تیس ہزار افراد کا لشکر شمال کی جانب روانہ ہو گیا۔ نوے کے قریب مرد گھروں میں رہ گئے۔ ممکن ہے کہ وہ حضورؐ کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے پیچھے رہ گئے ہوں۔ بعض لوگوں کو قدرتی طور پر اس بات کا دکھ ہوا ہوگا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں حقیقی انصار اور مہاجرین کو نظر انداز کر کے ابوسفیان جیسے لوگوں کو عزت و احترام اور قیمتی تحائف سے نوازا گیا تھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی جماعت کے اصلی حمایتی اپنی تحریک کی ابتدائی مثالیت پسندی سے چمٹے رہنے کے باعث مسئلہ بن جاتے ہیں اور وہ بعد میں آنے والے لوگوں کو، جو عموماً موقع پرست ہوتے ہیں، شک و شبے کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے نہایت دانشمندی سے ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں آپؐ کے پرانے دشمنوں میں بھی اسلام کے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ خود امت میں کئی مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس رویے کا اظہار غزوہ تبوک میں شامل ہونے والے مسلمانوں کے طرز عمل سے بھی ہوتا ہے۔ ابن ابی کے کیمپ میں بھی شکوے شکایتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کئی لوگ قصداً پیچھے رہ گئے جب کہ کچھ لوگ طاقتور بازنطینی فوج کا مقابلہ کرنے سے گریزاں تھے۔ رسول اللہؐ نے جب ان بڑبڑانے والوں سے پوچھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: ''ہم تو محض ہنسی مذاق کر رہے تھے یا رسول اللہؐ!''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے، آں حضرتؐ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ (اگر آپؐ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یوں ہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسولؐ ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لیے رہ گئے ہیں۔ (سورہ التوبہ آیت ۶۵..... مترجم)۔

آخر مسلم سپاہ مدینہ سے ۲۵۰ میل شمال مغرب میں تبوک کے مقام پر پہنچ گئی اور حضورؐ نے دس روز تک وہاں قیام کیا۔ اتنی بڑی فوج کے ساتھ بازنطینیوں کی دہلیز پر دس دن تک قیام کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے علاقے میں رہنے والے خانہ بدوش قبائل بہت متاثر ہوئے۔ رسول کریمؐ نے تبوک میں قیام کے دوران مقامی حکمرانوں کے ساتھ کئی معاہدے کیے۔ ایلات کے عیسائی بادشاہ یوحنانے، جو اس علاقے کا حکمران تھا جہاں اب جدید اسرائیل قائم ہے، آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کر لی اور جزیہ دیا۔ اسی طرح بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع یہودیوں کی تین بستیوں نے، جو اس وقت اردن اور مقناع میں ہیں، جزیہ دے کر مصالحت کر لی۔ حضورؐ نے حضرت خالدؓ کو ایک مختصر دستہ دے کر دومتہ الجندل روانہ کیا اور وہاں کے حاکم اکیدر نے، جو مذہباً نصرانی تھا، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔

یہ ایک معقول اور اہم کامیابی تھی اور آں حضرتؐ جب واپس مدینہ آئے تو نہایت مسرور اور پر اعتماد تھے۔ مدینہ سے باہر اپنی ریاست کی بنیاد مستحکم بنانے کی غرض سے آپؐ نے ملت اسلامیہ کی صفوں میں انتشار کو ختم کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ لیکن واپسی کے سفر میں بھی گلے شکووں اور مخالفت کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک موقع پر آپؐ کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرانے کی بھی سازش کی گئی تاہم آپؐ بحفاظت مدینہ پہنچ گئے۔ نخلستان سے روانگی سے پہلے آں حضرتؐ سے قبا کے مقام پر تعمیر ہونے والی ایک نئی مسجد میں نماز پڑھانے کی درخواست کی گئی لیکن آپؐ نے یہ فیصلہ واپسی تک موخر کر دیا تھا۔ اب آپؐ کو یقین ہو گیا کہ یہ مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں بھی ارشاد ہے کہ جن لوگوں نے مسجد ضرار تعمیر کی، حضورؐ کے پرانے دشمنوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے اور وہ آپؐ کی کامیابیوں کو برداشت نہیں کر رہے تھے۔ (اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لیے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں تفرقہ ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس سے پہلے سے اللہ اور رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ (سورہ التوبہ آیت ۱۰۷..... مترجم)۔ چنانچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے دو آدمیوں کو قبا بھیج کر مسجد ضرار کو آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ اگلی صبح آپؐ نے مدینہ میں رک جانے والوں کے طرز عمل کی تحقیقات کی۔ کئی لوگوں نے آپؐ سے فوراً معافی مانگ لی اور معقول عذر پیش کیے۔ آخر تین افراد سے دو ماہ کے لیے قطع تعلق کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب اسلام کی مخالفت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ تبوک سے واپسی کے بعد احترام اور صلح کی علامت کے طور پر آپؐ اپنے پرانے دشمن ابن ابی کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ کفار اور مشرکین کی مخالفت اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ جنوری ۶۳۱ عیسوی میں بت پرستوں کے مضبوط قلعے طائف کو بھی محاصرے کے ایک سال بعد مجبوراً ہتھیار ڈالنا پڑے۔ غزوہ حنین کے بعد ہوازن کو بھی، جو حضورؐ کے حلیف بن گئے تھے، اسلام کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ طائف سے آنے والے وفدوں نے صلح کے لیے رسول اللہؐ سے خصوصی مراعات حاصل کرنے کی درخواست کی۔ یہ تاجر لوگ تھے اور اکثر سفر میں رہتے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ کاروباری سفر کے دوران انہیں غیر عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی جائے، وہ اپنے انگور کے باغوں سے حاصل ہونے والی شراب بھی پینا چاہتے تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے لات کے بت کدے کو مزید چھ برس یا کم سے کم ایک سال کے لیے برقرار رکھنے کی بھی درخواست کر دی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہل طائف کی یہ تینوں درخواستیں مسترد کر دیں۔ آپؐ نے انہیں صرف یہ رعایت دی کہ وہ لات کے معبد کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر کے اپنے لوگوں کے غیظ وغضب کا نشانہ نہ بنیں چنانچہ آں حضرتؐ نے اس بت کدے کو گرانے کے لیے اپنی طرف سے ابوسفیانؓ کو طائف بھیج دیا۔

ابوسفیانؓ، جو پانچ سال تک رسول اللہؐ کے خلاف لڑتے رہے تھے اور جو میدان جنگ میں لات کا نعرہ لگاتے تھے، ان کی طرف سے لات کے معبد کو گرانا اس بات کی واضح علامت تھی کہ عرب سے بت پرستی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ہے۔ بت پرستی اور عربوں کا کئی صدیوں سے ساتھ رہا لیکن اب وہ خانہ بدوشی کے بجائے مستقل سکونت اختیار کرنے اور ساتویں صدی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں ان کی معاونت کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ سماجی تبدیلی کی داخلی حرکی قوتیں اب حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کامیابی ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔ آپؐ نے کامل فتح سے ہمکنار ہونے کے لیے صرف روحانی وجدان پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ قرآن کے رہنما اصول کی روشنی میں تمام دستیاب وسائل اور اعلیٰ فطری ذہانت کو بھی استعمال کیا۔ لیکن ۶۳۱ عیسوی میں حضورؐ بوڑھے ہو چکے تھے اور آپؐ کی صحت گرنے لگی تھی۔ کیا امت آپؐ کی رحلت کے بعد اپنا وجود برقرار رکھ سکے گی؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسواں باب

پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت؟

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ۶۲۲ عیسوی میں جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تھی تو یہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی طرف آپؐ کا پہلا قدم تھا۔ دس سال بعد آپؐ کی سلطنت تقریباً پورے عرب پر پھیل چکی تھی۔ حضورؐ نے اس سلطنت کے لیے ایسی مستحکم سیاسی بنیادیں استوار کیں کہ مسلمان ایک ہزار برس تک وسیع وعریض سلطنت پر حکمرانی کرتے رہے۔ آں حضرتؐ کی یہ سیاسی کامیابی انتھک جہدِ مسلسل اور مدینہ کے پر آشوب برسوں میں طویل جدوجہد کا ثمر تھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدائی پلان کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل نو کس قدر کٹھن، خطرناک اور جان گسل کام ہے۔ خدا کے الہامی لفظوں کو انسانی زبان میں قابلِ فہم بنانے کے لیے حضورؐ کو بڑی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اس الہامی کلام کے زیرِ اثر آپؐ کو ناقابلِ بیان بوجھ اٹھانا پڑتا۔ انسانی معاشرے میں خدائی الفاظ کو عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی بے مثل صبر و استقامت اور شاندار طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران وہ مایوسیوں کی انتہا کو بھی پہنچ گئے اور ایسی نوبت بھی آئی جب یہ گمان ہونے لگا کہ وہ حضورؐ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیں گے۔ لیکن آپؐ کی کامیابی سے ثابت ہوگیا کہ آپؐ کی غیر معمولی اور متنازع پالیسیاں درست تھیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدر کے مقام پر مشرکین کے خلاف جنگ لڑنے، یہودی قبائل کو مدینہ سے نکال باہر کرنے، انہیں قتل کرنے یا حدیبیہ میں صلح کرنے کے سلسلے میں جو بھی فیصلے کیے، وہ براہِ راست خدائی احکام کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ اس ضمن میں آپؐ کو دوسروں کی امداد اور رہنمائی حاصل کرنا پڑی اور یہ تمام تر فیصلے رسول اللہؐ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذاتی وجدان، خلقی سمجھ بوجھ اور فہم و فراست کے آئینہ دار تھے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں سے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ کسی معجزے کے ذریعے انہیں بچالے گا۔ اصل میں اسلام ایک حد درجہ عملی اور حقیقت پسند دین ہے جس کی نظروں میں انسانی ذہانت اور خدائی امداد کامل ہم آہنگی کے ساتھ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ۶۳۲ عیسوی تک ایسا دکھائی دینے لگا تھا کہ عرب میں خدائی منشا اور ارادے کا مکمل اطلاق ہو چکا ہے۔
رسول کریمؐ نے ماضی کے بہت سے پیغمبروں کے برعکس مسلمانوں کو نہ صرف مردوں اور عورتوں میں انفرادی سطح پر امید کا نیا پیغام دیا بلکہ انسانی تاریخ کو اخلاقی پستیوں سے نجات دلا کر بنی نوع انسان کو عدل اور مساوات کے اصولوں پر مبنی استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کی ترغیب دی تاکہ تمام مرد اور عورتیں اپنی خوابیدہ قوتوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ملت اسلامیہ کی سیاسی کامیابی کو مسلمانوں کے نزدیک ایک مقدس درجہ حاصل ہو گیا اور وہ اسے خدا کی غیر مرئی موجودگی کی واضح علامت سمجھنے لگے۔ مسلمان سیاسی سرگرمیوں کو ایک مقدس فریضہ تصور کرتے تھے اور بعد میں اسلامی سلطنت کی کامیابی کو اس بات کی روشن دلیل سمجھا جاتا تھا کہ پوری انسانیت کو بحیثیت مجموعی گناہوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرح گیلیلی کے پہاڑوں کے ارد گرد انوکھی وضع قطع اختیار کر کے تبلیغ اور بیماروں کو شفایاب نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس حضورؐ کو معاشرے میں اعلیٰ اقدار کی روشنی میں اصلاحات کرنے کے لیے انتھک سیاسی جدوجہد کرنا پڑی۔ آپؐ کے جاں نثاروں نے بھی اس ارفع نصب العین کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ ابتدائی عیسائیوں کی طرح صرف اپنی زندگیوں کی اصلاح کرنے کے بجائے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ نے اپنے پورے معاشرے کی نجات کا بیڑا اٹھایا اور اپنی تمام تر توجہ اسی مقصد پر مرکوز کر دی کیونکہ اس نصب العین کو حاصل کیے بغیر اخلاقی یا روحانی ترقی میں پیش رفت ممکن نہیں تھی۔ قرآن کریم میں واضح طور پر یہ عندیہ دیا گیا ہے کہ اس کائنات میں فرد کے ابدی مقدر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور مسلمانوں کے سماجی فرائض سب سے مقدم ہیں۔ تاریخ اور سیاسی سرگرمیاں بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہیں بلکہ ان کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ ان میں خدا کے الہامی نظام اور فلسفے کے کس قدر اثرات موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے ازلی مقدر کو سماجی اصلاح کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔
قرآن مجید میں روز قیامت، دوزخ اور جنت کا بار بار علامتی تذکرہ کیا گیا ہے جس سے اس نکتے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اس حوالے سے اشتراکیت اور اجتماعیت کے برعکس فرد کی آزادیٔ فکر و عمل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ نظریہ عربوں میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا اور ان کے سماجی قوانین میں اس رویے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ قبائلی نظام میں انحطاط کے باوجود قدیم جماعتی نصب العین اور مثالیت پسندی اب بھی موجود تھی اور حضرت محمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس حقیقت کا کامل ادراک تھا۔ چنانچہ آپؐ نے دنیا میں فرد کی انفرادیت کا وہ نظریہ متعارف کرایا جو ہمارے جدید مغربی آزادانہ نصب العین کے لیے باعث تسکین ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ محض نقطہ آغاز تھا اور عرب میں جب تک خوں ریزیوں کے لامتناہی سلسلے اور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ نہ ہوتا، اس وقت تک انفرادی شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔ ایک کرپٹ یا انتشار کا شکار معاشرہ، ماسوائے اولوالعزم افراد کے، لوگوں کو اخلاقی گراوٹ، اضطراب اور مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے چنانچہ ساتویں صدی کا عرب معاشرہ ایک ایسی سماجی اور انفرادی اصلاح کا متقاضی تھا جس سے دنیاوی آلائشوں سے نجات حاصل کر کے روحانی بالیدگی کا سامان میسر ہو سکتا۔

رسول کریمؐ نے مدینہ میں ایک ایسی جماعت پیدا کر لی جو نہایت طاقتور، آزاد اور گردوپیش کے انتشار سے محفوظ و مامون تھی۔ دوسرے قبائلی گروہ بھی، جو حضورؐ کے دینی وژن سے زیادہ مخلص نہیں تھے، مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ ہر چند کہ ملت اسلامیہ کو اپنی بقا کے لیے طاقت اور استحکام کی ضرورت تھی، اس کے باوجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے بڑا مقصد سیاسی قوت نہیں، ایک اچھا معاشرہ تشکیل دینا تھا۔

حضورؐ کی کامیابی سے قرآن مجید کے اس دعوے پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی کہ وہ معاشرے، جن میں نظم وضبط کا فقدان ہو اور جو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلیں، آخر کار تباہی اور بربادی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہؐ جب تبوک سے واپس مدینہ آئے تو بعض صحابہ کرامؓ نے اپنی تلواریں اتار کر رکھ دیں لیکن ایک روایت کے مطابق آں حضرتؐ نے انہیں بتایا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی اور انہیں ایک نئے جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کی رضا اور کامل اطاعت اور خدائی نظام کو رائج کرنے کا عمل کبھی ختم نہیں ہوگا اور انسانوں کو نئے خطرات اور مسائل پر قابو پانے کے لیے ہمیشہ مستعد رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کو کبھی جنگ لڑنا پڑے گی اور کبھی انہیں امن نصیب ہوگا لیکن انہیں انسانی تاریخ اور افراد کو دنیاوی آلائشوں سے، جو اس دنیا کی زندہ حقیقت ہیں [illegible] سونپا گیا ہے اور وہ آج بھی اس فرض کو نہایت سنجیدگی سے ادا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اہل طائف کے بے دلی سے اطاعت قبول کرنے کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے عرب اس نئے نظام کو قبول کرنے میں اب بھی ہچکچا رہے تھے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ بدوی قبائل کی وفاداری مصلحتوں پر مبنی تھی، اس کے باوجود آپؐ کے گرد صحابہؓ کا وسیع حلقہ موجود تھا جو اگرچہ حضورؐ کی تمام باتوں کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ نہ پاتے لیکن بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ آپؐ کے پیغام کے بنیادی مقصد کو پا گئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ شادیوں کے بعد نبی کریمؐ کے گھر کے افراد بن چکے تھے اور اس طرح آپؐ کے ساتھ ان کا روحانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق اور مضبوط ہوگیا۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ دین اسلام ان کی اولیں ترجیح ہے۔ عربوں کو اسلام کی ان تعلیمات اور بنیادی ارکان پر عمل کر کے اپنی زندگیوں میں اصلاح کرنا ہوگی۔ اس سے انہیں خدا کی ذات کو زندگی کا محور بنانے اور معاشرے کے کمزور اور بے کس افراد کی دیکھ بھال کا سبق ملتا تھا۔

رسول اللہؐ کے چوتھے قریبی رشتے دار حضرت علیؓ تھے جو باقی تینوں صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں نوجوان تھے اور وہ بعض اوقات ان معمر افراد کو برداشت نہ کرتے۔ لیکن ۶۳۲ عیسوی میں وہ حضورؐ کے خاندان کے چند زندہ افراد میں شامل تھے۔ حضرت ام کلثومؓ جنگ تبوک کے دوران انتقال کر گئی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اب نبی کریمؐ کی اولاد میں صرف حضرت فاطمہؓ (حضرت علیؓ کی زوجہ محترمہ) بچ گئی تھیں۔ آں حضرتؐ کو حضرت علیؓ کے دو بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ آپؐ ان دونوں بچوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح انہیں سواری کراتے۔ لیکن حضورؐ کا مصری کنیز مریمؑ کے بطن سے بھی ایک بیٹا ہوا تھا اور آپؐ ننھے ابراہیمؑ کو گود میں اٹھا کر مدینہ کی گلیوں میں گھوما کرتے تاہم حضرت عائشہؓ اس بات کو پسند نہ کرتیں: ''کیا تمہارے خیال میں یہ بچہ میرے جیسا نہیں ہے؟'' آں حضرتؐ حضرت عائشہؓ سے دریافت کرتے۔ ''مجھے تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی''۔ وہ پلٹ کر جواب دیتیں۔ ''دیکھو یہ کتنا صحت مند ہے اور اس کا رنگ روپ کس قدر خوبصورت ہے''۔ حضورؐ انہیں جوش دلاتے۔ ''جسے بھی بھیڑ کا دودھ پینے کو ملے، وہ یقیناً صحت مند اور خوبصورت بن جائے گا''۔ حضرت عائشہؓ ترش روئی سے جواب دیتیں۔ (Lings: Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources)۔ حضرت عائشہؓ غالباً حضرت مریمؑ کو روزانہ خصوصی دودھ فراہم کرنے پر ناخوش تھیں۔ اس دیکھ بھال کے باوجود حضرت ابراہیمؑ ۶۳۲ عیسوی کے شروع میں بیمار ہو گئے اور یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ صحت یاب نہیں ہو سکیں گے۔ ابراہیمؑ نے وفات پائی تو حضورؐ ان کے پاس تھے۔ ان کی رحلت پر آں حضرتؐ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور آخری لمحوں میں آپؐ نے انہیں گود میں اٹھا لیا۔ آپؐ نے یہ کہہ کر خود کو دلاسہ دیا کہ وہ جلد ہی ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہوں گے۔

ہجرت کے بعد دسویں سال کے دوران حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شدت کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگے کہ آپؐ کی دنیوی زندگی ختم ہونے کو ہے۔ اگر آپؐ مدینہ میں موجود ہوتے تو رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ہمیشہ گوشہ تنہائی اختیار کرتے۔ اس سال آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ وہ معمول سے زیادہ مدت کے لیے اعتکاف پر بیٹھیں۔ آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کو رازداری سے بتایا کہ آپؐ کے خیال میں آپ کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ ذی الحج کے مہینے میں حضورؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ اس سال آپؐ عازمین حج کے قافلے کی خود قیادت کریں گے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صرف ایک اللہ کو ماننے والے خانہ کعبہ کا طواف اور میدان عرفات میں سعی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر کے مناسک حج ادا کرنے والے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے نئے دین کی بنیادوں کو عربوں کی مقدس روایات میں مستحکم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ آں حضرتؐ فروری ۶۳۲ عیسوی کے آخر میں تمام ازواج مطہراتؓ اور صحابہؓ کے ایک بڑے قافلے کو لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۳ مارچ یعنی ۵ ذی الحج کو مکہ کے باہر پہنچ گئے۔ آپؐ بلند آواز سے پکار رہے تھے: ''لبیک اللّٰھم لبیک! حاضر ہوں۔ اے خدا میں حاضر ہوں''۔ پھر آپؐ عربوں کی پرانی روایات کے مطابق، جو انہیں دل سے عزیز تھیں، حج کے مناسک ادا کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس طرح حضورؐ نے ان مناسک کو نہ صرف نئی اہمیت دی بلکہ ایک منفرد اور تخلیقی برادری کا ماضی کے ساتھ تعلق بھی جوڑ دیا۔

اگر مسلمان مرد یا عورت کے حالات اجازت دیں تو اسے زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فریضہ حج ادا کرنا چاہیے۔ جس طرح کوئی اجنبی مذہبی یا سماجی رسوم عجیب وغریب معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح مناسک حج بھی بظاہر بے مصرف دکھائی دیتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ حج اب بھی مسلمانوں کی روحانی بالیدگی کا اہم ذریعہ ہے اور مسلمان اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ حج ان کی انفرادی اور امت کی اجتماعی روحانی زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ حج کے مناسک اور اعمال میں اسلام کی روحانیت کے تمام اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں کا پوری کاملیت کے ساتھ بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ آج لاکھوں مسلمان ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ تمام حجاج عرب نہیں ہوتے، اس کے باوجود وہ قدیم عرب عبادات کو اپنے طور پر ادا کرتے ہیں۔ یہ حاجی جب روایتی سفید لباس پہن کر رنگ ونسل اور طبقاتی امتیازات سے بالاتر ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں تو وہ اس احساس سے سرشار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کے نمائشی حدود سے آزاد ہو کر صرف ایک امت کے فرد کی حیثیت سے ایک ہی ذات اور ایک ہی مرکز کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ ایران کے مرحوم فلاسفر علی شریعتی نے خانہ کعبہ کے گرد طوافؔ کے دل نشین منظر سے متاثر ہو کر لکھا ہے:

جب آپ کعبۃ اللہ کا طواف کرتے اور اس کے قریب آتے ہیں تو آپ خود کو ایک چھوٹی سی ندی کے مصداق تصور کرتے ہیں جو ایک بڑے دریا میں گر کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ اس لہر کی رو میں بہہ کر زمین کے ساتھ آپ کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اچانک آپ سیلاب کی بلاخیز لہروں کے دوش پر تیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب آپ مرکز کے قریب پہنچتے ہیں تو حاجیوں کا ریلا آپ کو اس قدر تیزی سے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے کہ آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ اب آپ لوگوں کے وجود کا ایک حصہ اور ایک ایسا انسان بن جاتے ہیں جو زندہ اور لافانی ہے۔ خانہ کعبہ دنیا کا سورج ہے جو آپ کے چہرے کو اپنے مدار کی طرف کھینچتا ہے۔ آپ آفاقی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اللہ کے گرد طواف کرتے وقت آپ جلد ہی اپنے وجود کو بھول جاتے ہیں۔ آپ ایک ایسے ذرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو بتدریج گھل کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کامل محبت کا مظہر ہے، ایک ایسی محبت جو اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہو۔ (علی شریعتی: حج صفحات ۴۵ تا ۶۰)۔

یہودی اور عیسائی بھی اجتماعی روحانیت پر زور دیتے ہیں۔ سینٹ پال کا مسیح کے لامحدود جسم کا تصور بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کلیسا اور مسیحی برادری کے افراد محبت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ حج بھی ہر مسلمان کو اللہ کی ذات مطلق کو مرکز بناتے ہوئے ملت اسلامیہ کے ساتھ گہرے ربط کا موقع فراہم کرتا ہے۔

حج ایک لحاظ سے مسلمانوں کو رویے اور مرکز کی بنا پر ایک مثالی جماعت کی شکل دیتا ہے۔ دنیا کے بیشتر مذاہب کے نزدیک امن اور یگانگت حج کا مطمح نظر رہا ہے اور حجاج جب حرم کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں تو انہیں ہر قسم کے تشدد کی ممانعت کر دی جاتی ہے حتیٰ کہ کوئی حاجی نہ تو کسی کیڑے کو مار سکتا ہے اور نہ ہی کسی سے سخت بات کر سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۷ء میں حج کے دوران جب بعض ایرانی عازمین نے فساد برپا کیا جس میں ۴۰۲ افراد جاں بحق اور ۶۹۴ زخمی ہو گئے تھے تو عالم اسلام کے طول و عرض میں ان کی اس کارروائی پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا۔

قرآن کریم میں تمام مخلوقات کے خدا کی جانب لوٹنے کی بار بار تکرار کی گئی ہے اور حج خدائے برحق کی طرف مسلمانوں کی واپسی کے سفر کا طاقتور مظاہرہ ہے۔ حاجی بلند آواز میں مل کر تلبیہ کا نعرہ لگاتے ہیں جس سے ان میں ایک فرد اور ایک امت کی حیثیت سے اللہ کے حضور پیش ہونے کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ حج کے دنوں میں مسلمان دوسرے تمام معاملات کو پس پشت ڈال کر معمول کے مقابلے میں زیادہ شدت کے ساتھ اس احساس سے سرشار ہوتے ہیں۔ ۶۳۲ عیسوی میں جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خانہ کعبہ میں مہاجرین، انصار اور خانہ بدوشوں کی قیادت کر رہے تھے، اس وقت ان کے ذہنوں میں اللہ کی طرف واپسی کے سفر کا تصور پوری طرح جاگزیں ہوگا۔ تمام مقدس مقامات کی زیارت کرنے والے لوگ اپنے وجود کی اصلیت یا کائنات کے آغاز کی طرف مراجعت کرتے نظر آتے ہیں۔ مہاجرین مکہ میں اپنے گھروں کی جانب لوٹنے کا احساس خاص طور پر نمایاں تھا۔ لیکن حضورؐ تمام عربوں کو یہ یاد دہانی کرا رہے تھے کہ وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ رہے ہیں کیونکہ خانہ کعبہ کی تعمیر ان کے آباء واجداد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر کی تھی۔ مسلمان آج بھی کعبۃ اللہ میں اپنے حقیقی مسلم تشخص کی طرف واپسی کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ وہ قدرتی طور پر رسول اللہؐ کو یاد کرتے ہیں تاہم حج کے سب مناسک بنیادی طور پر تمام سچے توحید پرستوں کے اجداد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے منسوب ہیں۔ چنانچہ مسلمان جب صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے سعی کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں پیاسے اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں بے قراری سے دوڑتی ہوئی حضرت ہاجرہؑ کی یاد تازہ ہوتی ہے جنہیں حضرت ابراہیمؑ اس بیاباں میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ مکہ سے سولہ میل دور واقع میدان عرفات میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں پہلے پیغمبر اور نسل انسانی کے باپ حضرت آدمؑ اور اللہ نے عہد و پیمان باندھا تھا۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت بھی حجاج ماضی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ منیٰ میں وہ تین ستونوں پر کنکریاں مار کر خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے عہد کی تجدید کرتے ہیں۔ پھر وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے خدا کی رضا کے لیے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کی یاد میں بھیڑ یا جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان جو فریضہ حج ادا نہ کر سکیں، مقررہ وقت پر جانور کی قربانی کر کے اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ پوری ملت اسلامیہ ہر چیز یہاں تک کہ اپنی متاع عزیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

نبی کریمؐ نے ۶۳۲ عیسوی میں میدان عرفات میں جس مقام پر کھڑے ہو کر خطبہ حجۃ الوداع دیا تھا، آج اس کے قریب مسجد نمرہ کھڑی ہے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے، عورتوں سے حسن سلوک اور دور جاہلیت کی خونیں عداوتوں کو ختم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ آں حضرتؐ نے فرمایا: ''امت ایک ہے، خوب سمجھ لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں لہٰذا کسی بھی آدمی کے لیے اپنے بھائی کی کوئی چیز حلال نہیں بجز اس کے کہ وہ بطیب خاطر کوئی چیز خود دے دے، پس تم لوگ اپنے آپ پر کسی بھی حالت میں ظلم نہ کرنا۔ لوگو! بتاؤ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہ، صفحہ ۹۲۹: The Life of Muhammad. P 651)۔ یہ خطبہ کوہِ زیتون کے وعظ یا سینٹ پال کے خیرات سے متعلق مذہبی گیتوں سے بظاہر قدرے مشابہت رکھتا ہے لیکن اصل میں ان سے بہت مختلف ہے۔ رسول کریمؐ ایک حقیقت پسند انسان تھے اور آپؐ جانتے تھے کہ آپؐ مسلمانوں سے ایک ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں جو انقلابی نوعیت کی ہے۔ جس طرح کعبہ کا اللہ ایک تھا، اسی طرح عرب مسلمان بھی مختلف قبائل کے بجائے ایک امت تھے۔

حجۃ الوداع کے بعد واپس مدینہ آنے پر حضورؐ کو وقفے وقفے کے ساتھ شدید سر درد ہونے لگا۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز انہیں بھی سر درد ہوا اور وہ اپنے حجرے میں لیٹی ہوئی ''ہائے سر ہائے سر'' کہہ رہی تھیں تو آں حضرتؐ تشریف لائے اور آپؐ نے فرمایا: ''عائشہ! خدا کی قسم! میرے سر میں بھی درد ہے''۔ لیکن اس وقت بھی آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو تنگ کرنے کے لیے فرمایا: ''تمہارا کیا نقصان ہوتا اگر تم مجھ سے پہلے مر جاتیں، میں تمہیں کفن پہناتا اور نماز پڑھاتا، تمہیں دفن کرتا''۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے کہا: ''ایسا ہوتا تو آپ لوٹ آتے اور میرے گھر پر کسی بیوی کو لا کر رکھتے''۔ ''نہیں عائشہ!'' اس کے بعد رسول اللہؐ حجرے سے باہر چلے گئے: ''ہائے میرا سر'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۰۰: The Life of Muhammad. P. 578)۔

نبی کریمؐ پر مرض نے شدت اختیار کر لی اور آپؐ کو بے ہوشی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ لیکن آپؐ مستقل طور پر بستر پر نہ لیٹے۔ بعض اوقات آپؐ سر پر کپڑا لپیٹ کر نماز کی امامت کرانے یا مسلمانوں سے خطاب کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسجد میں چلے جاتے۔لیکن ایک صبح آپؐ نے شہدائے احد کے لیے خاص طور پر طویل دعا مانگی اور فرمایا: ''اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اس دنیا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، کے درمیان اختیار دیا کہ چاہو تو دنیا لے لو اور چاہو تو ماعند اللہ قبول کرو اور اس بندے نے ماعند اللہ اختیار کر لیا ہے''۔صحابہ کرامؓ میں وہ واحد شخص جو حضورؐ کی وفات کا عندیہ سمجھ گئے، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے چنانچہ وہ زاروقطار رونے لگے۔''ابوبکر! سہولت سے کام لو''۔ آں حضرتؐ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۰۶ :The Life of Muhammad. P. 679)۔

آخر میں حضرت میمونہؓ کے حجرے میں آپؐ پر مرض نے شدت اختیار کر لی۔ پھر آپؐ کی تمام ازواج مطہراتؓ اور کچھ مسلمان عورتیں آپؐ کے گرد جمع ہوگئیں اور آپؐ مسلسل یہ پوچھتے جا رہے تھے: ''کل میں کہاں ہوں گا؟ کل میں کہاں ہوں گا؟'' ازواج مطہراتؓ نے محسوس کر لیا کہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس جانے کے خواہش مند ہیں چنانچہ سب نے متفقہ طور پر حضورؐ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں منتقل کر دیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموشی کے ساتھ وہاں لیٹے رہے اور آپ کا سر حضرت عائشہؓ کی گود میں تھا۔لیکن لوگوں نے سمجھا کہ یہ ایک عارضی علالت ہے کیونکہ آپؐ اب بھی باقاعدگی سے مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔امت کے لیے آپؐ کی رحلت کا تصور اس قدر ناقابل برداشت اور ہولناک تھا کہ صحابہ کرامؓ آخری وقت کی واضح علامتوں کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے تاہم حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کو خبردار کر دیا کہ اب حضورؐ زیادہ دیر تک اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔رسول اللہؐ نے عرب میں جو مقام حاصل کیا تھا، وہ بے نظیر اور اپنی مثال آپ تھا، اس لیے اس نئے نظام میں حضورؐ کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ آں حضرتؐ ایک دن جب سر پر پٹی باندھ کر مسجد میں تشریف لائے اور آپؐ نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ حضرت زیدؓ کے نوجوان بیٹے حضرت اسامہؓ شمال کی جانب مہم کی قیادت کے لیے پوری طرح اہل ہیں تو صحابہ کرامؓ کو آپؐ کی صحت کے حوالے سے امید کی کرن نظر آ گئی۔ جب آپؐ زیادہ بیمار ہوگئے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ وہ امامت کر کے نماز پڑھا دیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ تک نے آپؐ کے اس فیصلے کی مزاحمت کی۔آخر حضورؐ کو فیصلے پر عمل درآمد کے لیے سختی سے کہنا پڑا۔حضرت عائشہؓ نے بعد میں بتایا: ''خدا کی قسم! میں یہ صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ میں چاہتی تھی یہ معاملہ ابوبکرؓ سے ہٹا لیا جائے کیونکہ میں جانتی تھی کہ لوگ یہ بات کبھی پسند نہ کریں گے کہ آپ کا قائم مقام کوئی دوسرا آدمی ہو''۔ اس کے باوجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابوبکرؓ کے پہلو کی طرف بیٹھ کر خاموشی سے نماز ادا کرتے رہے جس سے لوگوں کی ڈھارس بندھ گئی۔

۱۲ ربیع الاول ۸ جون ۶۳۲ عیسوی کو جب دوشنبہ کا دن ہوا تو رسول کریمؐ سر پر پٹی باندھے مسجد میں تشریف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لائے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ جب آں حضرتؐ باہر نکلے تو لوگوں نے ہنسنا اور کھلنا شروع کر دیا۔ ابوبکرؓ سمجھے کہ لوگوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ محض رسول اللہؐ کے لیے کیا ہے اس لیے انہوں نے نماز پڑھانے کی جگہ سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ حضورؐ نے ابوبکرؓ کی پشت پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''نماز پڑھاتے رہو''! چنانچہ آپؐ نے ان کے دائیں طرف بیٹھ کر نماز پڑھی۔ آپؐ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں واپس چلے گئے اور ان کی گود میں سر رکھ کر خاموشی سے لیٹ گئے۔ حضورؐ کی طبیعت اس قدر بہتر معلوم ہونے لگی کہ ایک صحابی (عبداللہ بن زمعہ...... مترجم) کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو اس وقت سے زیادہ اچھی حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپؐ کا چہرہ مبارک معمول سے زیادہ روشن دتاباں تھا۔ آپؐ کو دیکھ کر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے، جو ابھی تک مدینہ کے دوسری طرف رہتے تھے، آپؐ سے کہا: ''اے نبی اللہؐ! میں دیکھتا ہوں کہ اب آپؐ پر اللہ کا فضل و کرم ہے، جیسا کہ ہم لوگ چاہتے تھے۔ آج کا دن بنت خارجہ کا ہے (ابوبکرؓ کی نئی بیوی...... مترجم) تو کیا میں اس کے پاس چلا جاؤں؟''۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے ابوبکرؓ کو اجازت دے دی۔ سہ پہر کو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ نے حضورؐ سے ملاقات کے بعد لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ آپؐ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں: ''عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ایک ہری مسواک تھی۔ آپؐ نے اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ میں سمجھ گئی، آپؐ اسے لینا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ: کیا آپؐ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہ مسواک آپؐ کو دوں۔ فرمایا: ہاں! میں نے مسواک لے لی، اسے خوب چبا کر نرم کر دیا اور آپؐ کو دے دی۔ پھر آپؐ نے اس سے اسی طرح مسواک کی جس طرح کہ میں ہمیشہ آپؐ کو کرتے دیکھتی تھی۔ پھر آپؐ نے اسے رکھ دیا اور اب میں نے محسوس کیا کہ رسول اللہؐ میری گود میں بھاری ہوتے جا رہے ہیں۔ میں آپؐ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی تو دیکھتی کیا ہوں کہ آپؐ کی آنکھیں چڑھ گئی ہیں اور آپؐ فرما رہے ہیں: اے خداوند! اے میرے بہترین ساتھی! اس پر میں نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا، آپؐ کو اختیار دیا گیا اور آپؐ نے اس چیز کو منتخب کر لیا۔ دیکھا تو رسول اللہؐ کی روح قبض ہو چکی تھی۔ جس وقت آپؐ کی وفات ہوئی، آپؐ میرے سینے اور گلے کے درمیان تھے اور میرے گھر میں تھے۔ وفات کے بعد میں نے آپؐ کا سر تکیے پر رکھ دیا اور کھڑے ہو کر عورتوں کے ساتھ سینہ کوٹنا اور ہاتھ چہرے پر مارنا شروع کر دیا۔''

(محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۱۱: The Life of Muhammad. P. 682)۔

مسلمانوں نے عورتوں کی گریہ وزاری کو سنا تو وہ شدت غم سے نڈھال ہو کر زرد چہروں کے ساتھ تیزی سے مسجد میں جمع ہو گئے۔ حضورؐ کے انتقال کی خبر پورے نخلستان میں فوراً پھیل گئی اور حضرت ابوبکرؓ جلدی سے واپس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آ گئے ۔ انہوں نے رسول خداؐ کے چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالی، آپؐ کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیا اور کہا: ''آپؐ پر میرے ماں باپ قربان! جو موت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مقدر کی تھی، وہ آ گئی، اس کے بعد آپؐ موت کی تکلیف کبھی نہیں اٹھائیں گے''۔ پھر ابو بکرؓ نے آں حضورؐ کے چہرے پر چادر الٹ دی اور نکل کر باہر آ گئے۔ اس کے بعد وہ مسجد میں گئے جہاں عمرؓ مسلمانوں سے خطاب کر رہے تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا ہے۔ عمرؓ نے کہا: ''رسول اللہؐ کی روح عارضی طور پر آپؐ سے جدا ہوئی ہے۔ آپؐ یقیناً اپنی قوم میں واپس آئیں گے اور سب سے آخر میں انتقال کریں گے''۔ حضرت عمرؓ کے چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار دیکھ کر ابو بکرؓ نے کہا: ''عمر! سہولت سے کام لو، خاموش ہو جاؤ''۔ لیکن حضرت عمرؓ نہ مانے اور تقریر کرتے رہے، ابو بکرؓ نے جب یہ دیکھا کہ عمرؓ خاموش ہی نہیں ہوتے تو وہ آہستہ سے آگے بڑھے۔ لوگ ابو بکرؓ کے چہرے کے تاثرات اور ان کے پرسکون انداز سے متاثر ہوئے اور حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ حضورؐ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرتے ہوئے گزری ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کو بار بار خبردار کیا گیا ہے کہ وہ کسی مخلوق کو خدا کا مرتبہ نہ دیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زندگی بھر مسلمانوں سے یہ کہتے رہے کہ وہ آپ کی اس طرح عزت وتکریم نہ کریں جس طرح عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی توقیر کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ بھی ایک فانی انسان ہیں چنانچہ حضورؐ کی وفات سے انکار کرنا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بنیادی صداقت سے انکار کے مترادف ہے۔ لیکن جب تک مسلمان اس عقیدے پر قائم رہیں گے کہ عبادت اور پرستش کے لائق صرف خدا کی ذات ہے، اس وقت تک رسول اللہؐ بھی زندہ رہیں گے: ''اے لوگو! جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوجا کرتے تھے تو سن لو کہ محمدؐ تو مر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ بے شک زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں ہے''۔ (محمد ابن اسحاق: میرت رسول اللہ، صفحہ ۱۰۱۲: The Life of Muhamamd, P. 683)۔

حضرت ابو بکرؓ نے تقریر کے آخر میں اس قرآنی آیت کی تلاوت کی جو غزوہ احد میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب بہت سے مسلمان آپؐ کے قتل کی افواہ سن کر پریشان ہو گئے تھے:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف اللہ کے رسول ہی ہیں
ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں
کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟
اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑے گا
عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا (سورہ آل عمران آیت ۱۴۴)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کا مسلمانوں پر اس قدر اثر ہوا جیسے انہوں نے یہ آیت پہلی مرتبہ سنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بدحواس ہوکر کہا: ''یہ وہ آیت ہے کہ میں نے ابوبکرؓ کو ہی تلاوت کرتے سنا، پھر مجھ پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے اور اب میں سمجھ گیا کہ واقعی رسول اللہ وفات پا گئے ہیں۔'' (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، صفحہ ۱۰۱۳: The Life of Muhammad. P. 683)۔

رسول کریمؐ کی وفات سے امت مسلمہ کو بدترین بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اب تک حضورؐ ہر قدم پر مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے تھے، اب وہ آپؐ کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے؟ کیا وہ اپنا وجود بھی برقرار رکھ سکیں گے؟ کئی خانہ بدوش قبائل، جو محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر امت میں شامل ہو گئے تھے، یہ سوچ کر مسلمانوں سے الگ ہو گئے کہ حضورؐ کی وفات سے ان کا معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ عرب ایک مرتبہ پھر پرانے قبائل میں تقسیم ہو جائیں گے۔ بعض مخلص مسلمان بھی یہ سوچنے لگے کہ کیا رسول اللہ کی وفات سے آپؐ کا نصب العین بھی ختم ہو گیا ہے۔ (Wilfred Cantwell smith: Islam and Modern History, P. 32)۔ جو لوگ اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے، وہ فوراً متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کے اس طرز عمل سے امت میں اختلاف کی عکاسی ہوتی ہے جس کے بارے میں رسول اللہؐ زندگی کے آخری برسوں میں متفکر رہتے تھے۔

مسلمانوں کی اکثریت حضرت ابوبکرؓ کو، جو حضورؐ کے مشن کی ابتدا سے آپؐ کے قریبی دوست تھے، خلیفہ بنانا چاہتی تھی۔ حضرت عمرؓ بھی اس رائے کے حق میں تھے البتہ انصار قدرتی طور پر اپنے ایک فرد حضرت سعدؓ ابن عبادہ کو پہلا خلیفہ یا آں حضرتؐ کا نمائندہ بنانا چاہتے تھے۔ تیسری طرف رسول اللہؐ کے اپنے گھرانے کی خواہش تھی کہ حضرت علیؓ حضورؐ کے جانشین بنیں۔ آخر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ ان کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد نہایت پرسکون انداز میں بحران پر قابو پایا تھا جس سے پوری امت ان سے بہت متاثر تھی۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں سے خطاب کیا اور وہ رہنما اصول بیان کیے جو مسلمان حکمرانوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

''لوگو! بے شک میں تمہارا والی (امیر وخلیفہ) بنا دیا گیا ہوں اور میں تم سے بہتر نہیں، اگر میں اچھا کام کروں تو تم لوگ میری اعانت کرنا اور اگر برا کام کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سچائی (ہر شخص کے لیے ایک) امانت ہے اور جھوٹ خیانت (کا دوسرا نام) ہے۔ تم میں جو کمزور وضعیف ہیں، وہ میرے نزدیک اس وقت تک قوی اور طاقتور ہیں جب تک میں انہیں ان کا حق راحت کے ساتھ نہ دلوادوں ان شاء اللہ۔ اور تم میں جو طاقتور اور قوی ہیں، وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور رہوں گے جب تک میں اس سے حق واپس نہ لے لوں گا انشاء اللہ۔ جس قوم نے بھی اللہ کے راستے سے جہاد چھوڑا،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ نے اس پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی۔ اور جب بھی کسی قوم میں بدکاری پھیلی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر مصیبت اور بلا کو عام کر دیا، تم اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں اور جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں۔ اپنی نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ! اللہ تعالیٰ تم پر اپنا رحم فرمائے۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ صفحہ ۱۰۱۷: The Life of Muhammad. P. 687)۔

حضرت علیؓ شروع میں حضرت ابوبکرؓ سے الگ رہے لیکن بعد میں انہوں نے بیعت کر لی۔ ابوبکرؓ صرف دو برس کے بعد انتقال کر گئے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ آخر ۶۵۶ عیسوی میں حضرت علیؓ کو چوتھا خلیفہ چن لیا گیا۔ یہ چاروں خلفائے راشدینؓ ہیں کیونکہ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصولوں کے مطابق حکمرانی کی۔ حضرت علیؓ نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ ایک مسلمان حکمران کو ظالم نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کے نزدیک وہ اپنی رعایا کے برابر ہے اور اسے غریبوں اور بے کسوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہیے۔ کسی بھی حکومت کو قائم رکھنے کا یہ واحد اصول ہے:

سو اگر تمہاری رعیت بوجھ، غربت، بیماری، ذرائع آب پاشی کے منقطع ہونے، بارش کی کمی یا قحط اور سیلاب سے زمین کی تباہی کی شکایت کرے تو ان کا بوجھ اس حد تک کم کرو کہ تمہارے معاملات درست چلتے رہیں۔ اور ان کا بوجھ کم کرنے کو تم اپنی حکومت پر بوجھ نہ سمجھو کیونکہ وہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے بدلے میں تمہاری زمینوں میں خوش حالی لائیں گے اور تمہارے اقتدار کو استحکام دیں گے...... اصل میں زمین کی تباہی صرف اس صورت میں واقع ہوتی ہے جب اس پر رہنے والی مخلوق مصائب کا شکار ہوتی ہے اور اس کے حکام دولت جمع کرنے کی ہوس میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جب وہ اپنے اقتدار کے لیے ناجائز کام کو روا رکھتے ہیں اور جب وہ عبرت کی مثالوں سے سبق سیکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ (مصر کا گورنر مقرر ہونے پر مالکؒ ابن اشتر کو حضرت علیؓ کی ہدایات)۔

ایک حکمران کو چاہیے کہ وہ اپنی رعایا سے الگ تھلگ رہ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر نہ کرے، اسے رعایا کا بوجھ ہلکا کرنا چاہیے، ان کے مسائل کو سننے کے لیے ہر وقت دستیاب ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ مشاورت کرنی چاہیے۔

ہر چند کہ عام مسلمان حکمران اس اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان خلفائے راشدینؓ کے دور کو ہی سنہری زمانہ قرار دیتے اور اس کی آرزو کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے خلفا اور سلاطین مساوات اور انصاف کے اصولوں پر سختی سے کاربند نہ رہے لیکن یہ ضرور ہوا کہ بعض اوقات ایک مسلمان اٹھا اور اس نے ایک سلطنت قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا اور حکومت کرتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نور الدین اور صلاح الدین عام روش سے ہٹ کر غریبوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاس جاتے، انہوں نے ٹیکسوں کے نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا اور لوگ کسی بھی وقت ان تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ دور میں ہم خود یہ مشاہدہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے ایران کے بادشاہ اور مصر کے سادات جیسے حکمرانوں کے اقتدار کا اس لیے خاتمہ کر دیا کیونکہ ان کی حکومتیں غیر اسلامی تھیں۔ (میں نے اپنی کتاب: Holy War: The Crusades and Their Impact on Todays World کے صفحات ۲۲۳ تا ۲۸۴ میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے)۔ مسلمان پیغمبر اسلامؐ اور خلفائے راشدینؓ کے دور کو اب بھی مثالی عہد سمجھتے ہیں، مسلم معاشرے میں اس نصب العین کو ایک توانا عنصر کی حیثیت حاصل ہے اور جو حکمران اس حقیقت کو نظر انداز کرے، وہ تباہی سے دو چار ہوتا ہے۔

عیسائیت میں زیادہ جوش و خروش علم الٰہیات سے متعلق فلسفیانہ مناظروں تک محدود ہے اور مسیحیت میں تقسیم ان ہی فکری اور نظریاتی تنازعات کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہودیت کی طرح اسلام میں اس قسم کے ''کفر و الحاد'' کے فتووں اور مذہبی مناقشوں کا کوئی وجود نہیں۔ اسلام کے اہم اختلافات اور تنازعوں کی بڑی وجہ سیاسی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ملت اسلامیہ کے اتحاد اور یک جہتی کو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن اس میں رخنہ اس وقت پڑا جب مسلمانوں کے سوادِ اعظم اہل سنت اور شیعان علیؓ کے درمیان، جن کا عقیدہ تھا کہ صرف حضرت علیؓ کی اولاد ہی امت پر حکومت کر سکتی ہے، حکمرانی کے حق پر تنازع کھڑا ہوا۔ شیعہ فرقے نے اقلیتی جماعت کی حیثیت سے احتجاج کیا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نواسے حضرت حسینؓ نے اموی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یزید نے انہیں اور ان کی مختصر جماعت کو کربلا کی جنگ میں نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کرا دیا۔ شیعہ اور سنی گروہوں کے درمیان شدید تنازع اس بات پر پایا جاتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی قیادت کسے کرنی چاہیے اور کس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہیے؟ اس سے پہلے مسیحیت میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کے بارے میں اسی قسم کے مباحث ہوتے رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت کی سیاسی حیثیت کو اسلام میں ایک مقدس درجہ حاصل رہا ہے۔ گو کہ شیعوں نے الگ فقہ بنالی ہے، اس کے باوجود شیعوں اور سنیوں میں بنیادی اسلامی تعلیمات پر کوئی اختلافات نہیں ہے۔ قرآن اس قسم کے دینی اختلافات کو اخلاقیات کے منافی اور بے کار محض قرار دیتا ہے۔ لیکن سیاست کو اسلام میں اس وجہ سے اہمیت حاصل نہیں رہی کہ مسلمان حکمران اسے اپنے سیاسی اقتدار کے فروغ اور اعانت کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام دراصل تاریخ کو عدم استحکام اور انتشار سے پاک کر دینے کی ایک متحرک اور موثر کوشش ہے اور اگر معاشرے کی بنیاد عدل اور مساوات کے قوانین پر استوار نہ ہو تو نتیجہ انتشار اور افراتفری کی صورت میں نکلتا ہے۔ اسلام میں سیاسی جدوجہد کو ایک مسلمان کی ذاتی روحانی زندگی سے خارج نہیں کیا گیا بلکہ اس میں امت کو مقدس اہمیت حاصل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضورؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں کی تحریک ایک سیاسی جدوجہد کی صورت اختیار کر گئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی معاشرے کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھالا جائے تو وہ قائم و دائم رہ سکتا ہے۔ عرب افواج نے جلد ہی ایک سلطنت قائم کر لی جو ہمالہ سے پارینیز تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس میں قرآنی احکام پر عمل درآمد کے بجائے عرب سامراجیت کا جذبہ کارفرما تھا البتہ مسلم فاتحین نے اپنے نئے دین کو نئی رعایا پر مسلط کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جس طرح یہودیت اسرائیل کے بیٹوں کا مذہب تھا، اسی طرح اسلام بدستور عربوں کا دین رہا۔ تقریباً ۷۰۰ عیسوی میں تو ایک مختصر مدت کے لیے تبدیلی مذہب کو قانون کے ذریعے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن رسول اللہؐ کی رحلت کے کوئی ایک سو سال بعد مسلم حکمرانوں نے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے تبلیغی کوششیں شروع کر دیں اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ قرآن نے مشرق وسطیٰ اور افریقا کے لوگوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کیا تھا۔ اسلام میں دوسرے قدیم معاشروں کی حکمت کو اپنے اندر سمو لینے کی استعداد بھی موجود تھی چنانچہ مسلمان جلد ہی اپنا منفرد کلچر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلام لوگوں کو تقسیم کرنے والی قوت نہیں تھا بلکہ اس نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ اس میں مختلف معاشروں کو باہم مربوط کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

مسلمان فقہا نے نئے حالات اور نئے عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جہاد کے نظریے کو فروغ دیا۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ چونکہ معبود صرف ایک خدا ہے اس لیے پوری دنیا کو بھی ایک ہی سیاسی نظام کے تحت متحد ہو جانا چاہیے اور یہ کہ مسلمانوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ خدائی اصولوں کو دنیا سے منوانے اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں۔ امت مسلمہ سے مراد وہ دارالاسلام ہے جس میں خدا کا فرمان اور منشا نافذ ہوتی ہے جب کہ باقی دنیا، جو دارالحرب ہے، مقدس قدروں کی بے حرمتی کرنے والا وہ خطہ ہے جسے خدائی احکام کی کامل اطاعت کرنی چاہیے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں پر اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ مسلمان مشرق وسطیٰ کی اس پرانی روایت پر بدستور کاربند رہے جس میں ایک سے زیادہ مذاہب کے پیروکاروں کو مل جل کر رہنے کی آزادی تھی۔ مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ امن سے زندہ رہنے کے اصول پر عمل کرتے رہے جس کا اظہار قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں سے بھی ہوتا ہے۔

مختلف حکمران خاندانوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال، ہندوستان اور انڈونیشیا تک اسلام کی توسیع اور قرآن مجید کی مختلف تفسیروں کا تاریخ کے ساتھ اسلام کے مسلسل مکالمے کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ مسلمان زمانہ حال سے کچھ دیر پہلے تک جدیدیت کے ہر چیلنج سے تخلیقی طور پر عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں منگولوں کے ہاتھوں تباہی جیسی ہولناک مصیبتوں کا کئی بار نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تباہ حال کھنڈروں پر طاقت اور کامیابیوں کی عظیم الشان عمارت کھڑی کی۔ قرآن حکیم مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں کے لوگوں کو تباہی و بربادی پر قابو پانے کے لیے بدستور ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ ثابت ہوا اور اس نے لوگوں کو ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا عزم، جرأت اور حوصلہ بخشا۔ بعض اوقات مسلمانوں نے ان مشکلات پر روحانی قوت کے ذریعے قابو پایا چنانچہ عظیم صوفی مولانا جلال الدین رومیؒ نے منگول غول کے ہاتھوں اسلامی سلطنت کے مرکز بغداد کی تباہی کے چند ہی سال بعد مثنوی لکھی جسے تصوف کی دنیا میں عظیم ترین کلاسیک تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ ان صوفیائے عظام نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی روحانیت میں اسلام کے سماجی اور سیاسی عنصر کی جڑیں کس قدر گہری ہیں۔ خود کو امت کے لیے وقف کر دینے کے تصور کو ہمیشہ سے اسلامی تصوف کے اہم جزو کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جیسا کہ اسلامی فلسفہ تصوف کے عظیم ماہر لوئیس میسگنون Louis Massignon نے کہا ہے: ''تصوف کی روحانی تحریک نہ صرف معاشرتی برائیوں بلکہ خود اپنی ذاتی کمزوریوں کے خلاف ضمیر کی بغاوت کے نتیجے میں سامنے آئی جس کا مقصد یہ ہے کہ روحانی پاکیزگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان حاصل کیا جائے''۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لیڈن ۱۹۱۳ نیز Malice Ruthven: Islam and the world P. 230)۔ تصوف بنیادی طور پر ترک لذات اور زہد و تقویٰ کا نام ہے۔ صوفیائے کرام روحانی جدوجہد کی مہم میں مصروف رہتے ہیں جسے وہ ''جہاد اکبر'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں (جو جسمانی جنگ ''جہاد اصغر'' کے بالکل برعکس ہے)۔ لیکن عہد حاضر کے عالم اسلام میں یہ روحانیت سیاسی فعالیت سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ صوفیائے عظام بہت سی اصلاحی تحریکوں کے ہراول دستے میں شامل رہے ہیں اور انہوں نے ہر اس بات کی، جس سے ملت اسلامیہ کا وجود خطرے میں پڑ جائے، ہمیشہ بڑھ چڑھ کر مخالفت کی ہے۔ مسلم امہ کو منگول فوج جیسے بیرونی دشمن یا اسلامی اصولوں کے برخلاف نظام حکومت چلانے والے حکمران کا سامنا ہو، صوفیوں نے ہمیشہ ان کا جرأت مندی سے مقابلہ کیا ہے۔ وہ عیسائی راہبوں کی طرح دنیا سے منہ نہیں موڑتے بلکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے عرفان کے حصول میں ان کی مہم کے لیے میدان کارزار کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام کی روحانیت کی بنیاد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ پر رکھی گئی ہے جنہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی تھی بلکہ آپؐ اپنے معاشرے کی تشکیل نو کے لیے عمر بھر انتھک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ رسول کریمؐ نے کسی مثالی دنیا کے قیام یا مسیح موعود کا انتظار کرنے کے بجائے خود اپنی جہد مسلسل سے مدینے میں ایک مثالی معاشرہ قائم کر دیا۔ مسلمانوں نے شروع سے حضورؐ کی حیات مقدسہ کے طرز پر اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوشش کی۔ آپؐ کی ہجرت سیاسی مہم کا نقطۂ آغاز تھی اور خارجی فرقے کے زمانے سے، جنہوں نے ساتویں صدی کے دوران امت کے بڑے طبقے سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، سادات کے مصر میں ''تکفیر والہجرہ'' نامی تنظیم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیام تک ملت اسلامیہ میں اصلاح کے آرزومند مسلمانوں نے بدعنوان معاشرے سے الگ ہو کر اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ہمیشہ جنگ کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اگر وہ حکومت کا انتظام صحیح طریقے سے نہ چلا سکے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ انہیں خلافت کے منصب سے ہٹا دیں۔ مسلمان ان کی اس بات پر پوری سنجیدگی سے توجہ دیتے ہیں۔ امت کی بہبود مسلمانوں کی روحانی زندگی کا اس قدر اہم جزو ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کشی کو اعلیٰ روحانی فریضہ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آباء و اجداد کی عظیم روایات سے انحراف کی مخالفت یا مذہبی جوش، جنونی ہیجان اور غصے کے زیر اثر نہیں بلکہ قربانی، ایثار اور جرأت کے جذبے کے تحت جہاد میں حصہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ مرحوم علی شریعتی نے شاہ کے دور میں ایرانی عوام کو بتایا تھا، شہادت یہ نہیں کہ انسان رہبانیت کے اصول کے تحت تنہا لڑے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے دفاع کے لیے مخلصانہ جدوجہد کرنی چاہیے، چاہے اس میں کتنی ہی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور چاہے اس راہ میں اسے موت ہی کیوں نہ آ جائے:

آپ کی رہبانیت گوشہ نشینی اختیار کرنے میں نہیں، معاشرے میں رہنے اور اس قربانی، ایثار، اخلاص نفی ذات، مصائب کو جھیلنے اور تکلیفیں اٹھانے میں ہے جو لوگوں کے لیے ضروری ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا: ''ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی رہبانیت ہوتی ہے۔ اور میرے دین کی رہبانیت جہاد ہے''۔ (علی شریعتی: ج صفحہ ۵۴) ۔

دنیا کا ہر مذہب زندگی کے کسی پہلو پر خاص زور دیتا ہے لیکن اس معاشرتی فکر کو تینوں الہامی مذاہب کی روحانیت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اگر عیسائیت سیاسی جدوجہد کے بارے میں مسلمانوں کے منفرد نظریے پر تعجب کا اظہار کرتی ہے تو مسلمان اور یہود بھی ناقابل فہم مذہبی صداقتوں کے متعلق عیسائیوں کے نظریات کو حیرت انگیز خیال کرتے ہیں۔

مسلمان رسول کریمؐ کی ذات اقدس کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اور آپؐ کی ذات مسلمانوں میں باہمی اخوت اور یک جہتی برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ مسلمان اس بات پر مسلسل زور دیتے ہیں کہ رسول اللہؐ ان ہی کی طرح ایک عام انسان ہیں لیکن وہ صدیوں سے آں حضرتؐ کی ایک اور خصوصیت کا نمایاں طور پر تذکرہ کرتے ہیں۔ ہاں! رسول اللہؐ بھی دوسرے انسانوں جیسے ہیں لیکن آپؐ کی مثال پتھروں کے درمیان ہیرے جیسی ہے۔ (سید حسین نصر: Ideals and Realities of Islam P. 88)۔ عام پتھر غیر شفاف اور دھندلے جب کہ ہیرا شفاف اور روشنی کی لہریں جذب کر لیتا ہے۔ جس طرح قرآن مجید نے مسلمانوں کو فطری دنیا میں خدا کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کی تلقین کی ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کو بھی خدا کی ایک نشانی قرار دیا گیا ہے۔ اس کائنات میں خدا کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے سامنے مکمل عبدیت کے اعتراف میں جھک جانے کا نمونہ بھی سامنے آتا ہے۔ حضورؐ کے اسوہ حسنہ کی تشکیل آپؐ کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈالنے کی ایک تصوراتی کوشش اور آپؐ کے کامل نمونے کو روزمرہ زندگی کے تمام حالات پر منطبق کرنا ہے۔
عیسائیوں نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی، جو کلمۃ اللہ اور تخلیق کائنات کے خدائی پلان کا بلیو پرنٹ ہیں، خستہ حالت میں تصویر کشی کی ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ سے عیسائیوں کی عقیدت کے برعکس نبی کریمؐ مسلمانوں کے لیے محض تاریخی کردار ہی نہیں، کسی عظیم آرٹ کا ایسا شاہکار ہیں جو زندگی کے گوناگوں نقش ونگار سے مزین کرتا اور ماورائے ادراک حقیقت کی مختلف جہتوں کو روشن وتاباں بناتا ہے۔

اس طرح رسول کریمؐ ایک انسان کامل، اعلیٰ انسانی نمونہ اور خدا کے ساتھ رابطے کی مثالی صورت ہیں چنانچہ حضورؐ کے امی ہونے کی تصوراتی اہمیت بھی اس لیے زیادہ ہے کہ آپؐ زیادہ کشادہ دلی کے ساتھ خدائی پیغام کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ مسلمان اسرا اور معراج کے واقعے کو بھی مکمل فنا یا خدا کی ذات میں جذب ہونے کے تناظر میں دیکھتے ہیں جس کا ذکر صوفیا نے بھی اکثر کیا ہے۔ جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی نقل کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان اپنی روزمرہ زندگی میں حضورؐ کی سنت کی اتباع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح انہیں ذات خداوندی کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ آں حضرتؐ کی پیروی کرنے کا یہ عمل عیسیٰ علیہ السلام کی نقل کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ عملی اور ٹھوس ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی کے دوران مسلمان اسکالروں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث اور سنت کا عظیم مجموعہ مرتب کرنے کی غرض سے ریسرچ شروع کر دی۔ چنانچہ ان لوگوں نے حضورؐ کی احادیث اور بعض موقعوں پر آپؐ کے طرز عمل کے بارے میں تفصیلات جمع کرنے کے لیے اسلامی سلطنت کے طویل سفر کیے۔ اس طرح جو معلومات اکٹھی ہوئیں، وہ اور قرآن مجید اسلامی شریعت کی بنیاد بنے۔ یہی احادیث اور سنن ہر مسلمان کی روزمرہ زندگی اور روحانیت میں اساس قرار پائے۔ مسلمان عام بول چال، کھانے پینے، پیار محبت، طہارت اور عبادت غرض زندگی کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں رسول اللہؐ کی سنت کی نقل کر کے آپؐ کی حیات مقدسہ کو زمین میں دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے پاس تورات یا شریعت جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور ان کا خیال ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پابندی کرنا ایک دشوار کام ہے جس سے زندگی زیادہ بوجھل ہو جاتی ہے۔ عہد نامہ جدید میں اس قسم کی روحانیت کو انتہائی بودے انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں سینٹ پال تورات کو ہدف تنقید بنانے کے ساتھ ساتھ ان عیسائی یہودیوں پر بھی نکتہ چینی کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ کے مذہب کو صرف یہودیت کے ایک فرقے کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن مسلمان اور یہودی قانون کو بوجھ تصور نہیں کرتے۔ مسلمان سنت نبویؐ کو انتہائی مقدس سمجھتے اور اسے اپنی روزمرہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی موجودگی کے احساس کا منبع قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے طریقے پر عمل کر کے وہ نہ صرف آپؐ کی مثال کو اپنے باطن کی گہرائی میں اتار لیتے ہیں بلکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے روحانی رویے کو اپنا کر اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے احساس کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ بعض احادیث اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں ہیں جنہیں نبی کریمؐ کی زبان مبارک کے ذریعے ادا کیا گیا ہے۔ ان احادیث قدسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خدا کوئی مابعد الطبیعیاتی وجود نہیں بلکہ ہمیشہ سے انسان کے اندر پراسرار طور پر موجود ہے۔ درج ذیل حدیث قدسی میں مختلف سطحوں پر خدا کی روحانی موجودگی کو بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کر کے تقوے اور پرہیزگاری کے بلندترین مقام پر فائز ہوسکتا ہے:

جب میرا کوئی بندہ فرائض کی ادائیگی اور نوافل کے ذریعے میرا اقرب چاہتا ہے تو میں اس کو محبوب رکھتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے لازماً دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کوئی پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ بھی لازماً دیتا ہوں۔ (سید حسین نصر: The Significance of the Sunnah and Hadith in Islamic Spirituality PP. 107-108)۔ عیسائیوں کی مقدس رسوم کے طبعی عناصر کی طرح انسان کی خارجی سرگرمیاں اس داخلی عظمت کی واضح علامت ہوتی ہیں جس کی ہمیں پورے احترام کے ساتھ حفاظت کرنی چاہیے۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے طرز زندگی میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے اور دوسرے تمام تر اختلافات کے باوجود مسلمانوں نے ایک واضح تشخص حاصل کرلیا ہے جو انہیں فوری طور پر متحد کر دیتا ہے۔ ان کی نماز یا طہارت، ان کے کھانے پینے کے آداب یا حفظان صحت کے اصول ایک مشترک اور منفرد طرز کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر چین، انڈونیشیا اور مشرق وسطیٰ کے مختلف علاقوں کے مسلمان نماز میں سجدے کے لیے ایک جیسا انداز اختیار کرتے ہیں اور ٹھیک اتنے ہی سیکنڈز تک سجدہ ریز رہتے ہیں۔

مسلمانوں کو نبی کریمؐ سے گہری عقیدت اور محبت ہے اور انہیں اس بات سے زیادہ دلچسپی نہیں کہ تاریخی اعتبار سے آں حضرتؐ کی شخصیت کیا تھی۔ اس کے برعکس عیسائی، جو عیسیٰ علیہ السلام سے ایسی ہی عقیدت رکھتے ہیں، جدید تحقیق کے نتیجے میں حضرت عیسیٰؑ کی دنیاوی زندگی کے بارے میں اٹھنے والے سوالوں سے خائف نظر آتے ہیں۔ سلمان رشدی کے معاملے سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی ذات پر حملہ کرنا دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ اسلامی سلطنت میں رسول اللہؐ یا آپؐ کے دین کی کسی بھی حوالے سے تکذیب کرنا ہمیشہ سے ایک سنگین جرم رہا ہے۔ دور حاضر میں مغربی دنیا کے ہاتھوں ملت اسلامیہ کی تذلیل کی کوشش ان کو شدید صدمے سے دوچار کرنا ہے۔ اٹھارویں صدی کے دوران اسلامی سلطنت زوال کا شکار ہونا شروع ہوگئی اور اس مرتبہ اسے ایک نئی طاقت کے طور پر دوبارہ ابھرنا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ عالم اسلام کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انحطاط کے ساتھ ہی مغرب کو عروج حاصل ہوگیا اور اس نے ایک ایسا معاشرہ قائم کرلیا جو اس سے پہلے دنیا میں کبھی معرض وجود میں نہیں آیا تھا چنانچہ اس کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ یہ صرف مسلمانوں کی سیاسی تذلیل نہیں تھی بلکہ اس سے مسلمانوں کے تشخص کو بھی سخت دھچکا لگا ہے۔ اگر اسلام تاریخ میں پہلی مرتبہ ناکام ہوا تو اس کے دعووں کو کیسے درست تسلیم کیا جاسکتا تھا؟ قرآن کے سماجی تصورات اب تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں لیکن اگر مسلمان ملت اسلامیہ کی طرف سے بھرپور کوششوں کے باوجود خدائی پلان پر عمل درآمد کرنے میں ناکام ہوئے ہیں تو پھر اسلامی تاریخ میں ضرور کہیں گڑبڑ ہوئی ہے۔

پھر اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ امت مسلمہ کی کامیابی کو ہر مسلمان کی ذاتی مذہبی زندگی میں مقدس اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آج عالم اسلام کو ایسے ہی بحران کا سامنا ہے جس طرح کہ Lyell اور Darwin کے سائنسی انکشافات نے عیسائیت کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ میتھیو آرنلڈ کی نظم Dover Beach اور لارڈ ٹینی سن کی نظم In Memoriam میں بھی اسی قسم کے خوف اور مایوسی کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے جو آج کل کے بعض مسلمانوں کو درپیش ہے۔ مغرب اور اس کی فاتح لادینیت کے سامنے اسلام کی نمایاں حیثیت کی کس طرح وضاحت کی جائے؟ قرآن کریم کے معاشرتی قوانین کی روح یہ تھی کہ صحیح اصولوں پر قائم ہونے والا معاشرہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا معاشرہ اسی طریقے پر چل رہا ہوتا ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے جانشینوں کی قیادت میں امت کی کامیابی سے ثابت ہوگیا ہے کہ ایسا معاشرہ قابل عمل تھا اور اس کامیابی کو مقدس اہمیت حاصل تھی۔ عیسائیت کو عموماً مصائب کے دور میں عروج ملا لیکن اسلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اس کتاب کے شروع میں جب ہم رسول اللہؐ کے متعلق مغرب کے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے تو ہم نے نویں صدی میں قرطبہ کے ''شہیدوں'' کے غم و غصے اور مایوسی کا ذکر کیا تھا۔ آج عالم اسلام میں بھی بعض مسلمان ایسی ہی خوفناک کارروائیوں کی مدد سے اسلام میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔ اہل قرطبہ کی طرح بہت سے مسلمان بھی اپنے نئے تشخص اور اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے کی جستجو میں مصروف ہیں۔ حالیہ برسوں میں نام نہاد بنیاد پرست تحریکوں میں بھی یہی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کو مغرب کی بیرونی طاقت کے سامنے نہ صرف ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے بلکہ وہ اس وجہ سے بھی پریشان ہیں کہ ان کی اپنی قدریں مغرب کے غالب کلچر کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتی چلی جارہی ہیں۔ ہم نے مغرب میں جس سیکولرازم کی پوری احتیاط کے ساتھ آبیاری کی ہے، اس نے ہماری اپنی روایات کی کوکھ سے جنم لیا ہے لیکن اسلامی ملکوں میں یہ ایک اجنبی اور بدیشی چیز ہے اور اسے ہمیشہ مثبت نہیں، منفی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اسلامی دنیا میں لوگوں کی ایک نسل مشرق یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغرب کے اثرات سے آزاد رہ کر اپنے گھروں میں پلی بڑھی ہے۔ ان کے خیال میں ان کے مسائل کا حل صرف اسلامی روح کی طرف لوٹنے میں ہے۔ جس طرح نبی کریمؐ نے حج کے معنی کی دوبارہ تشریح کر کے اپنے دین کی بنیادیں عرب کی مقدس روایات پر استوار کی تھیں، اسی طرح انقلابی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے ماضی کی طرف مراجعت میں ہی ان کی عافیت ہے۔

نئی بنیاد پرستی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو واپس اصل راہ پر ڈالنے کی کوشش کی جائے اور امت کو ایک بار پھر متحد اور مضبوط بنایا جائے۔ انقلاب ایران صرف ماضی کی طرف رجوع کرنے کی کوشش ہی نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد ایران میں اعلیٰ اقدار کو از سر نو فروغ دینا تھا۔ ایران اور پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کے حوالے سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، وہ مغربی باشندوں کے لیے یقیناً تعجب انگیز ہے جنھوں نے سیکولر نظامِ حکومت قائم کر لیا ہے۔ دونوں ملکوں میں اسلامی اقدار کے فروغ اور اسلام کو دوبارہ ایک موثر طاقت بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ بیسویں صدی میں خدا کے کلام کو عملی صورت میں معاشرے میں نافذ کرنا بہت دشوار ہے۔ مسلمان ماضی میں آں حضرتؐ کی وفات اور منگولوں کی تباہی جیسے زیادہ المناک حادثوں کے بعد بھی دوبارہ عروج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اب یہ کام زیادہ مشکل نظر آتا ہے اور اس وقت حالت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ پر غیظ و غضب اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی مسلمانوں کے کربناک حالات کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اور اس سے ان کی اس شدید خواہش کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو اسلامی قوانین کی روشنی میں بہترین طریقے سے چلانے کے لیے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اسلام کی چند نئی انقلابی صورتیں غیر صحت مند نظر آتی ہیں لیکن اس وقت مسلمانوں میں عدم تحفظ اور مایوسی کا عنصر غالب آ گیا ہے جو قرطبہ کے ''شہیدوں'' کے خودکش حملوں کا جواز بنی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی ذہنی کیفیت میں مبتلا تھے۔ نہر سویز کے بحران میں اسلامی مفکر ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے لکھا تھا کہ ایک صحت مند اور فعال اسلام وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ اس سے مسلمانوں میں ان اعلیٰ اقدار اور نصب العین کو فروغ ملا ہے جو مغرب میں بھی رائج ہو سکتا اور ہمارے لیے قابل قبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اقدار اور نصب العین کا سرچشمہ ایک ہے۔ سویز بحران کے بعد مغرب نے مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو زیادہ برگشتہ اور مغرب کی لبرل سیکولرازم سے متنفر کر دیا ہے۔ ہم مغربی باشندوں نے اسلام کو سمجھنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اسلام کے بارے میں ہمارے نظریات ناپختہ، غیر سنجیدہ اور تعصب پر مبنی رہے ہیں اور آج ہم عالم اسلام میں پائے جانے والے غم و غصے اور تشدد کے رجحان سے نفرت کا اظہار کر کے رواداری اور ہمدردی کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ لیکن اسلام ختم یا منتشر ہونے والا مذہب نہیں ہے اور بہتر یہی ہے کہ یہ دین صحت مند اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضبوط رہے۔ ہم صرف یہ امید کر سکتے ہیں کہ ایسا وقت آنے میں تاخیر نہیں ہوگی۔

عالم اسلام کے لوگوں کو بیسویں صدی کے آخر میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے تاہم جیسا کہ ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے ۱۹۵۶ء میں اس جانب اشارہ کیا تھا، مغرب کو بھی ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ مسئلہ ہے جدید دنیا میں مغربی تہذیب اور عیسائیت دونوں کی "بنیادی کمزوری":

جدید دنیا میں مغربی تہذیب اور عیسائیت کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہے کہ اس کرۂ ارض پر وہ خود سے کمتر نہیں بلکہ برابر کی اہلیت رکھنے والے لوگوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ مغربی تہذیب جب تک عقلی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر اور مسیحی کلیسا فکری اعتبار سے دوسرے ہم عصر لوگوں کے ساتھ عزت واحترام کا سلوک روا نہیں رکھتا، وہ دونوں بیسویں صدی کے حقائق کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسلام کی حقیقی روح کا ادراک نہیں کر سکے۔(Smith: Islam and Modern History, P. 305)۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مغرب مشترک روایات کے حامل ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور سے مسلمانوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے لیکن مغرب اسے قبول نہیں کر سکتا۔ آج بعض مسلمانوں نے اہل کتاب کے معاشروں کی اس لیے مخالفت شروع کر دی ہے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کی تذلیل کی ہے اور تمسخر اڑایا ہے بلکہ انہوں نے اس نئی نفرت کو مذہب کا رنگ دینا شروع کر دیا ہے۔ سلمان رشدی کے معاملے کی وجہ سے اسلام اور مغرب کے درمیان رونما ہونے والے نئے تصادم سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبوب شخصیت کو مرکزی اہمیت مل گئی ہے۔ آج مسلمانوں کے لیے ہماری مغربی روایات اور اداروں کو سمجھنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم مغرب کے باشندوں کے لیے بھی لازم ہے کہ ہم بھی اسلام کے بارے میں پرانے تعصبات اور تنگ نظری کے رویے کو ترک کر دیں۔ مفاہمت اور رواداری کے عمل کا آغاز رسول اللہؐ کی ذات اقدس سے ہونا چاہیے جو ایک پیچیدہ اور محبت کرنے والی شخصیت تھے، جنہوں نے بعض اوقات ایسے کام کیے جنہیں قبول کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ ایک نہایت ذہین انسان تھے۔ آپؐ نے ایک ایسے دین اور ثقافتی روایت کی بنیاد رکھی جسے مغربی قصے کہانیوں کے برعکس تلوار کے زور پر نہیں پھیلایا گیا۔ اس مذہب کا نام اسلام ہے جس کا مطلب ہے امن اور سلامتی!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشاریہ

آدم ۱۲۰، ۱۳۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۸۲،
۱۹۰، ۲۲۶، ۳۳۸
آرتھر بادشاہ ۴۲
آرنلڈ میتھیو ۳۵۱
آمنہ بنت وہب ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۴۳
آیت اللہ خمینی ۱۵، ۲۲، ۳۰
ابراہیم (علیہ السلام) ۲۸، ۹۷، ۹۸
ابراہیمؑ (حضورؐ کے بیٹے) ۱۱۱، ۳۱۶، ۳۳۶
ابلیس ۱۵۹
ابن اشیہان الزہری ۱۴۴
ابن الحارث ۲۳۰، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۹
ابن دغنہ ۱۸۶
ابن رشد ۴۵، ۴۶
ابن سعد محمد ۶۸، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۴، ۲۱۴،
۲۶۴، ۳۱۲
ابن سینا ۴۵، ۴۶
ابن ہشام ۱۸۳
ابوبصیر ابن اسد ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۲۲
ابوجندل ابن سہیل ۲۹۶
ابوسفیان ۱۰، ۱۱۲، ۱۶۷، ۱۷۸، ۲۳۴، ۲۳۵،
۲۴۷، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۲،
۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۳۱۲،
۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۶، ۳۳۰، ۳۳۲
ابوسلمہ ۲۶۲
ابوطالب ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۴۲، ۱۴۳،
۱۴۷، ۱۵۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷،
۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴،
۱۸۵، ۱۹۲، ۲۳۳
ابوعامر ۲۱۲
ابوقیس ۲۱۲، ۲۷۴
ابوقیس ابن ابواسلت ۲۰۲
ابوالبختری ۱۷۹، ۱۸۳
ابوالعاص ۱۴۶، ۲۱۳، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۸۵،
۲۸۶
ابوالعالیہ ۱۵۷
ابوبراءؓ ۲۶۰
ابوبکرؓ ۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۶۹، ۱۸۴،
۱۸۵، ۱۸۶، ۲۰۰، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰،
۲۱۴، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۷۰، ۲۹۷،
۳۱۷، ۳۳۵، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲،
۳۴۳، ۳۴۴
ابوجہل (ابوالحکم) ۱۱، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۷۲، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۳،
۱۸۴، ۱۸۷، ۲۰۸، ۲۳۶، ۲۳۷،
۲۳۸، ۲۵۲، ۲۷۴، ۳۲۶

ابوطلحہ ۸

ابولبابہ بن المنظر ۲۷۸

ابولہب ۱۳۷، ۱۶۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۵، ۱۸۷،
۲۰۸، ۲۳۴، ۲۴۷

احابیش قبائل ۱۸۶، ۲۵۱، ۲۸۴

احادیث ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۱۵۵، ۳۱۰، ۳۲۱،
۳۴۹، ۳۵۰

احد غزوہ ۹، ۱۰، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶،
۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۸، ۲۷۳،
۳۱۴، ۳۴۲

احلاف ۹۱، ۱۰۳

احمد ۱۰۱، ۱۲۱، ۱۴۴

اخنس ابن شریق ۱۸۹

اربن ثانی پوپ ۴۱، ۳۲۹

اردن ۲۹، ۸۶، ۹۲، ۳۱۵، ۳۳۱

ارسطو ۴۶

ارشمیدس ۱۱۹

ارض مقدس ۳۳۰

ارم قبیلہ ۱۹۵

ارنیسٹ رینان (علم الانسان کے باثر ماہر) ۵۹

ازابیلا ملکہ اسپین ۴۵

الازہر یونیورسٹی ۱۵، ۳۰، ۵۸

اسحاق عیسائی راہب ۳۷، ۳۸

اسحاق محمد ابن اسحاق ۶۸، ۶۹، ۹۲، ۹۷، ۱۰۰،
۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۶،
۱۱۸، ۱۲۳، ۱۳۱، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۶،
۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴،
۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰،
۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۲،
۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۱،
۲۱۳، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۳۱، ۲۳۳،
۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۳، ۲۴۶،
۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۶۸،
۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷،
۲۷۹، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲،
۲۹۴، ۲۹۶، ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۱۴،
۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۹، ۳۳۹،
۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴

اسد ۹۱

اسد قبیلہ ۸۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۳۵، ۱۳۶،
۱۸۲، ۲۷۵، ۲۸۵

اسرا ۱۹۲، ۱۹۳، ۳۴۹

اسرائیل ریاست ۱۷، ۳۳، ۶۳، ۷۶، ۷۷، ۹۴،
۱۰۱، ۳۳۱

اسرائیلی ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۹۷، ۱۰۱، ۱۲۱، ۱۳۰،
۲۴۱، ۲۷۹، ۲۸۰

اسکندر اعظم ۴۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسکندریہ ۵۸
اسلامی کانفرنس ۱۵، ۳۰
اسلم قبیلہ ۲۸۸
اسمٰا ۱۴۸
اسماعیل محمد ابن اسماعیل البخاری ۷۰، ۱۱۵
اسماعیلؑ حضرت ۲۱۹، ۲۲۰، ۳۱۶، ۳۳۸
افریقا ۲۸، ۳۱، ۴۲، ۴۹، ۵۸، ۱۲۰، ۳۴۶
الافغانی جمال ۶۴
الحاد ۲۹، ۳۹، ۱۳۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۳۴۵
الحارث ۱۰۶
الحارث ابن فہر قبیلہ ۱۴۵
الحارث ابن فہر ۹۱
ام ایمن ۱۴۳، ۲۱۳
امامہ (حضورؐ کی نواسی) ۲۴۴
ام حبیبہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۳۱۲، ۳۲۲
ام رومانؓ ۱۴۸، ۲۱۳، ۲۷۱
ام سلمہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۱۳، ۱۱۲، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۸۷، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۲۴
ام عبداللہ ۳۲۰
ام فضلؓ ۱۴۳
ام کلثومؓ (حضورؐ کی بیٹی) ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۶۷، ۲۱۳، ۲۴۴، ۳۰۳، ۳۳۶
ام ہانی ۱۹۰، ۳۲۴
امریکا ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۹، ۳۰، ۷۱، ۱۶۰،
۱۹۴، ۱۹۵، ۲۲۴
اموی سلطنت ۳۲۶
امہات المومنین ۳۱۲، ۳۱۸
امیہ ابن خلف ۱۶۷
انات ۸۹، ۹۵
انبیا ۱۹۰، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۰
انجیل (بائبل) ۱۷، ۴۷، ۵۰، ۵۲، ۷۰، ۷۱، ۷۴، ۷۶، ۸۶، ۸۹، ۱۰۰، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۹۹، ۲۱۹، ۲۲۷، ۲۴۱، ۲۵۵، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۱۹
اندلس ۳۶، ۴۱
انصار ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۶۱، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۶، ۲۸۶، ۳۰۸، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۸، ۳۴۸
انقلاب فرانس ۵۹، ۶۲
انڈونیشیا ۳۴۶، ۳۵۰
اوس قبیلہ ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۱۱، ۲۵۳، ۲۶۱، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۸، ۳۰۸، ۳۲۸
اٹلی ۴۱، ۴۴، ۴۵
اہل بیت ۲۶۳
اہل کتاب ۱۰۱، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۴۰، ۱۸۹، ۲۰۲،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۰۳، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۷، ۲۵۳،
۲۷۵، ۲۸۴
ایران ۱۵، ۳۰، ۶۲، ۸۰، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۷۶،
۳۳۷، ۳۴۵، ۳۴۸، ۳۵۲
ایلفونسی پیٹر ۳۶
ایلنبی جنرل ۶۰
ایلویروپال ۳۶، ۳۷، ۳۸۰
ایڈورڈ گبن ۵۶، ۵۷، ۱۷۶
بابلی ۷۶
بازنطینی ۳۷، ۴۴، ۶۲، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۹۲،
۹۷، ۱۰۲، ۱۲۵، ۲۶۵، ۲۸۴، ۳۱۴،
۳۳۰، ۳۳۱
بپتسمہ ۲۴۰
بت پرست ۴۱، ۴۴، ۴۷، ۶۲، ۶۷، ۷۶، ۷۷،
۷۹، ۹۰، ۱۰۱، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۶۵،
۱۶۷، ۱۶۸، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲، ۲۹۱،
۳۰۲، ۳۳۲
بحیرا ۱۰۴، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹
بحیرہ احمر ۹۲، ۲۳۰، ۲۳۴، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۵۱، ۲۶۸، ۲۸۵، ۳۰۴، ۳۱۵، ۳۳۱
بدر ۷، ۹، ۱۰، ۱۱، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶،
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷،
۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵،
۲۵۹، ۲۶۲، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۹۹،
۳۰۰، ۳۰۱، ۳۱۴، ۳۲۶، ۳۲۷،
۳۳۳
بدوی ۱۹۹، ۲۵۰، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۰،
۲۷۳، ۲۸۴، ۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۰،
۲۹۴، ۳۰۷، ۳۳۵
بدھ مت ۳۲، ۹۴، ۱۲۱، ۱۳۸
براابن معرور ۲۰۴، ۲۲۱
بریڈفورڈ ۲۲، ۳۵، ۳۷
بعل ۹۵
بغداد ۳۴۷
بکر قبیلہ ۳۲۱، ۳۲۲
بلال ۱۲، ۱۳، ۱۴۵، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۸۵، ۲۱۳،
۲۱۴، ۲۲۲، ۳۱۳
بنات اللہ ۸۹، ۹۰، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۷،
۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۷
بنوخزاعہ ۹۱، ۲۶۸، ۲۸۹، ۲۹۵، ۳۲۱، ۳۲۲،
۳۲۳
بنوقریظہ+بنی قریظہ ۱۰۵، ۱۹۵، ۲۰۲، ۲۱۲، ۲۷۵،
۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰،
۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۷، ۳۱۰
بنوقینقاع ۱۹۵، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰،
۲۶۱، ۲۶۵، ۲۷۸
بنونضیر ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۶۰،
۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۷۸
بنی سعد ۱۰۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنی ہاشم ۹۳، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۳۲، ۱۴۲، ۱۴۴،
۱۴۵، ۱۴۶، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۸،
۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۸، ۲۰۸
بنیاد پرستی ۲۶، ۲۹، ۶۳، ۳۵۲
بوبر مارٹن ۲۷
بیت المقدس ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۹، ۵۱، ۶۰،
۸۰، ۱۹۰، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۱۲، ۲۲۱،
۲۲۲، ۲۷۹
بیعت رضوان ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۵، ۳۰۰
بیعت عقبہ ۲۰۰، ۲۰۶
بیعت عقبہ اول ۲۰۰
بیعت عقبہ ثانی ۲۰۶
پاکستان ۳۵۲
پال سینٹ ۳۹، ۵۵، ۶۴، ۷۴، ۷۷، ۱۷۴، ۲۲۴،
۲۲۵، ۲۹۹، ۳۰۸، ۳۳۸، ۳۳۹،
۳۴۹
پریکلس ۳۶، ۳۷، ۳۸
پروٹسٹنٹ ۲۷
تبوک ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۵، ۳۳۶
ترک ۲۹، ۴۱، ۴۶، ۵۲، ۵۴، ۵۸، ۶۰
ترکی ۵۴، ۱۳۰
تورات ۱۷، ۲۰، ۲۷، ۴۳، ۷۳، ۷۴، ۹۷، ۱۰۱،
۱۱۸، ۱۲۱، ۱۷۴، ۱۸۰، ۲۱۸، ۲۱۹،
۲۲۰، ۲۲۷، ۲۷۹، ۳۰۲، ۳۰۶،
۳۱۶، ۳۴۹
تیم قبیلہ ۱۰۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۸۶
تیونس ۶۰
ٹینی سن ایلفریڈ لارڈ ۳۵۱
ثعلبہ قبیلہ ۲۸۵
ثقیف ۸۹، ۱۸۸، ۲۵۷، ۳۲۸
ثمود ۱۸۰
جاپان ۷۱
جارج اسٹینر ۱۷۴
جان سینٹ ۲۹
جاہلیت ۱۹، ۲۸، ۴۵، ۷۷، ۷۸، ۹۰، ۱۰۱،
۱۰۴، ۱۱۰، ۱۷۷، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸،
۲۶۵، ۳۰۱، ۳۱۰، ۳۲۱، ۳۲۵، ۳۳۹
جرائیل (جبریل) ۷۱، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۳،
۱۵۶، ۱۶۰، ۱۷۰، ۲۶۰، ۲۷۷
جبلہ ۳۰۷، ۳۰۸
الجزائر ۶۰
جسٹن ۱۵۴
جعفر (ابوجعفر الطبری) ۶۸
جعفر بن ابوطالب ۱۱۳، ۱۴۳، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۸۳،
۱۹۰، ۳۱۲، ۳۱۵
جلال الدین رومی ۳۴۷
جمال ناصر ۱۸
جمح قبیلہ ۱۴۵، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۲، ۱۹۹، ۲۳۰،
۲۳۶، ۲۵۹
جنگ بعاث ۱۹۷، ۲۵۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنوبی امریکا ۲۲۴
جویریہ بنت حارث ۲۶۸
جویریہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۲۹۵
جہاد ۱۹، ۲۲، ۵۶، ۲۱۱، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۸، ۲۳۳، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۶، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۸، ۲۹۴، ۲۹۸، ۳۰۱، ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۴۳، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸
چاؤشسکو ۲۳۳
حبشہ ۷۹، ۹۲، ۱۰۲، ۱۳۳، ۱۴۵، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۴۴، ۲۸۳، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۳
حج ۶، ۶۶، ۸۷، ۸۹، ۹۲، ۹۶، ۱۰۲، ۱۷۲، ۱۹۰، ۱۹۵، ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۶، ۲۲۲، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۴، ۲۹۷، ۳۱۳، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹
حجاب ۱۸، ۱۷۳، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸
حجاج بن یوسف ۱۱۴
حجاز ۶، ۶۶، ۶۷، ۸۰، ۸۱، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۱۹، ۱۴۴، ۱۵۷، ۱۸۹، ۲۱۲
حجر اسود ۸۶، ۱۱۳، ۱۱۴
حدیث ۷۰، ۱۹۰، ۲۲۸، ۲۴۲، ۲۴۳، ۳۱۰
حدیث قدسی ۳۵۰
حرا پہاڑ ۱۲، ۱۱۶
حرم ۹، ۱۱، ۹۸، ۱۱۱، ۲۶۰، ۲۸۸، ۲۸۹، ۳۳۸
حسنؓ ۳۳۶
حسانؓ بن ثابت ۱۱۸، ۲۷۰
حسینؓ ۳۳۶، ۳۴۵
حفصہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۵۹، ۲۶۳، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۱۷
حکیم ابن حزام ۱۷۹
حلف الفضول ۱۰۳، ۱۴۶، ۱۸۲
حلم ۹۲، ۱۱۹، ۲۸۳
حلیمہ بنت ابوذویب ۱۰۵، ۱۰۶
حمزہؓ ۱۰، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۷، ۱۷۲، ۲۰۷، ۲۳۰، ۲۳۷، ۲۵۳، ۲۵۴، ۳۲۶
حمورابی ۴۸
حنیف عثمان ابن الحویرث ۱۲۵
حنیف ۱۶۳
حنیفہ قبیلہ ۲۸۴
حنین غزوہ ۹، ۳۲۸، ۳۳۲
حیی ابن اخطب ۲۷۵، ۲۷۷، ۳۱۱
خارجی فرقہ ۳۴۷
خالد بن ولید ۱۶۷، ۲۵۲، ۲۷۴، ۲۷۷، ۲۸۳، ۲۸۸، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۲۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خانہ بدوش قبائل ۴۱، ۴۲، ۶۶، ۶۷، ۷۹، ۸۰،
۸۱، ۸۲، ۹۰، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۱۰۲،
۱۳۷، ۱۴۱، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۸۶، ۱۹۰،
۱۹۶، ۲۳۰، ۲۸۵، ۲۸۸، ۲۸۹،
۲۹۵، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۴، ۳۱۶،
۳۲۳، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲،
۳۳۸، ۳۴۳
خانہ کعبہ ۶۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۸،
۱۰۳، ۱۱۳، ۱۳۱، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۸۳،
۱۹۰، ۲۲۰، ۲۷۵، ۲۸۶، ۲۸۷،
۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴،
۲۹۵، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۱۳، ۳۲۴،
۳۲۵، ۳۲۶، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸
خدیجہؓ بنت خویلد (حضورؐ کی پہلی بیوی) ۱۲، ۹۷،
۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۴، ۱۴۲،
۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۳،
۱۸۴، ۱۸۸، ۲۳۵، ۲۴۳، ۲۷۳،
۳۲۰
خزاعہ قبیلہ ۹۱، ۲۶۸، ۲۸۹، ۲۹۵، ۳۲۱، ۳۲۲،
۳۲۳
خزرج ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۶،
۲۱۱، ۲۵۳، ۲۶۸، ۲۷۰، ۲۷۱،
۲۷۸، ۳۰۸، ۳۲۸
خسرو شاہ ایران ۷۹، ۸۰
خطاب ابن نوفیل ۹۸

خلیجی جنگ ۲۲
خمینی آیت اللہ ۱۵، ۲۲، ۳۰
خندق ۱۰، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۹،
۲۸۲، ۲۸۳، ۳۱۴، ۳۲۲
خیبر ۱۲، ۷۹، ۲۶۲، ۲۷۵، ۲۸۰، ۲۸۵،
۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۷
داؤد بادشاہ ۷۵، ۱۹۹، ۲۳۳، ۲۷۹
دانتے ۴۵، ۴۶، ۱۹۱
دجال ۳۹، ۵۱، ۲۴۵
دمشق ۶۰
دومۃ الجندل ۲۸۵، ۳۳۱
ڈارون چارلس ۱۳۹
ڈیم جولیاں ۳۳
ڈینئل نارمن ۳۹، ۵۳
ذونواس ۷۹
رابن ہڈ ۴۲
ربی مائر ۳۰
رجیع کنواں ۲۵۹
رچرڈ ۵۱
رشدی سلمان ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۳۰، ۳۵، ۶۴،
۱۵۵، ۱۵۶، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۵۰،
۳۵۳
رشدی کی کتاب ۳۵، ۱۵۶
رعنا کبانی ۶۲، ۶۴
رقیہؓ (حضورؐ کی بیٹی) ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۶۷، ۱۶۹،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۸۳، ۲۰۷، ۲۳۴، ۲۴۴
رمضان ۶، ۱۲، ۱۴، ۲۶، ۲۷، ۱۱۵، ۲۳۴، ۲۴۲، ۳۲۳، ۳۳۶
رملہؓ ۳۱۲
رولینڈ ۴۱، ۴۷
روڈنسن ۳۳، ۶۳، ۱۱۱، ۱۵۵، ۱۵۶، ۲۷۹
رومی سلطنت ۷۷، ۱۵۳، ۲۲۴
زہرہ قبیلہ ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۸۹، ۲۳۶، ۳۰۳
زبور ۱۶۴، ۲۷۹
زبیرابن العوام ۲۱۳
زرتشت مذہب ۸۰، ۱۲۱، ۳۴۶
زیدابن حارث (حضورؐ کا لے پالک بیٹا) ۱۱۲
زیدابن عمرو ۱۰۰
زینبؓ بنت جحش (حضورؐ کی بیوی) ۱۴۳، ۲۱۳، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۸۵
زینبؓ بنت خزیمہ (حضورؐ کی بیوی) ۲۹۵
زینبؓ (حضورؐ کی بیٹی) ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۴۸، ۳۱۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۳۱۴
سادات انور (السادات انور) ۱۲۸
سارہؓ ۲۲۰
ساسانی ۷۹، ۸۰، ۸۷
سپین ۳۶، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۹
سدرۃ المنتہیٰ ۱۹، ۱۹۲
سدرن آرڈبلیو ۲۶، ۴۲، ۵۲
سردجنگ ۲۰، ۳۹، ۶۲
سریانی ۱۰۰، ۱۰۹
سسلی ۴۱، ۴۴، ۴۵، ۵۱
سعدابن ابی وقاص ۱۵۱
سعدابن عبادہ ۲۱۶، ۲۷۱، ۳۱۳، ۳۴۳
سعد ابن معاذ ۲۰۱، ۲۱۲، ۲۳۵، ۲۵۲، ۲۷۶، ۲۷۸
سعدقبیلہ ۱۰۵، ۲۸۵
سعودی عرب ۱۵، ۳۰، ۳۱
سقراط ۴۶، ۱۵۳، ۱۵۴
سکھ ۱۸
سلطنت عثمانیہ ۵۹، ۶۰
سلمان فارسی ۲۱۲، ۲۷۴
سلیم قبیلہ ۲۶۰، ۲۷۵
سلیمان بادشاہ ۷۵، ۱۹۹، ۲۱۴
سمتھ ولفریڈ کینٹ ویل ۲۰، ۶۵، ۳۵۲، ۳۵۳
سمرقند ۳۲
سنسکرت زبان ۷۲
سنہری بچھڑا ۲۱۷
سودہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۸، ۲۱۳، ۲۴۵، ۲۵۹
سوشلزم ۱۲۹، ۱۶۵
سوویت یونین ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوڈان ۶۰

سویز بحران ۳۵۲

سہم قبیلہ ۱۰۳، ۱۳۵

سہیل ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۳۸، ۲۴۳، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۱۳، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸

سہیل ابن عمرو ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۹، ۲۹۶

سید حسین نصر ۱۷۶

سید قطب ۱۸، ۱۹

سیل جارج ۵۶، ۵۷

سینا پہاڑ ۷۰

سیوطی، جلال الدین ۱۲۳

شارلیمن بادشاہ ۴۱، ۴۲

شاعری ۴۲، ۷۲، ۸۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۲۴۶، ۲۵۰

شام ۴۱، ۶۲، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۲۰، ۱۴۱، ۱۴۴، ۲۱۲، ۲۳۰، ۲۳۴، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۶۱، ۲۸۴، ۲۸۵، ۳۰۴، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۳۰

شاہراہ حجاز ۹۲

شاہراہ نجد ۹۲، ۲۵۱

شرک ۹۶، ۱۶۵، ۲۲۲، ۳۲۷

شریعتی علی ۳۳۷، ۳۴۸

شریعت ۴۹، ۷۰، ۷۶، ۲۵۹، ۳۳۷، ۳۴۹

شعب ابی طالب ۹، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۲

شیعہ ۱۳۹، ۱۶۰، ۲۴۳، ۲۶۳، ۳۴۵

شمالی افریقا ۲۸، ۳۱، ۱۲۰، ۱۵۸

شمل این میری ۱۰۶

شہادت کلمہ ۱۶۴

شہنشاہ ہرقل ۳۱۴

شہنشاہ فریڈرک ۴۵

شیطان ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱

شیطانی آیات ۶۹، ۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳

شیکسپیر ولیم ۷۲

صالحؑ ۱۸۰

صحابہ کرامؓ ۱۹، ۷۰، ۷۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۳۰، ۱۵۶، ۱۷۵، ۱۸۰، ۲۰۵، ۲۴۰، ۲۶۰، ۲۶۷، ۲۷۴، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۰

صفا پہاڑ ۱۷۶، ۱۷۷، ۳۱۳، ۳۲۶، ۳۳۸

صفوان ابن امیہ ۱۶۷، ۲۴۳، ۲۵۱، ۲۵۹، ۲۶۹، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۱، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸

صفیہ بنت عبدالمطلب ۱۲۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صفیہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۳۱۱، ۳۱۲
صلاح الدین ۵۱، ۶۰، ۱۳۰، ۳۴۴
صلح حدیبیہ ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۴،
۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱،
۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۳،
۳۲۱، ۳۲۷، ۳۳۳
صلیبی جنگیں ۲۹، ۳۲، ۳۶، ۴۱، ۴۳، ۴۴،
۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۴، ۵۵، ۵۹، ۶۰، ۶۲،
۶۵، ۱۳۰، ۲۲۴، ۲۴۹، ۳۳۰، ۳۴۴
صنعا ۹۲
صوفی ۳۲، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۵۹، ۱۸۶،
۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۳۴۷، ۳۴۹
صہیب ابن سنان ۱۴۴
طائف ۱۰، ۸۹، ۹۰، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۸۷، ۱۸۸،
۱۸۹، ۲۰۶، ۲۳۱، ۲۵۱، ۲۹۰، ۳۲۳،
۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۲، ۳۳۵
طالبان ۱۸
طبری ابوجعفر ۶۸، ۶۹، ۱۱۶، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۷،
۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۲۱۴، ۲۴۱
طفیل ابن عمرو ۱۷۲، ۱۷۳
طلحہ ابن عبیداللہ ۱۴۴
طواف ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۸، ۱۱۴، ۱۳۴،
۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۸۳، ۲۸۸، ۲۹۰،
۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۰۰، ۳۱۳،
۳۲۴، ۳۳۶، ۳۳۷

عائشہؓ (حضورؐ کی بیوی) ۸، ۹، ۶۹، ۱۱۴، ۱۲۳،
۱۹۳، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵،
۲۴۵، ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۶،
۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱،
۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۹، ۳۱۲، ۳۱۶،
۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۳۶، ۳۳۹،
۳۴۰، ۳۴۱
عاد قبیلہ ۱۰۱، ۱۸۰، ۱۹۵
عاشورہ ۲۰۳، ۲۴۱، ۲۴۲
عامۃ الفیل ۱۰۴
عامر ابوعامر ۲۱۲
عامر قبیلہ ۱۴۵، ۱۶۷، ۱۸۹، ۱۹۸، ۲۳۶، ۲۵۹،
۲۶۰
عباسؓ (حضورؐ کے چچا) ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۴۲،
۱۴۳، ۱۴۷، ۱۸۵، ۲۰۶، ۲۳۴،
۳۱۳، ۳۲۳، ۳۴۱
عبدشمس قبیلہ ۱۴۴، ۱۴۸، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۸۲،
۱۸۷
عبدالدار ۹۱
عبدالرحمٰن ۲۲۹، ۳۴۱
عبدالکعبہ ۱۴۶، ۱۴۸
عبداللہ ابن جحش ۱۴۳، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۵۴
عبداللہ ابن سہیل ۱۶۸، ۲۹۶، ۲۹۷
عبداللہ ابن عباس ۱۲
عبداللہ بن ابی ۱۹۷، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۵۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبداللہ بن ابوبکر ۱۴۸

عبداللہ بن سعد ۳۲۶

عبداللہ بن مسعود ۱۴۵

عبداللہ بن زمعہ ۳۴۱

عبداللہ (حضورؐ کے صاحبزادے) ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۲

عبداللہ (حضورؐ کے والد) ۱۰۸، ۱۴۳

عبدالمطلب ۱۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۳۱، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۸۷

عبدمناف قبیلہ ۹۱

عبرانی زبان ۵۹، ۷۲، ۲۰۹، ۳۰۰

عبیدہ ابن الحارث ۲۳۰، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۹

عبیداللہ ابن جحش ۹۷، ۳۱۲

عبیدہ ابن سامت ۲۴۸، ۲۵۰

عدن ۶۰

عثمان بن الحویرث ۹۷، ۱۲۵

عثمانؓ ابن عفان ۱۴۴، ۱۶۷، ۱۶۹، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۳۴، ۲۴۴، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۲۲، ۳۲۶، ۳۳۵، ۳۴۴

عثمان ابن مظعون ۱۲۹، ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۷

عدی قبیلہ ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۷۸، ۲۳۶، ۲۹۲

عراق ۶۲، ۹۲، ۹۸، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۸۹، ۲۵۱، ۲۸۴

عربی زبان ۲۳، ۳۷، ۵۴، ۵۶، ۵۹، ۷۲، ۱۰۱، ۱۲۰، ۱۲۷، ۱۴۲، ۱۶۱، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۹۷، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸

عربی محی الدین ۱۳۹

عرفات کوہ ۸۷، ۸۹، ۳۱۳، ۳۳۲، ۳۳۸، ۳۳۹

عروہ ابن الزبیر ۱۵۶

عطار فریدالدین ۱۹۲

عقبہ ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۲۸، ۲۳۵

عقیل (حضورؐ کے چچازاد بھائی) ۱۰۷، ۲۳۵، ۲۳۸

عکرمہ ۱۱، ۲۳۵، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۰، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷

علیؓ ۸، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۴۲، ۱۴۷، ۱۹۰، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۳۷، ۲۴۴، ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۷۰، ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۳۰، ۳۳۶، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵

عمار ابن یاسر ۱۴۵، ۱۶۹

عمرؓ ابن الخطاب ۷، ۸، ۳۰، ۶۹، ۹۸، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۴، ۲۰۷، ۲۳۵، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۵۵، ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۶، ۲۸۷، ۲۹۲، ۲۹۴، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۶، ۳۳۵، ۳۴۲، ۳۴۳،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۴۴
عمرو ابن العاص ۱۷۱، ۲۷۴، ۳۱۴، ۳۱۵
عمرہ ۲۷۳، ۳۲۹
عمیر ابن وہب ۲۳۶، ۲۴۳
عوف ۲۷۸
عیسیٰ ۱۰، ۱۷، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۵۵، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۹، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۸، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۹۰، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۴۰، ۲۵۸، ۲۷۹، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۲۵، ۳۳۴، ۳۴۲، ۳۴۵، ۳۴۹، ۳۵۰
غار ثور ۹، ۲۰۸، ۲۰۹
غرناطہ ۴۵
غزوہ ۸۴، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۵
غزوہ بدر ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۸۲
غزوہ خندق ۲۸۲، ۳۱۴، ۳۲۲
غزوہ احد ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۲، ۳۱۴، ۳۴۲
غزوہ حنین ۳۲۸، ۳۳۰، ۳۳۲
عزیٰ ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۵، ۱۰۸، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۸۲، ۳۲۷

فاختہ (ابو طالب کی بیٹی) ۱۱۰
فارس ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۹۰، ۹۲، ۱۰۴، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۸۴، ۳۱۴
فارقلیط ۱۰۰، ۱۲۱
فاطمہؓ (حضورؐ کی بیٹی) ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۲۱۳، ۲۴۴، ۲۶۳، ۲۷۳، ۳۲۴، ۳۳۶
فاطمہؓ (عمر ابن خطاب کی بہن) ۱۷۶، ۱۷۷
فدک ۱۲، ۷۹، ۳۱۱
فرعون ۱۸۰، ۲۴۰، ۲۴۱
فرقان ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۳۰۱
فریسی ۱۸۰
فریڈرک ثانی بادشاہ ۴۵
فلر پیٹر ۱۷۴
فلسطین ۵۹، ۷۴، ۹۲، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۵۴، ۱۹۶، ۳۳۰
فوسٹر ای۔ ایم ۲۴
قاسم (حضورؐ کے بیٹے) ۱۱۱، ۱۱۲
قاضی قرطبہ ۳۸
قاہرہ ۱۵، ۳۰، ۵۸
قبا ۲۰۹، ۲۱۰، ۳۳۱
قبائلی نظام ۳۳۴
قبیلہ بنو بکر ۳۲۱، ۳۲۲
قرطبہ ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۵، ۴۹، ۵۱، ۵۲، ۶۴، ۳۵۱، ۳۵۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریش ۹، ۱۰، ۱۱، ۶۶، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۵، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۴، ۳۰۸، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸

قشیری ۷۰

قصاص ۲۷۹، ۳۰۵، ۳۰۶

قصویٰ (حضور کی اونٹنی) ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۸۹، ۳۱۳، ۳۲۴

قصی ۹۱، ۱۰۲

قیامت ۱۲، ۳۹، ۷۳، ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۸۱، ۲۱۵، ۲۴۰، ۳۰۷، ۳۳۴

قینقاع قبیلہ ۱۹۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۶۱، ۲۷۵، ۲۷۸

کارتھیج ۱۹۴

کارلائل تھامس ۷۱

کثیر الازدواجی ۱۹۹

کعبہ ۶۷، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۸، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۳، ۱۹۰، ۲۰۴، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۷۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۱۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹

کنعان ۹۵، ۲۸۰

کنعانی ۱۷، ۴۸، ۸۹

کنفیڈریشن ۲۰۵

کوہ زیتون ۱۰، ۱۷۹، ۳۰۵، ۳۳۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیتھولک چرچ ۳۵، ۵۳

کیمبل جوزف ۱۹۴، ۱۹۵

گریگوری پوپ ۴۵

گیلیلی ۳۴۴

لائل سر ایلفرڈ ۶۱

لائبل ۱۳۹

لات ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۵، ۱۰۸، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۸۲، ۱۸۸، ۲۹۱، ۳۲۳، ۳۳۲

لبنان ۳۰، ۶۰

لبید بن ربیعہ ۱۸۶

لنگز مارٹن ۳۳، ۱۱۵، ۲۸۷

لوئیس نہم شاہ فرانس ۳۵

لوئیس ہفتم شاہ فرانس ۴۸

لوتھر مارٹن ۵۲

لوقا ۷۴، ۹۹، ۱۰۳

لیبیا ۶۰

محمد ابن عمر الواقدی ۲۵۲، ۲۸۷

محمد رضا پہلوی شہنشاہ ایران ۱۲۸

محمد ظفر اللہ خان ۲۴۲، ۳۲۶

محمد عبدہ ۶۱

مخزوم قبیلہ ۹۱، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۳۵، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۶، ۲۵۲، ۲۶۲، ۲۶۳

مدین ۱۸۰

مدینہ ۶، ۱۰، ۱۱، ۷۰، ۷۸، ۱۲۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۴۱

مراکش ۴۹، ۶۰

مروہ ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۱۲۶، ۳۰۸، ۳۱۳، ۳۳۸

مریم ۱۰۱، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۷۰، ۱۸۰، ۲۱۸، ۳۲۵

مریمؓ (حضورؐ کی کنیز) ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۳۶

مزدلفہ ۸۷

مسجد ضرار ۳۳۱

مسجد نبوی ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۷۴، ۲۷۸، ۳۱۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسجد نمرہ ۳۳۹

مسلم ابن الحجاج ۷۰

مصر ۶، ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۷۶، ۱۲۸، ۲۳۱، ۲۸۴، ۳۱۵، ۳۴۵، ۳۴۷

مصعب ابن عمیر ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۵۴

مطعم ۱۸۳، ۱۸۹، ۱۹۸، ۲۰۶، ۲۰۸

مطلب قبیلہ ۱۳۵، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۲

مطیبین ۹۱، ۱۰۳

مطعم ابن عدی ۱۸۳

معراج ۱۹، ۱۰۶، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۰۳، ۳۴۹

مقاطعہ ۹، ۱۷۲، ۱۸۲، ۱۸۴

مقوقس ۲۸۴، ۳۱۵

مکہ ۱۱، ۱۳، ۳۳، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۷۷، ۷۸، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۷، ۳۳۸

منات ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۵، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۴، ۳۲۷

منافقین ۲۵۵، ۲۶۸، ۲۶۵، ۲۶۹، ۲۷۶، ۲۹۳، ۳۳۰

منیٰ وادی ۱۹۵، ۲۰۴، ۳۱۳، ۳۳۹

موتہ ۳۱۵، ۳۳۰

موسیٰ ۴۸، ۷۰، ۷۲، ۷۴، ۷۶، ۹۷، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۷۱، ۱۸۰، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۷، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۸۰، ۳۱۲

موصل ۹۸

مہاجرین ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۸۶، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۳، ۲۴۸، ۲۵۴، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۷، ۲۹۴، ۳۰۸، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۳۰، ۳۳۸

میدان عرفات ۸۷، ۸۹، ۳۱۳، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۴۹

میسرہ ۱۱۱

میکسم روڈنسن ۳۳، ۶۳، ۱۱۱، ۱۲۳، ۱۵۵، ۲۷۹

میمونہؓ (حضور کی بیوی) ۳۱۳، ۳۲۴، ۳۴۰

نازی ۲۸، ۲۴۹، ۲۷۹

نپولین اول بادشاہ ۴۲، ۵۸، ۵۹، ۶۲

نجاشی ۷۹، ۱۰۲، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۲۸۴، ۲۹۲، ۳۱۲

نجد ۸۰، ۸۱، ۹۲، ۲۵۱، ۲۵۹، ۲۶۰

نجران ۸۰، ۸۹

نخلہ ۸۹، ۹۰، ۱۵۱، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۷، ۳۲۷

نذیر ۱۲۷

نکاراگوا ۶۲

نواب سلطان جہاں ۶

نوحؑ ۱۸۰، ۱۸۱

نورالدین ۳۴۴

نوفل قبیلہ ۱۴۵، ۱۸۹، ۱۹۸

نینویٰ ۱۸۹

وادی القریٰ ۲۴۹

واٹ ڈبلیو منٹگمری ۳۳، ۴۳، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۵۵، ۲۰۵، ۲۵۵، ۲۷۹

ورقہ بن نوفل ۹۷، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۸

ورڈز ورتھ ولیم ۱۲۳

ول ڈیورینٹ ۸

ولید ابن عتبہ ۲۳۷

وہابی ازم ۳۱

ہاجرہ ۲۲۰، ۳۱۶، ۳۲۸

ہارون ۱۹۰، ۲۴۰، ۳۱۲

ہالہ بنت وہب ۱۰۳

ہبل ۸۶، ۹۱، ۹۴، ۲۸۶

ہجرت ۹، ۷۰، ۹۱، ۱۰۱، ۱۶۹، ۱۸۴، ۱۹۸، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۳، ۲۴۲، ۲۴۷، ۲۶۱، ۲۷۰، ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۸۵، ۲۸۶، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۸، ۳۱۴، ۳۱۸، ۳۲۴، ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۳، ۳۳۶، ۳۴۷

ہرقل بادشاہ ۳۱۴

ہاشم ابن عبد مناف ۱۰۲

ہشام ابن عمرو ۱۷۹، ۱۸۲

ہمالہ ۶۸، ۳۴۶

ہند بنت عتبہ ۱۰، ۲۵۳، ۲۵۴، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۶

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہند بنت مغیرہ ۲۶۲

ہندومت ۹۴

ہندوستان ۵۸، ۳۴۶

ہوازن قبیلہ ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۲

ہٹلر ۶۶، ۲۳۳، ۲۴۹

یثرب ۷۸، ۹۰، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۱۸، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۸، ۲۳۶

یزید ۳۴۵

یعقوب ۱۲۶، ۱۸۰، ۲۱۹، ۲۷۱، ۲۸۴

یمن ۱۱، ۷۸، ۷۹، ۸۹، ۹۲، ۱۰۲، ۱۰۳

یوحنا شاہ ایلات ۷۴، ۳۳۱

یوسفؑ ۶، ۱۷، ۱۳۸، ۱۸۰، ۱۹۰

یوسف اسائی بادشاہ ۷۹

یونان ۴۱، ۷۲، ۹۴، ۱۱۹

یونسؑ ۱۸۰، ۱۸۹

یہواہ ۷۵، ۷۶، ۱۳۷

29639

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

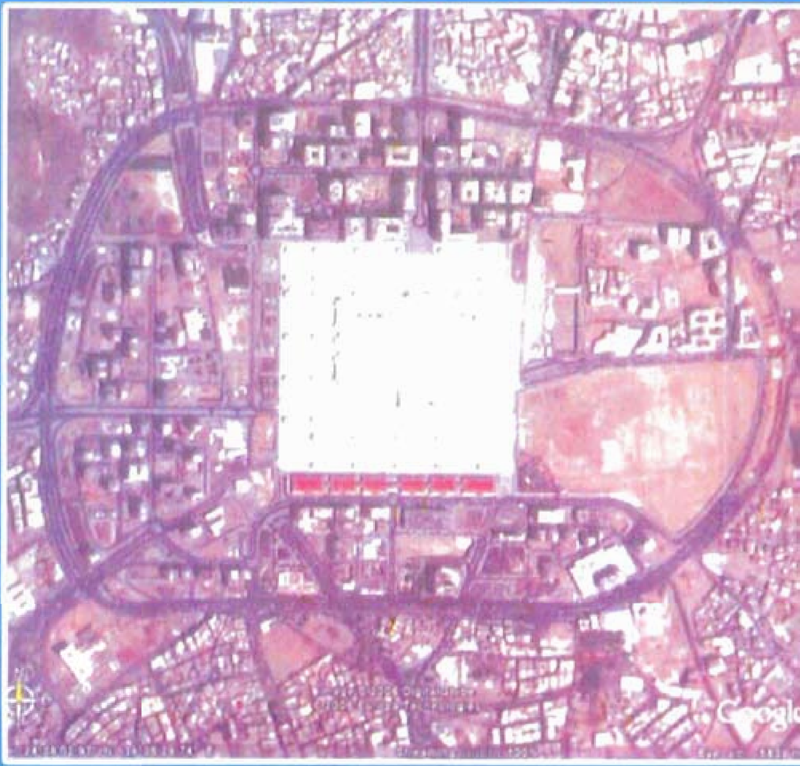

297.63 ح 528 ك
29639-EU-64